

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224024

UNIVERSAL
LIBRARY

224024

جامعہ

کتاب خانہ
کتاب خانہ

مطبوعات جامعہ

مکتبہ جامعہ نے اپریل ۱۹۴۷ء میں مندرجہ ذیل کتابوں کے جدید ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ یہ کتابیں کچھ عرصے سے ختم ہو گئی تھیں اور مانگ برابر آرہی تھی، اب انہیں نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ اربابِ ذوق توجہ فرمائیں۔

مضامین رشید یار سوم ۲۹۶ صفحہ ۱۱ اسلامی تاریخ کی کچی کہانیاں: بار چارم ۷۲ صفحہ

تاریخ القرآن ۱۵۸ + عمر دس جلدی " دوم ۸۰ "

حیاتِ حافظ ۱۷۶ + عمر ہمزاد (ڈراما) " ۴۵ "

رسولِ پاک ۴۸ + عمر دہائی کی دوسو برس کی تاریخ " ۶۰ +

ضبطِ نفس اور نفسِ بستی ۲۰۸ + عمر شہری آزادی " ۸۳ "

از بار العرب ۸۰ + عمر کوہی قرض " ۴۸ "

جمال الدین افغانی ۷۷ + عمر ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ " ۵۶ "

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ ممبئی۔

زیر ادا رت: نور محسن ہاشمی ایم: اے

فہرست مضامین

- | | |
|------------------------------------|--|
| ۱۔ مالیات جنگ | ۱۔ احمد خاں صاحب معظم الم اے فائنل (مثنویہ) |
| ۲۔ اقبال اور پاکس کے زادیہ اے نگاہ | ۲۔ م۔ جہر صاحب میرٹھی |
| ۲۔ ارتباط نصاب | ۳۔ عبد الغفور صاحب ایم۔ اے |
| ۴۔ مارکسزم اور فلسفہ اخلاق | ۳۔ مرزا محمد شفاق احمد صاحب بی۔ اے، ایل، ایل، بی |
| ۵۔ رسوم و رواج اور ان کی خصوصیات | ۴۔ محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (مثنویہ) |
| ۶۔ بھید (ذرا امہ) | ۴۔ مترجمہ نور الحسن ہاشمی |
| ۷۔ شاعر خدا کے حضور میں (نظم) | ۵۔ اثر صاحب صبا بی |
| ۸۔ ڈرائنگ روم (نظم) | ۵۔ سلام صاحب پھلی شہری |
| ۹۔ اپنی اصلاح (ہمارے تیسیم خانے) | ۶۔ محمد یونس صاحب معظم الم اے |
| ۱۰۔ تنقید و تبصرہ | ۶۔ م۔ ج |

۱) سوگوار شباب (۲) شہر خموشاں

(پرنسٹن پبلیشرز پرفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطالع دہلی)

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی
گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمایا

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

جامعہ

ذریعہ ادارہ نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۵ نمبر ۳ || بابۃ ماہ ستمبر ۱۹۷۱ء || چند لائبریری پرچہ

فہرست مضامین

- ۱۔ اقبال (غنائی تھیں)
- ۲۔ دینی منتیں
- ۳۔ جرمنی اور سوویت کی جنگ
- ۴۔ زندگی اور موت (سائنس کی روشنی میں)
- ۵۔ بحیرہ (ڈرامہ)
- ۶۔ نوید فردا (نظم)
- ۷۔ راہبدرانا تھہ ٹھاکرا (نظم)
- ۸۔ تنقید و تبصرہ
- ۱۔ رسالہ انجمن تاریخی تحقیقات علی گڑھ
- ۲۔ البیان
- ۳۔ فروس
- ۴۔ جدید اردو، وغیرہ

- ۱۵۷۔ عبد القیوم خاں صاحب باقی
- ۱۸۰۔ آیت اللہ بیگ صاحب مارٹن
- ۱۸۷۔ م۔ م۔ جوہر صاحب میرٹھی
- ۱۹۷۔ عبد الحسیب صاحب تعلیم سلم یونیورسٹی
- ۲۰۲۔ مترجمہ نور الحسن ہاشمی
- ۲۲۷۔ روشن صاحب صدیقی
- ۲۲۹۔ آصف علی صاحب ہیرسٹر
- ۲۳۳۔

۱۔ پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکس)، محبوب المصطفیٰ دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی۔
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں
ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگاکر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۵ نمبر ۲ بابۃ ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء چند لائحہ فی چراغ آفتاب

فہرست مضامین

- | | |
|---------------------------------------|---|
| ۱۔ آخن مارہروی (مرحوم) | ۲۳۵ پر وفیر رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) |
| ۲۔ گرائی اور ہندوستان | ۲۳۸ محمد احمد صاحب سبزواری ایم اے |
| ۳۔ استحصال | ۲۵۸ محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) |
| ۴۔ ربط کے نصب العین کا ارتقار | ۲۶۰ فضل الدین صاحب اثر |
| ۵۔ نئی تعلیم کے پڑھانے والے کیسے ہوں؟ | ۲۹۳ سید احمد علی صاحب |
| ۶۔ جام صباہی (رباعیات) | ۳۰۱ اثر صاحب صباہی |
| ۷۔ پیام زندگی (نظم) | ۳۰۲ سر روش عسکری طباطبائی لکھنوی |
| ۸۔ خواب ہستی (نظم) | ۳۰۳ معین حسن صاحب جدابی |
| ۹۔ غزل | ۳۰۴ جسگر صاحب مراد آبادی |
| ۱۰۔ تنقید و تبصرہ | ۳۰۵ |

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (کنن) ممبئی لکھنؤ دہلی)

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی
ہیں ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگاکر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

جامع

ذیاداد۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۵۳۔ نمبر ۵۱ | بابۃ ماہ نومبر ۱۹۴۱ء | چندہ لائبریری جڑاٹھ آنہ

فہرست مضامین

- | | | |
|-----|---------------------------------------|--------------------------|
| ۲۱۳ | فضل الدین صاحب اثر ایم۔ اے | ۱۔ ربط کا طریقہ تعلیم |
| ۲۲۱ | آیتہ اللہ بیگ صاحب عارت | ۲۔ ہماری آبادی |
| ۲۳۲ | محمد تقی صاحب ادوھوی | ۳۔ اسٹیلن کاروس |
| ۲۳۸ | محمد عبد القیوم خاں صاحب باقی ایم۔ اے | ۴۔ علامہ اقبال کا فلسفہ |
| ۲۴۸ | از اسٹیونسن | ۵۔ عاشقی (ترجمہ) |
| ۲۵۸ | خواجہ احمد صاحب فاروقی بی۔ اے | ۶۔ سرانجام رسانی کے تھتے |
| ۲۶۶ | شفقت اللہ صاحب کرانی بی۔ اے (آنرزا) | ۷۔ اندرون مصر |
| ۲۷۵ | امجد ندیم صاحب قاسمی | ۸۔ آخر کیوں؟ (نظم) |
| ۳۷۶ | جسگر صاحب مراد آبادی | ۹۔ غنبرل |
| ۳۷۷ | | ۱۰۔ تنقید و تبصرہ |

(پرنٹر دیلشیر پرنس محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطالع دہلی)

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی
ہیں۔ ارباب ذوقِ نیوی فہرست منگوا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

جامعہ

زیرِ ادارہ: نور الحسن ہاشمی ایم، ایسے

جلد ۳۵ - نمبر ۶ || بابۃ ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء || سالانہ فی پرتچہ

فہرست مضامین

۳۸۳	عبدغفور صاحب ایم۔ اے	۱۔ تعلیمی بحث
۴۰۱	محمد ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے	۲۔ لکھنویت کیا ہے؟
۴۰۹	ایم، ایم، جوہر صاحب میرٹھی	۳۔ علامہ اقبال کا فلسفہ
۴۱۷	نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے	۴۔ توہن کی غزل گوئی
۴۳۱	محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم۔ اے	۵۔ فانی کی موت
۴۳۳	اثر صاحب صہبائی	۶۔ تجلیات
۴۳۴	احمد ندیم صاحب قاسمی	۷۔ اس دور میں: (نظم)
۴۳۵	فضل حسین صاحب کیف اسرائیلی	۸۔ نوائے سحر (رباعیات)
۴۳۶	۹۔ تنقید و تبصرہ
۴۴۵	(م۔ م)	۱۰۔ رفتِ ارعالم

(پرنٹر و پبلشر: پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آگن) محبوب المطابع (دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی
الہ آباد، دائرہ حمیدیہ، سرانے میر اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین
اور دوسرے مشہور اداروں کی مطبوعات کی ایجنسی حاصل
ہے، اس لئے مکتبہ سے ہر موضوع کی کتابیں اصلی قیمت پر
حاصل کی جاسکتی ہیں

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے
ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمائیے اور قواعد و ضوابط
ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے۔

مالیات جنگ

جنگ کے سب سے زیادہ نمایاں اثرات ملک کے مالیہ پر پڑتے ہیں یوں تو معاشی زندگی کے ہر شعبہ کا جنگ سے متاثر ہونا ناگزیر ہے لیکن ہم ان اثرات کو فوراً محسوس نہیں کرتے البتہ حکومت کے مالیہ میں جنگ کی وجہ سے جو تغیرات ہوتے ہیں ان کا ہمیں نسبتاً جلد علم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حالت امن کی بہ نسبت حالت جنگ میں حکومت کے اخراجات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ آلات حرب کی فراہمی، سپاہیوں کے لئے خوراک کی رسد، فوجوں کی محل نقل، رگرووں کی بھرتی اور ان کی تحواہیں یہ وہ بعض مدات ہیں جن کے لئے جنگ کے زمانہ میں حکومت کو زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور ان جدید اخراجات کی پابجائی کے لئے حکومت کو مالیہ میں تغیرات کرنے پڑتے ہیں۔ نئے نئے مدات آمدنی نکالے جاتے ہیں اور ان مدات کی تقسیم بھی ایسی نہیں ہوگی جیسی کہ زمانہ امن میں ہو اگر تھی ہے۔ حکومت کے پاس دست غیب تو نہیں، ظاہر ہے کہ ان نئے مدات کے تحت جو آمدنی حاصل ہوگی وہ اہل ملک کی جیب ہی سے نکلے گی۔ گویا حکومت کے مالیہ میں تغیر و تبدل کا اثر بالراست اہل ملک پر پڑتا ہے۔

مالیات میں ان تغیرات کا اثر دوران جنگ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ حکومت اور عوام کو مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنگ کے اختتام سے بیرونی ہیجان تو ختم ہو جاتا ہے لیکن بیرونی سکون اندرونی سیاسی ہیجان کو باعث بنتا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں صنعتیں رواج پاتی ہیں وہ جنگ کے بعد بند ہو جاتی ہیں اور ان صنعتوں میں جو افراد مصروف تھے بیکار ہو جاتے ہیں ان اشخاص کو کام پر لگانا ایک حل طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔ جنگ سے قبل جو تجارتی حالات تھے عموماً آتے ہیں ان تمام حالات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں عام طور پر بے چینی اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں معمولی حالات کے پیدا ہو جانے کا سب سے بڑا سبب ہی حکومت کے مالیہ کی تبدیلیاں ہیں۔ جنگ کے بعد حکومت کے زیادہ اخراجات میں کمی ہوتی ہے دوران جنگ میں حکومت کی حیثیت ایک بہت بڑے خریدار کی سی ہوتی ہے لیکن جنگ کے بعد حکومت کی طلب میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قیمتوں میں تخفیف ہوتی ہے اور اس کا لازمی اثر آمدنیوں پر بھی پڑتا ہے۔

جنگی مالیات کے یہی وہ اثرات ہیں جن کی وجہ سے متمدن ممالک میں موازنوں پر حکومت اور عوام خاص نظر رکھتے ہیں اور دونوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ موازنہ کی ترتیب ایسی ہو کہ اس سے ایک طرف جنگی ضروریات کا مل طر پر پوری ہوں اور دوسری طرف ملک کا معاشی توازن برقرار نہ پائے۔

سوال یہ ہے کہ جنگی مالیات کا مقصد کیا ہے؟ ہم نے بتلایا ہے کہ زمانہ جنگ میں حکومت کو نئے نئے اخراجات لاحق ہوتے ہیں ان اخراجات کی جس سرعت کے ساتھ پابجائی کی جائے گی اسی قدر جنگ میں کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اخراجات جنگ کی پابجائی جنگی مالیات کا بنیادی کام ہے لیکن اخراجات جنگ کا ٹھیک ٹھیک منہم کیا ہے؟ فرض کیجئے کہ جنگ کے لئے لگھٹان کو دس کروڑ پونڈ کی ضرورت ہے یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت دس کروڑ پونڈ کے سکے دارالضرب میں ڈھال لے اور اپنی ضروریات پوری کرے باقی انظر میں تو یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے حکومت کو اپنی ضروریات کے لئے دس کروڑ پونڈ کے نہیں بلکہ ان کے ہم قدر وسائل اشیاء و خدمات درکار ہیں تاکہ جنگی ضروریات پوری ہو سکیں اور ظاہر ہے دس کروڑ پونڈ کے سکے ڈھالنے سے یہ کام سرانجام نہیں پاسکتا حکومت کو جن مشینا و خدمات کی ضرورت ہے ان کے زمانہ میں عوام ان سے مستفید ہوتے تھے لیکن اب اغراض جنگ کے لئے حکومت ان اشیاء و خدمات کو حاصل کرے گی اور دس کروڑ پونڈ کے ہم قدر مشینا و خدمات کے استعمال کی حد تک عوام کو حکومت کے حق میں دست بردار ہونا چاہئے گا۔ بالفاظ دیگر جنگ کے مصارف صحیحہ ان اشیاء و خدمات پر مشتمل ہیں جن کی تیاری و استعمال کو اس لئے ترک کرنا پڑتا ہے کہ جنگی ضروریات کی تکمیل ہو سکے مختصر یہ کہ ملک کے معاشی وسائل کے کثیر حصہ کو زمانہ امن کے کاروبار کی انجام دہی اور اشیاء کی تیاری سے زمانہ جنگ کے کاروبار کی سربراہی اور اشیاء ضروریات کی فراہمی کی طرف منتقل کرنا ہی مالیات جنگ کا بنیادی مقصد ہے۔

مالیات جنگ کے مختلف طریقے :-

حکومت اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ شاہی خزانوں میں معتد بہ رقم زیادہ تر اسی غرض سے رکھا کرتے تھے یا پھر جاری قرضے لیتے تھے اور حاصل میں اضافہ بھی کر دیا کرتے تھے بعض بعض اوقات رعایا سے جبراً و قہراً وصول کی جاتی تھیں کبھی کبھی خطابتا

اور جاگیریں دے کر ملک کے مالدار اشخاص سے روپے پیسے لیتے تھے۔ انعام عطیات اور جاگیر کے مادہ میں اشخاص کی خدمات اور آلات حرب حاصل کئے جاتے تھے جاگیر داری نظام میں ہر جاگیر دار اپنی جاگیر کے پورے وسائل کے ساتھ مرکزی حکومت کی جنگی ضروریات پوری کرتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جہاں طریقہ جنگ میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہاں جنگی ضروریات پورا کرنے کے قدیم ذرائع کے بجائے نئے طریقے رائج ہو گئے ہیں جس طرح جدید جنگی طریقے میکانی اور سائنٹفک اصولوں کی بنا پر ہر قدیم طریقے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح مالیات جنگ کے جدید طریقے اپنے علمی و تکنیکی نوعیت کے لحاظ سے قدیم ذرائع سے جدا گانہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اخراجات جنگ کی پابجائی کے چار مختلف طریقے ہیں۔

۱۔ صنعتی نگرانی۔

۲۔ محصول۔

۳۔ قرضہ۔

۴۔ افراط زر۔

۱۔ صنعتی نگرانی۔

اس طریقے کے مطابق ملک کے تمام معاشی شعبے حکومت کے تحت آ جاتے ہیں اور حکومت ان تمام شعبوں کی نگرانی کرتی ہے۔ ایسی صورت میں آلات حرب کی تیاری کے لئے تفصیل (Rationing) اور تفصیل قیمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ حکومت کو عوام کی آمدنی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنیاں ملٹی عالیہ پر قرار پتی ہیں۔ اشیاء کی تیاری میں جو اخراجات پہلے لاحق ہو کر تھے اب بھی وہی برداشت کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس اضافہ قیمت سے حکومت جنگی اخراجات کے لئے آمدنی حاصل کرتی ہے اور بقیہ حصہ سے ان اشیاء کی تیاری کے اخراجات کی پابجائی کی جاتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس طریقہ میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور بعض خرابیاں بھی۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عوام کی آمدنیوں میں تخریبات نہیں ہوتے اور جنگی

ضروریات کی فراہمی کا جو بار عوام پر پڑتا ہے وہ ان کے لئے کچھ زیادہ بارگراں نہیں ہوتا۔ جنگی ضروریات کے لئے جو محصول لگایا جاتا ہے اس کو عوام بخوشی پسند نہیں کرتے۔ اس طریقہ میں عوام پر قرضہ کا بار نہیں پڑتا۔ حکومت کے لئے بھی یہ طریقہ بہت سہولت بخش ثابت ہوتا ہے۔ تمام جنگی سامی ایک ہی مرکز اور نظام کے تحت شروع کی جاتی ہیں اور ان میں اعلیٰ درجہ کی مرکزیت پیدا کی جاسکتی ہے چونکہ جنگی اشیاء و خدمات کی فراہمی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے اس لئے اس میں کافی وقت بچتا ہے اور جنگ کے زمانہ میں وقت کی بچش فتح کا پیش خیمہ ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ماہرین کی نگرانی میں ایک لاکھ عمل تیار کیا جائے۔ موجودہ جنگ میں جرمنی اور برطانیہ اس طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ یہاں زمانہ امن کے غیر اہم کاروبار کو جنگی صنعتوں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور وزارت رسد ان کی نگرانی کرتی ہے اس وزارت کے دو فرغانے ہیں ایک تو یہ کہ قومی تحفظ کے لئے ضروری اشیاء فراہم کی جائیں اور دوسری حکومت کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کفایت شناسی سے کام لیا جائے۔

نفاٹس۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو سرعت کے ساتھ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جنگ کے ابتدائی زمانہ میں اس طریقہ پر عمل پیرا ہونا دشوار ہے۔ اس کے لئے بہت سے پیچیدہ انتظامی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں صنعتیں منتخب کی جائیں ان کے انتظام و نگرانی کے لئے کمپنیاں بنائی جائیں۔ ان کی مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔ یہ سب پانچ بیسے جائیں تب کہیں جا کر اس طریقہ کو پورے طور پر نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان تمام انتظامات کے لئے وقت درکار ہے۔

انتظامی نظام میں اس طریقہ کو بہت جلد اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ماسی شعبہ حکومت کے زیر نگرانی تو ہوتے ہی ہیں البتہ غیر اہم کاروبار و مصنوعات کو جنگی ضروریات تیار کرنے والے کارخانوں میں منتقل کر دینا پڑتا ہے اور ہسٹیاہر کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

موجودہ جنگ کے چھڑنے سے پیشتر ہی جنگ کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ اسی لئے انگلستان میں کئی صنعتوں مثلاً حمل نقل، جہاز رانی، طیارہ سازی وغیرہ کو جنگ سے قبل ہی قومی تنظیم و نگرانی کے تحت لے لیا گیا تھا

محصول: دیوں کے زمانہ میں بھی حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ محصول ہی ہے لیکن زمانہ جنگ میں جو محاصل لگائے جاتے ہیں ان کی نوعیت زمانہ امن کے محاصل سے جداگانہ ہوتی ہے۔ زمانہ امن میں محصول لگاتے وقت کئی باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً زمانہ امن کی محصول اندازی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ اشیا ضروری پر محصول نہ لگایا جائے تاکہ اس کا بار غریب طبقہ پر نہ پڑے یعنی آدم اسمتھ کا یہ قانون کہ ٹیکس کم سے کم ضروریات ہو۔ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ زمانہ امن میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ محصول خصوصاً محصول آمدنی اس تناسب سے لگایا جائے کہ اس کا رد عمل پس اندازی کی تخفیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو یعنی محصول اتنا زیادہ نہ ہو کہ افراد کی خطرات برداشت کرنے اور پس انداز کرنے کی قابلیت میں کمی ہو جائے۔ ورنہ اس سے بیروزگاری بڑھنے لگے گی اور معاشی ترقی میں یہ محصول سنگ گراں ثابت ہوگا۔ بالفاظ دیگر آدم اسمتھ کے قانون مدلت پر عمل کیا جاتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں ان اصولوں کا کچھ زیادہ پاس و بجا نہیں کیا جاتا۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت اشیا ضروری پر محصول لگانے سے نہیں چوکتی چنانچہ جنگ کے پھڑپھڑنے ہی حکومت بندنے و یا سلائی پر محصول لگا دیا ہے اور اب اس میں اضافہ کر رہی ہے غرض یہ کہ زمانہ جنگ میں چونکہ حکومت کو غیر معمولی اخراجات لاحق ہوتے ہیں اس لئے ان کی پابجائی کے لئے غیر معمولی محاصل لگائے جاتے ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کا بار ان افراد پر نہ پڑے جو فاقے کے سدا پر پہنچ گئے ہوں۔

جنگ کے زمانہ میں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ محاصل کا بار دو اہمند طبقہ پر زیادہ پڑے۔

محاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ محاصل میں اضافہ کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ نئے محاصل عائد کئے جائیں۔ موجودہ جنگی ضروریات کی فراہمی کا انتظام صرف محاصل میں اضافہ ہی سے ممکن نہیں۔ اس لئے دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو طریقہ عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے وہ (Fancy Taxes) یا بے اندازہ محصول ہے۔ اس سے دو محصول مراد ہیں جس سے پس اندازی کا محرک متاثر نہ ہو محصول منافع زائد یا محصول آمدنی زائد اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے تحت ہر اس شخص پر جس کی آمدنی جنگ کے زمانہ میں بہ نسبت امن کے زمانہ کے زیادہ رہی ہو محصول عائد کیا جاتا ہے لیکن ان محاصل سے زمانہ جنگ میں زیادہ آمد انہیں ملے گی کیونکہ منافع زائد آمدنی زائد کا انحصار مشیر قیمتوں کے اضافہ پر ہے اور جنگ کے زمانہ میں عوام اور حکومت دونوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قیمتوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔

اور اسی لئے یمتوں کی نگرانی کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جب صورت حال یہ ہو تو حکومت کو ان محل سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں۔ محصول منافع زائد کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ جنگ میں جو زائد منافع ہوتا ہے اس پر محصول لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے زمانہ جنگ کے منافع پر جو محصول لگایا جاتا ہے اس کو محصول منافع جنگ (War Profit Tax) کہتے ہیں۔ محصول منافع زائد درحقیقت ایک تجارتی یا کاروباری محصول ہے۔ دولت پر تین طرح سے محصول لگایا جاسکتا ہے۔ ایک تو پائیدار آمدنی پر، دوسرے اشخاص یا اداروں پر تیسرے اشخاص یا اشیاء پر۔ اشیاء پر جو محصول لگایا جاتا ہے وہ یا تو زمین پر لگایا جائے گا یا اصل پر یا پھر تجارت پر۔ محصول منافع زائد اشیاء پر ہی لگایا جاتا ہے۔

زمانہ جنگ میں جو نئے محامل لگائے جاتے ہیں ان کے منجملہ دو نوادہ پر بیان ہو چکے ہیں یعنی (۱) محصول منافع زائد (۲) محصول آمدنی زائد (۳) ایک تیسرا محصول محصول تعیشت ماید کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بے اندازہ محصول کی ایک قسم ہے ظاہر ہے کہ جنگی معیشت میں ظاہر و باطن کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مالیات جنگ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اشیاء تعیشت کا استعمال کم سے کم ہو۔ اس لئے ان پر محصول لگایا جاتا ہے۔

سالانہ اصل پر محصول (Annual Capital Tax) یہ بھی زمانہ جنگ کا ایک نیا محصول جو ایک سال گزرنے کے بعد جائیداد کی معمولی قیمت پر محصول لگایا جاتا ہے۔ اس محصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا سالانہ جبٹر رکھا جائے اور عموماً اس کی ادائی کے لئے چھ ماہ کی مدت دی جاتی ہے۔

۴۔ غیر منکسب آمدنی کا محصول۔ یہ بھی منجملہ ان نئے محامل کے ایک قسم کا محصول ہے جو زمانہ جنگ میں غیر منکسب آمدنی مثلاً ساشی گان، جاگیر کی آمدنی وغیرہ پر ماید کیا جاتا ہے۔ اس محصول کے ماید کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پوری کی پوری آمدنی حکومت لے لے یا دوسرے یہ کہ غیر منکسب آمدنی کا ایک حصہ لے لے اور بقیہ حصہ چھوڑے جو حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس کا انحصار شخص متعلقہ کی آمدنی پیدا کرنے کی قابلیت، اس کے سابقہ مطابلات اور اس کے زیر پرورش افراد کی تعداد پر ہوتا ہے۔

مزدوروں اور چوٹی چوٹی آمدنی والوں پر محصول ماید کرنے میں کئی ایک انتظامی دشواریاں پیش آتی ہیں اس لئے

ان پرنکس لگانے کا واحد طریقہ بالواسطہ محصول ہے یعنی اخراجات زندگی کی معمولی اشیاء مثلاً برقعہ، تباکو، شکر وغیرہ پر محصول لگایا جاتا ہے اور ہم پہلے بیان کر آئے ہیں زمانہ جنگ میں حکومت کا ان ضروری اشیاء پر محصول لگانا کچھ میسر نہیں خیال کیا جاتا۔

اخراجات جنگ کی پابجائی کے اس طریقہ میں نقصان بھی ہیں اور فوائد بھی۔

فوائد :- اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا البتہ اشیاء کی طلب میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ کہ محصول مائد کرنے سے پہلے محصول ادا کنندہ جن اشیاء کو زیادہ استعمال کرتا تھا محصول مائد کرنے کے بعد ان میں سے بعض اشیاء کی طلب میں کمی کر دے گا ممکن ہے کہ بعض کا استعمال ترک کر دے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی محصول مائد کرنے کے بعد اشیاء کی سابقہ طلب میں کمی ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان اشیاء کی انفرادی قیمت میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہو۔

(۲) اگر صرف حاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کی جائے تو جنگ کے بعد مالیات کے غیر معمولی مسائل باقی نہیں رہتے اور نہ انھیں حل کرنے کے لئے غیر معمولی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ نہ تو قرضہ عام میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور نہ ہی شرح سود میں اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے زیادتی کا رجحان پیدا ہوگا۔ الغرض اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے جنگ کے بعد حکومت کو ملک کی مالی و معاشی حالت درست کرنے کے لئے غیر معمولی درد سر ہی نہیں کرنی پڑے گی بلکہ حکومت کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ مجوزہ محاصل میں کمی کرے اور اس طرح عوام کی آمدنیوں کو جو دراصل جنگ میں گھٹ گئی تھیں سابقہ معیار پر لے آئے۔

نقص :- اس طریقہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ عوام اس کی دلی تائید نہیں کرتے جنگ کے زمانہ میں بھی بہت کم افراد ہوتے ہیں جو اپنی جیب پر بار پڑتے دیکھ کر چین بچیں نہ ہو جائیں۔

قرض :- اخراجات جنگ کی پابجائی کے لئے حکومت کثیر مقدار میں قرضے لیتی ہے اس قسم کے قرضوں کو غیر پیداوار کا جاتا ہے۔ قرض کی صورت میں پرنکس کی مانند رقم افراد کی جیب سے نکل کر حکومت کے ہاتھوں میں آتی ہے لیکن قرض پرنکس میں فرق یہ ہے کہ قرض دہندہ کی رقم کو ختم میعاد پر حکومت واپس کرنے کا وعدہ کرتی ہے لیکن محصول ادا کنندہ سے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ نہ صرف قرض دہندہ کو اس کا اصل واپس مل جاتا ہے بلکہ اس اصل پر بڑھتی

شرح سے سو بھی ادا کیا جاتا ہے۔

قرض حاصل کرنے کے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ اہل ملک سے حاصل کیا جائے یا دیگر ممالک سے اگر اہل ملک سے حاصل کیا جائے تو اس کی دو زمینیں ہو سکتی ہیں یعنی لازمی یا اختیاری۔ لازمی قرض سے مراد قرض کی وہ متعلقہ حکومت حاکم کی جانب سے مقرر کی جائے اور اگر اختیاری قرض ہو تو افراد کی آمدنی کا صرف وہی حصہ حاصل کیا جاسکتا ہے جو ان کے اپنے صرف سے بچ جائے یا جو محصول کی صورت میں ان کی جیب سے نہ چلا گیا ہو۔ جنگ کے زمانہ میں بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی غیر جانبدار ممالک سے قرضے حاصل کرتی ہیں۔ مثلاً گذشتہ جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ نے ۱۳۵۰ ملین پونڈ امریکہ سے قرض لے لئے تھے۔

اب ہم اس طریقہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں گے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں یہ طریقہ عوام کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ قرض دیکس و ونوں صورتوں میں افراد کی کچھ رقم ان کی جیبوں سے نکل حکومت کے خزانے میں داخل ہو جاتی ہے لیکن قرض کی صورت میں نہ صرف اہل کی واپسی کی امید رہتی ہے بلکہ اکثر صورتوں میں سو بھی ملتا ہے۔ اس لئے قرض دہندہ کے لئے یہ امر ناگوار نہیں گذرتا حکومت کو اس طریقہ سے نسبتاً آسانی کے ساتھ رقم مل جاتی ہے۔ قرضے حاصل کرنے کے لئے صنعتی نگرانی کے طریقہ کی مانند پیچیدہ انتظامات نہیں کرنے پڑتے۔

یہ طریقہ بھی نقصان سے پاک نہیں ہے قرض لیتے وقت حکومت کو ضمنی آسانی ہوتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ دشواریاں اس کو داگرتے وقت لاحق ہوتی ہیں۔ حکومت اس قرضہ ماسہ کو ادا کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کی ادائیگی کے لئے حکومت ٹکنگ فنڈ یا ذخیرہ ادائیگی قائم کرتی ہے اس فنڈ میں ہر سال ایک معینہ رقم جمع کی جاتی ہے تاکہ جمع شدہ رقم قرض کی ادائیگی میں دی جائے ایک دوسرے طریقہ طریقہ تبدیل ہے یعنی یہ کہ اختتام جنگ پر حکومت شرح سودیں کمی کر دے اور اسی شرح سے سود ادا کرنے کا اعلان کر دے قرض دہندہ اس طرز عمل پر احتجاج کرتے ہیں ایسی صورت میں حکومت اسی کم شرح سود پر نیا قرضہ حاصل کر کے پرانا قرضہ ادا کر دیتی ہے۔ برطانوی حکومت نے پولیائی جنگوں کے سلسلہ میں ہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ کثیر المقدار قرضوں میں تخفیف کرنے کا ایک تہہ اطلاق ہے کہ ملک کے امکان حادہ کی نقد اہلیت کا

ایک حصہ حکومت حاصل کرے۔ اس طریقے کے اختیار کرنے میں کمی دشواریاں ہیں۔ دل تو یہ کہ جائداد کی مالیت کا تین مشکل ہے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرین کا اندازہ بھی غلط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر قیمت کا صحیح اندازہ قائم بھی ہو جائے تو اس جائداد کا فروخت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر متعلق شخص جو اس جائداد کو خریدنے کے قابل ہو گا وہ خود بھی ہمارے مفروضہ کے مطابق اپنی جائداد فروخت کرنے کی فکر میں ہو گا۔ البتہ اگر مالکان جائداد حکومت کے لئیں دار ہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کی اُس رقم کی حد تک دستبردار ہو جائیں مثلاً ایک شخص کے پاس حکومت کا پانچ ہزار کا تکت ہے اور اب یہ شخص اس رقم کے لینے سے دستبردار ہو جائے۔ اسی طرح ایک شخص کے پاس ریلوے کمپنی کے حصص ہوں اور وہ اپنے حصص حکومت کو دیدے۔ حکومت ان حصص کو فروخت کر کے یا اس کی آمدنی سے اپنا قرضہ چکا سکتی ہے

آؤ اب ذکر طریقے کے سوا مندرجہ بالا دونوں طریقوں یعنی ذخیرہ ادائی یا طریق تبدیل کے ذریعہ قومی قرضہ کی ادائی کے لئے حکومت کو عوام پر محصول لگا کر ہی رقم حاصل کرنی پڑتی ہے اس طرح گویا اگر قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کی جائے تو اس کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے کیونکہ ان ہی پر ٹیکس لگا کر اس قرض کی ادائی عمل میں آتی ہے بعض معاشین کا خیال ہے کہ اخراجات جنگ کی ادائی موجودہ نسلوں کے اندر ختم ہو سکتا ہے اور بحالت ہوئی چاہئے اور آئندہ نسلوں پر اس کا بار غیر منصفانہ اور معاشی زندگی کے لئے مفرت رساں ہے لیکن بعض شخصیات اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جنگی مصارف کا بار آئندہ نسلوں پر بھی پڑنا چاہئے۔ کیونکہ جنگ کے خطرات اور مضار اثرات سے ملک کو محفوظ رکھ کر موجودہ نسل پیش ہمارا خدات انجام دیتی ہے اور اسی طرح بالواسطہ یا بالواسطہ جنگ سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے نئی نسل بھی مستفید ہوتی ہیں۔ موجودہ نسلوں کی یہ قربانی کیا کم ہے وہ جنگ اور اس کی ہولناکیوں کے مقابل میں اپنا خون بہاتی ہیں۔ اگر آئندہ نسلوں پر اخراجات جنگ کے ایک حصہ کا بار پڑتا ہے تو یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

الغرض قرض لینے کی صورت میں اخراجات جنگ کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی ادائی کے لئے ملک کے مختلف طبقوں پر ٹیکس لگایا جاتا ہے جس میں دولت مند متوسط حتی کہ غریب طبقہ کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح اخراجات جنگ کا بار نہ صرف دولت مند بلکہ متوسط اور غریب طبقوں پر بھی پڑتا ہے

بادی النظر میں یہ ہوتا ہے کہ ان طبقوں پر اسی تناسب سے بار پڑتا ہے جس تناسب سے کہ نیکس کی رقم وصول کی جاتی ہے لیکن یہ نطفہ غائر دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غریب طبقہ پر اس کا بار زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر دولت مند طبقہ کی جیب سے نیکس کی صورت میں کچھ رقم چھانی جا رہی ہے تو انہیں پھر یہ رقم سود کی شکل میں واپس مل جاتی ہے لیکن غریبوں سے نیکس تو برابر لیا جاتا ہے مگر انہیں کوئی مستندہ معاوضہ سود کی شکل میں واپس نہیں ملتا۔ گویا دولت مند طبقہ مزید دولت مند بن جاتا ہے اور غریب طبقہ غریب تر ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جنگی اغراض کے لئے زیادہ تر دولت مند طبقہ کے اندوختوں سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ دولت مند و غریب کی اضافی حیثیت جنگ کے زمانہ میں ایک سی نہیں ہوتی۔ جنگ کے زمانہ میں علی العموم قیمتیں اعلیٰ ہو جاتی ہیں۔ قیمتوں کے اضافہ سے امیر کی یہ نسبت غریب زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اخراجات جنگ کا جو بار غریب طبقہ پڑتا ہے وہ اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اغرض قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی جو معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔ دردم مسادات آمدنی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ کی ایک اور یہ خرابی ہے کہ کئی نئی صنعتیں جنہیں جنگ کے زمانہ میں جاری کرنے کے کافی مواقع رہتے ہیں محض اس وجہ سے جاری نہیں کی جاسکتیں کہ ملک کا گھیر سرمایہ قرضوں میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں یکساں پیدا ہوتی ہے۔

۷

یہ تو ہوا ان قرضوں کا حال جو اندرون ملک حاصل کئے جاتے ہیں مگر جنگی اغراض کے لئے بیرون ملک سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں تو اس کے نتائج اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ قرضے غیر پیداوار ہوتے ہیں ان سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی کہ جس سے غیر ملکی قرض دہندوں کو سود ادا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اہل وسو کی پابجائی اہل ملک پر محصول مائدہ کر کے کی جاتی ہے۔ دوسرے نظروں میں جس مقدار میں بیرون ملک سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اس سے زائد مقدار میں (اہل معسود) رقم واپس کی جاتی ہے مگر اس مقدار کی حد تک ملک کی دولت بغیر کسی معاوضہ کے ملک سے باہر چلی جاتی ہے۔ اس قسم کے غیر ملکی وغیر پیداوار قرضوں کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ جو ہمیشہ نے گذشتہ جنگ عظیم میں جو قرضے کثیر مقدار میں غیر مالک سے حاصل کئے تھے ان کے بوجھ سے جرمنی کی معاشی حالت ایک عرصہ دراز تک سنبھل نہیں سکی تھی اور بعض معاشین کا

کا تو اس وقت یہ خیال تھا کہ بس اب جو منی ختم ہو چکا۔

الغرض اس طریقہ سے مابعد جنگ الیات کے مختلف اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

افراط زرہم نے بیان کیا ہے کہ قرض کے ذریعہ بھی الیات جنگ کا انصرام کیا جاتا ہے۔ یہ قرض دو ذرائع سے لیا جاتا ہے۔ حکومت یہ قرض یا تو عوام سے لے سکتی ہے یا اداروں یعنی بینکوں سے۔ اگر حکومت بینکوں سے قرض لے تو عوام کے پاس جو مقدار رقم ہوتی ہے اس میں اضافہ کرنا ہوگا مثلاً اگر برطانوی حکومت انگلستان بینک سے قرض لے تو خزانی بل (Treasury Bills) جاری کرنے پڑیں گے اور جنگ ان کی ضمانت پر اپنے

کھاتہ داروں کے کھاتوں میں اضافہ کرے گا۔ اور یہ اضافہ غیر متناسب ہوگا۔ یا اگر حکومت معمولی بینکوں سے قرض لے تو یہی بینک خزانی بل کی طمانیت پر اپنے کھاتہ داروں کے کھاتوں میں اضافہ کریں گے۔ البتہ یہ اضافہ تناسب طریقہ سے ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں مقدار اعتبار میں اضافہ جوتا ہے اور اسی لئے زر نقد کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اسی اضافہ کو افراط زر کہا جاتا ہے۔ اگر عوام سے قرض لیا جائے تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔

افراط زر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہیں لیکن الیات جنگ میں اس اصطلاح کو صرف ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر کے عوام کے صرف میں کمی کی جاتی ہے۔ الیات جنگ کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ”ہر قسم کے صرف میں کمی کی جائے“ محصول، قرضہ، صنعتی نگرانی بھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ محصول اور قرضے کے ذریعہ عوام کی جیب سے رقم لے لی جاتی ہے۔ قبل ازیں کہ وہ اس رقم کو اپنے صرف میں لائیں۔ افراط زر میں یہ ہوتا ہے کہ انھیں خرچ کرنے کی اجازت حسب معمول دی جاتی ہے۔ لیکن جتنا وہ خرچ کرتے ہیں اس سے پہلے کی بنیست کم، شاید حاصل ہوتی ہیں۔

افراط زر کے دو طریقے ہیں ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ سادہ طریقہ یہ ہے کہ حکومت زندہ کاغذی کاغذی مقدار میں اجراء کرتی ہے اور یہ زر علی العموم غیر نقد پذیر ہوتا ہے یعنی حکومت اس کے معاوضہ میں سونا دینے کی ذمہ داری نہیں لیتی لیکن اس کے باوجود یہ زر اس وجہ سے جاری ہوتا ہے کہ حکومت اسے زر قانونی قرار دیتی ہے جس کے قبول کرنے پر ہر شخص اندرون ملک مجبور ہے۔ یہ زر فیضی ضروریات اور سپاہیوں کی تنخواہ میں دیا جاتا ہے زر کی مقدار میں اس حد تک اضافہ کیا جاتا ہے کہ حکومت کو انفرادی کی مطلوبہ تعداد اور سادہ سامان فراہم ہو جائے

بمقیدہ طریقہ وہ ہے جس کو ہم مختصراً ابتدا میں بیان کر آئے ہیں ہم نے افراط زر کی سادہ صورت بیان کی ہے کہ حکومت زر کا نقدی کا اجرا کرتی ہے لیکن موجودہ زمانہ خصوصاً متہدن ممالک میں زر کا نقدی کا استعمال کم ہوتا ہے کارڈ یا زیادہ تر چیک کے ذریعہ انجام پاتے ہیں ایسی صورت میں افراط زر کی نوعیت مختلف ہوگی۔ حکومت جنگوں سے خزانہ کے بلز کی طمانیت پر مصنوعی کمائے کوٹنے کی خواہش کرتی ہے اور دوسری طرف جنگی قرضہ جات کا اعلان کرتی ہے عوام جنگی قرضوں میں حصہ لینے کی خاطر ان حکاموں میں سے رقومات لیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرح حکومت کو قرضوں کی شکل میں جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ عوام کی آمدنی کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ مقدار اعتبار میں اضافہ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اور یہی مقدار حکومت کو قرضوں کی شکل میں حاصل ہوتی ہے گویا یہ رقم مصنوعی طریقہ سے خاص طور پر حکومت کو قرض دینے کے لئے مینا کی جاتی ہے حکومت افراط زر کی پالیسی اختیار کر رہی ہے یا نہیں اس کے آزمانے کا ایک ہی طریقہ ہے حکومت جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ کسی کی آمدنی کا حصہ ہے تو یہ صورت افراط زر کی نہیں ہوگی لیکن اگر حکومت کے خرچ میں اضافہ ہو اور عوام کے خرچ میں کمی نہ ہو تو یہ صورت افراط زر کی ہوگی اس سلسلہ میں ایک تشبیہ یاد رکھنے کے قابل ہے حکومت اگر سکوں کو زیادہ مقدار میں ڈالے تو اس سے قیمتوں میں لازماً اضافہ نہیں ہوتا اگر ملک میں بے روزگاری ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ زیادہ رقم اجرتوں میں چلی جائے اسی اصول پر نایزوں نے مالیات کا انتظام کیا محتاج ڈاکٹر ساخت سابق صدر راجراج بینک نے اس طریقہ کی کمزوری بتلائی تو انھیں برطرف کر دیا گیا لیکن یہ واضح رہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کر دینے کے بعد صرف اسی صورت میں قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا جب کہ بے روزگاری زیادہ شدید ہو۔

اب ہم اس طریقہ کی بعض خوبیوں اور خرابیوں پر غور کریں گے زمانہ جنگ میں بھی ہمارے صنعتی وسائل کا ایک کثیر حصہ ایک عرصہ تک حکومت کی نگرانی میں نہیں رہتا بلکہ خانگی افراد کی زیر سرکردگی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اگر ان افراد کی خدمات کو حکومت، غرض جنگ کے لئے حاصل کرنا چاہے تو پھر ان کے منافع میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر عام حالات میں ماطین پیداؤں سے شعبہ پیداؤں میں مصروف رہتے ہیں جہاں شرح منافع زیادہ ہوتا ہے جنگ کے زمانہ میں حکومت ان ماطین کو ان کا ہائے پیداؤں میں استعمال کرنا چاہتی ہے جو غرض جنگ کے لئے مفید ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان

عالمین کو ان شعبوں میں منتقل کرنے کے لئے حکومت دو طریقے اختیار کرتی ہے یعنی اختیاری اور جبری، جبری طریقہ وہ ہم صنعتی مگرانی کے طریقے کے تحت وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اور اس کی خامیوں کی بھی ہم نے مباحثہ کر دی ہے۔ ان ہی خامیوں کے پیش نظر یہ تو ناممکن ہے کہ جلد شعبہ ہائے پیداہش کے عالمین فی الملوکی کا ہائے پیداہش میں جبری طور پر منتقل کر دئے جائیں اس لئے حکومت منتقلی کا اختیاری طریقہ بھی رائج کرتی ہے۔ اس اختیاری طریقہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان عالمین کو جن کو کارہائے پیداہش میں منتقل کرنا مقصود ہے وہاں شرح منافع زیادہ ہو۔ افراط زر سے یہ شرط بخوبی پوری ہو سکتی ہے۔

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مالیات جنگ کے کامیاب انصرام کے لئے پس انداز کو ضروری ہے۔ افراط زر سے پس اندازی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی قومی آمدنی پانچ ہزار ملین پونڈ تھی جس میں سے چھ سو پانچ سو ملین پونڈ پس انداز کئے جاتے تھے گویا کل آمدنی کا تقریباً دس یا بارہ فی صد حصہ پس انداز کیا جاتا تھا لیکن حکومت نے اس جنگ میں کل آمدنی کا ۴۰ فی صد قرض لیا ہے غاہے کہ پروڈیگینڈ ترفیب و تخریب کے ذریعہ اس قدر رقم پس انداز نہیں کی جاسکتی تھی پس اندازی میں غیر معمولی اضافہ کی ایک یہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی بھل زرمیں اضافہ ہو اور صرف پر پابندی ماند کی جاسکے گویا حکومت ایک ہاتھ سے مقدار زرمیں اضافہ کرے اور دوسرے ہاتھ سے پروڈیگینڈے، اضافہ قیمت، حمل و نقل کی دشواریوں ان مختلف ذرائع سے صرف پر پابندی ماند کھسے۔ ایسی صورت میں ایک شخص پر محسوس کرتا ہے کہ اس کے اس زر کی مقدار میں تو اضافہ چھ گیا ہے لیکن وہ اس اضافہ کو صرف نہیں کر سکتا۔ اس طرح جبری پس اندازی ہوتی ہے۔

افراط زر کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ حکومت اخراجات جنگ کی تکمیل کے لئے قرض لیتی ہے۔ قرض لینے کے بعد اس قرض کے مطالبات سالانہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان زائد مطالبات کی ادائیگی کا بہتر طریقہ افراط زر سے ہے۔

افراط زر سے بعض مصلحتوں کو جن کی آمدنی غیر معین ہوتی ہے۔ غامدہ بھی پہنچ جاتا ہے مثلاً اگر اس سے بعض ادھات کا فی نفع اٹھاتے ہیں خصوصاً اس وقت جبکہ اشیا کے خریدنے اور بیچنے کے درمیانی وقفہ میں قیمتوں میں اضافہ ہو جائے تو تاجر کو غامدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اشیا اس کو کم قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں اور وہ انہیں

زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔ اسی طرح کارخانہ داروں کو بھی اضافہ قیمت سے بعض دفعہ فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے
 کہ قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ہی مصارف پیدا ہونے لگتا ہے۔ جو توں میں فی الفور اضافہ نہیں ہوتا مگر کارخانہ دار کو مصارف
 پیدا ہونے کے حساب سابق کم و بیش پر قرار رہتے ہیں لیکن اس کو اپنی اسٹیا کی نسبتاً زیادہ قیمت ملتی ہے اس طرح
 اس کو منافع کمانے کے زیادہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں واضح رہے کہ یہ صورت حال افراط زر کے ابتدائی زمانہ میں
 رہتی ہے لیکن جوں جوں افراط زر کے اثرات پھیل کر کم و بیش تمام اسٹیا کی قیمتوں کو متاثر کر کے ہیں اور دوسری طرف
 اجروں میں اضافہ کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے تو کارخانہ داروں کا یہ فائدہ منافع غائب ہو جاتا ہے۔

مشہور ماہر معاشیات جے ایم گینس کے اس قول سے بھی افراط زر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: افراط
 زر کے لئے کسی کو ذمہ داری لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دفعہ افراط زر ہو جانے کے بعد یہ خود بخود جاری ہو جاتا ہے
 نقصان دہ۔ افراط زر کی خواہیاں اس کی غریبوں سے زیادہ ہیں اگر افراط طویل مدت تک جاری رہے تو ایک نقطہ
 ایسا آ پہنچتا ہے جیکر زبے قدر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ افراط زر کے باعث جرمنی میں سٹاک ہولڈ میں مارک کی قدر گھٹ کر
 ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال نہایت خطرناک سمجھی جاتی ہے اس سے معاشرہ کی بنیادیں بل جاتی ہیں۔

افراط زر کا بار بار میر وغریب دونوں پر یکساں پڑتا ہے معاشرہ کے مختلف طبقوں پر جن کی مقدار آمدنی ایک
 ہی ہو لیکن نوعیت بدگمانہ ہو تو افراط زر کا باران طبقوں پر مختلف طور سے پڑتا ہے

وظیفہ خوار یا سود کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے والوں پر سب سے زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس لئے اگر ان
 لوگوں کی آمدنی تو حسب سابق ہی رہتی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے نتیجہ یہ کہ اس آمدنی سے وہ اتنی ہی محتاج
 زندگی نہیں خرید سکتے جتنی کہ وہ پہلے خرید کر لیتے تھے جو انشیاں اجروں کے ذریعہ آمدنی حاصل کرتے ہیں وہ اضافہ
 قیمتوں کے بعد اپنی اجروں میں بھی اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا ہے
 مختصر یہ کہ افراط زر سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اضافہ معینہ آمدنی پانے والوں کے لئے مضرب ہوتا ہے۔
 مقدار زر میں جس تناسب سے اضافہ کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ
 عوام اس کے عادی ہو جاتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کرنے کے باوجود بھی زر کی قلت محسوس
 کی جاتی ہے۔ اس مستبعد صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ جیسی کہ یہ معلوم رہتا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے

اس لئے زیادہ قیمت طلب کی جاتی ہے

افراط زر سے قیمتوں میں جو اضافہ ہو جاتا ہے وہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اور روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر اس کے لئے حکومت کو تعویذ کی حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے قیمتوں میں کمی ہوتی ہے اور رکس دام زاری پھیل جاتی ہے اس طرح افراط زر کی وجہ سے ختم جنگ پر معمولی حالات کے احیا کیلئے حکومت اور عوام دونوں کو نئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

افراط زر سے بعض معاشرتی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مزدوروں کی جانب سے اضافہ اجرت کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر آجرین نئے حالات سے اتنی جلدی تطابق نہیں پیدا کر سکتے۔ اس لئے اکثر صورتوں میں مزدور ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے آجرین اور حکومت دونوں کوشش کرتے ہیں مصالحتی کیمپیاں بنائی جاتی ہیں۔ باہمی سمجھوتوں اور رضی ناموں سے حالات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ختم جنگ کے بعد حکومت افراد زر کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ اس طرح زر کی مقدار میں اضافہ تو ختم ہو جاتا ہے لیکن قیمتیں معمول سے زائد معیار پر مستقیم ہو جاتی ہیں اس سے دو طرحے جن پر زیادہ بار پڑا ہے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اگر اس کا جلد اندازہ نہ ہو تو ان کی بحالی حکومت و معاشرہ کے لئے خطرناک صورت اختیار کرنے لگتی ہیں۔

ان تمام خرابیوں کے پیش نظر افراد زر کی پالیسی میں مزید احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے کہ زر کی مقدار میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو اور یہ کہ یہ اضافہ کہیں قابو سے باہر نہ ہو جائے غیر ارادی یا اضطراری افراط زر سے احتیاط کیا جاتا ہے۔

بعض معاشین نے افراط زر کے سلسلے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ حکومت تجارتی بینکوں سے خفیف یا معمولی شرح سود پر قرض لے اور ساتھ ہی تجارتی بینکوں کے معمولی معاملات قرض دہندگی پر نگرانی رکھے یہ لوگ براہ راست تجارتی بینکوں سے قرض لینے پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ اس سے مرکزی ارباب اقتدار کو افراط زر کا اندازہ ہوتا رہتا ہے مرکزی بینک مثلاً انگلستان بینک سے قرض لیا جائے تو مقدار اعتباراً جو اضافہ ہوگا اس کا اندازہ "حساب گمر" (Clearing Banks) کے ذخیرہ محفوظ کے تناسب سے ہو سکتا ہے

اور جب تک کوئی خاص قانون نہ نافذ کیا جائے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

دیگر طریقے ہنگامہ شکنہ صفحات میں ہم نے مفصل طور پر بالیات جنگ کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے یہ تو وہ مختلف طریقے تھے جن کا ماہرین معاشیات کہاں اہمیت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان مذکورہ طریقوں کے علاوہ بعض اور طریقے بھی ہیں جن کی اہمیت یقیناً اس قدر زیادہ تو نہیں ہے لیکن جنہیں مصارف جنگ کی پابجائی کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا: ذیل میں ان طریقوں کا مختصر تذکرہ کیلے آتا ہے۔

۱۔ دستہ اور آمد سے بھی مالیات جنگ میں مرد ملتی ہے بالفاظ دیگر اس کے ذریعہ مبادلات خارجہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ مبادلات خارجہ حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں: ایک تو یہ کہ اسٹیٹ بڑآمد کی جائیں۔ سونے چاندی کو غیر مالک کے ہاتھوں فروخت کیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات حاصل کی جائیں بعض اوقات قومی دولت اصل فائدہ کمکات، زمینیات وغیرہ کو غیر جانبدار مالک کے ہاتھوں فروخت کر کے مصارف جنگ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خدمات بڑآمد کی جائیں لیکن یہ طریقہ دوران جنگ میں بہت کم قابل عمل ہے۔ تیسرا طریقہ یہ کہ بیرونی کاروبار کے ملکی تمسکات کو غیر مالک میں فروخت کر دیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات درآمد کی جائیں۔

ان تمام طریقوں سے مصارف جنگ کا بار بڑی مدت تک آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

۲۔ مصارف جنگ کی پابجائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ محنت میں اضافہ کر کے مزید آمدنی حاصل کی جائے مثلاً بیروزگاروں سے کام لیا جائے اوقات کار میں اضافہ کیا جائے اور آرام و اطمینان سے بسر کرنے والی عورتوں و مردوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

۳۔ جنگی عطیات اور ان جنگ میں عوام کو طرح طرح سے ترغیب دینا بھی دلائی جاتی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ جنگ کی امداد میں بطور عطیہ دیں۔ ان کے قومی جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ حسب وطن آزادی و حریت خود کار ایشاد و قربانی جیسے لطیف جذبات کو جواہادی جاتی ہے نوآبادیات اور توابخ سے بھی جنگی امداد کے جذبہ میں کثیر روایات وصول کی جاتی ہیں۔ اصحاب ثروت سے بھی مختلف طریقوں سے عطیے وصول کئے جاتے ہیں۔ ویسی

ریاست کے والیوں سے قریب جلیانہ تعلقات کے تحت بھاری مقدار میں عطیے لئے جاتے ہیں۔

۴۔ پروفیسر کینس کی ایکٹیم | پروفیسر کینس نے اپنے رسالہ (How to Pay for the War) میں لازمی بچت یا بچری

پس اندازی کی ایک نئی ایکٹیم پیش کی ہے اس ایکٹیم کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک معینہ مقدار سے

زائد آمدنی پانے والے اپنی آمدنی کے ایک مقررہ حصہ کو لازمی طور پر پس انداز کریں اور اپنے استعمال میں نہ

لائیں اور یہ رقم وہ لوگ سینگ بنکس میں جمع کرائیں۔ حکومت اس بچت کو جنگی اخراجات کے لئے کام میں لائے اور

ختم جنگ پر حکومت ملک کی کل دولت پر محصول لگا کر اس رقموں کو مدد سودان کے کھاتوں میں جمع کر دے۔ کینس

کا خیال ہے کہ یہ طریقہ قرضہ و محصول کا درمیانی راستہ ہے اور اس سے مالیات جنگی کی تمام مشکلات پر قابو پایا

جاسکتا ہے اور پھر اس طریقہ سے چھوٹی چھوٹی آمدنیاں پانے والے اشخاص بھی حکومت کا ہاتھ بٹاسکتے ہیں دولت

جنگ میں تخفیف آمدنی کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف ہوگی اس کے ارتفاع کے لئے وہ دو تاجا دیر پیش کرتا ہے

ایک تو یہ کہ حکومت کی جانب سے اس امر کا مقول انتظام کیا جائے کہ ان اشخاص کو اپنی ضروریات زندگی محفوظ

اور واجبی دموں پر مل سکیں اور دوسرے یہ کہ ۱۰ سال سے کم عمر بچوں کو وہ شلنگ فی ہفتہ بھتہ دیا جائے۔

پروفیسر کینس کی اس ایکٹیم پر ماہرین معاشیات کے حلقوں میں نہایت دلچسپی سے غور کیا جا رہا ہے اور اکثریت

کی رائے یہ ہے کہ اس ایکٹیم کو کچھ حذف و ترمیم کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے ان مختلف طریقوں کا ذکر کیا جن کے ذریعہ موجودہ زمانہ میں مصارف جنگ کی

ادائیگی میں آتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ مناسب اور قابل عمل ہو

مندرجہ بالا مباحث سے ہم بعض ایسے نتائج اخذ کر سکتے ہیں جنہیں طریقہائے مالیات جنگ کے انتخاب

میں اصول و معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اخراجات جنگ کی ادائیگی کا سب سے بہتر اور مثالی طریقہ وہ ہے جس میں عوام پر مزید بار نہ پڑے۔

اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ زید کو شکار کا شوق ہے اور وہ اس شوق

کی تکمیل کے لئے سالانہ ایک مقررہ رقم ضروری اشیاء مثلاً بندوق، بارود وغیرہ کی خریداری پر صرف

کرتا ہے۔ اب اگر جنگی مصارف کی ادائیگی کے لئے حکومت اس سے قرض یا ٹیکس یا کسی اور صورت میں

ہر مترہ رقم وصول کرے تو اس سے عوام پر کوئی بار نہیں پڑے گا اس لئے کہ یہ انشیا پہلے ہی تیار ہوتی تھیں۔ اب بھی تیار ہوں گی اور ان انشیا کے تیار کرنے والوں پر اور ان کی آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ صرف ان انشیا کے استعمال میں تبدیلی ہوگی۔ پہلے یہ پینرس شوق و تفریح کی خاطر استعمال کی جاتی تھیں اور اب جنگ میں استعمال ہوگی اس کے برعکس صورت وہ ہے جس میں اخراجات جنگ کا عوام پر مزید بار پڑتا ہے مثلاً زید پہلے جو رقم اپنی محروم پوشاک پر صرف کرتا تھا اب جنگی مصارف کے لئے دے تو ظاہر ہے کہ اس رقم کی مدد تک جہاں شخص پوشاک تیار کرنے کی مختلف مشینوں میں مشغول تھے ان پر برا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس حد تک بیکار ہو جائیں مگر حکومت یہ رقم اسلحہ اور دیگر ضروریات جنگ پر صرف کرے گی اور ظاہر ہے کہ ان کی تیاری کے لئے دیگر کاروبار سے خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اس طرح عوام ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے۔

۲۔ جنگی اخراجات کا بار موجودہ نسلوں پر پڑنا چاہئے یا آئندہ نسلوں پر اس مسئلہ کے متعلق کافی اختلاف رائے موجود ہے جس کا مفصل تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں اس سلسلہ میں اگر بالکل کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکے تو کم از کم یہ امر تو قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ اس بار کو موجودہ اور آئندہ نسلوں میں مناسب طریقہ سے تقسیم کیا جائے یعنی یہ تو نہ ہو کہ مصارف جنگ کا تمام تر بوجھ آئندہ نسلوں پر ڈال دیا جائے کسب معاش اور تفریح آمدنی کے جو مستقل قومی وسائل ہیں انھیں جنگ کے بھینٹ چڑھا دینا قومی خودکشی اور معاشی غلامی کے مترادف ہے اس لئے ان وسائل کو ہر صورت محفوظ رکھنا موجودہ نسلوں کا قومی فرض ہے۔

۳۔ جنگی مصارف کی ادائیگی کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس میں یہ چیز ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس کا بار زیادہ تر دولت مند طبقہ پر پڑے اور غریب طبقہ کو اس بوجھ سے جس قدر طویل عرصہ تک بچایا جاسکے بچایا جائے۔ اگر اس طبقہ کے وسائل سے استفادہ ناگزیر ہی ہو تو دانشمندانہ طریق عمل یہ ہوگا کہ ان کی چھوٹی موٹی بچت پر ہی ہاتھ ڈالا جائے ان کی ناگزیر ضروریات کے کسی حصہ کو اغراض جنگ کے لئے استعمال کرنے کی بالکل آخری صورت میں ہی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۴۔ جنگ کے فیہ معمولی حالات میں عوام کی رضا مندی، خوشنودی اور دلی تائید ہی جنگی مہمات کے ہر کرنے میں ہمارا پہلا اور آخری مورچہ ہے اس لئے مالیات جنگ کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کے لئے عوام کی

دلی تائید ضروری ہے۔

۵۔ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس سے ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں روڑے نہ اٹھائے جاسکیں

۶۔ مالیات جنگ کا کامیاب طریقہ وہ ہے جس میں نظام درستقیم رہے اس میں غیر معمولی تبدیلیاں نہ ہوں اور نہ اس پر کسی قسم کے برے اثرات پڑیں۔

۷۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جنگی مہمات کو سر کرنے کی دمن میں ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس کے معرعات کو حکومت اور عوام دونوں دوران جنگ میں نہ محسوس کریں لیکن اختتام جنگ پر جب حکومت اور عوام کو پیچیدہ مالی مسائل سے دوچار ہونا پڑے تو فتح و کامیابی کا سارا نشہ ہرن ہو جائے اس لئے اس امر کا خیال مالیات جنگ کے انصرام کے وقت ضروری ہے کہ جنگ کے بعد پیچیدہ مالی مسائل سے روبراہ نہ ہونا پڑے۔

۸۔ جنگ میں کامیابی کے لئے اندرونی امن و امان نہایت ضروری ہے اگر حکومت کی توجہ اندرونی جگڑوں کے ارتفاع کی طرف مبذول رہے تو اس سے جنگی کامیابی میں بڑا رخنہ پڑ جائے گا اس لئے مالیات جنگ کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کی وجہ سے اندرون ملک کسی قسم کی معاشری خرابی اور شورش نہ پیدا ہونے پائے۔

۹۔ ایک طرف ان تمام امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور دوسری طرف ایسے طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں جن سے مالیات جنگ کا مقصد جلد از جلد حاصل ہو جائے۔ تھوڑے سے وقت اور معمولی کوشش سے وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جس سے معارف جنگ کی پابجائی ہو سکے اس لئے حکومت کو مالیات جنگ کے انصرام کے لئے جس قدر کم پیچیدہ و منتظانات کرنے پڑیں اتنی ہی کامیابی یقینی ہے

الیات جنگ کے مختلف طریقوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا ان تمام سیاروں پر بالکل پورا اثر ناممکن ہے علاوہ انہیں مالیات اور ماہرین جنگ کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی عظیم الشان — جیسی کہ گذشتہ جنگ عظیم تھی یا موجودہ جنگ ہے — کے معارف کی پابجائی کسی ایک طریقے سے ممکن نہیں ہے مختلف طریقوں بلکہ شاید ان تمام طریقوں کا استعمال

کرنا ناگزیر ہے۔ ان حالات اور واقعات کی موجودگی میں ہم سوا اے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان کا ایک ترجیحی سلسلہ قائم کیا جائے۔ ان مختلف طریقوں کی خوبیوں اور خرابیوں پر غور کرنے کے بعد ہمارے خیال میں سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی جانی چاہئے کہ صنعتی نگرانی کے طریقے کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کو وسعت دی جائے۔ اس کے بعد محصول کے ذریعہ جنگی مصارف برداشت کئے جائیں۔ اگر یہ طریقے ناکافی ثابت ہوں تو ہندوؤں ملک عوام کی حقیقی بچت سے قرضے حاصل کئے جائیں۔ اس کے بعد بھی مزید ذرائع آمدنی کی ضرورت ہو تو ہمارے خیال میں پروفیسر کینس کی اسکیم پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ افراط زر کا طریقہ ادھر ہر دنی قرضے حاصل کرنے کا طریقہ پورے غور و خوض اور کامل احتیاط کے ساتھ سب سے آخر میں استعمال کیا جائے۔

احمد خاں صاحب متعلم ایم۔ اے (فائنل) مٹانہ

اقبال و مارکس کے نزاعیہ ہائے نگاہ

یہ خیالی مکالمہ اقبال اور کارل مارکس کے فلسفہ کا موازنہ ہے جہاں تک اقبال کے فلسفہ کا تعلق ہے میرا منبع علم ہال جبریل ضرب کلیم سید بن صاحب کی کتاب ”اقبال اور تعلیم“ اور علامہ اقبال کے لکچر ہیں اور جان مک کال مارکس کا تعلق ہے وہ اس کی مشہور تصنیف ”سرمایہ“ اور دو چار اقتصادی کتب اور پروفیسر کول صاحب اور اسٹرنسکی صاحب کی تصانیف ہیں اور نیز فلسفہ کارل مارکس جو لینن گراڈ اور فلسفہ نے شائع کی ہے۔ ان سب کتابوں کے مطالعے میں نے ان دونوں بزرگوں کے نزاعیہ نگاہ میں جو فرق سمجھا وہ اس مہمہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی کتب میں کسی میری نظر سے ایسی چیز نہیں گذری جس سے مارکس کے خاص اسلام کی بابت خیالات معلوم ہوتے لیکن مذہب کی بابت ضرور ہیں۔ اس کے نزدیک ایک مذہب اتنا ہی اچھا یا برا ہے جتنا کہ دوسرا۔ اب سنئے کہ اس کے خیالات مذہب کے متعلق کیا ہیں؟

”انسان جو عظمت کی دنیا میں رہتا ہے مجبور ہے کہ غلط ایمان کی جگہ تلاش کرتا رہے یہ وہ کس طرح کرتا ہے؟ قدرت کی تسخیر سے گونجنے والا کہ بجلی پیدا کرے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح وہ سماجی زندگی کے پیڑ پھل بننے میں مدد دیتا ہے۔ دنیا کو اصل سے بدلے گا یا طبعی ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی خود کے جذبات اور نظریات کو بدلنے کا جب دنیا کو بدلنا نہایت مشکل ہو جائے۔ یہ آؤ انا مذہب اور بعدہ فلسفہ کا مرتبہ ہے اس میں پہلے دنیا کو سازگار بنانے کی کوشش ہوتی ہے اور جب نہیں ہو پاتی تو خود کو اس سے سازگار کرنا پڑتا ہے یعنی اگر زمانہ باؤنڈ سازد تو بازمانہ ساز اور اس طرح انسان خنامہ جانے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔“

مسلمانوں کا فلسفہ اس معنی میں سچ ہو گیا کہ بقول علامہ اقبال کے مسلمان تقدیر کا راکب ہونے کی بجائے مرکب ہو گیا۔ اسی امر کی طرف میں نے کارل مارکس سے اشارہ کر دیا ہے کہ شریعت میں مسلمان میں ماحول سے تجربہ کرنے کا شوق تھا لیکن وقت گذرنے پر وہ یزانیوں کے فلسفہ کے زیر اثر آ گیا جو تخیلیت ہے۔ اب یہ سنئے کہ تخیلیت کیا ہے؟

”علم و عمل کی کشمکش سے فلسفہ کا مملہ اور تخیلیت (مذہب) اور ادیت کے تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔“..... تخیلیں کے نزدیک یہ دنیا ایک کمر درجہ کی دنیا ہے جس میں اشیاء تفسیر پذیر رہتی ہیں استحکام نہیں یہ دنیا بالکل فریب اور دوہوکا ہے جس میں بکا۔ مے وحدت کے کثرت بہت زیادہ ہے لیکن برہمنی سے یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ اس لئے عمل ہمیشہ خیال سے کم اہمیت رکھتا ہے کہ چونکہ یہ ایکی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے تخیلیں کے نزدیک علم کا کام یہ ہے کہ حقیقت کے رموز کو بھائے جس کے

کہ اس قسم کی واقعیت حاصل کرتا رہے جس کی ضرورت معمولی روزمرہ کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔
سندرجہ بالا اعتبار سے اس کی فلسفہ میں سے پیش کیا گیا ہے۔ فی زمانہ مسلمانوں کا ہمہ گیر عقلی، معنویانہ زاویہ نگاہ رہ گیا ہے۔
بسیطاً اقبالیات بخون طوائف نظرائے ان کے گئے۔

غرض یہ عرض ہے کہ مکائد کا ہر خیال اقبال اور کارل مارکس کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ خیالی مکائد محض دو
مفکروں کے فلسفوں کے فرق کی کمی بھی جائے۔ اور اگر میں نے علامہ اقبال کے مجھے میں کچھ غلطی کی ہو تو ممنون ہوں گا اگر
کوئی صاحب مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کر دیں۔ (۲-۴-۴۰ جہر)

مارکس۔ اس وقت آپ کچھ سوچ رہے ہیں کیا مسئلہ زیر غور ہے؛

اقبال۔ مسلمانان عالم کے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ان میں جذبہ عمل، خود اعتمادی اور بے غوثی کس طرح
پیدا کی جاسکتی ہے۔

مارکس۔ میرے خیال میں مسلمانوں کا زوال اس لئے ہوا کہ ان کا فلسفہ زندگی مسخ ہو گیا۔

اقبال۔ درست فرمایا مسلمانوں کے فلسفہ زندگی کی داستان بھی عجیب ہے۔ شاید آپ کو علم ہو گا کہ مسلمانوں میں
صوفیوں کے دیگر وہ ہیں جس میں ایک کے بموجب زندگی کا مقصد ہستی کو ابداناً شخصیت کو جلا دینا
اور انفرادیت کو مستحکم کرنا ہے۔ ان تینوں خصوصیات کو وہ خودی کے نام سے پکارتا ہے اور اسی
شخص کو صاحب کمال یعنی قلندر مہربا ہے جو اپنی خودی کو اتنا ہمہ گیر بنائے کہ خدا کو اپنے آغوش میں لے لے
دوسرے گروہ کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے اس کے مطابق وہ شخص قلندر ہے جو اپنی شخصیت اور
انفرادیت کو اس درجہ بنائے کہ اپنے آپ کو خدا میں ضم کر دے اور بس۔

مارکس۔ درست۔ یہ نظریے ایک دوسرے کی تکرار ہیں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟

اقبال۔ میں نے صاف طور پر کہہ دیا ہے۔

کارل کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
میرے نزدیک ہر شے کا مقصد اپنی ہستی اور انفرادیت کو جلا دینا ہے۔ میں اپنی ہستی کو کسی دوسری ہستی میں
ضم کرنے کا قائل نہیں ہوں بلکہ دوسری ہستی کو اپنی آغوش محبت میں لینے کا قائل ہوں اگرچہ قطرہ ہی لیکن
سمندر میں ملنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اندر سمندر کی سی وسعت و طغیانی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یقین جو
کہ ہر ہستی اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتی ہے اور انسان اسی لئے اشرن المخلوقات ہے کہ اس میں انجی

خودی حکم کرنے کا جذبہ اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے میں نے کہا ہے ۔
 چوں حیات عالم از زور خودی است بس بقدر استواری زندگی است
 چوں زمین بہستی خود محکم است ماہ پابند طواف ہیسم است
 ہستی مہراز زمین محکم حراست پس زمین مسور چشم غاویں است
 خودی کو محکم بنانے کے لئے عمل ضروری ہے۔ انسان کا طرۂ اتیان تخلیقی عمل ہے۔ وہ دوسری مخلوق
 کی طرح کسی خاص راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں بلکہ انسان کو صحیح و غلط راستہ منتخب کرنے کا اختیار
 ہے۔ اس آزادی و اختیار سے غلطی کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ یہ غلطی کرنے کا امکان انسان کو
 تجسس و فکر اور اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زندگی ہم فانی دہم باقی است ایں ہمہ خلای و شقائق است
 زندہ! غلاق شومش تاق شو ہم چو ماگیہ سرندہ آفاق شو
 در شکن آرزو کہ ناید سازگار از ضمیر خود دگر عالم بیار
 ہر کہ اور اوقات تخسین نیست پیش ما جز کافرو ز بدین نیست
 بندہ آزاد را آید گراں زیتن اندر جان دگیلاں

بندہ آزاد قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے
 ماحول پر تخلیقی عمل کر کے خود اپنا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس میں رہتا ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ میں بھی تخلیقی عمل کا قائل ہوں لیکن کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا
 ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے لکچروں میں یہ کہا ہے ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیت الہی ہمارے
 سامنے یہ حقیقت بے نقاب کر رہی ہے کہ اسلام کا بنیادی تخیل نہ قومیت ہے نہ ساسدراج بلکہ
 جمعیت الاقوام ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جمعیت الاقوام کا تخیل ترقی یافتہ ماحول ہی میں پیدا ہو سکتا ہے
 جبکہ مختلف اقوام کے نمائندے ٹیلیفون تار اور ہوائی جہاز کے ذریعے اپنی اپنی حکومتوں سے برابر
 تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ آج سے تیر دو سو سال قبل جمعیت الاقوام کا تخیل پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ

اس زمانے میں نہ جمیعت الاقوام بنانے کی ضرورت تھی اور نہ وہ حالات موجود تھے جو ایسی جمیعت کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے یہ کنا کہ اسلام کا تخیل بین الاقوامی ہے غلط ہے۔

اقبال۔ آپ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیال و عمل کسی خاص ضرورت کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ضرورت ماحول کے تابع ہوتی ہے اس لئے کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ مارکس۔ جی ہاں! خیال و عمل کا وجود مدار انفرادی یا جماعتی ضرورت پر ہے اور ضرورت کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے ماحول سے سیری مراد نہ صرف قدرت کے عملیات ہیں بلکہ وہ تمام اشیاء ہیں جو انسان کے تخلیق عمل کا نتیجہ ہیں لیکن معاملہ یہاں بھی ختم نہیں ہوتا۔ ضرورت سے متاثر ہو کر انسان کے دماغ میں ماحول کے امکانات کی بموجب چند خیالات پیدا ہوتے ہیں پھر ان خیالات کی بموجب انسان عمل کرتا جو اس عمل سے انسان کے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی جو پھر یہ بدلا ہوا ماحول انسان کی ضرورتوں اور تخیلات کو بدلتا جو اور پھر ان خیالات کی بموجب انسان اپنے ماحول کو بدلتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا جو میں نے اپنی کتب سرمایہ کے صفحہ اول پر یہ کہہ دیا تھا کہ انسان قدرت پر عمل کر کے اس کو بدلتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو بدلتا جو میں مذہب کو بھی ماحول کا پابند سمجھتا ہوں کسی زمانہ کے مذہبی ماحول میں ہر زمانہ کے ماحول اور ضرورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور چونکہ ماحول اور ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں اس لئے مذہب کو بھی بدلتا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے زاویہ نگاہ کے مطابق مذہب کی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آتی جو اور اس لئے آپ کو مذہب میں اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہر وہ شے جو انسان اور ماحول کی پیدا کردہ ہو اس کو بھی بدلتا چاہئے۔ مذہب کو بھی آپ انسان اور ماحول کی پیداوار خیال کرتے ہیں ؟

مارکس قطعی۔

اقبال۔ لیکن مذہب کا معاملہ دوسرا ہے وہ عشق و نظر کا معاملہ ہے۔ اس میں استحکام بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ مذہب ارتقا کے خلاف نہیں ہے لیکن دنیا جہاں اولیٰ بدلتی بنتی بگڑتی رہتی ہے وہاں اس میں ایک اٹل اور لافانی عنصر بھی ہے۔

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا نقش کمں ہو کہ فو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوم جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام تفسیر لکھے اور اجتماع کرنے کا میں قائل ضرور ہوں لیکن میں مذہب کو ماحول کے مطابق بدلنا نہیں چاہتا بلکہ مذہب کے اصولوں کو ماحول کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

مقابلہ صاحب اصول واضح کرنے ہی میں تو ساری تبدیلی کر دی جاتی ہے کسی اصول کے الفاظ تو وہی رکھے جاتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل دیا جاتا ہے۔ عورت کی آزادی کا مسئلہ لیجے جس معاملہ میں آپ بہت رحمت پسند معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک جزوی بات عرض کرتا ہوں فرض کیجئے کہ یہ اصول قائم کیا جائے کہ عورت کو زینت و زیبائش نمایاں نہیں کرنی چاہئے۔ بظاہر بہت معصوم اصول معلوم ہوتا ہے اور یکبارگی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف زیبائش ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عورت کی غلامی اور آزادی کا مسئلہ ہے۔ آپ یہ غور فرمائیں کہ لفظ زینت و زیبائش کی کئی طریقہ پر تفسیر کی جاسکتی ہے اور اس لفظ کو کئی مفہوم دے جاسکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں ماحول کی ضرورت سے متاثر ہو کر عورت کی زیبائش سے مراد اس کی آواز، چال، ڈھال، رنگ روپ، چہرہ، مہر و لیا جاتا تھا اور زینت نمایاں نہ کرنے کے اصول کی اس طرح تفسیر کی جاتی تھی کہ عورت متعبد ہو کر رہ جاتی تھی اب جبکہ سماجی زندگی میں عورت کے حصہ لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور ماحول بدل رہا ہے تو زینت و زیبائش سے صرف بندے، جوڑیاں، زیور مراد لی جانے لگی ہے اور عورت کو چہرہ بے نقاب کرنے اور وقت ضرورت نامحرم سے گفتگو کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زینت کے لفظ کا مفہوم بدل دینے سے عورت حقیقت سے آزاد ہو گئی۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ زندگی اپنے ساتھ ساتھ لفظ کا مفہوم بھی بدل ڈالتی ہے جب آپ کسی مذہبی اصول کو مندرجہ بالا طریقہ پر واضح کرتے ہیں تو گویا آپ الفاظ تو وہی رکھتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بدل ڈالتے ہیں۔ مجھے یہ یاد کرنے میں تامل ہے کہ ایک ہی دائرے میں رو کر اصول اس قدر بدل جاسکتا ہے کہ اس کے بالکل برعکس نتیجے برآمد ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر آپ الفاظ کا مفہوم بدل کر اصول بدل ڈالتے ہیں اور کہتے یہ رہتے ہیں کہ اصول اپنی جگہ قائم ہے نفس اصول الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کا

مفہوم ہوتا ہے جس کو ضرورتاً بدل دیا جاتا ہے۔

اقبال۔ لیکن عورت کی زمینت کا مسئلہ تو کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے اگر جزوی باتوں کو ماحول کے اثر سے بدل بھی دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے

مارکس۔ چلے آپ نے یہ تو مانا کہ جزوی امور ماحول کے پابند ہوتے ہیں۔

اقبال۔ اس امر کو مان لینے میں کیا مضائقہ ہے لیکن اصول کو نہیں بدل سکتے۔ مساوات کا اصول لیجئے جب ہم نے یہ اصول مان لیا کہ بنی نوع انسان میں مساوات ہونی چاہئے تو سماجی اور انفرادی زندگی کی تشکیل اس طریقہ پر کرنی ہوگی کہ یہ اصول نہ ٹوٹے لیکن طریقہ کار بدل سکتے ہیں۔

مارکس۔ لیکن دیگر اصولوں کی طرح مساوات کے اصول کا مفہوم بھی ہر زمانہ میں اس زمانے کے ماحول کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ آج سے چند صدی پیشتر جب اجناس تجارت کے لئے بنی شریعت نہیں اور خرید و فروخت کا سلسلہ اتنا ترقی کر گیا کہ بازار اور منڈیاں پیدا ہو گئیں اور اس امر کا امکان پیدا ہو گیا کہ غریب انسان بلا غلامی قبول کئے بھی پیٹ بھر لے تو اس وقت مذاہب نے مساوات کو اپنا بنیادی اصول بنایا لیکن غلام رکھنے کی اجازت دینا اصول کو ماحول کے مطابق لانا تھا۔ مذاہب نے مساوات کا اصول بھی قائم کیا لیکن غلام، بیگاری اور مزدور کے وجود کی بھی حمایت کی۔ امیر اور غریب کے فرق کو بھی متعل طور پر سماجی زندگی کا جز بنا لیا لیکن اس ماحول میں وہی ہو سکتا تھا جو کچھ کیا گیا لیکن آج کل کے ماحول نے مساوات کے لفظ کو نیا مفہوم دیا ہے۔ آج کل دنیا مساوات قائم کرنے کے یہی سنی سمجھتی ہے کہ سماج کو انفرادی ملکیت سے نجات دلائی جائے اور اقتصادی مساوات قائم کی جائے۔ میں بھی مساوات کا قائل ہوں لیکن میرے اور آپ کے مساوات کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے اگر آپ یہ فرمائیں کہ دیکھو مارکس بھی ہمارے مساوات کے اصول کا قائل ہے تو یہ کہنا غلطی ہوگی کیونکہ اگرچہ میں بھی اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے مساوات ہی کا لفظ استعمال کرتا ہوں لیکن اس لفظ سے میرا مفہوم مساوات کے اسلامی مفہوم سے بہت جدا ہوتا ہے کسی زمانہ میں انسان کا ماحول قدرت کا عطا کردہ تھا لیکن اب انسان نے اپنے عمل سے ایک

نیا ماحول پیدا کر لیا ہے جس کے سامنے قدرتی ماحول کی اہمیت نسبتاً بہت کم رہ گئی ہے۔ اب ہمارا ماحول دریا، پہاڑ، میدان نہیں ہیں بلکہ انجن، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو وغیرہ ہیں۔ یہ نیا ماحول نئے امکانات اور نئی ضرورتیں پیدا کر کے ہمارے دماغ میں نئے خیالات پیدا کر رہا ہے اور ہم کو نئے طریقہ پر عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس وقت یہ یقین کرنا کہ پرانے تعلیمات کو از سر نو زندہ کیا جائے رحمت پسندی ہے۔

اقبال۔ تو یوں فرمائیے کہ انسان اپنے کردار کے ماحول میں رہتا ہے۔ انجن وغیرہ کیا ہیں یہ وہی کی شکل میں انسان کا صدیوں کا فکر و عمل ہی تو ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ انجن صدیوں کے انسانی فکر و عمل کی داستان ہے۔ انجن وہی کی شکل میں انسانی ذہن کا انسان جب تک اپنے تخیل کو مادی شکل نہ دے اس وقت تک اپنی خودی کو نمایاں نہیں کرتا۔

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فکر سے اپنے آپ کو بدلتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں اس خیال کو میں اس طرح بیان کرتا ہوں کہ طریقہ پیداوار سماجی تخیل اور عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ طریقہ پیداوار مادی شکل میں کسی سماج کا صدیوں کا فکر و عمل ہوتا ہے۔ سماج اپنے فکر سے اپنے فکر کو بدلتی ہے۔ یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ انسان اپنے عمل سے اپنے عمل کو بدلتا ہے۔

اقبال۔ درست آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں۔

مارکس۔ ہمارا خیال ہمارے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہمارا ماحول ہمارے خیال و عمل کا لیکن میں ماحول کو مقدم اور خیال کو موخر سمجھتا ہوں یعنی پہلے وجود بعد میں شعور، شعور وجود کا محتاج ہے لیکن جہاں تک خودی کو مستحکم کرنے کا تعلق ہے مجھے آپ سے قطعی اتفاق ہے۔ خودی صرف عمل سے مستحکم ہو سکتی ہے

اقبال۔ لیکن ایشیا داروں کی بدقسمتی دیکھئے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ صرف مراقبہ ہی سے انفرادیت یا خودی مستحکم ہوتی ہے حالانکہ خودی اس وقت جلا پاتی ہے جبکہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ تجربہ کرتا ہے اور بہت غور و فکر کے بعد بہت سی غلطیاں کرنے کے بعد وہ ایک راہ راست تلاش کرتا ہے جب انسان وہ کام کرتا ہے جو خدا کرتا ہے اس وقت انسان کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ خدا بھی مادہ کی شکل بدلتا ہے

اور انسان بھی - خدا بوجہ پیدا کرتا ہے تو انسان پاڑوں میں سے نرم ہوا بحال کر اس کا فواد بنا تا ہے میں نے
اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے -

توشب آفریدی چراغ آفریدم سنال آفریدی ایام آفریدم
بیابان و کوہ سار و راغ آفریدی خیاباں و گلزار و باغ آفریدم
من آمم کہ از سنگ آئینہ سازم من آمم کہ از زہر نوشینہ سازم
جب تک محل فکر کا ساتھی نہ ہو اس وقت تک خودی متکلم نہیں ہو سکتی ہے

خیز و خلاق جہان تازہ شو شعلہ در بر کمن غلیل آوازہ شو
دم بدم مشکل گرد آسان گذار دم بدم نوا فرین دوازہ کار

انسان خود مختار پیدا ہوا ہے اور خیر و شر کرنے پر قادر ہے وہ سورج کی طرح ایک راستہ چلنے پر مجبور
نہیں۔ عمل کی آزادی ہی خودی کو مستحکم کرتی ہے اور یہ معاملہ صرف افراد کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ
قوموں کی خودی بھی آزادی عمل سے مستحکم ہوتی ہے۔ میں انسان کو جنت سے بھگانے جانے کے قصہ کو
بھی اسی زاویہ سے دیکھتا ہوں جنت میں انسان سورج کی طرح ایک قانون میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ خیر ہی
خیر کر سکتا تھا اور اس پابندی کی وجہ سے وہ اپنی انفرادیت کو مستحکم نہیں کر سکتا تھا۔ جنت سے نکالے
جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آزادی عمل حاصل کی اور خیر و شر کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا
اور یہی ایک راستہ خودی کو مستحکم کرنے کا ہے کہ انسان اپنے عمل کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی
راہیں ڈھونڈے۔

از گل خود آدمی تعمیر کن آدمی را عامل تعمیر کن

مارکس - مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔ انسان اور اس کا ماحول آپس میں ایک دوسرے پر عمل کرتے
رہتے ہیں۔ انسان اسی وقت ہند بکھاتا ہے جبکہ دیکھو عمل سے قدرت کی طاقتوں پر قابو پالیتا ہے اور اپنے
لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جس میں وہ کروہ بہتر انسان بن سکے

اقبال - لیکن میں خودی کی ترقی کے لئے ایک اہم امر ہی اہم خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی دوسرے کے انکار و عمل

کی نقالی سے خودی طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور ہوتی ہے۔ فرد کی خودی اس کی اپنی سلاج کی کچھ اپنی تہذیب و تمدن میں رہ کر ترقی کر سکتی ہے کسی دوسری قوم کی کچھ اور تہذیب کی تقلید سے خودی کمزور ہوتی ہے۔

تراش از تیشہ خود جادہ خویش براہ دیگران رفتن عذاب است

مارکس۔ اب تو دنیا کی مختلف قوموں کی کچھ ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک نئی کچھ پیدا ہو رہی ہے جو تمام دنیا کی مشترکہ کچھ ہو گی۔ یہ کچھ تمام دنیا کے مزدوروں کے باہمی ارتباط سے پیدا ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک و قوم کی خاص کچھ نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص دود میں کسی خاص طبقہ کی خاص کچھ ہوتی ہے مثلاً اگر یورپ کے جاگیر دار دور کے جاگیر دار طبقہ کی کچھ کا مقابلہ ہندوستان کے جاگیر دارانہ دور کے جاگیر دار طبقہ سے کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یورپ کے جاگیر دار اور ہندوستان کے جاگیر دار میں کوئی فرق نہیں اسی طرح یورپ کے بیگاری اور ہندوستان کی بیگاری کی کچھ ایک تھی۔ اس وقت جو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ مشرق یورپ کی کچھ اختیار کرتی جا رہی ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ دور شروع ہوئے مدت ہوئی اور اس دور نے یورپ کو ایک خاص کچھ دی اب چونکہ ایشیائیں بھی وہی سرمایہ دارانہ دور حاوی ہوتا جا رہا ہے اس لئے ایشیائیں سرمایہ دارانہ دور کی کچھ رواج پاتی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ ہر جمہوری زمانہ میں ہوتا ہے یہ تبدیلی بہت خرابی کے بعد اپنی اصلی شکل اختیار کرے گی۔ کچھ بھی ارتقائی شے ہے۔ ایک ہی ملک میں مختلف طبقوں کی مختلف کچھ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ماحول بدلتا جاتا ہے کچھ بدلتی جاتی ہے۔ مختلف طبقوں کی محبت، مروت، وفاداری، خود داری، حیا و شرم۔ سچ جھوٹ کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔

اقبال۔ یہ تو درست ہے کہ دنیا میں ایک مشترکہ کچھ نہ ہوا ہو رہی ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اپنی ہی کچھ کو ضرورت کے مطابق برن چاہئے۔ میں کسی دوسرے کا بچہ خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اپنی بخل میں نہیں لے سکتا میں اپنا ہی بچہ پیدا کرنے اور پرورش کرنے کا قائل ہوں۔

ما کجا در تہ بال دیگران می باشی در ہواے چمن آزاد پریدن آموز

مارکس۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جس طرح ایک عورت جو اپنی کوکار آمد نہ بنائے تو فہرست کے بعد اگر چاہے بھی تو اولاد پیدا نہیں کر سکتی اور کسی دوسرے کا بچہ گو دینے پر مجبور ہوتی ہے اسی طرح اگر ایک قوم مدت تک بے عمل رہے تو وہ اپنی تخلیقی قوت کھودیتی ہے اور پھر اگر ترقی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی بلکہ اس کو ترقی یافتہ قوم کا طریقہ کار اور تہذیب و تمدن اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایشیا کی اقوام ترقی کی دوڑ میں اس وجہ پیچھے رہ گئی ہیں کہ اب ان کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ نہ صرف مغرب کا آلاتی طریقہ پیداوار اختیار کریں کہ بلکہ جو اشتراکی کچھ اس وقت یورپ میں پیدا ہو رہی ہے اس کی تعمیر میں پورا حصہ لیں۔

اقبال۔ دلانا رانی پروانہ تاکے نگہری شیوہ مردانہ تاکے
یکے خود را سبز خوشنیتن سوز طواف آتش بیگانہ تاکے

مارکس۔ لیکن قسمی تو یہ ہے کہ ایشیا کا اپنا سوز تو ختم ہو گیا۔ اب تو ایشیا میں تخلیقی شعلہ اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے تلک و تدبر صنعت و حرفت کی چنگاری مستعارے۔

اقبال۔ از سوال آشفته اجزائے خودی بے بجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گرد و خوار تر از گدائی گدہ یہ گرنادار تر

مارکس۔ میں کب کتا ہوں کہ آپ گداین کر سوال کریں یورپ کی تہذیب و تمدن صنعت و حرفت قرض لیجئے اور یہ قرض سود کے ادا کر دیجئے مگر یورپ نے بھی تو ایشیا سے علم و فضل لیا مغرب کو مشرق ہی نے مذہب دیا یہ یورپ کی قابلیت ہے کہ انھوں نے ایشیا سے قرض لے کر کام شروع کیا اور اس کو اتنا بڑھا کہ اب وہ اس قابل ہیں کہ ایشیا کو قرض دیں آخر ایشیا یورپ سے قرض لینا کیوں کسرٹا سمجھتی ہے۔

اقبال۔ ز خاک خویش طلب آتش کہ پیدائیت بجلی دگر سے و خور تقاضائیت

مارکس۔ لیکن یورپ نے بھی تو ایشیا کے شعلہ سے اپنی آگ روشن کی تھی اب ایشیا کو یورپ کی چنگاری سے اپنی شمع روشن کرنے میں کیوں عاجز معلوم ہوتا ہے۔

کا جو پھوڑا نکل آیا تھا اس میں شگفت دیا جا رہا ہے۔

رہا یہ امر کہ ایشیائی تہذیب کو پرانی روایات و تخیلات کے ذریعہ سے از سر نو زندہ کیا جاسکتا ہے تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے خود ایک جگہ اس قول کی تائید کی ہے کہ تاریخ عالم کا قیام ہی ممکن ہے کہ جن روایات و اقوال کو کسی قوم نے مردہ ہونے دیا ہو ان خیالات و اقوال کے ذریعہ سے اس قوم میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جاسکتی۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سب پرانی روایات کو زندہ کر کے قوم کو زندہ نہیں کر سکتے جس طرح پرانی دوا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طرح پرانی روایات اور کہنہ اصطلاحات و تخیلات بھی انسانوں پر اثر کرنا چھوڑ دیتے ہیں یا یوں کہیں کہ جس طرح مدت تک نرساڑ پیتے پیتے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے کہ پھر پرانی خوراک اس پر اثر نہیں کرتی اسی طرح پرانی روایات سنتے سنتے مسلمان ان کے سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب وہ ان پر اثر نہیں کرتیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

م۔م۔ جوہر صاحب میرٹھی

ارتباطِ نصاب

(یہ چند الفاظ نصابی مضامین کے ربط پر ایک مختصر مقالے کے سلسلے میں تیسری طرح سے لکھے گئے تھے)

کہتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا راز اس کے جرنے میں ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت کا راز اس کے اپنا خرچ آپ چلانے میں ہے۔

لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس کی کامیابی کا راز اس کے ارتباط میں ہے۔ اس کا وہ ارتباط جو نصاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصے سے، ایک مضمون کو دوسرے مضمون سے اور پورے مدرسے کو پوری زندگی سے مربوط کر دیتا ہے

جس طرح اتحاد ہماری سماجی زندگی کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے، اسی طرح ارتباط ہماری بنیادی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے جس طرح ہم سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے گلے کاٹنے والے مقابلے کو ختم کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم نصابی زندگی میں بھی مضامین کے باہمی تضادم اور ٹکراؤ کو ختم کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ہماری تعلیمی گائڑیں میں ہمارے مضامین پرانے رومن رتھوں کے گھوڑوں کی طرح برابر براہِ جھٹے ہوئے ہیں جو اکثر باہم مل کر کھینچنے کی بجائے ایک دوسرے کو دو لٹیوں اور کاٹ کھانے کے آداب بجالاتے رہتے ہیں۔ ہمارے طلباء اور ہمارے استاد ہمارے اسکول اور ہمارے نصاب، ہمارے چھوٹے اور ہمارے بڑے سبھی ایک سماجی تعلیمی معاشرتی گھوڑو ڈر میں متخلل ہیں۔ اس کے داؤں کہیں دولت کے منافع ہیں اور کہیں امتحانوں کے نمبر ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایک تضاد کی کوشش سے آپس میں سر جوڑ کر کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے والا جذبہ پیدا کریں۔ اس جذبے کے پیدا کرنے کی صحیح راہ ہمیں بنیادی اسکیم نے بتائی ہے، ارتباط، بہن سہن کے اسی اصول کا نصابی پہلو ہے۔ آپ نے پرانے کتبوں اور پاٹھ شالاؤں کے پڑھے لکھے اپنے بزرگوں کو یہی دیکھا ہوگا کہ آپ نے اکثر ان کی کمزوریوں اور ان کی تعلیم و تربیت کے کچے پن ان کی خامیوں پر تو سوچا ہی ہوگا۔ لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اکثر ان پرانے لکھن پڑھوں کے کردار میں ان کے کیرکٹر میں کیسی ہم آہنگی رکھنا تو ازن اور وزن ہوتا ہے۔ اس

ہم آج بھی تو ہم آج کل کے لکھنؤ بڑھوں میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ اس ہم آج بھی اُس توازن کا راز کیا تھا۔ اگر ہم پرانے نصاب پر ایک ہمدردانہ نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ اس کا ایک بڑا سبب نصابی ارتباط تھا وہ ارتباط جو کتب کو زندگی سے مربوط کرتا تھا، وہ ارتباط جو ایک مضمون کو دوسرے سے مربوط کرتا تھا، اس جاری و ساری اصول کو خواہ آپ مذہبی یا روہانی ماحول کا نام دیں یا اسے انسانیت کی روح بتائیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان مدرسوں کی فضا میں ایک توازن تھا جو غیر شعوری طور پر ان کے اداروں کو ان کی فضا کو ان کے بچوں کو اور ان کے بڑوں کو گرا مے ہوئے تھا۔

کسی شاعر نے کہا ہے کہ نئی عمارت کی اٹھان اُس کی تعمیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم پرانی بنیادوں کو جوڑے اٹھا کر کھینچ دیں لیکن پرانی تعلیم کی جڑوں کو اڑا دینے کی بارود نہ تو جڑ ہے نہ اپنا خراج آپہ چلانے کا پہلو ہے۔ یہ بارود تو ارتباط نصابی ہے اگر ہم ارتباط کو کامیاب کر دکھائیں گے تو ہم پرانی تعلیم کے کھلاڑی کو اس کی چال پر۔ اس کی ترقی سے ات دے سکیں گے۔ اس کے بعد بارے سامنے تعمیری میدان کھلا ہوگا جہاں ہم نئے اصولوں نئے طریقوں کی امداد سے ایک نیا کعبہ ایک نیا تعلیمی بیت المقدس تعمیر کر سکیں گے۔

عبد الغفور صاحب ایم۔ اے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مارکسزم اور فلسفہ اخلاق

Four hundred

مارکسی اخلاقیات کی بنیاد فحش کی جہلیات اور فیورباخ کے نظریہ سائنس انسانیت نے ڈالی ہے۔ فیورباخ نے وقتی قابل احترام مذہبی دینی اور مابعد الطبیعیاتی عقائد سے کنارہ کش ہو کر گوشت پوست کے انسان کو اس رنگ و بو والی دنیا میں لاکھڑا کیا اس نے ہر ایک چیز کو بیان تک کہ عقائد کو بھی انسانی مہار سے پرکھا۔ مارکس اور اینگلس نے اس مجرد تصور کو جس میں انسان ہمدردی فرد کی حیثیت رکھتا ہے بدل دیا۔ انہوں نے انسان کا متحرک اور اجتماعی وجود تصور کیا۔ اس طرح فلسفہ مارکس نے فیورباخ کے نظریہ انسانیت کو ترقی دے کر تاریخی اور سماجی اصولوں کو جہلیات پر پرکھ کر سمجھنے میں مدد پہنچائی۔ فیورباخ کی تنقید بہت زیادہ وسیع اور بڑی حد تک تخریبی ہے اس وجہ سے ہر چیز ایک نئی روشنی میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر تھورس بہت دیکھاؤسی خیالات کے اثرات کی وجہ سے اس کے نظریہ میں کہیں کہیں مذہبی اور دینی موز بھی جھلکتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں مذہب کی بنیادی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے یعنی یہ کہ عقائد کی بنیاد انسانیت (Egoism) پر ہے لیکن فیورباخ کے فلسفہ میں ایک بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اس کے اور مارکس کے فلسفہ میں اختلاف ہے۔ فیورباخ کے خیال میں انسان کی ہمتی اس کے احساس اور شعور کو پیدا کرتی ہے اور خود اس کے اپنے قوانین کی محکوم ہے۔ مگر آخر وہ قوانین ہیں کیا؟ وہ کس طرح اثر ڈالتے ہیں؟ فیورباخ ان سوالات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ انسان ہر چیز کی تشریح کرتا ہے لیکن بد قسمتی سے خود انسان کی کوئی تشریح نہیں کی گئی اور وہ خود اپنی جگہ پر ایک ناقابل تشریح قسم مان لیا گیا۔

مارکس نے کس طرح تشریح کی | مارکس نے یہ بتایا کہ انسان کا شعور اس کے طبعی ماحول کا نتیجہ ہے لیکن انسان کا ذہنی ارتقاء نتیجہ ہے سماجی ماحول کا، جو کہ بعد میں انسان کی طبیعتی کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر انسان کو اپنی جگہ پر مکمل معیار تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کے خیالات اور افعال ہر زمانہ اور ہر مختلف ماحول میں یکساں ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں مجبوراً یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ سماجی ایک غیر متغیر چیز

ہے اور اخلاقیات کے قوانین بھی کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔

انسان کی ہستی کو قائم رکھنے کی جدوجہد انفرادی نہیں اجتماعی ہے تاریخ کے آغا سے ہی انسان کی ہستی سماجی ہے اس لئے انسان کی ہستی اور اس کے خیالات جن قوانین کے محکوم ہیں انہیں ہم کو اس کے اجتماعی روابط میں تلاش کرنا چاہئے۔ مارکس نے تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد یہ طریقہ پیش کیا کہ انسانی شعور اس ماحول کی پیداوار ہے جس میں وہ اپنی معاش پیدا کرتا ہے اور چونکہ معاش پیدا کرنے کے طریقے مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسان کے خیالات اور ان کے اظہار کرنے کے طریقے بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب، فلسفہ، اخلاقیات، جمالیات اور قوانین سب ایک قسم کے ذہنی ڈھانچے ہیں۔ ان کی بنیاد معاشی روابط پر مبنی ہے جن سے افراد کی جماعتیں بنتی ہیں۔

زندگی کا بنیادی اصول: جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بحیثیت ایک اجتماعی ہستی کے اسے خود اپنی قسمت بنانا ہے تو وہ اپنے آپ کو مابعد الطبیعی فلسفہ، اخلاقیات کی زنجیروں اور عقائد کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا بنیادی اصول نہ تو بالذات سچائی ہے اور نہ مجرد نیکی۔ وہ تبدیلی یا تغیر پسندی ہے۔ ایک مسلسل ترقی جس کی وجہ سے انسان روحانی اور اخلاقی ترقی کے مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ انسان کے خیالات اور نصب العین ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کی تاریخ تمدن اس تبدیلی کے عمل کی شاہد ہے۔ پرانے زمانہ میں سماجی تبدیلیاں بے تکلفی سے ہوتی تھیں مگر جب سے انسان نے سائنس کی معلومات کے ذریعہ سے ایک طاقت حاصل کر لی ہے اس وقت سے اس نے مستقبل کی ترقی کے راستوں پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اسی وجہ سے خیالات کو ایک حسب اختیار تغیری طاقت حاصل ہو گئی ہے اور انسان نے انہیں انسانی وجود سے متعلقہ باتوں پر ایک طرح کا عبور حاصل کر لیا ہے۔ چنانچہ اب پہلے سے ایک خاکہ تیار کر کے سماجی تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے فلسفہ اخلاقی کو بھی تغیر پسند ہونا چاہئے تاکہ وہ انسانیت کے آنے والے سماجی ڈھانچے کو مزید اونچے میار پر پہنچا سکے صرف وہی اصول اور حیار جو مجموعی سماج کے تجربات سے اخذ کئے جاسکتے ہیں عام مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے دعویدار ہو سکتے ہیں کہ عوام ان پر عمل پیرا ہوں۔ یہ اصول اور میاں کسی طرح بھی مفاد مابہ کے متغاف نہیں ہو سکتے اس طرح اخلاقیات کے تصورات جو تجربہ پر مبنی ہوں سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتا ضروری ہیں۔

روایتی فلسفہ اخلاق | فلسفہ اخلاق اپنی روایتی شکلوں میں جس کے اصول مقرر ہوتے ہیں ہمیشہ قائم شدہ سماجی نظام کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہی اصولوں کو جھٹاتا ہے۔ وہ مفاد عامہ کے خلاف سماج کے صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے مفاد کو محفوظ رکھتا ہے۔ کس لئے؟ اس وجہ سے کہ مفاد عامہ کے لئے سماجی روابط میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے

روایتی اخلاقیات کی بنیاد نیکی اور بری صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب اور اسی قسم کے تصورات پر موقوف ہے۔ جن کی حقیقت جھوٹے نگوں سے زیادہ نہیں۔ ان تصورات کی کبھی صاف صاف تعریف نہیں کی جاتی اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ آخر ان کی ابتدا کیوں اور کیسے ہوئی؟ ہمیں ذرا غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تصورات میں بائیس تدریجاً تدریجاً ہے۔ جب ہمارے خیالات اور افعال ان تصورات کی مطابقت نہیں کرتے تو اس نظریہ کی رو سے برے ہیں۔ اس طرح جو چیز زمانہ حاضر میں بری ہے مستقبل میں اچھی ہے کیونکہ جب مفاد عامہ کے لئے سماجی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے تو پرانے اصولوں اور معیاروں پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور بعد میں نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی وجہ سے کہ روایتی عقائد کے مقابلہ میں ایسی طاقتیں کام کرتی ہیں جنہیں سماجی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تبدیلی جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے زندگی کے بنیادی اصول پر مبنی ہے۔

انسان فطری طور پر غیر مقلد ہے | انسان فطری طور پر غیر مقلد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ابتدائی حیوانیت کی حالت میں ہی قانع رہتا۔ اس لئے ہیگل کے الفاظ میں۔ ”بجائے اس کے کہ پرانی باتوں کی طرح یہ دہرایا جائے کہ انسان کی فطرت نیک ہے، یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس کی فطرت بری ہے۔“ جب کبھی بھی انسان نے کوئی قدم آگے بڑھا یا چاہا اسے ہمیشہ قائم شدہ نظام کے قوانین اور روایتی اخلاقیات کے اصولوں کو توڑنا پڑا غالباً اسی وجہ سے ہم ہندوستانیوں میں بھی مغربی تہذیب کو برا بھلا کہنے کی عادت ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے اصول روایتی اخلاقیات کے قوانین کے مطابق نہیں ہیں جو فرسودہ تہذیب کا آئینہ ہیں اور اسی وجہ سے برے کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں کے لئے مناسب اور ضروری ہیں جو رجعت پسند سماجی نظام کو ختم کرنے کے بعد فائدہ حاصل کریں گے

فلسفہ اخلاق میں اسی وقت انقلاب پیدا ہو سکتا ہے جب ہم اپنے دماغ سے اقدار مطلق کے تصور کو بحال باہر کریں۔ اسی صورت میں ہم لوگوں میں عدم تقلید کا احساس پیدا کر سکتے ہیں جو کہ زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ اگر کسرم ایک انقلابی فلسفہ ہے جو سماجی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے جو انسان کی ترقی اور مفاد کے لئے ضروری ہے۔ اگر کسرم کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اس فلسفہ اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرے جو عقائد پر مبنی ہے اس سے صرف کنارہ کشی ہی اختیار نہیں کی جاتی بلکہ اگر کسرم علوم سائنس کی روشنی میں پرانے عقائد کا بھانڈا پھوٹ کر انھیں خود بخود ختم کر دیتا ہے۔

مذہب اور اخلاقیات | خاص طور پر مغرب میں اخلاقیات کی بنیاد پرانے نظریہ فطرت پرستی پر قائم ہوئی۔ اس نظریہ پر مذہب کا اثر بہت کم تھا۔ مغربی فلسفہ اخلاق کا بانی سقراط ہے جو اس زمانے کے مذہب کے مطابق دیوتاؤں کا معتقد نہ ہونے کی وجہ سے مارا گیا۔ قرون وسطیٰ میں نظریہ انسانیت اور عقلی مابعد الطبیعیات نے ان جذبات کی ترجمانی کی جو اعتقادی مذہب اور باطنی دینیات کے خلاف پیدا ہو گئے تھے۔ پھر بھی فلسفہ اخلاق خواہ قدیم ہو یا موجودہ اس کے تصورات کی بنیاد معتقدہ ہے ان تصورات کا سرچشمہ وجدان (Intuition) ہے جس کی خود تشریح نہیں کی گئی۔ اس لئے مجبوراً آخری معیار وجدان ہی تصور کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ کے ایسے نظام کی بنیاد کھوکھلی اور کمزور ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ اس کمزوری کی پرورہ پوشی کے لئے ایسے معیار کو مافوق الفطرت اور مابعد الطبیعیاتی دنیا کے احکامات سے منسوب کیا گیا۔

فلسفہ اخلاق کا بانی تو سقراط تھا مگر اس کے شاگرد و خیر فاعلاطون نے اپنے استاد کے اصولوں کی تشریح کی اور ان سے ایک مابعد الطبیعیاتی نظام اخلاق اخذ کیا۔ سقراط کی غیر مذہبی تعلیم کی یہی مابعد الطبیعیاتی بنیاد بعد میں جا کر عیسائی دین کی فلسفیانہ بنیاد ہو گئی۔

ہندوستان اور فلسفہ اخلاق | ہندوستان میں مسیحی معنوں میں کوئی خاص فلسفہ اخلاق کا نظام تعمیر ہی نہیں ہوا جو مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ ہر نظام کی بنیاد کوئی نہ کوئی مقدس کتاب ہے۔ انفرادی اور اجتماعی افعال کے قوانین اور اصول، اخلاق کے ان تصورات سے مختلف ہیں جو انسان کو بغیر مذہبی رسومات کے ادا کئے روحانی ترقی پر پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذات مطلق کا خیال جو کہ اخلاق کے اعتقادی تصورات پر مشتمل

ہے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے نیکی، انصاف، بھلائی وغیرہ اسی قسم کے متعین معیار انسانی اعمال کے متعلق راہ مانے جاتے ہیں لیکن اگر کسی فلسفہ اخلاق کے مابعد دریافت کیجے کہ نیکی کیا ہے، تو اس کے حل جواب کا مطلب یہی ہوگا کہ نیکی وہی ہے جو نیکی کے تصور سے مطابقت کرے، پھر اسی سے نیکی کی تعریف دریافت کی جائے تو آپ کو یہ جواب ملے گا کہ اس اصطلاح کا کوئی تجربہ یا تشریح نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں انصاف پر اول سے ہے!! دوسرے الفاظ میں وہ ایک مجرد تصور ہے اس لئے مابعد الطبیعیاتی ہے۔

موجودہ فلسفہ اخلاق افلاطون کے فلسفہ کی ترقی یافتہ شکل ہے "اخلاقی نظام کا یہ غیر عقلی تصور خیالی دنیا کی ایک جھلک ہے۔ اس لئے فرض کر لیا گیا ہے کہ انسان جیسی طور پر اخلاق کا معیار و معیارانی ماننا ہے۔ اگر نظری اعتبار سے یہ تسلیم کر لیا جائے تو ہر شخص کا نفع، اخلاقاً جائز ہے لیکن عملی دنیا میں فلسفہ اخلاق اعتقادی ہو جائے اور انسانی افعال کے لئے قوانین وضع کرتا ہے جب نظریہ اول میں اختلاف ہوتا ہے تو اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ ماحول کی وجہ سے ضمیر کی روشنی کم ہو گئی یا ماحول الفاظ میں طلب سیاہ ہو گیا! اس وجہ سے جہلت "اخلاقی نظام" پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔ اس لئے نیکی جو انسان کی سرشت میں داخل ہے صرف انسانوں ہی میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو ان کے ماحول سے بلند رکھ سکتے ہیں! یہی نیکی ایک منسلک شاعر ہے جو صرف پاک روحوں پر پڑتی ہے۔ فلسفہ اخلاق اخلاقی ہے! جب ہمیں یہ علم ہو جاتا ہے کہ مطلق چائی ایک کھوکھلا تصور ہے تو نتیجہ میں فلسفہ اخلاق کا کل ڈھانچہ خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ انقلابی جبر صرف موجودہ علوم سائنس کی روشنی ہی میں کی جاسکتی ہے جس کا فلسفیانہ حاصل مادہ کسرم ہے۔ اخلاقی اقدار مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ ایک چیز اگر انسان کے لئے اچھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کے لئے بھی اچھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بری ہو، پھر کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا وقتی بھی ہو سکتا ہے آج ایک چیز اچھی ہے وہی کل بری بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کوئی چیز بیہودا ذات خود اور قطعی طور پر اچھی یا بری نہیں کہی جاسکتی نظریہ قطعیت کو اس رنگ و بو کی دنیا کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نظریہ کی اہمیت جس کی بنیاد عقیدہ اور مابعد الطبیعیات پر موجودہ و بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح سائنس نے فلسفہ اخلاق میں ایک انقلابی روح چھوٹا دی ہے۔

نظریہ انسانیت کیوں مناسب نہیں ہے! نظریہ انسانیت اگرچہ عقائد کی سختیوں کو نہیں مافوق الانسان قسم کی

چیزوں کی سرپرستی حاصل ہے ختم کرنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ یہ سختیاں جو اخلاقیات یا دوسرے ذرائع سے عالم کی جاتی میں صرف اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب ہم مافوق الانسان چیزوں کے بجائے خارجی تجربی اور قابل فہم فطرت کی حقیقتوں کو انسانی افعال کو دار کا معیار مابین نظر بنانا سیت ابراہیم کریں گے تا وہ مافوق الانسان طاقت سے تو سبکو تائب مگر انسان کے مجرد تصور کو فطرت سے بند رکھتا ہے۔ اس طرح ہم کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی کیونکہ انسان کو خاص وقتی تاریخی اور اجتماعی ماحول سے علیحدہ رکھا جاتا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے وہ انسانی فطرت کو دائمی، غیر بدل اور چلی چل رہی ایک تصور کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے ایسے تصور اور روح کی ابدیت میں نیز مافوق الانسانی چیزوں اور ابعاد الطبیعیاتی اخلاقی نظام میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا کیونکہ دونوں میں خارجی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

انسانی فطرت بدلتی رہتی ہے | انسان مافوق الانسانی اور ابعاد الطبیعیاتی رموز کی سمجھتیوں اور تشدد سے اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب اپنے آپ کو اس طبعی دنیا کا ایک جز سمجھنے لگے فلسفہ اسی وقت منید اور کارآمد ہو سکتا ہے جب انسانیت کا تصور فطرت پرستی ہو سکے اخلاقیات پر۔ انسان کی فطرت اسی طرح تغیر پذیر ہے جس طرح فطرت کے دھڑک پہلے ستیہ ہیں اگرچہ انسان میں ذہنی اور جذباتی کیفیات پائی جاتی ہیں مگر وہ پھر بھی طبعی کائنات کا ایک جز ہے۔ اس لئے انسان کی فطرت کا ابدی اور غیر تغیر تصور جس کی کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی اخلاقی اقدار کا آخری معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انسانی فطرت چونکہ بدلتی رہتی ہے اس لئے قدر کے معیار بھی بدلتے رہنا چاہئیں۔ اگر ہم ذرا سمجھ کر اجتماعی ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم مجبور ہوں گے کہ انسان کی غیر تغیر فطرت کے تصور کو خیر باد کہیں۔

اخلاق کے معیار زمان و مکان کے اعتبار سے لحاظ طبعی ماحول اور سماجی حالات جن میں کہ انسان رہتا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ انسان ایک اجتماعی حیوان ہے اس کی فطرت اسی ماحول سے بنتی ہے جس میں وہ سوسائٹی کے مفاد کے لئے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے کام کرتا ہے یا کام کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ انسانی سوسائٹی ایک باہم اور بے جان جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے وجود کو قائم رکھنے کے ذرائع اور طریقے اور اس کی اجتماعی ترقی اور مفاد کی وجوہات بدلتی رہتی ہیں جن سے انسان کے اخلاقی تصورات پر اثر پڑتا رہتا ہے۔ انسان کی کوئی انفرادی ہستی نہیں ہے اور نہ وہ اجتماعی روالہ طے سے آزاد ہے۔ اسے اپنی انفرادیت کا خیال بحیثیت جماعت کے

ایک فرد کے ہوتا ہے اس انفرادیت کو بنانے والا بھی جماعت کا ماحول ہوتا ہے۔ انسان مجموعہ ہے تاریخی اور اجتماعی تجربات کا۔ اس لئے اخلاقیات ایک اجتماعی فلسفہ ہے۔ اخلاق کے قوانین سماجی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنے ہیں اس لئے اقدار کا معیار جماعت کا مفاد ہے۔

مارکسی اخلاقیات | فلسفہ اخلاق کے تصورات دہنی، ابعد الطبیعیاتی، باطنی اور غیر استدلالی ہیں۔ مثلاً نیکی بذات خود ایسے تصورات کا مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر قائم شدہ سماجی نظام کو قائم رکھنا ہے جو سماج کے کسی ایک طبقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ ایسا فلسفہ کل سوسائٹی کے عام مفاد کا ہندو کا ہند نہیں ہو سکتا ایک غیر شعوری مطلق اخلاقی نظام پہلے ہی اسے ایک غائبی نظام فرض کر لیا گیا ہے مثلاً دنیا اس طرح کی ہے کیونکہ اس کے علاوہ وہ دوسری طرح کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اسے کسی اخلاق انسان نے بنایا ہے۔ اس طرح کے تصورات انسان کی ذہنیت کو پست بناتے ہیں اور جدوجہد کی صلاحیتوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں نتیجہ میں انسان مجبور محض بن جاتا ہے اور اپنے مفاد کے لئے بھی جدوجہد نہیں کر سکتا۔

مارکزم | اخلاقیات کو فحشی اور باطنی ابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کی چیزوں سے علیحدہ رکھتا ہے اس کے مطابق اخلاق کا معیار سوسائٹی کا مفاد ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کا نظام صرف ایک طبقہ کے مفاد کی وجہ میں چند افراد شامل ہیں، حفاظت کرتا ہے تو ایسے نظام کے قوانین غیر مفید ہیں۔ سوسائٹی کے عام مفاد کے لئے ایسے قوانین کا ختم کرنا ہی ضروری ہے۔ اگرچہ قائم شدہ نظام کے مطابق ایسا کرنا اخلاقیات کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح دو انسان کو اس لائق بنادیتا ہے کہ وہ خود بخود بغیر کسی بیرونی اخلاقی قوانین پر جو کہ پوری جماعت کے لئے مفید ہیں عمل کرے اور ان قوانین کی پابندی کرے۔

مارکسی اخلاقیات کا بنیادی اصول انیٹورس کے ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔
 ”میں دیکھتا ہوں۔ تم غلام سے آزاد ہونا چاہتا ہو انکار میں نیک بن سون کیونکہ نیک بننے سے بچے خوشی حاصل ہوتی ہے۔“

مرزا محمد شفیع احمد صاحبی لے ایل ایل بی

رسوم و رواج اور ان کی خصوصیات

رسوم و رواج کی اہمیت اور سماجی زندگی میں ان کی اہمیت کے متعلق ولیم گریم سینر (۱۸۴۰-۱۹۱۰) پر دفعہ عمرانیات میل یونیورسٹی نے نمایاں تحقیق کی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اس کی ایک کتاب ”Folk Ways“ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۶۹۲ صفحات، ۱۱۵ ابواب اور ایک اشاری ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سینر نے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔ عادات و اطوار اور رسوم و رواج میں فرق کیا ہے؟ رسوم و رواج کی خصوصیات بتلائی ہیں اور معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مزید براں غلامی، اقطاع محل، لٹل کشی، مردم خوری اور بوڑھیوں کو مار دینے کے جو طریقے زمانہ ماضی میں مروج تھے انکا دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ عمرانی نقطہ نظر سے اس کتاب کا مطالعہ باعث دلچسپی اور معلومات ہوگا۔

سینر نے طر طریق عادات و اطوار کے لئے ”ذکر دین“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور رسوم و رواج کو ”سورس“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ”سورس“ ایک لاطینی لفظ ”سوس“ کی جمع ہے جس کے معنی رسوم و رواج کے ہیں۔ طور و طریق عادات و اطوار کی ابتدا انسانی ضروریات و احتیاجات کی وجہ سے ہوئی۔ بھوک، محبت، شہمت اور ڈر انسانی جدوجہد کی چار اہم تحریکات ہیں۔ اگر اپنی روزمرہ زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جدوجہد براہ راست یا بالواسطہ جزاً یا کلاً مذکورہ چار تحریکات میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ وابستہ نظر آئے گی۔ ان ہی تحریکات کی وجہ سے ہم مختلف نوعیت کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد جس قدر وسیع ہوگی طر طریق اور عادات و اطوار بھی اتنی وسیع ہوتے جائیں گے کسی مخصوص احتیاج کے رفع کرنے کے لئے جب تک ہی نوعیت کی جدوجہد کو بار بار دہرایا جائے گا تو وہ عادات بن جائے گی۔ انسان کی چند احتیاجات فطری اور جمعی ہیں لیکن اکثر کٹائی اور عاداتی ہو کر جاتی ہیں۔ فطری احتیاجات کی پابجائی کے سلسلے میں کٹائی اور عاداتی احتیاجات رونما ہوتی ہیں۔ انفرادی عادات جب پسندیدہ اور مقبول عام ہوتے ہیں تو انھیں اجتماعی رتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور بعد ازاں اجتماعی عادات و اطوار، رسوم و رواج کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ

تجزیہ کرنے کی طرح طریق اور رسوم و رواج پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انفرادی خصائل، عادات و اطوار ہیں اور اجتماعی خصائل رسوم و رواج کہلاتے ہیں۔ رسوم و رواج درحقیقت کسی سوسائٹی یعنی سماج یا معاشرہ کے دو درجہ کی طرح ہیں جن پر عمل کر کے مختلف اقدیا، خواہشات، اعتقادات، توہات اور وجدانیات وغیرہ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں رسوم و رواج کا حصہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ رسوم و رواج کا اثر محض معاشرتی زندگی تک محدود ہے۔ سیاسی اور معاشی زندگی سے بھی رسوم و رواج کا بہت ہی قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سیاست اور معیشت کی تشکیل، ترقی یا تنزل میں رسوم و رواج کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ذیل میں ہم رسوم و رواج کی مختلف خصوصیات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ رسوم و رواج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تشکیل کسی مقررہ کمیٹی کی جانب سے کسی خاص پروگرام یا لائحہ عمل کے تحت نہیں ہوتی بلکہ وہ موسمی حالات، جغرافیائی ماحول اور دیگر امور کا ناکارہ ہونے کے خود بہ خود رونما ہوتے ہیں۔

۲۔ جسمانی عضو کی طرح رسوم و رواج بھی ترقی کرتے اور تنزل کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن جسمانی عضو کی رفتار ترقی یا تنزل کے مقابل رسوم و رواج کی ترقی یا تنزل کی رفتار سست ہوتی ہے جسمانی عضو کی عمر مقابلاً محدود ہوتی ہے اور رسوم و رواج بالعموم طویل عرصہ تک باقی رہتے ہیں

۳۔ رسوم و رواج نسل بعد نسل پہلے آتے ہیں جب ایک مرتبہ کوئی رسم کسی معاشرہ میں شروع ہو جاتی ہے تو اس کا سلسلہ مدتوں جاری رہتا ہے۔ رسوم و رواج کی ابتدا اور وجہ ابتدا کے متعلق بالعموم نا بلند رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود نہایت شدت کے ساتھ اس کی پابندی کی جاتی ہے وجہ یہی بتلائی جاتی ہے کہ چونکہ باپ دادا نے ایسا کیا تھا لہذا ہم بھی کر رہے ہیں۔

۴۔ مختلف قوموں کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے رسوم و رواج اور جاپان چین کے رسوم و رواج میں اختلافات پایا جائے گا۔ اسی طرح ایشیائی ممالک کے مقابل یورپی ممالک کے رسوم و رواج جدا گانہ ہوں گے۔ اگر ہم ہندوستان اور انگلستان کے رسوم و رواج کا مقابلہ کریں تو یہ فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی ملک میں رہنے والی غائب ذاتوں اور فرقوں کے رسوم و رواج جدا جدا

نظر آئیں گے۔ اسی بنا پر لکھا جاتا ہے کہ رسوم و رواج کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ وقت، مقام اور جماعت یا گروہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ منجملہ اور امور کے اس اختلاف کی ایک اہم وجہ عمومی حالات اور جغرافیائی خصوصیات ہیں۔

۵۔ رسوم و رواج میں بہ سرعت تبدیلی کرنا بہت ہی وقت طلب ہے بلکہ ناممکن ہے اگر رسوم و رواج کی قوت اور استحکام کا لحاظ کئے بغیر ان میں تبدیلی کی کوشش کی جائے تو خطرناک اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہونگے۔
رسوم و رواج میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سلج کی مرضی کو بہت بڑا دخل ہے

۶۔ مختلف قوموں کے ارتباطِ لہین و دین اور میل ملاپ کی وجہ سے رسوم و رواج میں بتدریج تبدیلی ہوتی ہے اور مشترک نوعیت کے رسوم و رواج خود بخود درونا ہوتے ہیں۔ رسوم و رواج کی تبدیلی میں سب سے اہم حصہ ربط اور ارتباط کا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تسلط اور استحکام کے بعد یہاں کی سابقہ تہذیب اور رسوم و رواج پر اسلامی تہذیب اور رسوم و رواج کا اثر پڑا اور اکثر رسوم و رواج میں مشترکہ خصوصیات پیدا ہوئیں۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد انگریزی تسلط اور استحکام کی وجہ سے ہمارے طور طریق عادات و اطوار اور رسوم و رواج پر انگریزی تہذیب و تمدن کا نمایاں اثر پڑ رہا ہے۔ روزمرہ زندگی میں اس کی بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوستانی باشندوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج انگریزی تہذیب سے بہت کچھ متاثر ہو چکے اور جو رسوم ہیں جن کی بنیادی وجہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کا یہی ربط ہے

۷۔ رسوم و رواج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں افراد کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انفرادی جدوجہد پر ان کا اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور ہماری ہر قسم کی جدوجہد اپنے معاشرے کے رسوم و رواج کے مطابق ہوتی ہے ہم وہی غذا استعمال کرتے ہیں جو ہمارا معاشرہ استعمال کرتا ہے ہم وہی لباس پہنتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے دیگر افراد پہنا کرتے ہیں ہم اسی نوعیت کے مکانات میں رہتے ہیں جس نوعیت کے مکانات میں ہمارے معاشرے کے دیگر افراد کان رہتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم رسوم و رواج کے پابند نظر آئیں گے۔

۸۔ رسوم و رواج اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی بعض رسوم و رواج اور طریقے کسی زمانہ میں مفید

ہوتے ہیں اور کسی زمانے میں مفرغہ پر رسوم و رواج کی تردید اور مفرغہ پر رسوم و رواج کا ترک کرنا سماجی خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان میں سماجی خوشحالی کے دیگر امور کی اصلاح کے علاوہ تہذیبی رسوم و رواج کی اصلاح کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کسی ملک کی سیاست اور معیشت حقیقی معنی میں اس وقت تک ٹھیک نہیں ہو سکتی جب تک معاشرتی حالات میں بھی مناسب حال ترمیم نہ کی جائے۔

۹۔ تعلیم یافتہ افراد کے مقابل غیر تعلیم یافتہ افراد پر رسوم و رواج کا اثر اور اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو معاشرہ جس قدر غیر تعلیم یافتہ ہو گا وہ اسی قدر قدامت پرست اور قدیم رسوم و رواج کا پابند نظر آئے گا۔ ہندوستان کی دیہی آبادی اس کی نمایاں مثال ہے۔ قدیم رسوم و رواج کا اثر دیہی معیشت پر بہت نمایاں نظر آئے گا۔

۱۰۔ رسوم و رواج کو گو کہ قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تاہم ان کی پابندی قانونی احکامات کی طرح کی باقی ہے۔ ان کی قوت اس قدر ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تحفظ ذات کے جذبات کو بھی اس کی پابجائی کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے۔ ہستی کی رسم کے تحت بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ نذر آتش ہو جانا پڑتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ کلیف سے بچنے کی خواہش انسانی جبلت میں داخل ہے کون عورت یہی جاگتی آگ میں جل جانے کے لئے بخوشی رضا ہوگی مگر معاشرہ کے رسوم و رواج اسے بے زبان بنا دیتے تھے اور وہ بغیر کسی دفاعی کوشش کے ہستی ہو جاتی تھی۔ اولاد کے ساتھ ماں باپ کی محبت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن سستی ہونے والی عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی کو جیتے جی جلتا ہوا دیکھ سکتے تھے لیکن رسم سستی کی مخالفت کی سکت ان میں نہ تھی۔ ذمہ داریوں کو زندہ درگور کر دینے کا جو طریقہ عرب میں مروج تھا اس بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسوم و رواج کے آگے ماں کی امتا بھی بے سود ثابت ہوتی ہے۔ کون عورت بخوشی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی بچی کو زندہ درگور کر دیا جائے محض یہ رسوم و رواج کی قوت ہے کہ ناقابل برداشت امور بھی قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ رسوم و رواج کو دو حقیقت نفس اجتماعی (سوشل مائنڈ) کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور بہت کم افراد میں نفس اجتماعی دھس کا مظاہرہ طور طریق اور رسوم و رواج کے ذریعہ ہوتا ہے، کا مقابلہ کرنے کی استطاعت ہوتی ہے۔ جو افراد تعمیری نقطہ نظر سے نفس اجتماعی کا مقابلہ کرتے ہیں وہ مصلح معاشرت ہوتے ہیں۔ بشرط میں یہ صلاحیت نہیں ہو سکتی نفس اجتماعی کے آگے نفس انفرادی کو بالعموم سر جھکا کر پڑتا ہے۔ بعض ہندو فرقوں میں اب بھی بیوہ عورتوں کا سر منڈ دیا جاتا ہے

کوئی عورت اس سلوک کو بخوشی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی لیکن اجتماعی اور سماجی رسوم و رواج کی قوت کے آگے وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر نوجوان بیوہ عورتیں اس وجہ سے اپنی ساری عمر بیوگی میں گزارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں کہ عقد ثانی کے طلاق کو ساج کی نگاہ میں عیب تصور کیا جاتا ہے۔ بالغ بیواؤں سے کہیں زیادہ انہوں نے حالت نابالغ بیواؤں کی ہوتی ہے جنہیں معاشرہ کے رسوم کے مطابق ساری عمر سوگ میں گزارنا پڑتا ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کا قوی ترین اور منظم ترین ادارہ حکومت ہے لیکن ہر قسم کی فوجی اور حربی طاقت کے باوجود حکومت کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ تقریبی رسوم و رواج کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ کیونکہ کسی قسم کا عملی اقدام کرنے سے قبل ملکی روایات اور رسوم و رواج کا پورا پورا لحاظ ضروری ہوتا ہے ورنہ بھالت دیگر خطرناک نتائج رونما ہوتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کی اصلاحی کوشش دائمی تعمیری حیثیت رکھتی تھی لیکن سماجی روایات اور رسوم و رواج کو نظر انداز کرنے سے جو نتائج برآمد ہوئے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ رسوم و رواج کی اسی اہمیت اور قوت کے پیش نظر قدیم مفکرین نے انہیں "معاشرہ کا بادشاہ" کہا ہے۔ شکسپیر نے "نظام کا لقب" دیا ہے اور بکنین نے "انسانی زندگی کا سب سے بڑا بحرِ طوفان قرار دیا ہے" تارو کہتا ہے کہ "انسان کو رسوم و رواج کے پنجے سے چھٹکارہ نہیں۔ اگر ایک نوعیت کی رسم سے رہائی پاتا ہے تو پھر دوسری کا شکار ہو جاتا ہے" ہر صورت انسان کے لئے رسوم و رواج کی پابندی لازمی اور ضروری ہوتی ہے۔ حکومتی قوانین کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے لیکن رسوم و رواج کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔ ہر شخص کیسے ملے ضروری ہو جائے کہ وہ سماج کے طور طریق اور اپنے عادات و اطوار میں مطابقت پیدا کرے ورنہ وہ رکن معاشرہ کی حیثیت سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔

محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

لکچرار شعبہ معاشیات

بھیس

(ترجمہ کینڈا مصنفہ برنارڈشا)

گزشتہ سے پیشتر

ہرکس کا لہجہ اور زبان خاص لندن کے جاہل لوگوں کی بولی میں ہے۔ اس کے الفاظ ادھر کچرے ہوتے ہیں۔ جوہ جھٹھ میں جو سندھ سے نہیں نکلتا اور جہاں ہانگنا ہوتا ہے وہاں اڑا جاتا ہے اور جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہاں لگا تا ہے جس طرح ہمارے ہندوستان کی بولیوں میں جہلا رخ اور ق کو اٹ پٹ کر دیتے ہیں۔ یا یہاں کہ میاں، انوس کہ نفوس، جا رہے کہ جا رہے یا کہہ دیا کہ کیدیا کہتے ہیں۔ ترجمہ میں ملیں زبان ہی رکھی گئی ہے، (مترجم)

ہرکس۔ (چمکت پرہکتے ہوئے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ سٹرنا ریل یہاں موجود ہیں۔
پ۔ (اٹکتے ہوئے) میں جا کر بلائے لاتی ہوں۔

ب۔ اس کی طرنا امید ہی سے گھورتے ہوئے آپ وہ فوجان لیڈی نہیں جو یہاں پہلے ٹائپ کیا کرتی تھیں؟
پ۔ جی نہیں۔

ب۔ آئندہ ان کی طرنا بڑھتے ہوئے اور زیر لب جڑا بڑاتے ہوئے یہاں! وہ آپ سے کم عمر تھیں کیوں نا؟ اس کا بٹن اس کی طرف نکلے گئی ہے، پھر دروازے کو زور سے بند کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے کیا اپنے گشت پر جا رہے ہو؟
سٹرنا!

ل۔ (اپنی یادداشت کو تہہ کر کے جب میں رکھتے ہوئے) جی ہاں مجھے جلدی جانا ہے،
ب۔ (فوراً سٹرنا میں آپ کو روکنا نہیں چاہتا مجھے سٹرنا ریل سے ایک نجی کام ہے اور اسی لئے میں آیا ہوں)

ل۔ اجنبی اگر میرا گزرا دے، دخلت کا نہیں ہرگز نہ گئیں، گڈ مارنگ

ب۔ (نہایت شغفتہ سے) =

(جیسے ہی لپکتی جانا ہوتا ہے مارگل واپس آتا ہے)

م۔ (لیکسی سے) کیا چل دیئے؟

ل۔ جی ہاں۔

م۔ میرا تیری رومال لے لو اور گلے میں لپیٹ لو، باہر ہوا بہت سرد ہے۔ جاؤ۔

(لیکسی اس عنایت سے بگڑ گئی کی تا ملائمت بھڑل جاتا ہے، خوش ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے)

ب۔ جیسے تم اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ خواب ہی کیا کرتے ہو، گڈ مارنگ، میں جب کسی اپنے ملازم کو کچھ دیتا ہوں اور جس کی کمائی کا انحصار مجھ ہی پر ہوتا ہے تو میں اس کو بس اسی کی اوقات ہی پر رکھتا ہوں۔

م۔ (ذرا تیزی سے) میں ہمیشہ اپنے نائبوں کو اپنا ساتھی اور مددگار سمجھتا ہوں، اور اس لئے جتنا وہ میرا خیال

کرتے ہیں، اگر اتنا ہی کام آپ کو اپنے کلرکوں اور آدمیوں سے حاصل ہو جائے تو آپ بہت جلد امیر ہو جائیں لیجئے اپنی پرانی کرسی (وہ ذرا تشریفی سے اس آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آشدان کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک خالی کرسی میز پر اٹھاتا ہے، اور اپنے مہمانان کو ذرا فاصلہ پر بیٹھا) (بیز حرکت کئے، تم بس ویسے ہی رہے جیسے!

م۔ آپ جب بھلی دفعہ آئے تھے یہی کوئی تین برس کا عرصہ گزرا، جاں تک میرا خیال ہے تو آپ نے یہی

بات فرما اور صفائی سے کسی تہی آپ کے صحیح الفاظ اس وقت یہ تھے، جیسے! ااں تم وہی ہمیشہ کے ایسے بڑے بیوقوف ہی رہے!

ب۔ (لطیف و اطمینان والے ہوئے) غالباً، ہاں میں نے ایک کئی سالین (مصلحت کے بغیر) غرض کرتے

ہوئے، میرا مطلب اس سے کوئی تکلیف پہنچانا نہیں تھا، ایک پارٹی کو اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ ذرا

بیوقوف بھی ہو، تو تم جانتے ہو بلکہ اس کے پیشے کے لئے یہ ضروری بھی ہے، بہر حال میں پرانی بدحواسی

کو یاد رکھتے نہیں آیا ہوں اس لئے گزشتہ پر صلاہ بھیجو ایک ایک سویدگی اختیار کرتے رہے اور اہل کے قریب

آتے ہوئے، جس تین سال کا زرمہ گذراتم نے میرے ساتھ بڑا گھانا کیا تھا تم نے میرا ایک ٹیکہ تڑوا دیا تھا اور جب میں نے غم و فوس کے باعث تم پر غصہ کا اظہار کیا تھا تو تم نے میری لڑکی کو میرے خلاف کر دیا تھا لیکن ہر حال اب میں ایک بچے عیسائی کا فرض ادا کرنے آیا ہوں (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) یہی جیس میں تم کو ملنا کرتا ہوں۔

م۔ (چونک کر اٹھ بیٹھا) خدا غارت کرے تمہاری اس دیدہ دلیری کو۔

ب۔ (بچھے دبتے ہوئے اور اس قسم کے برتاؤ پر آنکھیں نمناک کرتے ہوئے) جیس کیا ایک پادری کے لئے اس قسم کی بات زبان پر لانا مناسب ہے اور خاص کر تمہاری زبان پر!

م۔ (غصہ سے) نہیں جناب، ایک پادری کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں میں نے غلط الفاظ استعمال کئے بلکہ مجھ کو تو یہ کتنا چاہئے کہ جہنم میں جائے تیری بے فیرتی بلکہ یہی الفاظ سینٹ پال اپرا یا نڈا نامی تم سے کہتا کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارا دو ٹیکہ بھول گیا۔ جب تم نے محتاج خانے کو کپڑے مہیا کرنے کا ٹیکہ لیا تھا:

ب۔ (چونک کر مناد کے جوش میں آکر) جیس میں نے حصول ادا کرنے والوں کے حق میں بڑا مفید کام کیا میرا ٹیکہ سب سے کم ٹیکہ تھا تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

م۔ ہاں، سب سے کم خرچ کا! اس لئے کہ تم نے مزدوروں کو نہایت ہی کم نوا ہیں دیں جتنی کہ کوئی دوسرا مالک کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی کم کہ بھوکوں مرنے کی ذمہ داری آجائے، بلکہ اس سے بھی کم خصوصاً ان بچاری عورتوں کو جو تمہارے یہاں کپڑے سی تھیں۔ تمہاری نواہیں اس قدر کم تھیں کہ ان بچاریوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتیں (غصہ اور بھی تیز ہوتا جاتا ہے) وہ عورتیں میرے گرجے میں آتی تھیں اس لئے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اس ٹیکہ کو منسوخ کرالے کے لئے میں خیرات خانے کی مجلس انتظامی کے رکنوں کو غیرت دلائی ہیں نے خیرات خانہ کا معمولی چندہ ادا کرنے والوں کو غیرت دلائی، شخص کو غیرت دلائی لیکن تمہیں نہ دلا سکا۔ (بے مدگرم ہو کر) اب یہاں تم کس منہ سے آئے ہو اور پھر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم مجھے سنا کر تمہو اور اپنی لڑکی کو بیچ میں لاتے ہو اور۔

ب۔ غصہ نہ ہو، غصہ نہ ہو! جیسے ایک ذرا سی بات پر اتنے خفتانہ ہو۔ میں نے مان تو لیا کہ میں نے غلطی کی۔

م۔ کب تم نے مانا، میں نے نہیں سنا۔

ب۔ نہیں۔ واقعی میں نے اعتراض کر لیا اور اب پھر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں اس خط کے متعلق جو میں نے تمہیں لکھا تھا اب کافی ہے؟

م۔ (انگلیاں جھٹاتے ہوئے) نہیں، ابھی نہیں۔ پہلے یہ بتلائیں کہ آپ نے تنخواہ میں بڑھادیں کہ نہیں؟

ب۔ (ناگمانہ انداز میں) ہاں

م۔ کیا!

ب۔ (چاپلوسی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مصنوعی جوش اور رقت کے بھروسے) اب میں ایک مثالی مالک ہو گیا ہوں

اب میں عورتوں کو ڈر نہیں رکھتا۔ وہ اب سب کی سب ہٹا دی گئی ہیں۔ اب سب کام مشینری سے کیا جاتا ہے اور کسی شخص کو چھینٹیں فی گھنٹہ کم نہیں ملتا، اور جو کاریگر ہیں ان کو ٹریڈ یونین کے نرخ سے مزدوری دیتا ہوں (غور) اکیسے اب آپ کیا کہتے ہیں؟

م۔ (نہایت سرور ہو کر) کیا واقعی؟ کیا واقعی؟ اس گنہگار کے لئے جو توبہ کر لے آسمان کے خزانے بے حد

بے انتہا خوشیاں پنپاؤں کرتے ہیں، دہریوں کے پاس صدق دل سے نہایت عفو طلباں ہو جاتے ہوئے) میرے بزرگیں! کس قدر ارفع و اعلیٰ کام آپ نے کیا ہے! میں آپ سے تہہ دل سے اپنے خواب خیالات کی معافی چاہتا ہوں اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے) اب آپ کو کس قدر مسرت محال ہوئی ہوگی! کیوں نا، اکیسے کہیں کہ اب آپ کا دل، عید، خوش، عید، مسرور ہے بلکہ آپ روحانی طور پر خوش تو اب نظر آتے ہیں۔

ب۔ (نہایت پشیمانی سے) ہاں خوشی تو ہے، بلکہ خوش تو ہونا ہی چاہئے، اور خصوصاً جبکہ تم اس بات کو دیکھ رہے

ہو لیکن خیر اب ضلع کی کونسل سے میرا معاہدہ تو طے ہی ہو گیا ہے (نہایت دھیان دہن سے) وہ ہرگز تیار نہیں تھے جب تک کہ میں ابھی تنخواہیں دینے کا وعدہ نہ کروں، برا ہوا ان گدوں کا کہ میرے معاملات میں دخل دیا ہے۔

م۔ (اس کا ہاتھ چمڑتے ہوئے نہایت اسی سے) تو یہ کہنے اس ڈر کے سبب آپ نے تنخواہیں بڑھا دیں، اور اسی سے

بیٹھا جاتا ہے)

ب۔ (سجیگی سے خوب ایندھن لگائی اہوں میں، اور آٹھویں کس لئے کرتا؟ لیکن جانتے ہو آخر اس سے ہوتا ہی کیا ہے؟ سو اسے اس کے کہ مزدور شراہیں پی کر مست اور گستاخ ہو جاتے ہیں، نہایت آناہان سے آرام کر سی میں سا کر بیٹھا جاتا ہے، لیکن جیسے تمہارا کام بہت اچھا ہے، تمہارا نام اخبارات میں آ جاتا ہے اور تم بڑے آدمی ہو جاتے ہو، لیکن جیسے دیکھو۔ تم کتنی بے انصافی کرتے ہو کہ ان مزدوروں کو اس قدر روپیہ دیتے ہو جو جانتے بھی نہیں کہ خرچ کس طرح کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے لے لیتے ہو جو اس کا بہت بہتر مصرف کر سکتے تھے۔

م۔ (نہایت گری آہ بھر کر اور مرد مسرے سے کہتے ہوئے) آج آپ میرے پاس آخر کس کام سے آئے ہیں؟ یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ محض غریبوں اور اناہت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔

ب۔ (دور سے کراہاں، میں یوں ہی غریبوں اور اناہت کے طور پر آیا ہوں۔ کسی کام سے نہیں۔

م۔ (اطمینان اور خاموشی سے) مجھے آپ کی بات کا قطعی اعتبار نہیں ہے۔

ب۔ (نہایت غصہ سے اٹھتے ہوئے، جیسے سیوہاریل) اب یہ پھر میری نسبت پڑے گا۔

م۔ (بہتر کھانٹنے، یقینی بار اس کی ضرورت ہوگی تمہیں معقول کرنے کے اتنی بار کوں کا قطعی کہ میں تمہاری بات کا بالکل اعتبار نہیں کرتا۔

ب۔ (نہایت مجروح ہو کر، خیر اگر تم نے یہ طے ہی کر لیا ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں تو

خیر بہتر ہے کہ اب میں جاؤں) (نہایت بدلی سے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ ماربل کوئی اثر نہیں لیتا۔ وہ ذرا کھٹکتا

ہے، جیسے) مجھے امید نہیں تھی کہ تمہاری ایسی نہ معاف کرنے والی طبیعت ہوگی زاریں پھر بھی کوئی جواب

نہیں دیتا۔ وہ چند اور قدم بدلی سے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ایک دم منہ پھلائے واپس آتا ہے۔ رونے

لجہ میں کہتے ہوئے، ہم ضرور باہم دوست رہیں گے خواہ ہماری رائیں کتنی ہی خلاف کیوں نہ ہوں۔ یہ

آخر آج تم اس قدر بدل کیوں گئے ہو میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں آج محض دوستانہ طور پر آیا تھا۔ تم

سے لڑنے کیلئے نہیں میں اور پھر میں تم سے لڑوں، میری چہیتی بیٹی کے تم شوہر ہو، آؤ آؤ جیسے آؤ

ہزاروں ہاتھ ماراؤ (ماربل کے کانڈے پر محبت کے جذبہ سے ہاتھ رکھ دیتا ہے،

م۔ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے دیکھو بگس! کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ ہم تم ویسے ہی دوست ہو جائیں جیسے کہ پیشتر تھے یعنی اس ٹیکہ والے معاملے سے پہلے؟

ب۔ ہاں جیسے! ہاں ویسے ہی بالکل ویسے ہی۔

م۔ تو اچھا پھر تم اپنا بڑا ذویا ہی کیوں نہیں رکھتے جیسا کہ پہلے تھا۔

ب۔ (نہایت احتیاط سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے) کیا مطلب تمہارا جیسے؟

م۔ مطلب یہ کہ پہلے تم مجھے نوجوان بیوقوف سمجھا کرتے تھے۔

ب۔ (منانے ہوئے) میں تمہیں بیوقوف سمجھتا تو نہیں تھا۔ میں.....

م۔ (بات کاٹتے ہوئے) تم واقعی سمجھتے تھے اور میں تم کو کھوسٹ باجی سمجھا کرتا تھا۔

ب۔ (ماربل کی خودالزائی کو جوش سے روکتے ہوئے) انہیں تم ہرگز نہیں سمجھتے تھے جیسے اب تم صاف صاف اپنے متعلق نا انصافی سے کام لے رہے ہو۔

م۔ انہیں میں واقعی سمجھتا تھا لیکن اس سے کوئی ہم لوگوں کی دوستی میں فرق نہیں آسکتا۔ تم کو

ایسا ہی شخص بنایا جس کو میں نہایت باجی کتا ہوں۔ اسی نے مجھ کو ایسا شخص بنایا جس کو تم بیوقوف

کہتے ہو۔ میں اس کی مصلحت میں کیا چارہ؟ (اس بات کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بگس کے چہرہ پر وہ اخلاقی نقاب جسے وہ

قام کے ہوئے قاعدہ دو گئی جسم زرد پڑ گیا اور ماربل کی طرف نظر گرنے لگا۔ وہ گئی خود کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی کوشش

کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے نیچے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے۔ ماربل اپنے اسی اطمینان

کے لہجہ میں کتا چلا جاتا ہے یہی عجیب لایا مجال تھی اس کے معاملات میں دخل دیتا نہ اپنے بارے میں کچھ

کہہ سکتا تھا نہ تمہارے لئے بس اس وقت تک جب تک کہ تم یہاں نہایت اہم کاری کے ساتھ یہ

یقین کرتے ہوئے آؤ کہ تم نہایت باجی اور کینے آدمی ہو اور اپنے اس باجی پن پر ناز بھی کرتے ہو تو اس

وقت تک میرے تمہارے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار تعلقات ہیں گے اور تم کو میں ہمیشہ خوش آمدید کہوں گا

لیکن (اب ماربل کا لہجہ تیز اور دشت ہو جاتا ہے۔ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کڑی بر نہایت زور سے ہاتھ مارنے ہوئے کہا)

اس کی قطعی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم چھوڑ کر تے ڈنگیں مار تے یہاں آؤ کہ تم ایک مثالی الگ ہو گئے

ہو اور ظلم و ستم سے تائب ہو گئے ہو حالانکہ یہ ظاہری تبدیلی صرف مصلح کی یونین کے خوف سے واقع ہوئی ہے۔ وہ یہ بات اس کی طرف اہمیت دینے کے لئے سر جھکا کر کہتا ہے، پھر آئندہ ان کے قریب چلا جاتا ہے جہاں وہ نہایت اطمینان و شان سے جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ میٹھ آئندہ ان کی طرف سے اور سلسلہ سخن جاری ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ شخص اپنے متعلق صداقت سے کام لے خواہ وہ برائی کیوں نہ ہو۔ اچھا خیر، تو مطلب یہ کہ یا تو آپ اپنا ہیٹ سنبھال لے اور چل دیجئے یا بیٹھئے یہ مان کر سچے دل سے کہ آپ نہایت پاجی آدمی ہیں اور پھر اپنی پاجیا نہ بچھیں تبائیے کہ سچ بھی آخر آپ اب مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں اور میں جس کے جذبات اب بہت کافی تم چکے ہیں۔ اتنے کہ وہ ایک کہیا ہی نہیں اپنے بونٹوں پر پیدا کر سکتا ہے اس علی تجویز سے نرم ہو جاتا ہے وہ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور آخر کار ہمت آہستہ آہستہ نہایت تمیز سے اس کو یہ پوچھ جاتا ہے جو ماربل نے اس کے واسطے خالی کی تھی ہاں، اب یہ ٹھیک ہے۔ اچھا اب بتاؤ۔

ب۔ اکیلا ہی نہیں ہتے ہوئے، ہمیں، تم بھی عجیب قسم کے جانور ہو جس میں کوئی بھی شک نہیں لیکن ذرا جوش کے ساتھ، پھر بھی تمہاری باتوں پر پیارا ہی جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ کسی کو بھی پادری کی باتوں کا زیادہ اثر نہ لینا چاہئے ورنہ دنیا کا کوئی کام ہی نہیں چل سکتا اپنے کو سنجیدہ گفتگو کے لئے خاموش کرنا ہے اور ماربل کی طرف دیکھتے ہوئے خشک سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کرنا ہے، لیکن خیر میں تمہاری باتوں کو برا نہیں ماننا اور جبکہ تم چاہتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے آزاد نہ بنیں تو میں اس بات کو چھپانا نہیں چاہتا کہ میں واقعی تم کو ایک زمانہ میں کچھ بے وقوف سمجھتا تھا لیکن اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ شاید میں اس بات کو قبل از وقت کہتا تھا۔

م۔ (اکرم بنیاش ہو کر، اہا ہا! آخر تم کو پتہ لگ گیا نا؟)

ب۔ (خیر سے) ہاں، زمانہ بہت کافی گزر گیا۔ پانچ سال گزرے کہ تمہارے خیالات پر غور کرنے کا کوئی خیال تک نہ کرتا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ آخر تمہیں وعظ دینے ہی کیوں دیا جاتا ہے مجھے ایک پادری کا حال معلوم ہے کہ اسے لندن کے اپنی پادری نے عرصہ سے مسترب کر رکھا ہے حالانکہ وہ بیچارہ اسی قدر لائبرل ہے جتنے کہ تم ہو لیکن آج اگر کوئی مجھ سے شرط کرے کہ تمہارے متعلق کہ تم خود آخر عمر تک لندن کے

پادری اعلیٰ ہوجاؤ گے تو میں قطعی شرط کروں گا (نہایت جوش ہے) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور تمہارے ساتھی نہایت مستعد اور با اثر ہو رہے ہیں اور کوئی نہ کوئی غلط فہمییں ابھی کوئیکے گناخواہ تمہاری زبان بند ہی کیلئے کیوں نہ ہو تم کو سوچنی چاہی! جو راہ تم نے اختیار کی ہے وہ آخر میں تم کو ضرور کچھ نہ کچھ دے کر رہے گی۔

۴۔ دابا ہاتھ نہایت نجسنگی سے بڑھاتے ہوئے ہاتھ ملاؤ (گوس) اب تم بھی سچی اور یا انداز نہ باتیں کر رہے ہو۔ خیر لندن کا پادری اعلیٰ تو میں نہیں بنایا جاؤں گا اگر بنا دیا گیا تو میں تم کو تمام بڑے بڑے باجی اور ظالمہ جوں سے ملا دوں گا جو میرے یہاں شب و روز دعوتوں پر آتے ہیں گے۔

ب۔ (نہایت میٹھی جلی بنا رہا تھا) اب وہ کہتا ہے (ہاں) جسے تمہارے مذاق نہ جائیں گے، خیر تو گویا اب ہم میں مصالحت قطعی ہو گئی ہے اور سب غلط فہمیاں رفع ہو گئیں۔ کیوں نا جیسے؛

ایک زانیائی آواز جس ہمکہ کیوں نہیں دیتے کہ ہاں ہاں!

(دونوں ایک دم چونک پڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کینیڈا آگئی ہے اور ان دونوں کی طرف گویا اورادہ شفقت سے دیکھ رہی ہے جس کا خاص ملکہ ازلہ ہے۔ بیٹیس برس کی عورت، خوب مغبوط جسم، تند رست اور امید ہے کہ آگے چل کر گول مول ہو جائے لیکن خیر ابھی تو اپنے شباب پر ہے یعنی یہ کہ جوانی بھی ہے اور ماں پونے کا فریبی اس کے طریقے بالکل ایسی عورت جیسے ہیں جس نے بخوبی یقین کر لیا ہے کہ وہ لوگوں کی توہم اپنی طرف بڑی آسانی، بڑی معافی اور بالکل کھف کے مرکز کی ہستی ہے نہ خیر یہاں تک تو یہ کہجا سکتا ہے کہ وہ ان خوبصورت عورتوں کی طرح ہے جو مردوں سے اپنی جنسی خوبی کی بدولت جو چاہیں کر والیں، لیکن کینیڈا کی تین پیشانی، باہمت نظریں، مستحکم ٹھوڑی اور منہ کی ساخت ظاہر کرتی ہیں کہ وسیع النظر، اعلیٰ کار اور طبیعت کی ہمدرد ہے۔ ایک دوزخین شخص ضرور کھلے گا کہ جس کسی نے وہ مرتجہ والی تصویر اس کے آئینہ کے اوپر لگائی ہوگی اس نے اس تصویر اور اس عورت میں ضرور کوئی روحانی شائبہ دیکھی ہوگی حالانکہ کینیڈا یا اس کے شوہر کو اس کا تان گمان بھی نہیں ہے نہ اس کا کہ قدرت کا یہ شاہکار طبعیان کے اس شاہکار سے کچھ تعلق بھی رکھتا ہے۔ اس وقت وہ مہر چھوٹی ہیٹ لگائے اور لبادہ اوڑھے ہوئے ہے ہاتھ میں ایک کبل کا بندل ہے جس میں اس کی چھتری کھٹی ہوئی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک مینڈیگ

ہے اور کچھ تصویر دار رسالے،

م۔ اپنی کلائی پر یکایک چونک کر کینڈ ڈاکیوں۔ اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اس قدر دیر ہو گئی ہے نہایت مضطرب ہو جاتا ہے، میری پیاری اذیتری سے اس کی طرف بڑھتا ہے اور کبل کے ہنڈل کو الگ رکھ دیتا ہے۔ ساتھ ہی انوسن نظر ہر کرتا جاتا ہے کہ وہ انش جاناکس قدر بھول گیا، میں نے سوچا تھا کہ تم کو انش سے لے آؤں گا لیکن میں نے وقت کا کچھ خیال ہی نہیں کیا (کبل کو صوفے پر پٹختے ہوئے) مجھ کو اس قدر باتوں میں لگا لیا۔ اس (اس کی طرف پھرتے ہوئے) میں بالکل بھول گیا کینڈ ڈا پیاری (منظور ہوتا ہے ایسے جذبات کے ساتھ تاکہ وہ اس کی فراوانی کو معاف کر دے اور بھول جائے)

ب۔ کچھ شرمندہ ہو کر اور اپنی قدر و منزلت کو عرض خط میں بھج کر کہو اچھی تو کینڈ ڈا (وہ ابھی ماربل کی آفرش میں ہے۔ لیکن اپنا رخسار باپ کی طرف بڑھا دیتی ہے اور وہ چوم لیتا ہے، میرے اور جس کے درمیان اب مصالحت ہو گئی ہے نہایت باعزت بکھوتہ! کیوں نا جیسے؟

م۔ (جزبہ کر) اودھ اپنا ڈا اپنی مصالحت۔ مجھے تمہاری وجہ سے دیر ہو گئی کہ کینڈ ڈا کو نہ لاسکا (نہایت محبت سے) میری پیاری کینڈ ڈا تمہارا سب سامان کہاں ہے۔ تم کیسے یہاں تک.....

ک۔ (قطع کلام کرتے ہوئے اور خود کو جھڑاتے ہوئے) وہاں! وہاں! میں اکیلی نہیں تھی یوہین اسٹین پر تھا در وہاں سے میرے ساتھ آیا ہے۔

م۔ (خوش ہو کر) یوہین؟

ک۔ ہاں! وہ باہر میرے اسباب کی دیکھ بھال میں الجھ رہا ہو گا۔ پیارے جلدی باہر جاؤ ورنہ وہ دھم اپنے پاس سے گاڑی والے کو دیرے گا اور یہ مجھ پر چاہتی نہیں (ماربل جلدی سے باہر جاتا ہے کینڈ ڈا اپنا ہینڈ بیگ فرش پر رکھ دیتی ہے اس کے بعد بارہ اور ڈپٹی انا ملتی ہے (وہ صوفے پر رکھ دیتی ہے اور کبل کا پارل بھی لیکن اس سلسلہ میں بات جیت جا رہی ہے) تو یا پھر کاکیا رنگ ٹھنک ہے۔

ب۔ کینڈ ڈا جب سے تم وہاں سے آئیں وہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دفعہ ادھر آؤ اور اپنی بہن سے مل جاؤ۔ یہ یوہین کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟

ک۔ یو جین ماریل کی ایک دریافت ہے۔ جون میں یہ ماریل کو ٹیگز کے پٹے پر سوتا ہوا مل گیا۔ کیا آپ نے ہم لوگوں کی نئی تصویریں دیکھی؟ (تصویر ہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ اسی کی وی ہوئی ہے۔

ب۔ یقین نہ کرتے ہوئے اسے بس رہنے دو یعنی گویا تم مجھے اپنے باپ کو یہ بتلا رہی ہو! ایک معمولی گاڑیاؤ کا دلال جو پٹے پر سوتا ہو اور پھر وہ ایسی تصویر خریدے (سختی سے) مجھے دھوکہ نہ دو۔ یہ ایک بہت اعلیٰ مذہبی تصویر ہے اور جیس کا اپنا انتخاب۔

ک۔ نہیں بابا، یو جین گاڑیوں کا دلال نہیں ہے۔

ب۔ پھر آخر وہ کیا ہے (طنز یہ) شاید کوئی امیر کبیر! کیوں نا؟

ک۔ دسکر آکر مہلاتے ہوئے) ہاں اس کا بچا ایک لارڈ ہے۔ زندہ بیچ بیچ کا لارڈ۔

ب۔ ایسی عمدہ خبر یقین نہ کرتے ہوئے) اسے نہیں!

ک۔ ہاں جب جیس نے اسے بندیر پایا۔ اس کی جیب میں ایک ہفتہ کا بچپن پونڈ کا بل پڑا ہوا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ اسے ایک ہفتہ سے پہلے اس روپیہ نہیں مل سکتا کسی سے قرض لینے میں اسے شرم آتی تھی۔ وہ بڑا پیارا لڑکا ہے ہم لوگ اسے بہت چاہتے ہیں۔

ب۔ (اشرافیت کو حیرت دکھاتے ہوئے لیکن بھرپور مکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ) ہوں امیر تو خیال نہیں کہ کسی لارڈ

کا بھتیجا اس طرف وکٹوریہ پارک میں آئے گا۔ ہاں جب تک کچھ بیوقوف نہ ہو (تصویر کی طرف پھر دیکھتے

ہوئے) حالانکہ کینڈی مجھے یہ تصویر زیادہ پسند نہیں پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آرٹ نہایت اعلیٰ قسم کا ہے

دیکھو تم اس سے میرا تعارف ضرور کرادینا بھول نہ جانا کینڈی (اپنی گھڑی کی طرف گھبرا کر دیکھتا ہے) میں

اب صرف دو منٹ اور بٹھر سکتا ہوں۔

ماریل یو جین کو ساتھ لئے دایں آتا ہے، برگیس یو جین کو نہایت لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے یو جین

ایک نہایت عجیب قسم کا شرمیلا لڑکا ہے کوئی اٹھارہ برس کی عمر ہوگی، دلا پتلا، انسانی لئے ہوئے بہت

باریک بچوں کی سی آواز اور نہایت گھبراہٹا ہوا سا چہرہ، ڈری بھی ہوئی سی باتیں جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ آنا ز شباب کی آمد آمد سے گھبرا رہا ہے۔ نہایت ہستقل۔ اس کی کچھ میں نہیں آتا کہ کہاں کھڑا ہوا کیا کرے

دو برس یعنی ایک نئی صورت کو دیکھ کر دشت زدہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر موعہ ملے تو فوراً کسی گوشہ میں بھاگ جائے کسی غیر معمولی عام صحبت کا احساس بھی اس کے اعصاب پر بہت شدید ہوتا ہے لیکن اس کے متعنے ہنر اور آنکھیں سب کی بناوٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مندی بہت کافی ہے اس کی کشادہ معمولوں سے یہ بھی ہویدا ہے کہ طبیعت میں رحم بھی ہے علیہ اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس دنیا کا معلوم ہی نہیں ہوتا خشک اور خمد آدیوں کو تو اس کی صورت تکلیف دہ معلوم ہوگی لیکن شاعرانہ داغ والے اسے خرمشتہ ہی سمجھیں گے اس کا لباس بے نکاسا ہے۔ ایک پرانی نئی سرج کی جیکٹ ہے جس کے ٹن کٹے ہوئے ہیں اس کے نیچے ادنی ٹینس کی قمیص بٹانی کا کام دینے کے لئے ایک ٹیڈی رومال منجا ہوا ہے۔ پتلون جیکٹ ہی کے رنگ کا ہے، پیر میں بھورے کینوئیں کے جوتے ہیں اس کی ہیڈت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ غالباً پارکوں کی گھاس میں پڑے رہے ہیں۔ دو کپس پانی مل گیا تو وہ بھی منجھایا ہے اور برش۔ خیر سے معلوم ہوتا ہے کبھی کرتے ہی نہیں۔

جیسے ہی یو جین ایک اجنبی کی شکل دیکھتا ہے رک جاتا ہے اور دیوار سے لگے لگے کمرے کی دوسری طرف جانے لگتا ہے

۲۔ (داخل ہونے پر) ادھر آؤ، ادھر کہاں جاتے ہو، ابھی کچھ دیر ٹھہرو تو آپ میرے خسرانیں مسٹر برگین اور آپ مسٹر راج بیگس۔

یو جین پانچ منٹس سا بھرتے ہوئے اور کتابخانہ کا شمار لیتے ہوئے جناب نہایت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔

ب۔ اس کے پاس جاتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے۔ ماریل اس عرصہ میں کینڈا کے پاس جہاں آشدان کے پاس بیٹھی ہے چلا جاتا ہے یقین جانیے آپ سے مل کر بے انتہا مسرت ہوئی اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے گواہ لہانے پر مجبور کرتے ہوئے مسٹر راج بیگس کہنے آج کا موسم کیا ہے؟ مجھے اسید ہے کہ آپ جیس کے احمقانہ خیالات سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔

ی م۔ احمقانہ خیالات! اچھا آپ کا مطلب ان کے سوشلزم سے چھوٹکل نہیں۔

ب۔ ہاں یہ ٹھیک ہے پھر اپنی ٹکڑی دیکھتے ہوئے، اچھا میں اب جاؤں گا۔ مجبوراً سخت کام ہے۔ آپ کیا

میری طرف تو نہیں آ رہے ہیں مسٹر راج بنکیس؟

می۔م۔ کس طرف؟

ب۔ وکٹوریہ پارک اسٹیشن۔ وہاں سے ایک گاڑی شہر جانے کو بارہ بجے پچیس بدلتی ہے۔

م۔ جی نہیں میرا خیال ہے یو جین ہم لوگوں کے ساتھ اب کھانا کھا کر جائے گا۔

می۔م۔ (گہرا کرمائی چاہتے ہوئے) نہیں امیں۔ میں۔

ب۔ اچا خیر میں آپ کو مجبور نہ کروں گا۔ میری بھی رائے یہی ہے کہ بہتر ہے آپ یہاں کینڈی کے ساتھ

کھانا کھانے کے بعد تشریف لے جائیں لیکن کسی دن غریب خانہ پر بھی احضرتنا دل فرمائیں مجھے امید ہے

آپ میرے کلب پر تشریف لائیں گے۔ فریمن فاؤنڈرس۔ نارٹن فالگلیٹ۔ دیکھئے آئیے گا ضرور کیئے آپ

آئیں گے؟

می۔م۔ شکریہ مسٹر بنگس لیکن یہ نارٹن فالگلیٹ ہے کہاں؟ سرے میں نا!؟

(برگس انسان کو اسے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے)

ک۔ (دوہین کو اپنے باپا سے نجات دلانے کے لئے آتے ہوئے) پایا دیکھئے آپ کی گاڑی چوٹ جانے لگی اگر آپ فوراً

وہاں نہ پہنچ جائیں گے۔ غلام کو پہرا کر مسٹر راج بنکیس کو بتا دیجئے گا کہ آپ کا کلب کہاں ہے۔ اس وقت

تاخیر مناسبت نہیں ہے۔

ب۔ (ہنسی سے بے حال) سرے میں! اہ! اہ! خیال برائیں ہے میں نے آج آپ ہی کو ایسا شخص پایا ہے جو

یہ نہیں جانتا کہ نارٹن فالگلیٹ کہاں ہے (اپنے غل پر خود نا دم ہو کر) خدا حافظ! مسٹر راج بنکیس مجھے امید

ہے کہ آپ میری اس ہنسی کو معاف فرمائیں گے اور کچھ اثر نہ لیں گے (بہرا ہوا ہاتھ بڑھاتا ہے)

می۔م۔ (گہرا ہنستے ہاتھ لاتے ہوئے) نہیں، نہیں کوئی بات نہیں!

ب۔ خدا حافظ! کینڈی! پھر کبھی آؤں گا جس خدا حافظ!

م۔ تو کیا آپ جانیے ہی گا؟

ب۔ نہیں، تمہارے آنے کی ضرورت نہیں، (اشادیں و فرماں باہر مل جاتا ہے)

م۔ میں تمہیں کچھ دور تو پہنچاؤں (اس کے پیچھے جاتا ہے)

(یوحین ان دونوں کی طرف متاثر رہتا ہے، سانس نہیں لیتا یا ان تک کہ برگس نظروں سے غائب ہو جاتا ہے)

ک۔ (ہنستے ہوئے) یوحین، یوحین چونک پڑتا ہے اور نہایت شگافہ اس کی طرف آتا ہے لیکن اس کی ہنسی ہونی نظروں

کو دیکھ کر ایک دم رگ جلتا ہے، میرے باپ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ی۔ میرا۔ میں ابھی تک اُن کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا لیکن نہایت عمدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

ک۔ (دھکے طنز سے) اور تم فری مین فاؤنڈریس کلب ان کی دعوت کمانے جاؤ گے ضرور کیوں نا؟

ی۔ م۔ (گھبراہٹ سے اور اس مذاق کو بخیدہ بات سمجھتے ہوئے) ہاں، اگر آپ کی ایسی ہی خواہش ہے۔

ک۔ (متاثر ہو کر) تمہیں معلوم ہے کہ تم بہت ہی اچھے لڑکے ہو یوحین، بہت عجیب، اگر تم میرے والد پر اس

دقت سے ہوتے تو مجھے برا نہ معلوم ہوتا لیکن تم نے بہت اچھا کیا کہ تم نے نہیں اور اتنی اچھی طرح

بیٹھ آئے

ی۔ م۔ کیا مجھے ہنسا چاہئے تھا؟ ہاں میں نے بھی یہ خیال کیا تھا کہ انہوں نے کوئی دھچپ بات کہی تھی۔ لیکن

قصہ یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے میں، اس قدر غیر مطمئن رہتا ہوں کہ مجھے کسی مذاق کا بھی پتہ نہیں چلتا

مجھے بہت افسوس ہے (وہ مرنے پر بیٹھ جاتا ہے کہنیاں گھٹنوں پر اور سر کو مٹھیوں سے دبائے گویا بہت ہی

مکملت میں ہے)

ک۔ (اسے خوش کہتے ہوئے) اچھا ہو گا، خیر بڑے بچے: آج تو تمہاری حالت ہر روز سے زیادہ خراب معلوم ہوتی

ہے، کیا بات ہے؟ گاڑی میں اس قدر درست اور رنجیدہ کیوں بیٹھے رہے؟

ی۔ م۔ وہ کچھ نہیں، میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ گاڑیاں کو کرایہ کتنا دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا سوچنا

عص بیوقوفی ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ چیزیں میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہیں اور میں

اجنبی لوگوں سے ملنے جلنے میں کس قدر لاگ الگ جان چھپانے پھر رہا ہوں، جلدی اور خجستگی ہے لیکن اب

وہ تو سب قصہ ختم ہو گیا گاڑیاں خوشی سے کس قدر پھول گیا تھا اور کس ادب سے اس نے اپنی ٹوپی

اٹھائی جب اریل نے اسے دو شلنگ دئے ہیں تو دس دینے والا تھا۔

(ماریل اٹھ داپس آتا ہے چند خطوط اور اخبار ہاتھ میں جو ابھی دوپہر کی ڈاک سے آئے ہیں)

ک۔ ارے جیس، ڈیر اریو جیں گاڑیاں کہو دس شلنگ دینے جا رہا تھا۔ دس شلنگ صرف تین چار منٹ کے کرایہ کے لئے! اوہ، ڈیر!

م۔ (میز پر سے اپنے خطوط دیکھتے ہوئے) مارچ بینکس! ان کے کہنے کا تم خیال نہ کرو زیادہ دینے کی طبیعت بہتر ہے بلنبٹ کم دہی کے یہ آج کل بہت شاذ ہوتی ہے۔

می م۔ (نا امید ہوتے ہوئے) نہیں، یہ سب شخص بزدلی اور کمزوری ہے۔ مسٹر ماریل بالکل حق بجانب ہیں۔

ک۔ ماں واقعی میں! اپنا ہنڈ بیگ اٹالیتی ہے، چامیں تمہیں جیس کے پاس فی الحال چھوڑے جاتی ہوں میرا خیال ہے کہ تم اس قدر کافی شاعر ہو کہ شاید ہی محسوس کر سکو کہ ایک عورت میں اکس دن بعد اپنے گھر واپس آتی ہے تو اسے اپنا گھر کیسا گستا ہے! وہ میرا کبل کا ہنڈل تو اٹھا دو (یو جین، وہ پارل کونج سے اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے، وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیتی ہے اور بیگ دائیں ہاتھ میں، اچھا اب میرا لبادہ میرے ہاتھ پر لٹکا تو دو! وہ ایسا ہی کرتا ہے) اور میری بیٹ! وہ ہیٹ کو رنگ والے ہاتھ میں دیتا ہے، اچھا اب میرے لئے دو واڑہ تو کھول دو (وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دو واڑہ کھول دیتا ہے) شکریہ! (وہ باہر چلی جاتی ہے اور مارچ بینکس دو واڑہ بند کر لیتا ہے)

م۔ (اب بھی اپنی میز پر نشوون ہے) تو مارچ بینکس تم کھانا کھا کر جاؤ گے سمجھ گئے؟

می م۔ (گہرا کر) نہیں اب مجھے رکنا نہیں چاہئے (وہ ماریل کی نظروں کی طرف جلدی سے دیکھتا ہے لیکن اس کی سر ہائی کی نظروں بچا جاتا ہے اور نہایت ہی گویا میں کہتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ میں رک نہیں سکتا۔

م۔ تمہارا مطلب یہ کہ تم کو گئے نہیں؟

می م۔ (غور سے) نہیں۔ میں رکنا تو ضرور قطعی۔ شکریہ، بہت بہت لیکن۔ لیکن

م۔ لیکن لیکن لیکن لیکن! اگر تمہیں رکنا ہے تو رک جاؤ۔ اگر خرم معلوم ہوتی ہے تو جاؤ! وہ ذرا پارک میں دو ایک چکر لگاؤ۔ ڈیر، بچے تک خوب شاعری کر دو پھر اس کے بعد چلے آؤ اور خوب بیٹ بھر کے کھانا کھانا

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کرتا لیکن مجھے واقعی ایسا کرنا چاہئے؟ اہل یہ ہے کہ مجھ سے سفر ماریل نے کہا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ سفر ماریل تم کو کھانا کھانے کے لئے روکیں گے لیکن اگر روکیں تو تم نہ رکنا کیونکہ وہ جی سے نہ کہیں گے (بھڑائی ہوئی آواز سے) انہوں نے کہا تھا کہ تم سمجھ جانا لیکن میں سمجھ ہی نہیں پاتا ہوں کہ اب جیسا آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے رکنا چاہئے کہ نہیں لیکن آپ مہربانی سے ان سے نہ کہئے گا کہ میں نے آپ سے یہ بات کہدی۔

م۔ (ہنسی سے ہنستے ہوئے) ادو، بس اتنی سی بات ہے، تو بس اب تم میرا ہی کھانا لو کہ ذرا پارک میں دو چار چکر لگاؤ تمہاری دقت رفع ہو جائے گی

ی م۔ کیسے؟

م۔ (ہنسی کے اسے لٹ پٹ ہوتے ہوئے، بڑے گدھے ہو) لیکن اس قدر صفائی خود اسے اور یو جین کو ناگوار معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے گھر کو لکھتا ہے، نہیں میں اس طرح نہ کروں گا۔ (دو یو جین کے پاس نہایت بزرگانہ مہربانی سے آتا ہے) پیارے لڑکے ہم دونوں کی سی پرست شادیوں میں بیوی کا گھر واپس آنا نہایت متبرک حقیقت رکھتا ہے (راج جیکس جلدی سے اس کی طرف دیکھتا ہے کچھ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے) اگر کوئی پرانا ماسٹی یا حقیقت کوئی واقعی ہمدرد ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن کبھی کبھی کا آنے والا ایسے موقعوں پر حاج ہوتا ہے۔ (یو جین کو جس بات کا ذکر تھا وہی کسی جاتی ہے چنانچہ اس کا چہرہ اس بات کو سمجھ کر ڈر جاتا ہے لیکن ماریل اپنے خیالات میں جو اس بات کو محسوس نہیں کرتا اس کے جاتا ہے، کینڈا نے یہ خیال کیا کہ شاید میں تمہاری موجودگی یہاں پسند نہ کروں لیکن اس نے غلطی کی میں تمہیں بچھا چاہتا ہوں چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی دیکھ لو کہ ہساری ازدواجی زندگی کس قدر پرست ہے۔

ی م۔ پرست؟ تمہاری شادی تمہارا ایسا خیال ہے؟ آپ کو اس امر کا یقین ہے؟

م۔ (خوشی سے) لڑکے میں اسے قطعی جانتا ہوں (لارڈشی فو کا لڈ نے لکھا ہے کہ اکثر شادیاں غنیمت ہو جاتی ہیں لیکن پرست شادی کوئی نہیں ہوتی لیکن تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کس خوشی سے ایسے چھوٹے، مسکرا کی افتر پردازی دیکھتا ہوں) اہا، اچھا اب تم پارک جاؤ، اپنی نظم لکھو۔ پورے ڈیڑھ بجے آ جانا۔ اچھی طرح سمجھو

کہ ہم انتظار نہیں کیا کرتے۔

ی م۔ (غصہ سے) نہیں ذرا رک جائیے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے کھلاؤں گا۔ تھلی۔

م۔ (متنب ہو کر) آئیں! آؤ کیا چیز کھلاؤ گے؟

ی م۔ میں ضرور رکوں گا۔ ایک بات ایسی ہے جو ہمارے آپ کے درمیان قطعی طے ہو جانا چاہئے۔

م۔ (اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) ابھی؟

ی م۔ (نہایت جوش سے) ابھی قبل اس کے کہ آپ کمرے سے باہر جائیں (وہ چند قدم پیچھے ہٹتا ہے) گویا کہ ماریل کو

دروازہ کی طرف جانے دینا نہیں چاہتا،

م۔ (غیر حرکت کئے۔ نہایت سنجیدگی سے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ واقعی کوئی خاص بات ہے) میں ابھی جاتا نہیں ہوں میاں

صاحبزادے بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ تم جا رہے ہو (یوہین اس کے پختہ لہجہ سے اور بھی مشتعل ہو جاتا ہے) لیکن

مارے غصہ کے لالچ رہا ہے اور اس کی طرف بیٹہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماریل اس کے پاس جاتا ہے اور اپنا

ہاتھ اس کے کاندے پر نہایت محبت سے لیکن جا کے دکھتا ہے اور اس کا کچھ خیال نہیں کرتا کہ وہ اس کے چائے

کی کوشش کرتا ہے، کیا بات ہے میاں! اطمینان سے بیٹھ تو جاؤ اور پھر بتاؤ کہ آخر تم کیا ہیرو یا درکھو کہ ہم لوگ

تو آپہنچا مصمت دوست ہیں اس لئے ایک دوسرے کی بات صبر و توجہ سے سنیں گے وہ خواہ کچھ ہی

کیوں نہ ہو۔

ی م۔ (گھوم کر منہ سامنے کرتے ہوئے) انہیں میں کچھ سمجھ بھول نہیں رہا ہوں نہیں صرف اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے

چھپاتے ہوئے، ڈور رہا ہوں! ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے اور اپنے منہ کو اوپر کی طرف نہایت غصہ سے بڑھاتے

ہوئے اور چیخ کر کہتے ہوئے، تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ وقت صبر و توجہ کا ہے کہ نہیں! (ماریل بالکل

پتھر کی طرح مضبوط ساکت بیٹھا اس کی طرف نہایت مہربانی سے دیکھ رہا ہے) مجھے ایسی مطمئن نظروں سے نہ

دیکھو تم شاید سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ لیکن اگر تمہارے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو

میں تم کو چکرا دوں گا۔

م۔ (نہایت بے رحم خود اعتمادی سے) مجھے پکڑا دو گے! صاحبزادے بولو تو آخر کس طرح؟

ی م۔ پہلی بات تو یہ کہ۔

م۔ ہاں، پہلی بات تو یہ کہ؟

ی م۔ کہ میں تمہاری بیوی سے محبت کرتا ہوں۔

داریل کچھ زکنا ہے اس کے بھائی کو بھرا اس کی طرف مکتا رہتا ہے اور پھر اس کے بعد ناقابل برداشت

نہی کے اسے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ یوہین چونک پڑا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا اور جسدی

قصدا اور حقارت سے بھر جاتا ہے)

م۔ (بٹیتے ہوئے تاکہ اپنی ہنسی کو ختم کرے) ہاں ہاں! میرے پیارے بچے تم کو واقعی اس سے محبت ہوگی

ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے بلکہ لوگ مجبور ہیں اس سے محبت کرنے کے لئے اور مجھے یہ چیز پسند

ہے لیکن اس کی طرف نہایت خوش مزاجی سے دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں یوہین کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا

معاہدہ ایسا ہے کہ ہر کسی سے کہا بھی جائے؟ تم ابھی برس برس کے بھی نہیں ہوئے اور وہ تمہیں کے اوپر

بے کیا درمل تمہاری محبت ایسی نہیں معلوم ہوئی گویا طفلانہ محبت ہو؟

ی م۔ اگرچہ کہ کیا تم اس کے متعلق ایسے الفاظ کہہ سکتے ہو! وہ جس محبت اور جس جذبہ عشق کو پیدا کرتی ہے۔ آ

ان الفاظ سے تعبیر کرنا اس کی ہتک کرنا ہے۔

م۔ (نہایت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اور بالکل بدلے ہوئے لہجہ میں) اس کی ہتک! یوہین! ذرا سوچ

سمجھ کر بات کرو، ابھی تک میں خاموش رہا اور مجھے امید ہے کہ خاموش رہوں گا۔ لیکن چند باتیں ایسی

ہیں جن کی میں قطعی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھ کو اس بات پر مجبور نہ کرو کہ میں اپنا برتاؤ تمہارے ساتھ

بالکل دیا رکھوں جیسا کہ ایک بچہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ آدمی نمذ! آدمی تم اب بچہ نہیں ہو۔

ی م۔ (باتہ کی ایسی حرکت سے گویا وہ چند چیزوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہے) ادھر! یہ سب نقص اور بناوٹ چھوڑو

میری روح کانپ جاتی ہے جب میں سوچتا ہوں کہ اس کو اتنے برس اسی قسم کی مصنوعی اور بناوٹی باتیں

سننے میں برداشت کرنے پڑے جبکہ تم اپنی خود بینی اور آرام کے لئے اپنی اغراض پر اندھا دھند اس کو

بے نیٹ پر مانتے رہے۔ تم اس کی طرف منہ کرتے ہوئے جس کا ایک خیال ایک احساس بھی اس کے

خیالات و احساسات سے لگا نہیں کھاتا۔

م۔ فلسفیانہ طور پر لیکن وہ ان سب باتوں کو اطمینان سے برداشت کر لیتی ہے (اس کے چہرے کی طرف بالکل سامنے دیکھتے ہوئے) یوحین، پیارے لڑکے تم محض اپنے کو بیوقوف بنا رہے ہو، بہت ہی بیوقوف۔ یہی لفظ تمہارے بالکل صحیح ہے اور اس وقت تمہارے حسب حال بھی۔ اس بات کو اپنے پرانے طریقہ یعنی سر کو جھکا کر کہتا ہے اور اشدان کے قریب چٹائی پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ سینکے لگتا ہے۔

ی م۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب میں جانتا نہیں ہوں، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ چیزیں جن کے متعلق لوگ اپنے کو بیوقوف بنالیتے ہیں، وہ ان چیزوں کی بہ نسبت جن کے متعلق لوگ اپنے کو عقلمند بنائے رکھتے ہیں کم صحیح یا کم بچی جوتی ہیں؟ (ماریل کا اطمینان پہلی مرتبہ غائب ہوتا ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے متحیر ہو جاتا ہے، اپنے ہاتھ سینکنا بھول جاتا ہے کھڑا سستا رہتا ہے جو کتنا۔ اور سوچ میں) بلکہ وہی چیزیں زیادہ بچی اور حقیقی جوتی ہیں۔ تم اپنے کو بہت خاموش اور متعل اور اپنے کو بہت عقلمند بنائے ہوئے ہو۔ کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ میں تمہاری بیوی کیسے متعلق بے وقوف بنا ہوا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ بڑھا شخص جو ابھی یہاں تھا نہایت عقلمند تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ تم سوشلزم کے متعلق نہایت بیوقوف بنے ہوئے ہو۔ ماریل کی پریشانی نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے۔ یوحین اپنی بات بڑھتی دیکھ کر گنگنا رہتا ہے اور اس پر سوالات کی بوجھا ڈکڑ دیتا ہے، کیا اس سے تمہیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کہ نہیں، کیا یہ آپ کی انتہائی متانت اور ظاہری سکون اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں؟

م۔ مارچ میکس شیطان تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا کر رہا ہے۔ ایک شخص کے جذبہ خود اعتمادی کو متزلزل کر دینا بہت آسان بات ہے۔ نہایت ہی آسان، لیکن اس سے فائدہ اٹھانا آدنی کی روح کو برا کر دینا یہ شیطانی کام ہے۔ اس لئے غور کرو اور دیکھو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔

ی م۔ (دشستہ سے) میں جانتا ہوں میں جو کچھ کر رہا ہوں میں یہ دیدہ و دانستہ کر رہا ہوں میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں جکرا دوں گا (دھڑلایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں اور ایک لمحہ تک

حریفانہ بھگاہیں بدلتی رہتی ہیں اس کے بعد اریل کو اپنی عظمت کا پیرا احساس ہوتا ہے

م- (نہایت شریفانہ نہایت وعظمت کے لہجہ میں) یوحین سنو کسی نہ کسی دن مجھے امیر کیا قطعی یقین ہے کہ تم بھی میری طرح ایک نہایت خوش و مطمئن آدمی ہو جاؤ گے (یوحین نہایت بے چینی سے پھر رہا ہے جیسے کہ وہ چوکی اور اطمینان سے قطعی افسانہ میں رکھتا۔ اریل اس پر بڑی ذلت محسوس کرتا ہے لیکن پھر بھی نہایت خوبصورتی سے اپنے کو قابو میں رکھتا ہے، منتقل مزاجی اور نہایت خوبی سے اپنے طرز تقریر کو قائم رکھتا ہے) تمہاری شاگرد ہو جائے گی اور تم اپنی تمام کوششوں سے، دنیا کے چپے چپے میں اپنے گھر کی ایسی خوشی و مسرت پھیلانے کی کوشش کرو گے۔ دنیا کو جنت بنانے والوں میں سے ایک تم بھی ہو گے ممکن ہے تم مجھ سے بھی بڑھ جاؤ اور ایک بڑے تعمیری شخص بنکلو اور میں محض ایک معمولی مسافر تم ابھی نوجوان ہو لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم میں خوبیاں اور لیاقت مجھ سے بڑھ کر ہیں۔ تم شاعر ہو اور شاعری کے اندر خدا اپنی تمام الوہیت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس وقت تم کو اتنی بڑی بات سن کر کانپ جانا چاہئے یہ سوچ کر کہ ایک بہت بڑا بار امانت تم کو اٹھانا ہے اور اتنے بڑے عطیہ کا حامل ہونا ہے۔

می- (بغیر متاثر ہوئے اور بیدار روی سے۔ اس کے لڑکپن کا بے ڈمگ جوش اریل کی بلاغت کے سامنے ایک وضع تضاد پیش کرتا ہے) میں اس بات کو سن کر نہیں کاٹتا۔ البتہ جب اس الوہیت کے فقدان کو دوسروں میں دیکھتا ہوں تب البتہ کانپ جاتا ہوں۔

م- (اپنی نصاحت و بلاغت کو دو آتشہ کرتے ہوئے سچے جوش اور یوحین کی ضد سے متاثر ہو کر) اچھا اگر ایسا ہی ہے تو وہ الوہیت ان لوگوں میں، مجھ میں پیدا کر دو اسے ختم کرنے کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ آئندہ جب تم بھی اتنے ہی خوش ہو جاؤ گے جتنا کہ میں ہوں تو میں تمہارا دینی بھائی بن جاؤں گا۔ میں تم کو اس اعتقاد میں مدد دوں گا کہ خدا نے ہمیں ایک دنیا دی ہے جسے ہم محض اپنی جو قوتی کے باعث جنت نہیں بنا پاتے۔ میں تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہارا فضل خوشی و مسرت کے بیج بوز رہا ہے اور جس سے تمام دنیا معمولی لوگ بھی رہتی دنیا تک فائدہ و مسرت اُٹھاتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں تم کو تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہاری بوری تم سے

محبت کرنی ہے اور تمہارے گھر میں نہایت خوش و خرم ہے۔ اپج ہینکس ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کی رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے بلکہ بے انتہا رہتی ہے اور ہمیشہ۔ ذیسا میں بہت سی چیزیں اور باتیں ایسی ہیں جو ہیں شک میں ڈالنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں اگر ہم ذرا سی ڈھیل دیں تو یہ ہم پر فزایورش کر دیں گی۔ اپنے گھروں میں بھی ہم ایسے رہتے ہیں جیسے کسی میدان میں خیمہ ڈالے پڑے ہوں اور چاروں طرف شک کی فوجیں گھیر ڈالے ہوئے ہوں۔ کیا تم ننداری کر کے ان فوجوں کو میرے گھر میں داخل کر کے مجھے تباہ کر ڈالو گے؟

ی۔ م۔ (دھشت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے) کیا وہ اسی طرح کے نفلی گرو کر کے دھندے تمہارے ہاں سا کرتی ہے ایک عورت جس کا دل اعلیٰ، داغ اور جن کی روح حق پہچانی اور آزادی کی طلبگار ہو اسے تشبیہ و استعارات، وعظ، فرسودہ تقریروں اور محض تسانی کے خانی گھنٹ دے جاتے ہیں کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ عورت کی روح محض ان تقریروں پر زندہ رہ سکتی ہے؟

م۔ (جل کر) اپج ہینکس ابھی تک تو میں کچھ بلا نہیں لیکن اب تم مجھے بے اختیار کئے دے رہے ہو میری لیاقتوں میں اسی قدر حقیقت موجود ہے جتنی کہ تمہاری لیکن اظہار حقیقت کے لئے صحیح اور مناسب الفاظ مہیا کرنا یہ ایک عطیہ فطری ہوا کرتا ہے۔

ی۔ م۔ (غصہ سے) یہ محض چرب زبانی کا عطیہ ہے اور کچھ نہیں۔ تمہاری لغائی کے عطیہ کو حقیقت بیانی سے کیا نسبت اور اگر ہے تو بس اسی قدر کہ جتنا ایک باجہ بجالے کے لئے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے میں تمہارے گرجے میں کبھی نہیں گیا ہوں لیکن میں تمہارے سیاسی جلسوں میں گیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ واقعی تم مجمع کو اس قدر متاثر کر لیتے ہو گو یادہ سب شراب پیئے ہوئے ہوں اور ان سب کی بیویاں اپنے اپنے شوہروں کا منہ تکتی رہتی ہیں کہ یہ کس قدر بیوقوف ہو گئے ہیں۔ ان خوب یاد آیا یہ قصہ تو پورا ہے تم کو انجیل میں بھی مل جائے گا۔ وہ یہ کہ داؤد علیہ السلام کو جوش برانگیختہ کرنے میں تمہاری طرح کمال حاصل تھا لیکن نہایت زور دے کر کہتے ہوئے ان کی بیویوں میں ان سے نفرت کرتی تھیں۔

م۔ (بڑے غصہ سے) اچھا، میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ، اس تم نے! وہ اس کی طرف نہایت غصہ سے بڑھتا ہے

می۔ مومن سے چپکے ہوئے، مجھے چھوڑ دو۔ مجھے صحت چھوڑ دو، ماربل نہایت مضبوطی سے اس کے کوٹ کا کارکچر ہے۔ یوہین مومن میں ایک جاتا ہے اور دوسرے جینے لگتا ہے، چھوڑ دو ماربل، دیکھو اگر تم نے مجھے ارا تو میں اپنے کو مار ڈالوں گا میں اسے برداشت نہیں کر سکتا (منہ بدست ہوئے) مجھے جانے دو۔ ہٹاؤ اپنا ہاتھ!

م۔ (حقارت سے) بہت لیکن زور دے کر کہتے ہوئے (بزدل، رونا پلا) اسے چھوڑتے ہوئے (جاقبل اس کے کہ تو ڈر کر رونے لگے۔

می۔ مومن پر گہری سانسیں لیتے ہوئے لیکن ماربل کی دست کشی سے مطمئن ہو کر، میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ دراصل تم مجھ سے ڈرتے ہو۔

م۔ (انایت، اطمینان سے اس کے سر پر کھڑے ہوئے) یہ تو ظاہر ہی ہے، بالکل صاف ظاہر ہے۔ یہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔

می۔ (بہم چڑھاتے ہوئے غصے سے) ہاں یہ بالکل صاف ظاہر ہے (ماربل حقارت سے منہ پھیر کر آگے بڑھتا ہے۔ یوہین وحش کر کے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے جاتا ہے) تم یہ سمجھتے ہو چونکہ میں مار کھلنے سے ڈرتا ہوں (آواز دہرائی) ہر جاتی ہے چونکہ میں کچھ کر نہیں سکتا سوائے اس کے کہ میں، دو دوں جب میرا مقابل کوئی طاقتور شخص ہو جائے۔ چونکہ میں گاڑی کی چھت سے اتنا بڑا اور بھاری بنڈل نہیں اٹھا سکتا جتنا کہ تم اٹھا سکتے ہو چونکہ ایک مہریش مزدور کی طرح تمہاری بیوی کی خاطر تم سے لڑا نہیں سکتا۔ ان سب باتوں سے تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے ڈھٹا ہوں لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ اگرچہ مجھ میں جسے تم بولناؤ ہی ہمت کہتے ہو نہیں ہے تو مجھ میں بولناؤ ہی بزدلی بھی نہیں ہے میں ایک پادری کے خیالات کو شکست دیدوں گا۔ قطعی اور فاش۔ میں خود اپنے خیالات ان کی جگہ قائم کروں گا اور اس کو تمہارے خیالات کی غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ تم مجھے گھر سے باہر نکال دے رہے ہو اس لئے کہ تم اسے میرے اور اپنے خیالات میں اپنی مرضی کے مطابق پسند کرنے کی اجازت اور آزادی دینا نہیں چاہتے اور اسی ڈر کی وجہ سے اب مجھے اس سے ملنے نہیں دینا چاہتے ہوں ذلیل غصہ سے ایک دم اس کی طرف مڑ پڑتا ہے۔ یوہین مارے ڈر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے مجھے چھوڑ دیجئے میں جا رہا ہوں۔

م۔ (حقارت آمیز نفرت سے) نہیں، تمہاری دیر رک جاؤ اب میں تمہیں چھوڑوں گا بھی نہیں، ڈر و دست۔ جب میری

بیوی واپس آئے گی، وہ مجھ سے پوچھے گی کہ تم کیوں چلے گئے اور جب اس سے کہنا جائے گا کہ اب تم کبھی ہمارے دلیزیر قدم نہیں رکھ سکتے تو وہ پوچھے گی کہ کیوں؛ پھر مجھے تشریح کرنا ہوگی اور میں تمہارے باجی بن کا قصہ سنا کر اسے نگلیں کرنا نہیں چاہتا۔

ی م۔ اتنا دوش سے بھر داپیں آتے ہوئے، نہیں ہم کو بتانا چاہئے، بلکہ بتانا ہوگا اور اگر تم ذرا بھی جھوٹ بولے تو میں تمہیں نہایت بزدل جھوٹا اور فریبی بھوں گا۔ اس سے وہی کہنا جو کچھ میں نے کہا ہے اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے اپنی طاقت اور پامردی دکھا کر مجھے ایسا خنجر بڑا کر بیسے کہنا چوہے کو جس خنجر بڑا ہے اور کس طرح میں دیکھ گیا اور ڈر گیا، اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے مجھے بزدل رو دنا اور کہتے کا پلٹا بنایا اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ اگر یہ سب اس سے نہ کہو گے تو میں خود کدوں کا بلکہ اسے سب حالات لکھ کر بھیج دوں گا۔

م۔ (دیرانی ہو کر) یہ آخر تم یہ سب باتیں کیوں اسے بتانا چاہتے ہو؟
 ی م۔ اشعار نہ بٹاشت کے ساتھ کیونکہ وہ مجھ کو سمجھ جائے گی اور یہ بھی سمجھ جائے گی کہ میں بھی اس کو سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی اسے بتانے میں چھوڑا، اگر تم حرف بھرت سچا تو اس کے سامنے رکھنے کے لئے تیار نہیں ہو جیسا کہ میں چاہتا ہوں تو سمجھ لو کہ آخر زندگی تک تمہیں اس کا احساس رہے گا کہ وہ مل وہ میسری ملکیت ہے نہ کہ تمہاری بس خدا حافظ! (جلتے ہوئے)

م۔ (نہایت پریشان ہو کر) رکو! میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔
 ی م۔ (دردازہ کے قریب گھومتے ہوئے) بہر حال جب میں چلا جاؤں گا تو تم اس سے کچھ تو کہو گے ہی۔ (پانچ کو گئے یا جھوٹ۔ بہر حال دونوں میں میرا فائدہ ہے۔)

م۔ (مساحت کے لہجے میں) ہائیکس ابا اوقات صلحت کا اتفاق نہ ہوتا ہے۔
 ی م۔ (بات کاٹتے ہوئے) ہاں میں جانتا ہوں کہ جھوٹ بولا جائے لیکن یہ سب بیکار ہوگا۔ خدا حافظ پادری۔
 (جیسے ہی یوحین جانے کیلئے دروازہ کھوتا ہے۔ ادھر سے کینڈا آ جاتا ہے جو گھر کے کام کاج کا لباس پہنے ہوئے ہے،)

ک۔ یوحین کیا علیحدے ہو (اس کی طرف بہت غور سے دیکھتے ہوئے) اؤ۔ خدا کی پناہ ذرا اپنی حالت تو دیکھو اس

حالت میں باہر جا رہے ہو۔ واقعی تم بڑے شاعر ہو جس ذرا اس کو دیکھو تو وہ اس کے کوٹ کا کارڈ پکڑ کر اس کے سامنے لاتی ہے اور ریل کو دکھلاتی ہے، ذرا آپ کا کارڈ دیکھئے، ٹائی دیکھئے اور ذرا بالوں کی حالت دیکھئے کوئی دیکھے تو کہے کہ خدا غواستہ جیسے کسی نے گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے ایہیں اب ریل کے چرو کی حالت دیکھئے کی کوشش کرتا ہے لیکن کینڈڈا سے پھر گشتی ہے، جس اب ذرا سیدھے کھڑے رہو، چپ چاپ اداس کے کوٹ کے ٹن ایک ایک کر کے بند کرتی ہے ٹائی کی گروہ باندھتی ہے اور بالوں کو سہاڑتی ہی ہاں، اب تم ٹھیک معلوم ہوتے ہو ایک اچھے لڑکے کی طرح۔ ایسے کہ اب میں تم سے کہہ سکتی ہوں کہ بہتر یہ ہے تم ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر جاؤ۔ حالانکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ یہاں نہ کرنا کھانا اس آدھ گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ وہ اس کی ٹائی کی لڑکھو بازی ٹھیک کرتی ہے اور یہیں اس کا ہاتھ چوم لیتا ہے، ادھر، یو توئی کی باتیں نہ کرو۔

ی۔ م۔ میں یہ کتنا واقعی چاہتا ہوں اگر آپ کے شوہر صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔
ک۔ جیسے اگر یو جین ایک اچھے لڑکے کی طرح رہنے کا وعدہ کرے اور میرے کام میں مدد دے تو اس کو رکنے کی اجازت ہے،

م۔ مختصر اہاں ہاں ضرور وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنے کاغذات مشغول ہونے کا ہاتھ کرتا ہے،
ی۔ م۔ اپنا بازو کینڈڈا کی طرف بڑھاتے ہوئے، آئیے میز پر کھانا چن دیں (وہ اس کا بازو قبول کر لیتی ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں جب باہر جاتے ہیں تو یہ جین کہتا ہے) اس وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ مسرور شخص ہوں۔

م۔ میں بھی تھا۔ ایک گھنٹہ ہوا۔ (بیکردہ) (باقی آئندہ)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

شاعر خدا کے حضور میں

شاعر

اے اللہ العالمین!

اے کہ تجھ سے رفتی روئے فلک، روئے زمیں! اے کہ تیرے نور سے روشن ہے گیتی کی جہیں!
اے کہ پسائے دو عالم ہے ترے زیرِ نگین! اے مرے مسبود! کوئی بھی ترا ہمتا نہیں!!
اے اللہ العالمین!

اپنے درد و غم کا تجھ سے اجرا کہنے کو ہوں روح پر جو جھیلتا ہوں بر ملا - کہنے کو ہوں
جانے اب حرفِ ردا یا نارد ادا کہنے کو ہوں خون میں ڈوبا ہوا ہے میرا حوتِ آنشیں
اے اللہ العالمین!

لعل دیا قوت و گہر سرمایہ داری کیسے مخلوق کی زر نگاری ہنمرباری کیسے
حور و غلمانِ اہرن کی پیش کاری کیسے تیرے بندوں کے لئے آبِ خنک ناں جو ہیں
اے اللہ العالمین!

عشر تیں ہی عشر تیں ہیں اہرن کے واسطے جنتیں ہی جنتیں ہیں اہرن کے واسطے
تیری ساری نعمتیں ہیں اہرن کے واسطے جو بچاری ہیں ترے ان کے لئے کچھ بھی نہیں!
اے اللہ العالمین!

اہل حق کے واسطے زخمِ جگر، رنج و محن! اہل حق کے واسطے زندان ہے یا دارِ درس!
اہل حق کی منتیں ہیں خواہ بے گور و کفن! کلوے کلوے کیوں نہ ہو جائے دل اند و گفن!
اے اللہ العالمین!

بے کسوں کے پاس محنت کے سوا کچھ بھی نہیں ان کی قسمت میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اک تری رحمت کی حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ڈرے یہ بھی تجھے برگشتہ نہ ہو جائیں کیں!!

اے اللہ العالمین!

غمزوؤں کی سرد اور خاموش آہوں کی قسم
تیری خاموشی کی تیرے دادخواہوں کی قسم
پسکی پسکی صورتوں، نگین نگاہوں کی قسم
ڈگمگا جاتا ہے میدا بھی کبھی پائے یقین!

اے اللہ العالمین!

خدا

کارزار دہر میں شمشیر اٹھانا چاہئے
باغ ہستی میں اگر ہے شوق گل چینی تجھے
زخم بڑھ بڑھ کر لگانا اور کھانا چاہئے
خار چھینے پر بھی تجھ کو مسکھانا چاہئے
زندہ رہنے کا سبق ان کو سکھانا چاہئے
خفتہ بختوں کا ذرا شانہ ہلانا چاہئے
خود بھی گر جانے کو ہے دیوار استبداد کی
اس کو گرنے کا لگ کر کوئی ہسانا چاہئے
ریز و ریزہ ہو کے بیوند عدم ہو جانے لگی
ق ضرب کاری "نام حق" لے کر لگانا چاہئے
ابھی اور ہے حسی کا نام مذہب ہے اگر
صفوہ ہستی سے مذہب کو مٹانا چاہئے
زندگی ہی زندگی ہے، آگئی ہی آگئی
حق کو راہ زیست میں شغل بنانا چاہئے
حق ہی حق، تجھ کو نظر آنے کا ہر سو جلوہ گر
اک ذرا باطل کے پردے کو ہٹانا چاہئے
اہرمن نے کر دیا تیرا گلستاں پائمال
پھر اسی اجڑے گلستاں کو بسانا چاہئے
میں مٹا سکتا ہوں دم بھر میں وجود اہرمن
لیکن اسے شاعر! تجھے خود ہی مٹانا چاہئے

اہرمن ہو سرنگوں میری مسرت جو ہی

تیرے ہاتھوں پر گئے میری مشیت جو ہی

نغمہ شاعر

خزاں روش ہوا ہرمن کی بلند حق کا نشان رہے گا!
رہے گا جب تک ہی نقشِ ہل کا مروجہ قیخ راں رہے گا!

مری نوا بانگ صوری، ہے مری میا شمع نور حق ہے
 رہے گا وہ دور کامرانی چلے گا وہ دور شادمانی
 دلوں میں ہوگا ظہورِ نواں نصاؤں میں ہوگا نورِ نواں
 رہے گی بھل کی شہرِ باری نہ بھل بھل کی فتنہ کاری
 نہ شکستِ خواہی رہے گی نہ نجاتِ سروری رہے گی
 نہ ہوگی بے کاریوں کی کلفت نہ ہوگی ناداریوں کی آفت
 رہیں گی پامال آرزوئیں نہ راگھائیں جائیں گی وفائیں
 رہے گا دلِ شاد عشقِ دائم رہے گا شادابِ حسنِ دائم
 ادھر سے ہوگی دلعسے الفت ادھر سے ہوگا نزولِ رحمت
 رہیں گی معصوم عرشِ دالوں سے روزِ شبِ صحبتیں ہماری
 اتر کے عرشِ بریں سے ہوگا ہماری جنت میں جلوہ فرما
 شجرِ حیرتِ شب و صبح سے نجوم و خورشید سے قمر سے

ہزار ہوں باوجودِ باران، رواں مرا کارواں رہیگا
 کشاکشِ خیر و شر رہے گی، نہ فکرِ سود و زیاں رہیگا
 رہے گا نامِ اہرن کا باقی نہ اہرن کا نشان رہیگا
 رہے گا فرمانِ حق ہی جاری کہ حق ہی حق کامراں رہیگا
 نہ سطوتِ قیصری رہے گی نہ غرہِ حسکراں رہیگا
 نہ شکوہ آسماں رہے گا نہ گریہِ خونِ فشاں رہیگا
 نہ حسنِ دامنِ کشاں رہے گا نہ عشقِ گرمِ فشاں رہیگا
 رہے گا بھل کو شکوہ گل نہ گل کو خوفِ خزاں رہیگا
 نہ حق سے ہم سرگراں رہیں گے نہ ہم حقِ سرگراں رہیگا
 رہے گا کوئی حجابِ باقی نہ آسماں درمیاں رہیگا
 خدا سے حق بن کے نورِ الفت ہائے ہی درمیاں رہیگا
 سرائے گیتی کے بامِ دے سے سدا یہ نغمہ رواں رہیگا

”غلیفِ حق“ نے اہرن کو جاں سے آخرِ مٹا کے چھوڑا

اور اپنے اجڑے ہوئے گلستاں کو رشکِ جنت بنائے چھوڑا

((آترِ صبا))

ڈرائنگ روم

(سامیٹ)

یہ سینیری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں

یہ کچ ہے، یہ پاپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے

یہ ریڈیو ہے، یہ قہقہے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلہ سہ ہے

یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشاہ، یہ ملکہ ہیں؛

— ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہیں؛

— ہاں اس پر رات کو سونے سے مٹی مٹی نیند آتی ہے؛

ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے؛

بھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے۔ ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ؛

— اتنی جلدی مزدور عورت! آخر یہ گلے میں ہاں کیوں؟

لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا۔ بس اتنی محبت کافی ہے؛

اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے؛

اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں —؟؟

— میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹا پاپ کے دھوئیں کے بادل پر

میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک نخسیل کے میلے آنچل میں

(سلام مچھلی شہری)

ہمارے یتیم خانے

یتیم بچوں کی پرورش بھی قوم کا ایک اہم فریضہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی یتیم خانے موجود ہیں مگر ان کی حالت اس قدر زبوں ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ بعض لوگوں نے تو اس کو معاش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ چار پانچ اندے لے کر یتیم بچوں کو لے کر اور ایک رسید بک چھو اگر گلی گلی پھرایا جاتا ہے اور یتیم بچوں سے بھیک منگوا کر اپنا علو امانہ اسیدھا کیا جاتا ہے۔ کچھ باقاعدہ یتیم خانے بھی ہیں جن کی آمدنی کا دار و مدار کچھ وقف شدہ جائیداد اور چندوں پر منحصر ہے۔ چندہ کرنا کچھ عیب کی بات نہیں ہے مگر جو طریقہ ہمارے یتیم خانوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف میسب ہے بلکہ یتیم بچوں کی آئندہ زندگی کے لیے بھی مضر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو دو تین تین یتیم بچے چندہ کا ایک مقل بکس ہاتھ میں لے کر ریلوں کے ڈبوں میں آتے ہیں اور اپنی درد بھری کھٹانا کر مسافروں سے چندہ کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یتیم بچوں کو لے کر شہر در شہر کوچہ کوچہ پھرایا جاتا ہے۔

اگر یتیم خانوں کے اندرونی حالات دیکھے جائیں تو اور زیادہ مایوس کن ہیں نہ کوئی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے نہ یتیم بچوں کو کام کاج سے لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں نفیروں کی کثرت کا باعث خود ہمارے یتیم خانے بھی ہیں جو انھیں بچپن ہی سے بھیک مانگنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

میرے خیال میں مندرجہ ذیل اصولوں پر یتیم خانوں کی تنظیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ ایک شہر میں صرف ایک یتیم خانہ ہو جو شہر کے معزز متمول حضرات اور تعلیم یافتہ حضرات کے تحت میں چلے لوگوں کو تلقین کی جائے کہ وہ ایسے لوگوں کو جو یتیم بچوں اور بچیوں کو لے کر ان کے گھروں پر آتے ہیں ہرگز چندہ نہ دیں۔

۲۔ یتیم خانے کی ایک عمدہ خوبصورت اور کشادہ عمارت ہو جس میں بچوں اور بچیوں کے رہنے کا باقاعدہ انتظام ہو۔ عموماً یہ عمارت شہر کے باہر ہو۔ اس کے قریب کٹی و فیروہ کے پارک ہوں تاکہ بچے کھیل کو کیلے انھیں ہسٹال کیلئے

۳۔ ہمدانی کے ذرائع (۱۲) جو جامد ادا میں یتیم خانوں کے نام ہیں انھیں کمیٹی اپنے تحت میں کرے۔

(ب) اگر شہر میں ایسی مسجدیں ہوں جن کی آمدنی بہت زیادہ ہو تو ان کی منتظمہ کمیٹی کو مجبور کر کے ایک آدمہ جامد ادا یتیم خانے کے نام وقف کرا لی جائے۔

(ج) یتیم خانے کی کمیٹی کے معزز ممبران اپنی جیب سے کچھ ماہوار چندہ مقرر کر دیں لیکن یہ رقم متعین نہیں کی جائے (د) چندہ کے خوبصورت کبس جو اکثر مسلمان تاجروں کی دکانوں اور دستبول ملازم پشہ حضرات کے مکانوں میں لٹکائے جائیں تاکہ وہ روزانہ یا ہفتہ واری یا ماہواری اس میں کچھ چندہ ڈال دیا کریں۔ ہر ماہ یتیم خانہ کا ایک ملازم اس کبس میں سے باقاعدہ رسید دے کر رقم لے آئے۔

(س) عموماً شہر کی میونسپل کمیٹیاں یتیم خانوں کو کچھ رقم سالانہ دیا کرتی ہیں اسے وصول کیا جائے۔ (س) بارہا سنا ہے کہ مسلمانوں کا اکھوں رجحان جنس سود کی شکل میں ملتا ہے ہر سال عیسائی مشنریوں کو چلا جاتا ہے جس حد تک ہو سکے اس رقم کو وصول کیا جائے۔

یتیم خانے کا ہمدانی انتظام عموماً یتیم خانوں میں اس بات کا انتظام کیا جاتا ہے کہ بچوں کو کچھ قرآن شریف کی تعلیم اور کچھ لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس کے علاوہ چند یتیم خانوں میں بعض دستکاریاں سکھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے جو یہ چیزیں اپنی جگہ بہت اچھی ہیں مگر ان کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں نکل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر مندرجہ ذیل طریقہ ہے۔

(و) بجائے خود پرائمری تعلیم کا انتظام کرنے کے بچوں کو میونسپل کمیٹی کے پرائمری اسکولوں میں تعلیم دلوائی جائے۔ اس سے یتیم خانے کو خواہ مخواہ تعلیم کے خرچ کا زیر بار نہیں ہونا پڑے گا۔

(ب) پرائمری تعلیم کے بعد جو چند لڑکے خوب ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتے ہوں ان کو ہائی اسکول میں داخل کرادیں۔ ان کے کھانے اور رہائش کا انتظام یتیم خانے میں ہو۔

(ج) عموماً ہر ایک موسمے میں صوبے کی حکومت کی طرف سے دستکاری سکھانے کا مفت انتظام ہوتا ہے مثلاً دہلی میں غلہ چڑی والا نین سرکاری دست کار انسٹیٹیوٹ ہے۔ جہاں کپڑا بننا، کپڑا رنگنا، سوزہ بنانا، نواز بننا، درمی بننا وغیرہ وغیرہ کا کام مفت سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال عموماً جنوری فروری کے مہینے میں شہر کی

کھیاں پانے کے طریقہ کی تعلیم منت دی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے اس قسم کا انتظام ہوتے ہوئے یتیم خانوں کا خود بخود اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا نہ صرف فضول خرچی ہے بلکہ بچوں کے لئے مغربہ ہے کیونکہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یتیم خانے کاغذ خواہ انتظام نہیں کر سکتے صرف معمولی انتظام پر اکتفا کرتے ہیں جو بچوں کو عمدہ دستکار نہیں بنا سکتا۔ برخلاف اسکے سرکاری دستکاری انسٹیٹیوٹ میں بخوبی انتظام ہوتا ہے سخت انوس ہے کہ حکومت روپیہ صرف کرے دوسری قومیں فائدہ اٹھائیں ہم فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس واسطے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسی دستکاری انسٹیٹیوٹوں میں داخل کرایا جائے تاکہ یتیم بچے عمدہ دستکار ہو کر اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

(۷) اکثر بڑے لوگ جب کبھی کچھ بڑی دعوت کرتے ہیں تو یتیم بچوں کی دعوت بھی کر دیا کرتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یتیم خانے کے لوگ یتیم بچوں کی لین ڈوری بنا کر بازاروں میں سے گزرتے ہوئے دعوت کے مقام پر لے جاتے ہیں اس طریقہ کو بالکل بند کیا جائے کیونکہ یہ نہ صرف میسر ہو بلکہ بچوں کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہو جائے اس سوان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

(۹) اکثر بڑے کارخانوں اور یوںے درکشپ میں دس دس بارہ سال کے بچے بطور شاگردی (Apprentice) کے رکھے جاتے ہیں جنہیں چار پانچ سال تک کا زمانہ کلام سکھایا جاتا ہے۔ شاگردی کے زمانے میں کچھ اجرت بھی دیا جاتی ہے شاگردی کی مدت کے بعد انہیں وہاں پر باقاعدہ ملازم رکھ لیا جاتا ہے مثلاً حال ہی میں این۔ ڈبلیو۔ ریلوے کے درکشپ میں تین سو لاکھوں کی بطور تنخواہ دار شاگردوں کے ضرورت تھی جنہیں پانچ سال تک ٹریننگ دی جائے گی ٹریننگ کے زمانہ کی اجرت پانچ آنے یومیہ پہلے سال۔ سات آنے یومیہ دوسرے سال۔ بارہ آنے یومیہ پانچویں سال مقرر تھی۔ اس کے بعد جو وہ آنے یومیہ یا ایک روپیہ یومیہ پر انہیں باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائے گا یتیم خانوں کو چاہئے کہ جب کبھی اس قسم کے اعلانات آئیں تو کچھ بچوں کو درکشپ میں داخل کرا دیں۔ وقتاً فوقتاً یتیم خانہ کا کوئی ممبر ان بچوں کی درکشپ میں جا کر دیکھ بھال کر لیا کرے۔

۱۰۔ جو نوجوان بچے کھانے کے لائق ہو جائیں ان کی شادی کا انتظام یتیم بچوں سے کر دیا جائے یتیم بچوں کو کٹھنہ کاری اور دیگر کم بلو دستکاریاں سکھانے کا انتظام کیا جائے کچھ یتیم بچوں کو دینے کی تعلیم دلائی جائے تاکہ وہ عمدہ اور قابل دایہ بن سکیں۔

۱۱۔ اگر سرمایہ اجازت دے تو یتیم خانے کی حد دو کو سین کیا جائے یعنی یتیم خانہ نہ صرف بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا انتظام کرے بلکہ شہر کے ان غریب مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت و پرورش کا انتظام بھی کرے جو غربت کے باعث اپنے بچوں کو نہ تعلیم دلا سکتے ہیں نہ کوئی دستکاری سکھا سکتے ہیں۔

محمد یونس صاحب معلم ایم اے دہلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سوگوارِ شباب :- از جنوں گور کپوری ایوان اشاعت گور کپور، ساکنہ ۲۶/۱۰/۲۰۱۶ء صفحات ۱۳۶

یہ ایک طویل افسانہ ہے جسے مجنوں گورکھپوری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ پلاٹ ہارڈی کے ایک مشورناول سے لیا گیا ہے اور ہندوستانی ماحول میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آصف پور کا جاتم ایک جاناں جہاں گشت زمیندار سندیلہ کی ایک بڑھی لکھی خوبصورت مہذب گھرانے کی بڑی سائزہ سے شادی کر لیتا ہے اور تین سال بعد پھر رگ دیوانگی بھرتی ہے اور دو غائب ہو جاتا ہے۔ واقعات قصہ اس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب اسے لاپتہ ہوئے آٹھ سال گزر جاتے ہیں اور سائزہ اٹھارہ برس کی حدینہ سے ۲۶ برس کی پنجہ کار اور اپنی زمینداری کا انتظام کرنے والی بڑی منظم بی بی ہو جاتی ہے مشتاق اس کا ایک دو گونہ جوان رشتہ دار جو بی تعلیم صرف این۔ اے تک پوری کر کے اسے ختم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اس کی اماک کے ایک بوسیدہ اور شکستہ قدیم عمارت کو روٹ کو بی لابریری بنائے کیلئے اجازت حاصل کر لیتا ہے۔ سائزہ بھی وہاں آنے جانے لگتی ہے اور محبت کے تماشے شروع ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ تمام رومانیت اور شہریت محض ایک جذبہ (جسے جنسی جہلت کہتے ہیں) کی کرشمہ ساز یوں کا نام ہے جہاں یہ پورا ہوا عقل کو کسی طرح موقوف نہ کیا دہیں یہ جوش یہ آندھی محض ایک خوشنالیکن بے بنیاد و محکوم معلوم ہوتے لگتی ہے۔ پناہیچہ اسی تلخ حقیقت کا ظاہر کرنا مجنوں صاحب کا مقصد اولین ہے۔ واقعات کچھ ایسے پلٹا کھاتے ہیں کہ رشتہ گوارس کا چچا پھر تعلیم کے لئے بھیج دیتا ہے سائزہ کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی محبت محض ایک خود غرضی ہنہ ورنہ حقیقت مشتاق کی جائز مقدار مشتاق سے کم عمر اس کی چچا زاد بہن زمین ہے۔ اس حقیقت کا احساس اسے روکتا ہے کہ وہ مشتاق کو اپنی خود غرضی کا شکار نہ ہونے دے۔ پناہیچہ شیخ عاتم کی وفات کی خبر سن کر ایک بہت معمولی آدمی سے شادی کر لیتی ہے اور اپنی بی بیہ جائداد مشتاق کے نام لکھ دیتی ہے اور ان تمام باتوں کی اطلاع مشتاق کو دیر میں ہو

شفاق کئی سال گھر نہیں آتا اور بالابالا اعلیٰ نگلہ سے ولایت چلا جاتا ہے اور وہاں کئی سال بعد ساڑھ کے شوہر کی وفات کی خبر سن کر ساڑھ سے شادی کرنے کی غرض سے واپس آتا ہے۔ ساڑھ یہ مژدہ سنتے ہی جاں بحق ہو جاتی ہے۔

مجنوں صاحب میں رومانیت زیادہ ہے اور ہارڈی کی سی توفیت بہت کم ہے۔ اسی لئے اس افسانے میں وہ پہلو کمزور ہیں جاں قدرت کی سفاکی اور ہیر جی جتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھی مقامی حالات کی کم واقفیت نے اس ناول کو ایک رومانی دنیا میں ہی رکھا ہے اور ہارڈی کی طرح مفصل مقامی رنگوں کی تشریح سے جو زیارت پیدا ہو جاتی ہے وہ اس میں کثر پائی جاتی ہے۔ اس کا بہت کچھ ذمہ دار مجنوں صاحب کا نفیلت ناشاعرانہ خطاب کا اسلوب بھی ہے لیکن تھاکر وہ چیز پیدا ہو جاتی اگر یہ افسانہ ناول کی شکل میں مفصل لکھا جاتا اور اسی اختصار کی وجہ سے ہارڈی کی طرح قدرت کے سامنے اُس بے بسی کا اظہار نہیں ہو پاتا جس میں انسان گرفتار نظر آتا ہے۔ البتہ مصنف کا مقصد واضح ہو گیا ہے کہ تام شغریٰ اور رومانیت محض ایک جذبہ جنسی کی کرشمہ ساز یوں کا ایک رنگین خواب ہے اور بس۔ اردو داں طبقے کی رومانیت سے حد سے زیادہ انہیں کیلئے تو یہ اچھا زہر ہے ورنہ شغریٰ بھی اپنی اقدار رکھتی ہے۔ امید ہے کہ مجنوں صاحب کا یہ افسانہ بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

شہر مخوشاں :- از سید محمود مورخ بی۔ اے گلگندوش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ساڑھ ۳۱۲ صفحات ۱۱۵ قیمت ۷۰ کاغذ کتابت و طباعت معمولی۔

یحمود صاحب کے سات سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ ہے شروع میں شاہد صاحب مدیر سانی کا ایک مختصر تعارف نامہ بھی ہے۔ سائنٹفک افسانوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ افسانے فرضی سائنس کے مفروضوں پر مبنی ہیں مثلاً کسی کو آبِ حیات مل گیا ہے اور کوئی نظروں سے غائب ہونے کے راز سے واقف ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے فرضی سائنس کی کمائیاں محمود صاحب نے عوام کی تفریح طبع کے لئے لکھی ہیں اس لئے انہیں ہر جہت میں افسانے نہ سمجھا جائے بلکہ ظلم ہو شراکی سی کمائیاں۔ جن لوگوں کو دلچسپی ہو اور جو دنیا کے کاروبار اور مٹی تین سے لمحہ بہ لمحہ کے لئے آزادی حاصل کر کے ایک خیالی و فرضی دنیا میں پھونچ جانا چاہتے ہوں وہ ضرور پڑھیں۔ قیمت ۷۰ کاغذ زیادہ

جامعہ

ذی زاداد۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۵ - نمبر ۲ | بابۃ ماہ اگست ۱۹۲۱ء | چند لائبریری پرچہ

فہرست مضامین

- | | | |
|-----|---------------------------------|---------------------------|
| ۷۹ | عبدالقیوم خاں صاحب باقی | ۱- اقبال (غنائی تمثیل) |
| ۹۸ | م۔ م جوہر صاحب میرٹھی | ۲- علامہ اقبال کا فلسفہ |
| ۱۰۸ | ضیاء الدین احمد صاحب الدہ آبادی | ۳- جدید تعلیمی نظریہ |
| ۱۱۶ | سید احمد علی صاحب | ۴- تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟ |
| ۱۲۲ | مترجمہ نور الحسن ہاشمی | ۵- بھید (ڈرامہ) |
| ۱۴۸ | سروش عسکری طباطبائی بی۔ اے | ۶- دہر آشوب (نظم) |
| ۱۵۰ | فضل حسین صاحب کیف | ۷- نوائے سحر (رباعیات) |
| ۱۵۱ | آتش کفنوی مرحوم | ۸- شے کہنہ |
| ۱۵۲ | فراق صاحب گورکھپوری | ۹- غنزل |
| ۱۵۳ | | ۱۰- تنقید و تبصرہ |

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کے
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں منظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

اقبال

مردوں زیرِ گنبد در بستر پیدا کردہ ام را ہے کہ از اندیشہ برتری پر دآہ سحر گاہ ہے
پس از من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند جہانے را دیگر گوں کرد یک مرد و خود آگاہ ہے!
(اقبال)

یہ نثرانہ نظر اور خیال کا ایک سفر ہے جو کلامِ اقبال کی روشنی میں بارگاہِ تجلی تک کیا گیا ہے
اس میں میں نے اقبال کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام و کمانے کی کوشش کی ہے
اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کو دیکھنے اور دکھانے کے غماز پہلو ہو سکتے ہیں نے ان میں سے دسی
پہلو لیا ہے جسے میں سب پر حاوی اور اہم سمجھا۔ یہ غماز نہیں کہ فکرِ اقبال کی گہرائیوں تک پہنچنا
دشوار ہے۔ یہ شاید توفیقِ الٰہی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائی تمثیل لکھنے
کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس ”سی دشوار پسند“ پر رائے زنیوں ہوں گی لیکن اقدامِ اولین کی توفیق
سے قطع نظر اگر اس میں ناظر کو شاعرِ مشرق کا پیام نظر آجائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا

پہلا منظر

میلاد آسمانی

جنت کے ایک رنگین ترین حصہ میں جہاں شاعروں کی رومی اپنے بلند تخیل اور دلی تناؤں کو پھروں کی طرح کھلتا ہوا دکھتی ہیں اور ان کی آوازوں کے ساتھ آبیاری کر سکتی ہیں غالب کی روح ایک بلند مقام پر کھڑی ہوئی مسرور نظر آ رہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے،

روح غالب۔ نور ایوان تصور، مری نیر ویاں نگہی برق طوفان تخیلی، میری پردا ز خیال

آج آشفتمہ ہوئے گیوئے شگبون فرق آج بیتاب ہوا شاہد رنگین وصال

قابل رشک ہے انداز جنوں کا انجام ہو گیا جنت اسرار بہاں خیال

سجدہ ریزی میں ہو مصروف مری لہجہ جبر عوا آئینہ فردا ہے مراد و جہاں

ایک فرشتہ۔ ہمدرد طائر سدرہ ترے ارمان بلند رنگ بیتابی فطرت تھے دل کے احوال

دوسرا فرشتہ۔ بحر فردا پہ مچلنے لگی تیری آمید بھر گیا بادۂ الفت سے تیرا جام سفال

جنت کے پھروں کا ایک خوشنما گلدستہ ہاتھ میں لئے ہوئے روح حالی آتی ہے اور غالب کو پیش کرتی،

روح حالی۔ میرے اشکوں نے دیا تھا ہے اک رنگ مو اُس گلستانِ تنہا میں بسا ر آئی ہے

نخک تھی داوی نا شا و محبت کی زمیں آج اس دشت پر گھنگور گھٹا چائی ہے

اور منہاں یہ اسی گلزار کا لایا ہے غریب

آپ کے ہاتھ میں بیدار ہوں اور اسکے نصیب!

(سامنے سے گونسنے کی روح ایک عجیب و غریب ٹیٹہ سنباٹے ہوئے گذرتی ہے اس میں چند حین جلوے

نظر آتے بعض انسان بعض بھول بعض پریاں بعض ستاروں اور چاند سے ملتی جلتی ہیں کبھی کبھی ایک عجیب و

غریب شکل بھی اس میں سے جھانکتی ہے۔ چلتے ہوئے گونسنے کی روح غالب کو دیکھ کر مسکراتی ہے)

گونسنے کی روح۔ جام افلاک میں رقصاں مری مسکنا نظر فرش انجم پہ درخشاں مری مخلوق خیال

عشق نے توڑ دیا بند نقاب ماضی آج رنگیں نظر آتا ہے سرابر وہ حال

اپنے میں ملاحظہ اور عراقی کی رو میں اہمہ میں ہاتھ ملائے ہوئے آتی ہیں گونے کی روح ان کے لئے تھوڑا
سرسجھاتی اور گزر جاتی ہے)

حافظ۔ دوشس دیدم کہ ملائک درمیانہ زند
عراقی۔ نختیں بادہ کا ندر جام کر زند
گل آدم بہ سرشتند و پیانہ زند
چشم مست ساقی وام کر زند
چو خود کر زند راز خوشن فاش
عراقی را چہ را بدنام کر زند

(اس گلشن سے دور ایک چٹان پر درجہ اور دانتے کی رو میں کھڑی مونی باتیں کر رہی ہیں ان کے ایک
چہروں پر بھی حوش کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالب اور عالی یہ نظارہ دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں
تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک وسیع میدان ملتا ہے اور اس میں ایک بلنہ فیصل نظر آتی ہے۔ اس
پر دور رو میں چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں ایک شوپنا را اور دوسری حکیم نطشہ کی ہے۔ دونوں کچھ تھکی
ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کے چہروں پر فیر مونی نگہنگی ہے)

شوپنا را کی روح مستی عقل و ہوش سے گمیش جہاں ہے
میراجون و بخود زینہ کائنات ہے
دہم وجود ہے نقاب فطرت بے نیاز کا
مرحلہ حیات پھر مرحلہ حیات ہے
نطشہ کی روح گنگائی ہے

لذت دہم و گماں چھائی ہو غم خانوں میں
میرا سیبا کی انکارنے ڈالے رننے
گوخ اٹھانند غم میرے صنم خانوں میں
دہر کے خالق و مخلوق کے اصنافوں میں
غلبہ چھائے گا اک شاہ عربیا کل رنگ
زندگی آئے گی کچھ دہر کے دیرانوں میں
غائب اور عالی کی رو میں ایک ایسے مقام پر پہنچی ہیں جہاں سیکڑوں قسم کی روشنیوں جگمگا رہی ہیں سارا بلغ
مالیشان ایوانوں سے خرب ہے۔ سامنے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں نظر آتی ہیں۔ اتنا سایہ دار مقام ہے
کہ روح کو عیندی آنے لگتی ہے چٹوں میں بجلیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نور کے آبشار نکلا ہوں کے سامنے
گرتے ہیں۔ بلع کی ایک زرنگا و عراب سے پیر زلفی حاج پنے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہ اقبال کا ہاتھ تھا سے
دے فرشتوں کے آگے چل رہے ہیں۔ پیچھے فرشتوں کا نغمہ رہتا ہے)

فرشتوں! نعرہ ز عشق کہ خونیں جگر سے پیدا شد
 کا نغمہ! فطرت آشفقت کہ از خاک جان مجبور ہے
 خن ازید کہ صاحب نظر سے پیدا شد
 خود گرے، خود شکنے خود دگر سے پیدا شد
 خبر سے رفت ز گردوں ز شبستان ازل
 خدا سے پرو گیاں پروردے سے پیدا شد

دوسرا منظر

کوہ ہمالہ

اکوہ چالاکسی سر پہ تلک چوٹیاں کمر اور بادلوں کا ایک پر شکوہ نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے
 ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت ممین وادیوں میں جھرتے
 ہیں۔ کمر، بادل، برف اور چنار اپنا اپنا مال دل بیان کرتے ہیں۔

کمر۔ اس نیلگوں نصائیں سرودی بھی ہوئی ہو
 یا چتر آسمان کو جمال لگی ہوئی ہے!
 اک وحی زندگانی ہے دگر نزل میرا
 شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا
 بادل۔ کتنا اجلا ہے مرا ذوق تجسلی یارب!
 کتنا اجماع ہے مرا ذوق تجسلی یارب!
 ایک بیان تسلی ہیں مرے اشک حزیں
 ایک طوفان تماشا ہے مرا رنگ حجاب!
 برف۔ دہشت ہے زندگی کی جوش زوال میرا
 دہشت ہے زندگی کی جوش زوال میرا
 تعمیر سے کسی کی گرتی ہوں آہن کر
 کسا رکی جبین پر ہے انفعال میرا
 زور کا طوفان آتا ہے۔ چنار کے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے جلتے ہوئے درخت پکارتے ہیں،
 یہ رحمت کے اخلاذ میں پل رہے ہیں،
 چنگل ہے یا موت کا انخروں ہے
 کئے جا رہی ہے لگائی جھبائی!
 خدا رکھے شاید جواں سال ہیں ہم!
 محبت کی گرمی سے پامال ہیں ہم!

چٹان کے ذریعہ۔ ہوا اور پانی سے ہم مل رہے ہیں
 فرشتہ اجل کا بار اوروں ہے
 ہماری صداؤں کی آتش فوائی
 فطرت کی اس ہم فوائی کا ساتھ ہمارا نہیں دیتا سب حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ہمارا جواب دیتا ہے،
 مری خاموشیوں میں میری فطرت کی نوازش ہو

ہمالہ۔ مری خاموشیوں میں میری فطرت کی نوازش ہو

ثنا سے ہنساؤ! مجھ سے اپنی ہونیں سکتی مری جاں اپنا گنج ناشی یوں کونہیں سکتی
 گوجر طائر بام فلک اس باج انجم ہے بیا بجا رزل میں نکر کا جس کے تلاطم ہے
 صدا اس کی سورج تصور صہوم جائے گی نظر اک فطرت عالی کی نغمہ بن کے آئے گی!
 (اس وقت بالائی خاموش اور بلند چٹائیوں پر نضائے آسانی میں یہ نغمہ گونجتا ہے)

اسے ہالہ انے فیصل کشور ہندوستان چومتا ہے تیری پیشانی کو جبک کر آماں
 تج میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشا تو جواں ہے گردش شام دھر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے

تو بجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و نسیم کی موجوں کو شرما تی ہوئی
 آئینہ سا شاہ قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھپتی جا اس عراق و نشیں کے ساز کو

اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو! (باگ در)

تیسرا منظر

نغمہ کائنات

اگر کہ ارض کی ایک پرسکون وادی آبت رگرتا ہوا آسمان پر ستارہ زہر و کجنگار ہے اقبال کی روح اس میں
 کھڑی ہے اس کے ساتھ ایک نوجوان روح اور ہے یہ دنیا میں ہی دن پیدا ہونے والے شاعر کی ہے
 اقبال اسے زمین کی طرف نصرت کر رہے ہیں نوجوان روح اقبال کو سلام کر کے آگے بڑھتی ہے اور
 سطح ارض پہنچتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر روح ارضی یہ ترانہ گاتی ہے)

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو، رادھیکہ

اس جلوہ بے پردہ کو جلووں میں چھپا دیکھ ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکہ بیم ورجا دیکھ

لے باگ در! مانتا ہے بال جبریل مثلاً

سجے کا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے تارے
 ناپید ترے بحرِ تنخیل کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے ترارے
 تعمیر خودی کر، اثر آہ رسا دیکھ!

اشاعرِ مستقبل کی روح جب گزرتی ہے اقبالِ فلک زہرہ سے سرکراتے ہیں۔ اسنے میں عالمِ ناسوت

ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے،

عالمِ ناسوت مجھ پر کھلا وہ عکسِ جاں آئینہ حیات کا
 میرے یہ باغ و رُخ ہیں جن ازل کو دانتا
 لوحِ اقبالِ عالمِ ناسوت سے کسے ہے

عالمِ آب و خاک و بادِ سرعیاں ہے تو کہ میں
 وہ شب و روز و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جے
 کس کی نمود کے لئے شام و بحسب ہیں گرم سیر
 تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و غورِ نگر
 وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہی تو کہ میں؟
 اس کی حر ہے تو کہ میں اس کی اذان ہی تو کہ میں؟
 سناؤ روزگار پر بارگراں ہے تو کہ میں؟
 کشتِ وجہ کے لئے آبِ رواں ہی تو کہ میں؟

اس کے اثر سے افلاک میں نئے نئے گونجنے لگتے ہیں۔ چند آوازیں اس طرح آرہی ہیں،

ستارے۔ کسی کی شوخی غمِ دل کی آہ بن کے رہی
 ہمارے آگے بھی پہنچا خیالِ حسنِ پرست
 چاند۔ لے رہا تھا میری بستی کا سکون اُگلایاں
 میرے غاروں میں ادا سی تھی عدمِ آبادی
 کس نے روحِ آسمان کو اپنی منزل کر دیا
 خورشیدِ میری مجھہ دگدگاز آگ کی برنگال تھی
 خوبرقِ آفتابِ میری تجلیوں میں تھا
 آتشِ دل بڑھاسی دہن کس کی مدد لے دیر
 کسی کی روحِ باری بگاہ بن کے رہی
 شعاعِ منزلِ جاںِ خفراہ بن کے رہی
 سوزِ خاموشی میں ملتی تھیں میری تنہائیاں
 میرے کماؤں میں حشرِ تمیّلِ برباد کی
 کس نے مجھ کو سینہ آفاق کا دل کر دیا
 میری فضا نے آتشیں ہیبتِ ذوالجلال تھی
 دشنہ خیطِ کبریا، میری تسلیوں میں تھا
 سوزِ عشقِ بخشِ دی کون فلکِ نور دئے؟

فنا آسمانی۔ کون کتا ہے کہ لے کرتی ہوا کہ جست گاہ
 رضاں۔ مری نگاہ محبت کا آشنائے کوئی
 فردوس۔ یہاں نہ روجوں میں تشنگی تھی
 نہ کانیبتی تھیں نظر سے اُن کی
 یہ کون بولا مرے مکانوں
 یہ کون بولا کہ عشق انسان
 دو جہاں۔ شکر ہے ہم بھی آگئے ایک نگاہ ناز میں
 وقت بہ کس نے دیکھی تھی مرے زنگ سیاست کی بیابا
 کس نے ظلمت سے کالائے شبتانوں کو
 ساقی۔ محبت سودل کو گر با لگئی
 شراب کن پھر بلا ساقی
 مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
 بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات
 سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
 بڑے جایہ کوہ گراں توڑ کر
 تری آگ اس خاکدان سو نہیں
 لا کھ۔ نعمۃ اللہ ہو کے پاساں رہتے تھے ہم
 کس نے ہم کو آشنائے درد انساں کر دیا
 جبریل۔ نہ کہ تقلید اسے جبریل میرے جذبِ متی کی
 سروسش۔

لعبت خاک ساختن می نہ منور خدائے را
 لعبت خاک ساختن می نہ منور خدائے را

چوتھا منظر

مسجد قرطبہ

(روحِ اقبال مسجد قرطبہ میں ہے ہسپانیائی آسان کا چاند مسجد کے مینار سے کتا ہے)

پانڈے موج ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے رنگ عالم مری منزل سے نکل کر دیکھے

کس قدر رواج پہ ہے تیس محبت کا جنوں میری سیلی مجھے محل سے نکل کر دیکھے

لالہ کی جو صدا مسجد و محراب میں ہے ایک ایمان بھرے دل سے نکل کر دیکھے

عہد اسلام کے ماضی پہ تمنا بن کر آہ غم سینہ بسیل سے نکل کر دیکھے

مینار۔ نظر آٹانی تو برباد تھا جہاں غل میں سرفراز ہوا یا گنا بگوار ہوا

گیانہ پیچ کے دل تک مری نگاہ کا تیر سمجھ رہا تھا کہ اس کے جگر کے پل پل پل

سنی تھی میں نے بڑی شان کی صدقہ سنی تھی میں نے بڑی شان کی صدقہ

نظر آئے گا شاید کبھی زمانے میں جو انقلاب کہ عالم پہ آشکار ہوا

مسجد قرطبہ روح اسلام کبھی دہرے ہو گی نہ فنا ایک پڑدور کی سن اب بھی صدا آتی ہے

(روحِ اقبال عالمِ عمریت میں)

کافر بند ہی ہوں میں، دیکھ مراد ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و دروالب پہ صلوٰۃ و درو

شوق مری لے میں ہر ذوق مری نے میں ہو نغمہ اللہ ہو، میری رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مرو خدا کی دلیل دو بھی جلیل و جلیل، تو بھی جلیل و جلیل

تیرے درو بام پر دادی ایمین کا نور تیرا منار بلند، جلوہ گہ جب سر میل

بہرائے گردادی اکبر کی طرف باقی ہے اور کتنی ہے)

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب

عالم نور ہے ابھی پر وہ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہمیں اس کی عربے حجاب

(ایسے میں زندگی اقبال کے سامنے کمزیر ہو جاتی ہے وہ اس سے لاکھ فیلو کی نظم نغمہ جیات سنانے لگی

فرائض کرتے ہیں۔ زندگی مسکراتی ہے اور چند خوبصورت لڑکوں کو سامنے لاکھڑا کرتی ہے۔ زندگی کہتی جو
لاگت فیکر کی نظم نہیں یاد نہیں ہے۔ ایک اور نظم سنئے،

لڑکوں کی سنگت

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں جو زندگی
تو اسے پیانہ، مروڑ و فردا سے نہ باپ جاو داں ہیمن و داں ہر دم جوان جو زندگی
اپنی دنیا آپ، پیرا اگرگزندوں میں سے ہر آرم ہے ہنر کن نکاں جو زندگی
فلوڑم تہی میں تو ابھرا ہے مانند حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں جو زندگی
”عہد مسلم“ سامنے آتا ہے اور لکھا ہے،

اے عظیم روت و دل اور لے خیل سوز جاں تیری چشم شوق پر روتن زمین و آسمان
تیری فطرت راز دان شوکت اہل حجاز تیری حکمت امت مرحوم کی آئینہ ساز
تیرے دل میں ترشش فرح و کجاہ چراغ تیرے ہاتھوں میں منور علم و عرفان کا یلغ
قوم مسلم نیم جاں ہے بیچ و بے انجام ہے ان غریبوں کے لئے اب تیرا کیا پیغام ہے
(روح اقبال جواب دیتی ہے،)

نہ سلیقہ مجھ میں حکیم کا نہ قرینہ مجھ میں غلیل کا میں ہلاک جاوے سامری تو قیل شیوہ آذری
میں نوا کے سونستہ درگلو، تو سپریدہ رنگ و میدبو میں حکایت غم آرزو و وحدیت، اتم دلبری
دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ ہی ہے شان قلندری
تری خاک میں ہے اگر شتر تو خیال فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نان شیر پر ہے مار قوت حیدری
کرم لے شتر عرب و عجم کا کھڑے ہیں منتظر کرم وہ گدا کہ تو نے عطا کیا جو جنیں داغ سکندری
(عالم اسلام نے مختلف گوشوں سے آمین کی صدائیں آتی ہیں، اور پھر چند شتر کہتے ہیں،)

مکتہ - یاں گری طواف تو ہے سوز جاں نہیں لب پر وہ سنج زمزمہ الا ماں نہیں
مدینہ - گم بیاست میں پیام مصطفیٰ ہے دماغوں میں مقام مصطفیٰ

انقلاب اے دوسری انقلاب
 پاکی جن محل کی میں دما کرتا ہوں
 اک نئی لذت ایماں میں جیا کرتا ہوں
 یاں کی زمین پاک ہے لذت اعتقاد سے
 کن قدسیوں کے پاؤں کی زندگی ہوئی ہو
 مذہب نے سکھائے تھے آداب خود آگاہی
 نہیں ہے اب دہر دو زبان کو صلح و شنتی گوارا
 کتنی دل انگار ہوں کتنی دل انگار ہوں
 آج اُس عہد کی دل سے طلبگار ہوں
 کفر کی آغوش میں قیسمی خندار ہوں
 ہنسنا ہے خون مسلم نادان کیا بتاؤں !
 قاسم کی روح میرے بدن سے نکل گئی

درس اب دیتی نہیں ام الکتاب
 قسطنطنیہ۔ نام پور زمانہ میں سنسکرتا ہوں
 دست جمہوریت آزاد قیادت بیدار
 بغداد و کاش کے سارے اہل دل کام لیں اعتماد سے
 دمشق سے وائے انقلاب ہے اوندھی ہوئی ہوں میں
 مصر۔ ہر چیز پہ چھایا ہے اب ذوق شہنشاہی
 ایران۔ عرب کی تہذیب سے ملاقات مج کی تعمیر کو سہارا
 شام۔ غمغیا۔ ہوں غمغیا۔ غمغیا۔ ہوں
 میری زمین پاک تھی میری جبین پاک تھی
 ایک سے بڑھ کر ہے ایک میرے لئے دشمن تیز
 فلسطین۔ جو رہو دو جور نصاریٰ کے دکھاؤں
 ہندوستان۔ افغانا شوخ و شنگ کی تلوار چیل گئی

(روح اقبال ان آوازوں کو سن کر دما کرتی ہے)

یارب دل مسلم کو وہ زندہ و تمنا دے
 جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرامے
 (نوجوان شاعر مستقبل کی روح پر اسرار طبع سے مسجد کے ایک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سن رہی ہے
 اور دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے)

شاعر مستقبل۔ روح فردا سے بنا ہے دل نالاں میرا
 میری جاں روشنی عشق پہ رقصاں ہوگی
 دل مرے رہبر عالمی پہ فدا ہوتا ہے
 روز بستی ہی رہی تشنگی ذوق صدا
 وقت آتے ہوئے لائے گا گلستاں میرا
 حُسن بن جائے گا جس روز بیاں میرا
 اس کے المام میں پوشیدہ ہے ایماں میرا
 ایسے فنون سے ہوا درود کا درماں میرا

شاعر مستقبل روئے ہوتا ہے۔ روح نہیں ایک زاہد کے لباس میں نمودار ہو کر راستہ میں داخل ہوتی اور گنہگار ہے۔

روح ملیں۔ آج دوں تجھ کو اپنے دل کی بات فکر کی آزادیوں میں ہے نجات

دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اگر یہی ہے یہ انتظام کائنات

غور سے خود پڑھ کلام اقبال کا راگماں ورنہ یہ صبح و شام ہے

کہ خودی پیدا کر مل جائے خدا تیرے شاعر کا یہی پیغام ہے

شاعر مستقبل ایک عالم فکر اور اندیشہ میں پڑ جاتا ہے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ روح نہیں پرستار ان

اقبال کے ذوق و شوق کا جائزہ لینے جاتی ہے کئی جگہ آزمائش کے بعد خوشی واپس آتی ہے کہ

اس کے دوسروں کو ہنوز دھکا نہیں پہنچا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں وہ اطمینان کا سانس لیکر کھتی ہے

روح ملیں۔ شکر ہے علم نے کی میری تسلی ورنہ میں بھری بزم میں بے چین ہوا جاتا تھا

شور مہتی کا بھلا ہو کہ مٹا یا اس کو لغو و حق و یقین مجھ سے سنا جاتا تھا

میں نے دکھائی زمانہ کو وفاؤں کی بہار شاعر دل مری تم لرزائے جاتا تھا

بارگاہِ فطرت

چھٹا منظر

ایک دن بارگاہِ فطرت میں مظاہر حیات کی ایک محسوس گم ہوتی ہے ہوا، پھول، شبنم، صبح، نور، روح

قص، فوارہ، لالہ، سجرا، سمندر، موج، شمع، پردانہ، جگنو، پروں کو ہمارے نیم عری، امید، وجود، نگاہ، بابل، جال

جدت و تخلیق کے حسین پیکر سب جمع ہوئے ہیں ہوائی بری پاؤں میں شبنم کے گنگوڑا باندھ کر قیص کرتی

جوتی آتی ہے اور یوں نغمہ سرا ہوتی ہے

ہوا کی پری۔ چٹن چٹان، چٹن چٹان، چٹن چٹان چٹن چٹان، چٹن چٹان

سحر مراد دل نظر مری جاں اثر مرا غم خطر مری شاں

لے یہ بحر موسیقی کی ایک خوبصورت لیکن مکمل نال "ہولی" یا "چاچو" پر قائم کی گئی ہے۔ بول ہیں۔ دما دہن دما دہن۔ باتن۔ باتن

دما دما دہن اور تقطیع ہوگی۔ فَعْلٌ فَعْلُنْ فَعْلٌ فَعْلُنْ۔

پانچواں منظر

وسوسہ شیطانی

(روح ابلیس عالم تمنائی میں بے قرار نظر آ رہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روح ابلیس! تیرا سو برس پہلے جو گنجی تھی صدا
گم کیا تھا جس کو میں نے خواہاں بنے زلیست میں
کروٹوں میں زندگی کی میں نے ٹالا تھا جسے
کیوں ہوا محراب جاں میں نور کا روشن چراغ
یا الہی کیوں مٹا جاتا ہے مغرب کا فوں
کیوں ہوا پیدا دیا رہند میں اک بے قرار
نعرہ جذب قائد رست لرز جاتا ہوں میں
خیر اب بھی اک تسلی ہے کہ شاید اہل ہوش
جا کے بزم زلیست میں یہ راز دیکھوں تو سہی
اتنے میں شاعر متقبل کی روح ایک شفاتِ چشمہ کے کنارے کلامِ اقبال کا مطالعہ کرتی ہوئی نظر آتی ہو کہہ رہی ہے،
شاعر متقبل۔ کیسے نظر آئے گا اس کا مقام بلند
عقل و خرد جس کے پر و وق جنوں جس کی روح
چاہتا ہوں جاننا اس کے سخن کا پیام
چاہتا ہوں شکستِ محبہ ہو اس دل کا راز
اس وقت حضرت خضر سامنے آکر شاعر متقبل کو ایک صحیح رہبر کا پتہ نشان بتاتے ہیں جو بگناہ ہستی
سے دور ایک خانقاہ میں اقبال پر خاموشی کے ساتھ فکر کر رہا ہے؛

حضرت خضر۔ اسے خوش خیال بزمِ محبت، نہ فکر کر
ہر گام پر خیال رہے راہِ راست کا
جا اور اس کی مصلح علم و ہنر کو ڈھونڈو
ہو طالبِ پیامِ ازل یا بشر کو ڈھونڈو

میں پیام عالم راز ہوں میں صلے بزم حیات ہوں
دفا کا فلک دعا کی زمیں خضر ہے کہیں سفر ہے کہیں

میں پیام عالم راز ہوں میں صلے بزم حیات ہوں
وطن میں کبھی چین میں کبھی چمک میں نماں گہن میں کبھی

میں پیام عالم راز ہوں میں صلے بزم حیات ہوں
فلک سے پرے زمیں پر سفر ملک سے ملوں خدا پر نظر

میں پیام عالم راز ہوں میں صلے بزم حیات ہوں
چُھن چھنان چُھن چھنان چُھن چھنان چُھن چھنان

(ہنستے ہوئے پھول شب بزم پری سے کہتے ہیں)

پھول شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا
اے قاصد افلاک نہیں دور نہیں ہے
ہوتا ہے مگر محنت پر واز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں کی زمیں دور نہیں ہے
(صبح اٹھاتی ہوئی آتی ہے)

صبح - مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہ پا گو ہر شب بزم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ دیبا باں سے ہم آغوش و لکین
ہاتوں سے تھے دہن افلاک چھوٹے

» اتنے میں آخواب کی کرنیں نور بر ساقی ہوئی سکراتی آتی ہیں،

ایک کرن - مرے نرول میں جاں بخشوں کی فیض دلا
مرے خرام میں ارواح آسمان کا جلال
میں چین رہی ہوں کہ نظرت میں جو نور دہری
میں جل رہی ہوں کہ گردش میں آئے جام غل

» اے دیکھ کر شب بزم پری گاتی ہوئی اڑ جاتی ہے کرن کسیتی ہے،

کرن - دل آئینے کی طرح صاف ہے مٹی کا
نگاہ صاف کو عالم میں کوئی باک نہیں
نوا کر تابے موج نفس سے رہر آؤ
وہ نے نواز کہ جس کا غمیر پاک نہیں

» اتنے میں سمندر کی گونجی ہوئی آواز آتی ہے،

سمندر میں بھی ہوں روح یزداں مجھ میں ہے زور طوفاں
 تاروں کا میں افسانہ جلوؤں کا میں دیوانہ
 سالہا میں میری شوکت ہستی میں میری عظمت
 آئینہ نور جاں کا گنجینہ میں ایساں کا
 شورش ہے زل میں میں بھی ہوں آبِ گل میں

(روح دریا میں راقی ہوئی آتی ہے اور کتی ہے)

موج دریا میں اچلتی ہوں کبھی جذبِ مرہِ کامل سے
 ہوں وہ رہر کہ محبت ہے نچے منزل سے
 جوش میں سر کو نکلتی ہوں کبھی ساحل سے
 کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
 زحمت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں
 وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(شعِ زکاء آج پئے ہوئے آتی ہے اور کتی ہے)

شمع - پوچھتا ہے مجھ سے یہ ایک شاعر نہیں نوا
 از کجا میں آتشِ عالم فروزا نہ ختی
 کس کی منونِ کرم ہے میری فطرت کی ضیا
 کو مک لے مایہ را سوزِ کلیمِ آخوستی
 (جگنو چمک کر آتا ہے)

جگنو - کس طرح میرا جسادہ کوئی دکھا رہا ہے
 جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
 آتی ہیں سن صدائیں فطرت کی انجمن میں
 یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
 آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
 یا جان پڑ گئی ہے متاب کی کرن میں
 نکمہ کوئی گرا ہے متاب کی قبا کا
 ذرہ ہے یا نایاں سوچ کے پہرین میں
 چوڑے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
 نکلا کبھی گسن سے آیا کبھی گسن میں

لے یہ ہر مسمیٰ کی ایک دہانہاں جو ہر پاسے بول ہیں - دہن دہن نا - دہانے ترکٹ دہن نا - من قن نا - دہانے ترکٹ دہن نا -
 قطع ہوگی - مفعول، مفعولات - جگہ باگ ورامتہ - لے باگ ورامتہ -

(پروانہ آواز دیتا ہے)

پروانہ پروانہ پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو؟

(جگنو جواب دیتا ہے)

جگنو۔ اللہ کا شکر کہ پروانہ نہیں میں دروازہ گر آتش بیگا نہ نہیں میں

(ایک آواز آتی ہے)

اے کرک شب تار اپائے تو نور است

پروانہ تو یک سلسلہ غیب و حضور است آئین ظہور است

ماہم کہ انہ تو از خاک و سیدیم

دیمیم تپسیم نہ دیمیم تپسیمیم جائے نہ رسیدیم

(ننگا کی پری مسکراتی ہوئی آتی ہے اور گنگنائی ہے)

نگاہ کی پری۔ بہارِ وفا فلہ لالہ اے حشرائی شباب وستی و ذوق و سرود و رعنائی

اندھیری رات میں شیکھیں ستاروں کی یہ بحریہ فلک نیلگوں کی پیمنائی

سفرِ عروسِ قمر کا عمارِ شب میں طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائیں

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں کہ بچتی نہیں فطرتِ جمال و زیبائی

روحِ اقبال اس روحِ پرور بارگاہ میں لب جو ایک سایہ دار و رخسار کے نیچے بھی ہوئی اپنا گیت

نکار رہی ہے۔ پہاڑوں سے آواز نکلا کے ساری فضا میں گونجتی ہے۔ پریاں حسین بیکو اور ساری مجلس

رقص کرتی اور خوشیوں کی بانسریاں بجاتی ہے،

روحِ اقبال میٹیری نوئے شوقِ شورِ حرمِ ذات میں غلغلہ اے الاماں بکدہ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیرِ میرے تخیلات میں میری نگاہ سے غلغلہ تیری تجلیات میں!

نگاہ میری نگاہ تیز چسپیر گئی دل وجود گاہِ الجھ کے رو گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک رازِ تصانیف کا ثبات میں!

اے پیامِ مشرق۔ اے ضربِ کیم صندل۔ اے بالِ جبریل ص۔

آواز سر دوش پر اسرار طبع سے گونجتی ہے۔ روح اقبال اسے سن کر
 مٹا دیا مجھے ساقی نے عالم میں تو پلا کے مجھ کوئے لالہ لا ہو
 نہ سے نہ شعر نہ ساقی نہ شوخ نیک و بے سکوٹ کوہ دلچیز و لالہ خود رو!

ساتواں منظر

خانقاہ

شاہِ مستقبل کی روح حضرت خضر کے بتائے ہوئے راستے پر چلی رہی ہے اور خاموش مفکر کی خانقاہ
 کی طرف جا رہی ہے راستے میں اسے کالج، فوجی تربیت گاہیں، سیاسی دفاتر، دارالبحث ملتے ہیں
 یہ ان کی طرف سے منہ چیر کے گزر جاتی ہے۔

شکر کی سرحد پر فضا جنگل اور گنجان درختوں کی مچاؤں میں ایک چوٹی سی خانقاہ ہے۔ اس کے
 کنگرے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا روح شاعر کا استقبال کرتا ہے۔

پرندہ۔	اے گلستانِ عشق کے راہی خوش آمدی	اے پیکرِ حسین نگاہی خوش آمدی
گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے	عالمِ تمام رحمت پروردگار ہے	مستی جاں سے میکدہ پر دوشِ ہونفا
ہنگامہ حیات سے خاموش ہے فضا	اشغلی فکر و تاشایساں نہیں	اک نورِ منتظر ہے زمین آسماں نہیں
ہر موجِ نسیم میں ہیں خوش گویاں	ہر پرواز میں طیور کے طوفانِ زندگی	ہر برگِ گل کی چھاؤں گلستانِ زندگی
یاں غورِ مطمئن ہے یہاں فکرِ پرسکون	شہرت کی دھوپ سایہ نشانی نہیں کبھی	خوش ہوں کہ تجویں برأتِ فکر و تلاش ہے
خوش ہوں کہ تیری روح میں اک روشنائش ہو	یاں آکے اپنے دل کی تمنا مٹائے گا	خاموشی حیات سے کچھ فیض پائے گا!

(شاعر کی روح پرندے کا یہ گیت سن کر محو ہو جاتی ہے بھر کھتی ہے)

شاعر مقبل اسے مطرب خیال ابھی نغمہ سنائے جا
اس منزل سکون کا ابھی گیت گائے جا
(طاہر میر نغمہ سرا ہوتا ہے)

پرنندہ - منزل گدے سکون کی تمنا خدا گواہ
تسکین آرزو کا تقاضا خدا گواہ
اک زندگی ہو دولت کون و کان ہو
اک جنت خیال ہی بہت آسمان ہو
اس سرزمین پاک کے نزدیک کے دیکھ
یہ خاک بے نیاز جنس سے لگا کے دیکھ
یاں کھڑکیاں ہیں جلو چمن و جال کی
چمن چمن کے گروہ ہیں شامیں خیال کی

(ایک گار پرنندہ اذہا ہے شاعر کچھ سرچ کر خانقاہ میں قدم رکھتا ہے یہاں ایک درویش کتابوں کا
انبار لگائے ہوئے کچھ کو رہا ہے روح شاعر اجازت مانگ کے یوں گویا ہوتی ہے)

شاعر مقبل اسے رہنمائے فکر و نظر خضر بے نیاز
جس کی نگاہ پاک پہ ظاہر دلوں کا راز
اک بے قرار زیست ہوں آشفۂ نگاہ
کرتا ہوں فکر شعرا ہر سانس میں گناہ
اقبال کے کلام سے مجھ کو نیاز ہے
اقبال میری زیست مرا فخر و ناز ہے
کرتا ہوں اس کے ساتھ تماشائے زندگی
پاتا ہوں اس میں اپنی تمنائے زندگی
لیکن بہت عمیق یہ بحر خیال ہے
مجھ سے بہت بلند یہ اوج کمال ہے
آتا نہیں ہے فہم میں اس زور کا کلام
مجھائیے مجھے مرے اقبال کا پیام
(درویش کچھ تبسم کر کے اور تھوڑی سی فکر کے ساتھ عینک کتاب پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال
کے پیام سے پہلے انھیں ایک نصیحت کرنی ہے)

مفکر درویش - سن پہلے کہ آتا ہے تجھے بزمِ جہاں میں
کے غور کہ تاثیر ہے کچھ تیری زباں میں
نزدیک ہے آزاد خیالی کا زمانہ
بن جائے گی یہ بزمِ جہاں غم کا فنانہ
تو ہونہ کبھی باد و کشِ غفلِ انعیار
بر باد نہ کر دہر میں آزادی کا انکار
آفت ہے دل و جان کیلئے دہر کا جادو
اک آگ ہے اراں کے لئے دہر کا جادو
عظمت کے تلاطم میں بسے جاتا ہے ادا
ہر بات پرانی ہی کسے جاتا ہے انساں

پھیلا ہے تیرے سامنے مستقبل خاموش
 داتیرے دل جہاں کیلئے وقت کی آغوش
 ہوگا تیرے ہاتھوں میں زمانے کا تخت
 آئے گا ترے سامنے قوموں کا تجاہل
 عظمت کی مے ناب سے بھر ساغر الام
 لے شاعر عالی سے دل پاک کا انعام
 اس میں مگر آزادی فطرت نہ بہانے
 کوئین کو اپنا کوئی پیغام سنا دے
 شاعر مستقبل۔ اپنی کمزوری تعظیم کو چھپان گیا
 (منکر رویش پھر کہتے ہیں)

اے نوجوان شوق ترے درد کے نشانہ
 اقبال کے پیام کا اب کرنے انتظار
 کھول آنکھ اور دیکھ نگاہ نیاز سے
 آتے ہیں کون کون کریم مجاز سے؟
 (شاعر مستقبل دیکھتا ہے کہ چارہ بصورت پیکر جن کے چہروں پر آسانی تجلیاں بس رہی ہیں زرنگار
 تاج پہنم ہوئے دہانے ہاتھوں میں تاروں کی شمعیں لے اور اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے سے
 ملائے ہوئے نص کننا آ رہے ہیں۔ ان پیکروں کے تاجوں پر سنہری حروف بن "عشق" "یقین"
 "خود می" اور "عل" لکھا ہوا ہے۔ جلوس یہ تراز گاتے ہوئے گزرتا ہے)

عشق۔ ساروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
 ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
 خود می۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
 چمن اور بھی آشیان اور بھی ہیں
 یقیں۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
 مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
 عمل۔ قوتا ہیں بے پروا رہے کام تیرا
 ترے سامنے آساں اور بھی ہیں
 سب مل کر۔ اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رو جا
 کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
 (دریش کتے ہیں)

مفکر رویش۔ اس گوشہ تاریک میں ہم اہل نظر ہیں
 اک شعل رہہ روشنی راہ گنہ رہیں
 سمجھاتے نہیں آنکھوں دکھاتے ہیں سائل
 رہتے نہیں الفاظ بیاں دیر کے حامل
 اقبال کے پیغام کے یہ چار عناصر
 احساس پتیرے ہوئے اشن و ظاہر

اللہ کرے ان کا ہونزدیک سے دیدار

اللہ کرے دل ہوتا ان کا پرستار

(صدقائے المام آتی ہے)

یہ ایک آئینہ ہیں تری جلوہ گاہ ہیں
اک رشتہ خیال ہو تیری نگاہ میں
اقبال کے پیام کو آنکھوں دکھا دیا
گو یا مرے خیال کو عارف بنا دیا

عشق و خودی یقین عمل چار نکس ہیں
ان چار موتیوں کو پروا ایک ہی جگہ
شاعرِ مستقبل - قربان اس نگاہ کے جس نے یہ یک نگاہ
کوندا میں بکلیاں میرے وہم و گمان پر

(پھریوں دعا کرتا ہے)

نظر آ رہی ہیں تری بارگاہ ہیں
الہی مجھے قوت ہاں دے
تلاطم میں ہے زندگی کا فانیہ
تجلی سے پیدا ہو روشن نگاہی
نظر کی طرح ساری دنیا پہ چھاؤں
دل و جاں ہیں آساں کے مسافر
مرے دل پہ چھا جائے رنگِ انبی!

رواقِ فلک پر تجلی ہیں نگاہ ہیں
الہی مجھے ذوق فکر و عمل دے
سرا فراز ہے انقلابِ زمانہ
طے مجھ کو اس ہزم میں راست راہی
میں جذباتِ عالم کو رستہ دکھا دیا
مرے دل پہ روشن ہو پیغامِ شاعر
ہو جوشِ محبت مری رہنمائی

(باقی آئندہ)

عبدالقیوم خاں صاحب باقی

علامہ اقبال کا فلسفہ

جوہر صاحب نے اس مضمون میں علامہ اقبال کے فلسفہ کو ان کی تقاریر سے اخذ کر کے اور ان کے کلام سے ان کی تشریح کر کے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضمناً وہ ابہام بھی ظاہر کیا ہے جو دل اور عقل کے تعارضات پیش کرنے میں علامہ کی تقریروں میں پیدا ہو گیا ہے۔ سن کی دنیا، اور سن کی دنیا کی نگاہ کو بھی واضح کیا ہے۔ علامہ اقبال سن کی دنیا کے مائل ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تمام صوفیاء کی دنیا کے مائل رہے ہیں لیکن علامہ تصوف کے خلاف ہیں کیونکہ یہ خودی کو فنا کی طرف لے جاتا ہے حقیقت کو منفی طور سے مائل کرنے کی بجائے وہ مثبت طریقے سے حامل کرنا چاہتے ہیں یعنی خودی کو ماقور بنا کر لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ علامہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں لیکن عشق کا جذبہ اگر بغیر عقل کے ہو تو وہ فنا کی طرف لے جاتا ہے عشق کی انتہا خود کو دوسرے میں محسوس کرنا ہے لیکن اس انتہا تک پہنچنے کے یہ مہنی ہیں کہ فرد اپنی خودی سے ہاتھ دھو بیٹھے اس طور پر خودی اور عشق خود متضاد چیزیں نہیں۔ خودی کی ترقی کیلئے عقل و عدل کی زیادہ ضرورت ہے نہایت عشق کے اکتے میں کہ عشق کا جذبہ عقل کی طرف راغب کرتا ہے لیکن خود غیری اور خودی کو ترقی کرنے کا جذبہ بھی عقل اور تربط کی طرف مائل کرتا ہے عشق دوسروں کی تمہیں خود کو فنا کر دینے پر مائل کرتا ہے خود غیری کا جذبہ اپنی اور دوسروں کی تمہیں کی طرف راغب کرتا ہے بغیر خود کو فنا کئے یہیں علامہ کے بیان میں ابہام پیدا ہو گیا ہے ایک طرف وہ صوفیوں کے عشق کو سراہتے ہیں دوسری طرف وہ خود غیری کے جذبہ کو اتنا اجارتے ہیں کہ خود کو بھی خدا میں جذب کرنا نہیں چاہتے بلکہ بڑاں گیری کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

عشق، دل، امن کی دنیا، روح اور ضمیر کا کرب و اضطراب جب سکون پذیر ہو جاتا ہے تب کچھ اصول بنایا جاسکتا ہے تاکہ امن کی دنیا، مطمئن رہے۔ غائر حرا اور وحی کے نزول نے اسی امن کی دنیا، کی خاطر بنیادی اصول مقرر کر دیئے تاکہ امت انسان فی مزید نگاہ میں نہ پڑے اس لئے اب امن کی دنیا، کا ذکر کرنا ہی مبطل ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اب اگر فکر کی جائے تو یقین کی دنیا، کی کیونکہ یہی ہماری زندگی ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی اسلامی اصولوں کی امن کی دنیا یا عشق یا تصوف میں پڑنا ایک سی لا حاصل ہے۔

چنانچہ اس مضمون میں انہیں باتوں کی طرف جوہر صاحب نے اشارہ کیا ہے اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کچھ اور لکھنا چاہیں تو شکریہ کے ساتھ ہم اسے قبول کریں گے،

(مدیر)

اختر آداب عرض یوسف صاحب؛ کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟
 یوسف۔ آئیے اختر صاحب؛ علامہ اقبال کے پیکر کتابی شکل میں گل آئے ہیں انہیں دیکھ رہا ہوں۔
 اختر۔ خوب کیا کچھ ادنیٰ کتاب ہے۔ پہلا باب کس موضوع پر ہے۔
 یوسف۔ وہی موضوع جس سے مرحوم کی شاعری پر ہے۔

خود سے راہ و روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
 درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہ گزر کو کیسا خبر ہے
 گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راوہ منزل نہیں ہے

اختر۔ جی ہاں۔ یہ امام غزالی کا فلسفہ ہے۔ ضرب کلیم میں علامہ نے امام صاحب کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے
 علم نے مجھ سے کما عشق ہے دیوانہ پن۔ عشق نے مجھ سے کہا علم بے تخمین وطن
 بندہ تخمین وطن؛ اگر کم کتابی نہ بن عشق سراپا حضورِ مسلم سراپا حجاب
 یوسف۔ پہلے پیکر کا موضوع بھی یہی ہے کہ کیا حقیقت کو صرف عقل سے سمجھ سکتے ہیں؛ علامہ کا خیال ہے کہ خدا
 یعنی حقیقت کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کا صرف تجربہ کر سکتے ہیں اور وہ تجربہ بھی عقل سے نہیں کر سکتے
 بلکہ اس کے لئے وجدان یعنی عشق یا نظر کی ضرورت ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے مرکز کائنات علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
 عشق سکون و نبات عشق حیات و مات علم ہے پیدا سوال عشق ہے نہاں جواب
 علامہ کے نزدیک خرد سے تو حقیقت کو جزوی طور پر سمجھا جاتا ہے لیکن دل یا عشق یا نظر سے کل حقیقت کا
 مجموعی طور پر احساس یا تجربہ کیا جاتا ہے۔ خرد حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناکمل ہے لگتے ہیں۔

عقل گو آستان سے دور نہیں اُس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ کے نزدیک خرد و نظر ایک ہی شے کے دو رخ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ محدود و گنا
 ہیں۔ علامہ برگران کے اس خیال سے متفق ہیں کہ عشق یا نظر یعنی وجدان بھی اعلیٰ قسم کی خرد ہوتی ہے۔

اختر۔ یہی کچھ سمجھا نہیں یوسف صاحب؛

یوسف۔ آپ کیا نہیں سمجھے۔ براوریہ وہی خیال ہے جس کا علامہ بار بار اٹھا رکرتے ہیں۔ بال جبریل میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
اور ایک جگہ کہتے ہیں۔

عقل بے مایہ امانت کی سزا دار نہیں
راہبرِ ہونٹ و نغیں تو زبوں کا رجات
اختیار یوسف صاحب! میں خرد اور نظر کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں اگر خرد اور نظر میں وہی فرق ہے جو عقل اور تیز عقل میں ہوتا ہے تو یہ کدینا کافی ہے کہ حقیقت زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ اس شکل میں حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نئی شے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے جس کو علامہ نے کبھی دل کبھی عشق کبھی نظر کہا ہے۔ نہ صرف یہی کہ علامہ عشق و نظر کے قائل ہیں بلکہ عقل کو باغی اور کم مایہ خیال کرتے ہیں کبھی فرماتے ہیں۔

سپہ تازہ براگنیزم از ولایت عشق
کہ در حرمِ خطبے از بناوت خرد است
کبھی فرماتے ہیں۔

ترپ۔ رہا ہے فاطمیں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف
جیسا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے علامہ کے نزدیک نظر اور خرد کی نوعیت میں فرق ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نظر کو تیز عقل کہنا غلطی ہوگی۔

یوسف۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نظر سے حقیقت کے اس پہلو کا شعور ہوتا ہے جس کو خرد سے نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ کے نزدیک دل بھی مشاہدہ کرتا ہے اور اگر اس مشاہدہ کی درست ترجمانی کے بعد عمل کیا جائے تو انسان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کی سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے مشاہدات اسی طرح حقیقی تجربہ ہوتے ہیں جس طرح خرد کے تجربات۔ البتہ دل کے مشاہدات کو تحلیل کر کے نہیں بنا سکتے۔

معجزہ اہل فکر فلسفہ بیچ بیچ
معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اختہر کیا علامہ کا یہ خیال ہے کہ تجربہ دو طرح ہوتا ہے ایک دل سے اور دوسرا دماغ سے اور یہ دل ہی ہے جو بیک وقت کل حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے ؟

یوسف - علامہ کا یہ خیال ہے کہ دل کی نظر سے حقیقت کو دیکھنے اور تجربہ کرنے سے انسان کو وہ الہامات ہوتے ہیں جن سے خود بے بہرہ ہے۔ آپ خود کے ذریعہ سے مجموعی حقیقت کا دیدار نہیں کر سکتے لیکن دل بسا اوقات دھوکا کھا بھی جاتا ہے اور غیر حقیقت کو حقیقت اور غیر حقیقت کے پیغام کو حقیقت کا پیغام یعنی وحی و الہام سمجھ لگتا ہے اِن بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل حقیقت کے پیغام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے غلط راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دماغ صرف جزوی حقیقت معلوم کر سکتا ہے اور جزوی اور مجموعی حقیقت میں وہی فرق ہے جو باجے کے ایک سراور ایک راگ میں ہوتا ہے۔ راگ اگرچہ سر دل کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن وہ اثر اور نوعیت میں کسی ایک سر سے مختلف ہوتا ہے بعینہ مجموعی حقیقت جزوی حقیقت سے اثر اور نوعیت میں جدا ہوتی ہے

مصل ہے بے زہام ابھی عشق جو بے تمام ابھی نقش گرازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اختہر - اس کے معنی ہوئے کہ درست علم حاصل کرنے کے لئے عشق پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

یوسف - جی ہاں۔ علامہ نے یہ لکھا ہے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے لئے بھی شیطان کی پیش کردہ حقیقت اور پیغام اور اصل حقیقت اور پیغام میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ علامہ نے اس خیال کی تائید میں کلام مجید کی ایک آیت بھی پیش کی ہے۔

ترجمہ ہتمے تبل بھی ہم نے رسول اور پیغمبر بھیجے جن کی خواہشات میں شیطان نے غلط غماش و غفل

کر دی لیکن خدا شیطان کے چاہے کو پورا نہیں ہونے دے گا۔

بال جبریل میں سالک راہ کو اس طرح خبر دیا کرتے ہیں کہ

دل ہر غلام خسرو دیا کہ امام خود سالک را دہوشیا رخت ہے یہ مرحلہ

اختہر تب تو یوسف صاحب اول دنیا بھی خود چالاک کی طرح ہو گیا غلطی کا امکان دونوں جگہ ہے خود بھی غلطی کر سکتی ہے اور نظر بھی۔

یوسف۔ نظربھی غلطی کر سکتی ہے لیکن خود کو صرف جزوی حقیقت دیکھ سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

فنان را در عقل ہزار حیلہ میرس بیا کہ عشق کمالے ز یک نفسے دارد

اختصر۔ لیکن یوسف صاحب یہ تو فرمائیے کہ جب آپ نے دل کا غلطی کرنا تسلیم کر لیا تو یہ معلوم کرنے کا کیا معیار رہا کہ دل کا فلاں مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا یا غیر حقیقت کا۔ پھر علامہ ایک اور بات بھی فرماتے ہیں کہ بعض دل مشاہدات کی درست ترجائی نہیں کر سکتا۔ اس شکل میں یہ کس طرح فیصلہ ہوگا کہ دل مشاہدہ کی درست ترجائی کر رہا ہے یا غلط۔

یوسف۔ اختصر صاحب علامہ نے وہ معیار بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا کچھ ان معیاروں کی بات ہے۔ علامہ نے دو معیار مقرر کئے ہیں۔ ایک عقلی دوسرا افادتی عقلی معیار سے یہ مراد ہے کہ حقیقت وہ ہے جس کی نوعیت کو عقل قبول کرے۔ افادتی معیار یہ ہے کہ انہیں پیغامات کو حقیقی سمجھا جائے جن پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے برآمد ہوں۔

اختصر۔ یوسف صاحب علامہ نے یہ معیار قائم کر کے اپنے دل بنیاد کے نظریہ کی تردید کر دی۔ علامہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے نہ مجموعی حقیقت کا شعور کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغامات سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے چاری عقل پر حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز کرنے کا بار ڈالتے ہیں اگر علامہ کے نزدیک عقل میں یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقت اور اس کے پیغامات اور غیر حقیقت اور اس کے پیغامات میں تمیز کر سکے اور ان کو جانچ سکے تو گویا علامہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل چالاک دل بنیاد سے کہیں زیادہ بیدار ہے کہ وہ دل کی محسوس کردہ حقیقت اور پیغام کو پرکھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افادتی معیار بھی عقلی معیار ہے عقل تو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ حقیقت کے کسی خاص پیغام پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے نکل رہے ہیں یا برعکس۔

یوسف۔ اختصر صاحب آپ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نظریہ یا دل بھی غلطی کر سکتا ہے تو دل کو داغ سے الگ علم مائل کرنے کا ذریعہ مان لینے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

اختصر۔ یوسف صاحب میرے خیال میں عقل میں ہر حقیقت سمجھنے کی اہلیت ہے۔ صرف فکر و جستجو دوکار ہے۔

حقیقت کے جن پہلوؤں کو ہم فی الحال نہ سمجھ سکیں ان کی طرف ہمارا غیر جانبدارانہ رویہ ہونا چاہئے نہ ان کا انکار اور نہ ان کا اقرار کرنا چاہئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ چونکہ کالمین کے بہت سے بنیادی تجلیات عقل میں نہیں آتے لیکن ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان مفکرین کو جنہوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی تجلیات کو درست ثابت کرنے کے لئے عقل کو معذور اور دل کو روشن بنائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہیں کہ دل جو علم حاصل کرتا ہے وہ عقل کے احاطے میں نہیں آسکتا۔ علامہ پہلے تو فرماتے ہیں کہ دل ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے عقل انسانی مجموعی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ دل حقیقت کا تجربہ تو کرتا ہے لیکن معزز مرتبہ اس کو متاثر نہیں لگ جاتا ہے اور وہ غیر حقیقت کو حقیقت تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں عقل اس کی مدد کرتی ہے اور تجربہ کی محنت اور غیر صحت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب عقل دل کے تجربہ کے نتیجے وغیرہ حقیقی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے تو وہ خود اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔

یوسف صاحب اگر آپ کو لگاؤ اور نگہ دور سے تو یہ عرض کر دوں کہ دل دنیا کے فلسفہ نے دنیا کو عام طور پر اور ایشیا کو خاص طور پر جتنا نقصان پہنچایا ہے شاید ہی کسی دوسرے فلسفہ نے پہنچایا ہو۔ دل کو عقل پر ترجیح دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق نے عقل کو معطل قرار دے دیا جس کی وجہ سے سکری انضام پیدا ہو گیا اور بجائے زندگی میں جدوجہد کرنے اور عقل سے کام لے کر قدرت کی طاقتوں پر تکیا ہونے اور ان کو نبی نوع انسان کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کے ایشیا والے مراقبہ، تصوف اور علم باطن کے پیچھے بڑگئے جس کے نتائج ہماری غلامی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یوسف صاحب! لیکن اختر صاحب علامہ کے فلسفہ میں عقل کے لئے بھی کافی میدان ہے عقلی جدوجہد کو کسی نے منس نہیں کیا بلکہ اس سے بھی جزوی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ جس قسم کے تصوف کے آپ خلاف ہیں علامہ بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ علامہ کے نزدیک وہ مراقبہ، تصوف اور علم باطن باطل ہے جس سے عمل پیدا نہ ہو۔ شاعر مشرق کے نزدیک مراقبہ وغیرہ سے انسان میں جرات عمل پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ریاضت بیکار ہے۔ اختر صاحب جہاں تک میں سمجھا ہوں علامہ نے خود وحشت میں تمیز صرف اس بنا پر

کی ہے کہ خرد انسان کو عمل پر مجبور نہیں کرتی۔ اکثر صاحب کے دماغ بے عمل ہوتے ہیں عشق کا کام ہے کہ وہ انسان کو عمل پر مجبور کرے تاکہ

لاکھ حکیم سر کجیب ایک کلیسم سر کجیف

علامہ ضرب حکیم میں تصوف کے عنوان سے لکھتے ہیں ۷

یہ جسکتِ ملکوتی یہ عسلم لاہوتی حرم کے درد کے دریاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراتبے یہ سرور تری خودی کے گنگاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی اقبال کی اصطلاح میں انفرادیت کا نام ہے جو انسان کے اپنے ماحول پر عمل کرنے سے مستحکم ہوتی ہے۔ توحید کے عنوان سے علامہ فرماتے ہیں۔

زندہ وقت قحی جان میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے؛ فقط ایک مسئلہ علم کلام

روشن اس صنوبرے اگر ظلمت کروار نہ ہو خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملانہ فتنہ وحدت انکار کی بے وحدت کو دارِ جہنم

خرد اگر عمل بھی پیدا کرتی ہے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف خود کے تابع ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر عشق کے تابع ہو کر عمل کیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتیجے برآمد ہوں۔ خرد کو عشق کے تابع رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔

اختیار من اتفاق سے ایسی دنیا میں یورپ اور امریکہ موجود ہیں جہاں کے انسان بلا تامل عشق کی مدد کے صاحبِ عمل ہیں۔ دل نہیں بلکہ خرد ان کے تمام عمل کی محرک ہے۔ ان کی خرد نے آپ کی دل کی دنیا کی تحلیل کر کے رکھ دی۔ اس حقیقت کے سامنے آپ کا دل کا فلسفہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ دل مینا کا فلسفہ اپاجھی کا فلسفہ ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ جب یہ ان لیا کہ کل حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا طریقہ عقل سے جدا ہے اور انسان کا مقصد حیات حقیقت کا مجموعی دیدار ہے جس سے زندہ و پائندہ علم حاصل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کل حقیقت کا دیدار اور زندہ و پائندہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور حقیقت کا دیدار ایک دو روز کے مراقبہ سے تو ہو نہیں سکتا اس کے لئے عہد و کار ہے

جس کے یہی معنی ہوں گے کہ انسان تمام عمر ریاضت اور مراقبے میں گزار دے۔ یوسف صاحب ایشیا کی غلامی اسی عشق و نظر کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ یورپ کی زندگی اور ترقی سے متاثر ہو کر اقبال اس پر تو مجبور ہو گئے کہ ذوقِ کردار کا پیام دیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے عشق و نظر کا نظریہ پیش کر کے ایسا کیا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ کر اس کو عمل کی تلقین کی جائے۔ مسلمانوں میں عشق و نظر کا فیونی فلسفہ اتنا سراپت کر گیا ہے کہ اب ان کو فیونی فلسفہ کی خوشبو بھی پینک میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ ہی کی ہستی تھی کہ جس نے وقتی تقاضے کو سمجھا اور اردو شاعری کو نیا رنگ دیا اور گلِ ذہل اور خط و خال سے ہٹ کر عمل کا پیام دیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ نے دل کی دنیا کا راگ الاپ کر اپنے پیام کو کالعدم کر دیا۔

یوسف۔ اختر صاحب یہ تو آپ درست فرماتے ہیں کہ باطن کی کشادگی اور مراقبے کے ذریعہ سے حقیقت کی جستجو کی آڑے کر ایشیا اپنا بیج بن گیا۔ مشرق میں کی دنیا میں پھنس گیا اور تن کی دنیا سے اتنا بے نیاز ہوا کہ ایک عرصہ سے یورپ کا غلام بن گیا۔ لیکن اختر صاحب جیسا میں عرض کر چکا ہوں علامہ اس قسم کے تصوف سے بہت بیزار ہیں اور اس کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں :-

صوفی کی طریقت میں نقطہ سستی احوال ملا کی شریعت میں نقطہ سستی گفتار
شاعر کی فواہر وہ دانشور وہ بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کی رنگ دہلے میں نقطہ سستی کردار

اختر صاحب یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ میں کردار پر از حد زور دیا گیا ہے لیکن علامہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ خود کے علاوہ عشق و نظر کو مانتے ہیں اور ان کو جو شکر و ادراک پیدا کرنے کا سبب بتاتے ہیں۔ عشق و نظر کے فلسفہ پر کسی تمدن کی بنیاد رکھ کر افراد کو کردار کا پیام دینا ایسا ہے جیسے پیاسے آدمی کا گلا دبا کر اس کو پانی پلانے کی کوشش کرنا۔ یورپ اس فلسفہ کی جسم تو دید ہے یوسف صاحب میں تو ایشیا کے زوال کا یہی سبب سمجھتا ہوں کہ ایشیا والوں نے فکر جستجو سے کنارہ کر لیا اور عقل سے بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو معبودات کے سمندر میں ڈال دیا جہاں تو بہات کی پھیلوں نے

انہیں ہرپ کر لیا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ایسا کہ صاحب جذب دوسو زستی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حسب عقل کی ہے جو تجربہ سے کام لے کر حقیقت کو پہچانے۔ علامہ اگرچہ دنیا کو پیام عمل دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی جاری ہے۔

من کی دنیا من کی دنیا سوزنی جذب حقوق تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا کم و رفن
من کی دولت ہاتھ جب آتی ہے تو جاتی ہیر تن کی دولت چھاؤں ہو آتا ہے دن جاتا ہیر
ایشیا دلوں کی ساری عمر من کی دولت مائل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اور تن کی دولت اختیار
کے حصہ میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تن کی دنیا میں آلودہ رہنے والے من کی دنیا میں غرق رہنے
والوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یوسف صاحب آپ کو یہ تو علم ہو گا کہ علامہ ربانیت اور خانقاہی کے بہت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر پہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی
علامہ ہر بات میں کچھ مذہب معلوم ہوتے ہیں

یوسف اختر صاحب۔ دراصل ایشیا دلوں کی تباہی اس لئے ہوئی کہ مولانا روم نے من کی دنیا میں رہنے والوں
اور دل دنیا کے دعویداروں کے لئے جو کسوٹی بنائی تھی جس کے علامہ بھی قائل ہیں اس کسوٹی کو
ہم نے فراموش کر دیا ہے
اختر وہ کسوٹی کیا ہے؟

یوسف۔ آں کہ برافلاک و فدا رش بود برز میں رفتن چہ دشوارش بود
مولانا فرماتے ہیں کہ جو افلاک پر چل سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے جب ہمیں یہ معلوم
کرنا ہو کہ فلاں شخص واقعی بزرگ یعنی حقیقت آشنا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی دناوی حالت
کیسی ہے۔ باطن کی تلاش کا اسی کو حق ہے جو ظاہر کو اپنے تابع کر چکا ہو۔
اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

ایشیا میں اب تک یہ جوتا رہا ہے اور چہرہ ہے کہ جب دنیا کے طاغوت نہ سہ سکے تو تارک الدنیا ہو کر مرقبہ کرنے لگے۔ جو تن کی دنیا پر قابو نہ پاسکا وہن کی دنیا میں کیا کر سکتا ہے۔ جیسے علامہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
قہقہہ شہر بھی رہبانیت پر ہے مجبور کہو کہ میں شریعت کے دست بہرت
گر پرکش کش زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہو تو اور کیا ہے شکست

آخر سر خیر آپ نے یہ تو انا کہ پہلی حقیقت تن کی دنیا ہے اور من کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے مادی دنیا کو مسخر کرنا ضروری ہے معاف کیجئے گا میں من کی دنیا کے فلسفہ ہی کو ایشیا کی تباہ حالی کا باعث خیال کرتا ہوں۔ یورپ والے بلا جذب و شوق و عشق و متی اور من کی دنیا کے پیچھے پڑے ہر اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہیں۔
یوسف۔ آخر صاحب یورپ میں جو کشت و خون ہو رہا ہے اس کی اہل و عیال ہے کہ یورپ کی نظر صرف تن کی دنیا تک محدود ہے

مشرق حق را دید عالم را نہ دید غرب در عالم خزید از حق و امید
چشم بر حق باز کردن بندگی است خویش را بے پروہ دیدن زندگی است

آخر سر یوسف صاحب یورپ کی نظروں کی دنیا تک محدود ہی لیکن دو ایشیا سے تو بہتر ہے جس کی نظر غلامی و کجی ہے۔
مشرق کو ترقی کرنے کے لئے دونوں دنیا میں فحش کرنی ہوگی لیکن یورپ نے تن کی دنیا فحش کر لی ہے اور علم نفیات کے ذریعہ سے من کی دنیا میں بھی قریب نصف کے فحش کر لی ہے۔ یورپ کا کشت و خون تو وہ تباہی نہیں جو جہاں ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر رہا ہے جسے زندگی مقامروں نے بنا دیا ہے تارخانہ جس طرح بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کو درد و کرب برداشت کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب ”جہان کن“ کے بطن سے ”جہان نو“ پیدا ہوتا ہے تو تمام دنیا میں تشنج پیدا ہوتا ہے یہ جنگ و ہی تشنج ہے جس کو آپ تباہی و بربادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یوسف۔ عصر حاضر را خود بخیر پاست جان بے تاجے کہ من و اہم کماست
آخر سر۔ مست رکھو ذکر و فکر مع گا ہی میں انہیں بہتہ ترک و طریق مانقا ہی میں انہیں
م۔ م۔ جوہر صاحب میرٹھی

جدید تعلیمی نظریہ

تعلیم کی تعریف | تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کے بالغ ممبروں کی سعی اور جدوجہد ہے جس سے آنے والی نسلوں کی نشوونما اور تکمیل، زندگی کے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سچ ہے کہ اکثر تعلیم کا لفظ اس سے وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جان اسٹوارٹ مل نے تعلیم کے دائرہ میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا ہے جو "نوع انسانی کے تعمیر میں مدد و معاون ہوتی ہیں، اور شاعرانہ حیثیت سے ہم تمام نئی نوع انسان کی تعلیم بھی مادیاتی میں لیکن یہ تمام استعالات خطیبانہ ہیں جو عاقلانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں ذاتی ہدایت اور تربیت ایک ضروری عنصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی سکیمیں تادمہ جڑے کھٹے لوگوں کے تجربات سے بنائی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام تجربات (بچے کے لئے) سبق آموز ہوتے ہیں۔ آیا ایک تجربہ ایک فرد (یعنی بچہ) کی تعلیم کا جزو ہے یا نہیں، اس کا جواب اس وقت دیا جاسکتا ہے جب ہم یہ معلوم کر لیں کہ تعلیم کا طریقہ ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کی آغوش تربیت میں پلا تھا اور وہ اسی کا تجربہ تھا، اگر وہ بچہ کا تجربہ تھا تو تعلیم کا جزو ہوگا ورنہ نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم خواہ اچھی ہو یا بری، اس کی اچائی یا برائی کا انحصار معلم کی حسن سیرت، دانائی اور ذکاوت پر ہوگا۔ وہ اچھی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس سے صحیح نتیجہ نکلے اور اس کیلئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر موزوں و مناسب ہوں کہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکے۔ نیز وہ تعلیمی، ایک رنگی اور ثابت قدمی سے کام میں لائے جاسکیں۔

یوں تعلیم معین طور پر ایک انفرادی فعل ہے اور ہر سوسائٹی میں اس کی وسیع تاثیر اور وقت کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ تمام زمانوں اور تمام مقامات میں ان لوگوں کی فضیلت، دانائی اور صلاحیت کے متعلق اختلافات ہیں جن کے ہاتھوں میں بچوں کی ذمہ داری اور نشوونما ہے۔ تاہم باوجود ان اختلافات کے ہر معلم اپنے عہد اور ملک کے رائج تصور اور نظریہ کو کم و بیش کمال اور واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ کامیاب تعلیمی جدوجہد کیلئے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کو یہ حیثیت جمہوری تعلیم کی فطرت اور قیمت کا بخوبی اندازہ کرنا چاہئے۔

بہر کیف اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک بیدار اور حساس قوم میں ملین کا جو قوم کی عاجزوں کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں یہ ملے کر ثابت ہی عام اصطلاحات کے سوا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دیں کیونکہ جب ہم ان افراد پر نظر ڈالتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو ان خلاطوں سے متعلق ہونا چاہئے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے جسم و روح میں ان تمام خوبیوں اور کمالات کی نشو و نما جو جن کی صلاحیت ان میں موجود ہے اس سے ان خوبیوں اور کمالات کی فطرت سانسے نہیں آتی اور ان نقطہ ہائے نظر پر کبھی عالمگیر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ ہر عہد میں اندازے کے بین اختلاف رہے ہیں۔ انفرادی حسن و کمال کا منظر حقیقی زندگی اور صرف حقیقی زندگی ہے۔ اور ایسی زندگی زمان و مکان، مذہب و تمدن، قومی جذبات اور مادی حالات پر دسترس کے معین حالات میں بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے افلاطونی عہد کے ایجنڈہ کا کمال زندگی، موجودہ لندن، پیرس اور نیویارک سے بہت مختلف تھا۔ لہذا جہاں تک کوئی تصور تعلیم علی طریقے کی رہبری کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرہ کی حالت ترقی اور تعلیم میں ہر لحاظ سے تعلق جو جس میں وہ دی جاتی ہے۔

تعلیم اور قوم ایک لحاظ سے قوم کے آئین اور عام نظریہ کا اس کی تعلیمی سیرت پر خاص اثر ہوتا ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے تحفظ و تکمیل میں سرگرم رہے لیکن وہ زندگی انفرادی کمزوریوں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ایک مثالی قوم میں انفرادی اور اجتماعی اغراض و مقاصد کی مماثلت ہونی چاہئے لیکن تاریخ مثالی اقوام کے وجود پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی اور اس کے حالات کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہیں۔ علماء اختلافات کا دور دورہ ہمیشہ رہا ہے جس کا نتیجہ کہیں جلب منفعت اور کہیں انداد ترقی ہوا ہے مختلف زمان و مکان میں متاثر ہوا۔ کاہن اختلاف رہا ہے ہر ایک کی دلچسپیوں اور انفرادی ترقی کے دعووں میں مصالحت یا موخر کو مقدم کا تابع بنانے میں سوسائٹیوں کی رغبت بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہے، اور ان کے تعلیمی تصورات میں اختلافات کی جھلک نظر آتا یا نہیں ہوتی ہے۔ اقوام کا ابتدائی رجحان افراد کی شخصیت کو مکمل طور سے تابع بنانا ہے لیکن مغربی قبائل میں عیسائیت کی آمد کے وقت سے انفرادی زندگی کی اہمیت بڑھ جانے کے سبب اس رجحان کو روکا گیا اور لطیف بنا کر منقطع کیا گیا۔ وہی طور پر متناقض لیکن واضح واقعہ ہے کہ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) نے اپنی بہت وسیع صفت کے حیرت انگیز کھلم کھلا مظاہر سے گھرے، قرب بنانے اور جدید اجتماعی تنظیم کے وسیع الجہاد

نے واقعتاً قدیم رجحان کے خلاف رد عمل پیدا کیا۔ اور تعلیمی خیالات میں اس کو ظاہر کیا۔ تعلیمی نظریہ کو ہمیشہ کم و بیش مرکزِ تھل پر مبنی ہونا چاہئے یعنی پہلے ایک ہی بچہ پر ساری توجہ منطقت کرنی چاہئے اور ان فطری صلاحیتوں اور فطرتی قوتوں کو جو اس کو تعلیم یافتہ بناتی ہیں مرکزِ توجہ بنانا چاہئے۔ لیکن موجودہ میلان اس سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اس کی رو سے فرد کی تکمیل تعلیمی جہد و جد کی علت غائی ہے۔ اس میں اجتماعی مطالبات سے بے پروائی شامل نہیں ہے اور نہ اس سے معاشرتی انتشار ہی مراد ہے بلکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ قومی زندگی کی بہترین تشکیل ایسی تعلیم سے ہوگی جس میں معاشرتی سرگرمیوں کو انفرادی زندگی کے اعلیٰ درجوں تک ترقی کرنے کا ایک حنر درسی واسطہ خیال کیا جائے۔ یہ بہتر ہے اس چیز کی بہ نسبت جس کے ماتحت انفرادی فنون و فنائے مطالبات کو قرار دیا جائے۔ یہ تصور کم و بیش صاف طور پر محسوس ہو کر امریکہ، برطانیہ اور دیگر تمدن مالک میں فنون و فنائے لے شیعہ ہدایت کا کام دیتا رہا اور مسئلہ اعر کے بعد سے اس کی روشنی میں تمدن قوموں نے عملی ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔

نظریہ کے تئیر کی حیرت انگیز علامت ترقی کرنے والے ملکوں میں عبوری تعلیم کی از سر نو تشکیل تک منتهج ہوتی ہے۔ اس کی امتیازی صفت قدیم تصور کو مٹا کر جدید کو لانا ہے جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس اہم معاشرتی طبقات سے مطابقت رکھیں۔ اس خیال سے ہر طبقے کے بچے ایسی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع پائیں جس میں طفلانہ ضروریات ہم پیم ہونچانے کا سامان موجود ہو۔ نیز اس میں ثانوی تعلیم مغفانِ شباب کی ضروریات کے مطابق ہو۔ مالکِ متحدہ امریکہ میں ابتدائی تعلیم کی عمارت اسی ستون پر قائم ہے۔ اس لئے وہ ان جو نیر اور سینئر ہائی اسکول موجود ہیں جو پچیس تین تین، اسی اور پچاس تین تین، انگلستان میں ۱۹۲۷ء میں تعلیمی بورڈ کی کمیٹی نے مغفانِ شباب کی تعلیمی رپورٹ اسی اصول پر شائع کی ہے۔ جرمن ریخ بھی ان تعلیمی غیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک حد تک یہ ترقیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ جدید صنعت و حرفت اور آئین حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اوسط درجے کے شہری کا قدیم شہریوں سے زیادہ بلند معیارِ علم و تربیت ہونا چاہئے لیکن اس کی اصولی تشریح اس تصور میں موجود ہے۔

۱۷ امریکہ میں قدیم آٹھ سالہ نصابِ تعلیم ختم کر دیا گیا ہے اور اب اس کے بجائے چھ سال کا ایک جدید نصاب تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رودستہ تین سال تک جو نیر ہائی اسکول کو رس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں بچوں کے حیاتیاتی، انسانی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور تین سال کا سینئر ہائی اسکول کو رس مغفانِ شباب کیلئے مرتب کیا گیا ہے جس میں ان کی انسانی ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے

کہ ایک قوم کا فرض ہے کہ وہ فانی ترقی اور غوغائی کے بہترین مواقع تمام افراد کی دسترس میں دیے جو ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

نصاب ان اعتبارات سے نصاب تک خیال کا پہونچنا فطری بات ہے۔ بچوں اور بچیوں کو کیا پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح جواب اس اصول میں ہے جو مقصد تعلیم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسکول کا یہ کام ہے کہ وہ ترقی و تبحر اور خاندانی زندگی کے اثرات کی اصلاح کئے ساتھ ساتھ بچوں پر ان روحانی قوتوں کا اثر ڈالے جو اس قوم یا جماعت کی خصوصیات میں سے ہوں اور ان کو اس لئے تیار کرے کہ وہ قوم کی زندگی کی بحالیت اور ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس کام کے انجام دینے میں اسکول کے لئے ضروری ہے کہ وہ واقعی معاشرہ جو جس میں قومی سیرت کے بہترین نصب العین موجود ہوں اور اس لئے اس قابل ہو کہ بچوں کے رگ دریشہ میں وہی خصمیتیں اور سیرتیں منتقل ہو کر مستحکم ہو جائیں۔ انگلستان کے نام نہاد پبلک اسکولوں کی شہرت کا دار و مدار انہیں اصول کو کامیابی کے ساتھ چلانے پر ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان اسکولوں کے معاشرتی نصب العین میں جسمانی قوت اور جرات، نیک اخلاق، قومی روح، مضبوط نفس اور آزادی و حکومت خود اختیاری کے لئے تربیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے کسی شہری کی تخلیق کے لئے یہ تمام باتیں قیمتی عناصر ہیں اور اس لئے ان کا وجود ہر قسم کے اسکولوں کی زندگی میں لازمی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلباء کو متعدد مضامین کی تعلیم دیں۔ یہاں پر ہم جس اصول کی پیروی کرتے ہیں اس کے گونا گوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص قوم کی زندگی اور ضروریات کا وسیع یا محدود نقطہ نظر رکھے۔ محدود نقطہ نظر کی رو سے قوم کو کسی وقت کسی قسم کے علم و حذاقت کی ضرورت پیش آتی ہو تاکہ وہ اپنی اقتصادی اور دوسرے قسم کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسکولوں کا یہ کام ہے کہ وہ ایسے نوجوان طلباء پیدا کریں جو اس علم و حذاقت سے بہرہ ور ہوں۔ وسیع نقطہ نظر کے لحاظ سے حال کی افادہ ضروریات کو کم اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے بجائے طلباء کو ان عناصر سے روشناس کرایا جاتا ہے جو لوگوں کی تاریخی زندگی میں نمایاں دائی اور بنیادی طور پر توجہ خیال کئے جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے تباہی سے صنعتی اور لبرل (عام تعلیم جو تہذیب نفس کے لئے دی جائے) تعلیم اور جدید اور کلاسیکل تعلیم میں اور کم واضح طور پر اس تعلیم میں جو علم کی قیمت پر زور دیتی ہے اور اس میں جو فہنی تربیت اور تادیب پر زور دیتی ہے تناقض پیدا ہو گیا ہے۔

ان متعدد خیالات میں جو مذکورہ بالاتناقصات میں شامل ہیں ہم کو ایک محفل نصاب تعلیم کا تعین لازمی ہے ایسے نظریہ کی بنیاد یقیناً اس پر قائم ہونا چاہئے جس کو وسیع نقطہ نظر کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے خاص اصول یہ ہوں گے کہ اسکولی معاشرہ اپنے تخلیقی اثرات میں ان ذہنی، جالیاتی اور عملی سرگرمیوں کی کیفیتوں کو شامل کرے جنہوں نے انسانی روح کے ارتقا میں اہم حصہ لیا ہے اور جن کی وجہ سے عصر جدید کے داغ کی تشکیل ہوئی، ادب اور آرٹ، موسیقی و صنعت ریاضی اور سائنس، جغرافیہ اور تاریخ مکمل نصاب کے ضروری جوہر ہیں لیکن یہ چیزیں صرف گوناگوں طریقوں سے نصاب میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ داخل ہو سکتی ہیں اگر مختلف قسم کے طلباء کی گوناگوں ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب ہوں مثلاً کسی مخصوص صنف کے لئے تیار کرنا کسی خاص اصول کے مطابق ہوتا ہے اگر اس کا مقصد صرف اذکار کے استعمال کی صداقت یا تجربی صنعتی علم نہ ہو بلکہ متعلم کو اسکول میں کسی ایسے ضروری پیشہ یا فن کے اخلاقی، سائنٹفک یا جالیاتی روایات کے اندر رکھا جائے جس نے ہمارے تمدن و تہذیب کی ترقی میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور برابر لے رہا ہے۔ اس طرح عمل کرنے سے صنعتی تربیت آبادی کے بڑے حصوں کے لئے حقیقی لبرل تعلیم کی تکمیل اور ہمواری کا موزوں طریقہ ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جو زیادہ تر قدیم کلاسیک (ادب، القدامہ کے مطالعہ پر مبنی) ہو لبرل سمجھانے کی سعی نہیں ہے جب تک کہ وہ ایسی نہ ہو کہ اس سے ایک طالب علم وجود و دنیا میں آزاد انسان نہ بن سکے۔ اس کے خیالات حساس ہوں اور وہ اس تربیت کی ذہنی اور معاشرتی تحریکات کی اہمیت سے باخبر ہو۔

اس نقطہ نظر سے ذہنی تربیت یا تادیب کا ترقی دینا اور سنوارنا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے تعلیمی نظریہ اور عمل پر وہ اتنا گہرا اثر برابر ڈال رہا ہے کہ اس کی پراعتیا ط تحلیل کی ضرورت ہے۔ اسی خیال کو لطیفے کے طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو وہ اسکول میں سیکھے اور پھر بھلا دینے کے بعد یاد رکھتا ہے لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کیا یاد رکھتا ہے؟ خام نقطہ نظر کے مطابق اسکولی مطالعوں سے بعض قابلیتیں اور دماغی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور وہی ترقی ان کو جاری رکھنے کا عملی باعث ہوتی ہیں مثلاً انہیں جو بچہ روزانہ سیکھتا ہے ممکن ہے کہ اسکول چھوڑنے ہی وہ بہت جلد نیا مہیا ہو جائیں لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے اس کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے اور یہی اس کی کافی تائید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی بھی اپنے حاصل کردہ علم طبیعیات اور علم کیمیا کے استعمال کرنے کا موقع نہ ملے لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس نے ان علوم سے

توت مشاہدہ اور قوت استدلال مائل کر لی ہوں جن کی قیمت مانگ لیں گے اور اس نے تمام بحث طلب امور میں سائنٹفک طریقہ کے استعمال کی عادت ڈال لی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی رائج ہے کہ علم ہندسہ سے قوت تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور جہر و مقابلہ سے دماغی درستی۔ ان مثالوں میں نفسیاتی قوت ذہنی یا نظریہ نقل تربیت ذہنی کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی فطری قوت کو ایک موضوع پر تربیت دینے میں دوسرے موضوع کی تربیت کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جدید نفسیاتی تجربات نے اس خیال پارینہ کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان سے یہ ثابت ہے کہ ایک انسان جو اشارے یا دکر نے میں طویل مشق سے اپنی قوت حافظہ کو تربیت کرتا ہے وہ کسی حالت میں شکر کے ٹکڑوں کو اس سے کم محنت میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قابل یقین نہیں کہ علم نباتات اور مسلم طبقات الارض کا ایک ذکی ناظر جس نے اپنی تربیت سے آنکھ کی مرعرت اور اعصاب کے اوصاف مائل کر لئے ہیں وہ ان کو ذہنی کی شاہراہوں پر موڑ چلانے میں مدد دیں گے۔ ان یقینی واقعات اور عمومی اعتبارات سے دماغی تربیت کا خیال باطل ثابت ہو رہا ہے لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ غلیات جو جان لاک اور دیگر قابل اور تجربہ کار معلموں کی کاوش کا نتیجہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں ہر بوٹ اسپنسر نے اپنی کتاب ”تعلیم“ میں صحیح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکولی معلموں کی قدر علم اور قدر تربیت کا تقاضا بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اپنے طلباء کو ایسے علم سے روشناس کریں جو بیش قیمت ہے یعنی وہ علم جس کی امور زندگی کے منضبط کرنے میں ناگزیر عملی قیمت ہے تو ہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین ممکن دماغی تربیت کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے کہ بہترین قسم کے علم کی تلاش سے بہترین دماغی اویس نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے یہ عقیدہ کہ جو جان لاک اسپنسر کا ذاتی تعلق ہے منسوخ کر کے ماننے والے کے عقیدے کا ایک جزو سمجھنا چاہئے لیکن اس کو مذکورہ بالا عام اصول نصاب کا نتیجہ بھی خیال کرنا چاہئے۔ یہ کما جاتا تھا کہ بہترین تعلیمی سرگرمیاں وہ ہیں جنہوں نے تمدن کی ترکیب اور ترقی میں خردوری اور متقل مدد پہنچائی ہے۔ ان امدادوں کا حقیقی سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو قوم کے نابھہ (Genius) اتنے مثلاً بڑے بڑے آرٹسٹ، صنایع، شعراء، ادباء، فنی اور سائنٹسٹ، ارباب سیاست، یہی لوگ ایوان تمدن کے نقاش اور معمار ہیں اور انہیں لوگوں نے سرگرمیوں کی تشکیل اور نشاں کی ہے۔ ان کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی اور اس طرح سرگرمیوں کی روایات — ذہنی جالیاتی اور عملی تخلیق ہے جن کی معین اور مخصوص شکلیں آج ہمارے سامنے

ہیں۔ اسی طرح شری اور نفیس ادبی روایات کی نشوونما عالمگیر عادت لفظی ارتباط سے ہوئی ہے۔ فن تمیز اور صنعت مادی زندگی کی عالمگیر ضروریات سے بڑھے ہیں۔ سائنس کی ترقی عالمگیر عطیہ تجسس اور بے پایاں علمی مقاصد کے لئے قطعی علم کی ہمہ گیر ضرورت سے ہوئی اور اسی طرح دوسری بنیادی سرگرمیوں کی جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں نشوونما ہوئی جس قدر ایک طالب علم کا مطالعہ ان روایات سے اس کا قریبی تعلق پیدا کر دیتا ہے یا اس میں ان کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی قدر اس کا داغ ان اعلیٰ دماغوں کا پرتو اور آئینہ ہو جاتا ہے جنہوں نے ان کو وضع کیا تھا اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کا دماغ منظم بھی ہو جاتا ہے۔ العرض اسکوئی زندگی کے نظم اور مطالعہ سے یہ مراد ہے کہ بچوں میں یہ قوت و صلاحیت چھوٹے پیلے پر پیدا ہو کہ وہ جلیل القدر شعراء کے ہم طبع ہیں، اہم فن کے ہمسرہ، حکما اور فلاسفہ کے ہم مرتبہ ہو سکیں۔ ان میں وہ وقت نظر پیدا ہو کہ فطرت اور کائنات کا مطالعہ ایک سائنس دان کی عینک سے کریں اور ایسے شری ہوں کہ ان کے پیش نظر عظیم اثنان شہریوں کی دنیا زندگی کا نصب العین ہو۔ اس قسم کی تادیب و تربیت سکھم ہوتی ہے نہ کہ باور ہوا اور اس کی قیمت ہمہ گیر ہے کیونکہ جو سرگرمیاں اس کی تشکیل کرتی ہیں وہ تمدن زندگی کی بنیادی سرگرمیاں ہیں۔

ابن ہک مدرسہ کے نظام میں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے لکھنا ممکن نہیں۔ کچھ تو یوں کہ مذہب کی اصطلاح بہت ہی عجیبہ اور بے پایاں مظاہر پوشل ہے اور کچھ یوں کہ لوگوں کا اندازہ مذہب کے متعلق اس قدر گونا گوں ہے کہ بعض حالتوں میں بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں بہت سے لوگ متناقض معتقدات کے پیرو ہیں جو اخلاقیات کی تعلیم بغیر مذہب کے جاننا اور لازم خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مذہب ایک روحانی مرض ہے یا یوں سمجھئے کہ تہذیب کے مدظل و نفعیت کا فریب محض ہے جس کو موجودہ زندگی میں ناپید ہو جانا چاہئے۔ جو لوگ اتنا ہی نقطہ نظر کے علمبردار ہیں وہ نصاب سے مذہبی تعلیم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں وہ قوموں کی زندگی میں کسی اہم اور بڑی قیمت والے عامل کی نمائندگی نہیں کرتی، باوجود اس کے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اتنا پسند بھی ایمان رکھتے ہیں جن کے پیش نظر تین نصاب العین کی اعلیٰ قیمت ہوتی ہے۔ یہ معترف ہیں کہ وہ نصاب العین بجا طور پر خدمت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اصلاح باطن پر کچھ اثر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جاسکے کہ ایسا ایمان یقیناً مذہبی کلمات کے گائیڈ ہے کہ وہ تمام صحیح اور سچے مذاہب کا لب لباب ہے تو یہ شبہ کہ آیا نصاب تعلیم عام

اصول مذہبی تعلیم پر منطبق ہوتا ہے۔ رٹے ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مذہب اس وسیع مفہوم میں انسانی جاعتوں کی بقا اور ترقی کا ایک بنیادی عامل ہے اور اس لئے..... اُس مذہبی تعلیم کو لازماً اسکولی معاشرہ کا ایک عامل ہونا چاہئے لیکن یہاں پر مذہبی تعلیم (بہت عام مفہوم میں) اور مخصوص معتقدات کے مابین رشتہ کا سوال باقی رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر کوئی اتفاق یا آسانی نہیں ہو سکتا۔ غالباً دماغی ترقی کے عام خط و خال کے متعلق سب لوگ متفق ہوں گے یعنی مذہب اعتقادی عناصر درج کی فطرت اس منظم نظریہ کی مائل ہے جو مذہبی عبادت کے مقاصد اور سرچشموں سے متعلق ہے، ان پر غفلت و شباب سے پہلے کم زور دنیا چاہئے لیکن اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے تو اس کی تطبیق مباحثے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

اسکولی حکومت | اسکولی نظم حکومت کے متعلق اسی قسم کی کچھ نظری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسکولی معاشرہ کا دروازہ اس مصنوعی جمہوری پر ہے جس کی نوعیت اُس بڑی سوسائٹی کے دبانے والے اثرات سے مختلف ہوتی ہے جن سے ایک شہری ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکولی حکومت کا حامل بزرگوں کے منتخب مقاصد کی روشنی میں بچوں کی زندگی کا انضباط ہے تاہم چونکہ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بچے اور بچیاں بحیثیت مرد اور عورت کے بڑی سوسائٹی کی عمومی زندگی میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنا سیکھیں اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے بنیادی خط و خال اسکولی معاشرہ میں موجود ہوں۔ جہاں جہاں جمہوری عقائد کا دور دورہ ہے وہاں اس اصول کو کام میں لانا غیر یقینی ہے۔ موجودہ دور میں انگلستان، امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسکولی نظام حکومت کو مکمل جمہوری بنیاد پر چلانے کے تجربات کئے گئے ہیں جن کی رو سے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بحیثیت قانون ساز اور حاکم عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں چونکہ اس قسم کے تجربات بچوں کی نشوونما کی روایات سے متناقض ہیں اس لئے ان کی عملی کامیابی میں بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ تجربات کامیابی حاصل کرتے ہیں جہاں قصور و اربط کو بد اخلاقی سے زیادہ ارباب بست و کشادگی نظر آتی اور عملی سے نجات دلانے کا سوال پیدا ہوتا ہے یعنی ممالک میں اسکولی حکومت کی باگ ڈور اسکولی معاشرہ کے بالغ نمبروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ انگلستان میں خاص کر موجودہ اسکولوں اور گزشتہ صدی کے اسکولوں کے موازنہ میں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک نمایاں عام ترقی اسی جانب میں ہوئی ہے جس کو زیادہ دلیہ مصلحتیں بہت آگے

برصا کے ہیں۔ ساتھ کا استبدادی رویہ جو ایک زمانہ میں ان کا طرہ امتیاز تھا عموماً اس طرح پر متدل ہوا کرتا ہے۔ اب وہ ماکہ مطلق کی طرح اپنی مرضی کا اثر ڈال کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کی حیثیت ایک نظریہ فطری مربی کی ہے جس کے قائم رکھنے میں ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اب اسکولوں میں یہ خیال عام طور پر پھیل رہا ہے کہ اسکول کی حکومت کا بوجھ ان بالغ طلباء کے کندھوں پر رکھا جائے جو اسکولی افادے کو سمجھ سکتے اور اس کی ذمہ داریوں کو برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ اس طریقے سے طلباء کی مرضی کے مطابق کام ہوگا۔ خود اختیاری اور ذمہ داری کا احساس ہوگا اور نیز اس سے اخلاق کی نشوونما بھی ہو سکے گی۔

سنسنیائے امت کا قدیم نظریہ بھی اسکولی حکومت کے نظریہ کی طرح بدلتا ہوگا کیونکہ مزارعہ کا ایک آگے ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ کسی زمانہ میں مزارعہ اسکولی حکومت کا ایک اہم آلہ تھا لیکن آج کل کوئی معلم اس کا استعمال اس شدت سے نہیں کرتا جیسا کہ پہلے معمولیت اور رستی کے خیال سے کرتا تھا۔ اس کی وجہ موجودہ مذہب انسانیت نہیں ہے کیونکہ موجودہ تعلیمی نظریہ کی روشنی میں استاد بے چین اور پریشانی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ ہزار کی ضرورت اس بات کا ہے کہ طلباء کی حقیقی ضروریات اور اسکولی زندگی کے حالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اسس ہم آہنگی نہ پائے جانے کا ذمہ دار خود استاد ہی ہے۔ اسی لئے وہ اصلاح شر کے لئے مزارعہ کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ ان حالات کی روشنی کی سعی کرتا ہے۔ ایسی باتیں مام اصول کے مطابق ہے جس کی وجہ سے اسکول کا کام صحت بخش اور قیمتی قسم کی قطعی سرگزیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی اہم ہے کہ داخلی تادیب کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب صحیح کام کو صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول میں خودی نمودار ہو جائے گی۔ چاہے وہ کتنا ہی سائنٹفک طریقہ سے چلایا جائے کیونکہ معلم کا فرض نہ صرف طلباء کے غلط کرنے کے انسانی رجحان کا جانچنا ہے بلکہ والدین کے غیر دانشمندانہ سلوک کا معاملہ کرنا ہے جو انہوں نے بچوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے ساتھ کیا غلط کاری اور اس کے متعلق مزارعہ کے انداز کی تبنی بھی خواہش کی جائے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے بچوں کے ساتھ کیا نہ برتاؤ کرنا استبدادی ضابطے سے زیادہ اصلاح کا حامل ہو سکتا ہے۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی بی۔ اے

تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟

ہندوستان میں موثر تعلیم کے نتائج کا ریکارڈ شاؤنا دور ہی کسی مدرسہ میں ملے گا۔ اسی ہم اس سلج پر نہیں پہنچے ہیں۔ ہماری تنخواہوں کی کمی اور ہماری سستی اس قسم کے تجربوں میں مانع ہے۔ ہم میں سے اکثر معلمی کے کام کو کوئی اچھا درجہ نہیں دیتے اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھانے والے اکثر اُستاد و فخر کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے ان میں اور ان کی تنخواہیں ایک کنٹیکٹ سٹی رہتی ہے جس کا بالآخر نتیجہ یاوہی یا تنخواہ بڑھانے کے وسائل کا تلاش کرنا ہوتا ہے۔ لہذا ان دونوں صورتوں میں تجربہ کی یادداشت محفوظ ہونا اور اسے ملک کے افادہ کے لئے پیش کرنا امر محال رہا ہے۔ ہمارے قابل مفکرین نے بھی جو کم و بیش کسی تجربہ کو دیکھتے رہے ہیں باہر کی کتابوں کے ترجموں سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔ یہ سب سے بڑا قومی نقصان ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ ذاتی بے اعتمادی ہو۔ ہم یا ہمارے ساتھی جو کچھ تجربہ کرتے ہیں اس کے درست ہونے میں انھیں ہمیشہ شک ہوتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کا کیا ہوا تجربہ بالکل صحیح اور بالکل اصولوں کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ بے اعتمادی کی وجہ سے ہم اپنا کیا ہوا تجربہ خواہ وہ کتنا ہی اصولوں کے مطابق کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے اعتراض اور اپنی کم مانگی کا خیال ہر وقت دامنگیر ہوتا ہے۔ لہذا اس قسم کی اچھی سے اچھی چیز بطور یادداشت کے محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے لوگوں کے سامنے نہیں آتی۔

بے شمار تعلیمی مسائل ہیں جن پر تجربہ کیا جاسکتا ہے اور دیکھا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے کیا نتائج ہوتے ہیں یہاں کے حالات کے مطابق کس قسم کے رد و بدل کی ضرورت ہے۔ مثلاً طلباء میں اچھی ماد میں کیسے پیدا کی جاسکتی ہیں اس کے لئے کیا کیا علمی وسائل اختیار کئے گئے؟ طلباء مختلف مضامین میں کیوں کمزور رہ جاتے ہیں؟ کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں؟ تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟ کون کون سے مواقع پر طلباء نے موثر طریقہ پر سیکھا؟ حافی بہتر بنانے کے لئے گاؤں یا شہر میں کون کون ذرائع اختیار کئے گئے؟ کون کون سی صورتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں؟ پھر غلے بچوں کو کوئی حرفہ سکھانے کے دوران میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں؟ ان پر کس طرح قابو پایا

جاتا ہے؟ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں جو تجربہ کرنے کے بعد لوگوں کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ہماری امداد ہوگی خواہ اس میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں۔ اس خیال سے تو کوئی تجربہ پیش ہی نہ کرنا چاہئے کہ یہ تجربہ اور اس کے نتائج سو فی صدی صحیح اور درست ہوں گے۔ تعلیم میں کوئی بات بالکل آخری نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یا اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں تجربوں کو دل سے کرنا چاہئے اور بغیر کسی قسم کے فرضی اور خیالی امانہ کے اس کے نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر دینا چاہئے۔ اس مضمون میں میں اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا تجربہ تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟ کے متعلق چند باتیں اور اس کے نتائج پیش کرتا ہوں۔

جامعہ ملیہ کے قریب باغ کے مدرسہ میں جسے تعلیمی مرکز بھی کہتے ہیں بچوں کے کام کے ریکارڈ رکھنے کی برابر کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایک ریکارڈ روم ہے جہاں بچوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ، پچوں کی لکھائی کے نمونے، پچوں کے مضامین۔ پچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں، پچوں کی لکھی ہوئی نظمیں اور پچوں کے قلمی رسائل وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ ان رسالوں میں بچوں کی کسی مسئلہ کے متعلق جو مدرسہ یا ان کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ آزاد رائے کی یادداشت بھی محفوظ رکھی جاتی ہے۔ اور حسب سے ہم نے جڑوں کے ذریعہ تعلیم دینا شروع کی ہے۔ پچوں کے بنائے ہوئے کاغذ، ابری اور کارڈ بورڈ کے نمونے بھی یہاں رکھے جاتے ہیں۔ اس تمام کام میں ہم بچوں کی طبیعتوں کے رجحان کا اندازہ کرتے رہتے ہیں اور معلوم کرتے رہتے ہیں کہ بچے کہاں موثر طریقہ پر سیکھتے ہیں۔ کہاں ان کی توجہ سب سے زیادہ ہوتی ہے؟ کہاں وہ بے توجہی کی وجہ سے نقصان کر بیٹھے ہیں؟ کام کتنے ندرتہ دیکھ رہا ہے اور کب سے اس کی تجسس کم ہونے لگتی ہے؟ ایک موٹی سی بات اس تمام کام میں یہ سمجھیں انی ہے کہ تعلیم اس وقت تک موثر نہیں ہوتی جب تک وہ طالب علم کا اپنا مقصد نہیں ہو جاتی خواہ وہ کسی قسم کی تعلیم جو ہم استاد اسی بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کام مکمل اور کسی بات کے بتلانے اور سکھانے کو طالب علم کا مقصد بنادیں۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ اس بات کو ہم اپنی ضرورت سے سیکھ رہے ہیں۔ بغیر سیکھے ہماری ضرورت نہیں پوری ہوگی۔ اگر آپ تعلیم اور کام کو طلبا کے لئے بامقصد بنادیں تو آپ دیکھیں گے کہ تعلیم خود بخود موثر ہوتی چلی جائے گی۔ آپ کو طریقہ تعلیم سے بھی کم مدد ملنی پڑے گی۔ طالب علم اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے

جوابات لیکننا چاہے گا اس کے لئے وہ خود طریقہ تعلیم معلوم کرے گا اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ سیکھنے کے تمام درجے طریقہ تعلیم کے متعلق طے کر رہا ہوگا۔

تعلیمی مرکز میں جہاں باغبانی ہکاڑو بورڈ اور بری بنانا اور کاغذ بنانا سکھایا جاتا ہے اور اس کام کی دیکھ بھال کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہاں لین دین اور حسابی مشق کے لئے بچوں کے بینک بچوں کی دوکان اور شعبہ مصنوعات کی اشتیاء فروخت کرنے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ میں نے جن مواقع کا اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر ان حروف اور مقاصد سے متعلق ہیں ہم نے زیر بحث بات اس وقت پیش کی جب طلباء نے اس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی جب وہ آمادہ نظر آئے جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ بات ان کا مقصد ہو چکی ہے۔

۱۔ بچوں کے بینک کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے جن بچوں کی رقمیں بینک میں جمع ہیں ان کو اس موقع پر ان کی رقم پر منافع ملے گا۔ بینک کے تین سو ممبر ہیں ۱۰۰ فی صدی سالانہ کے حساب سے منافع دیا جائے گا۔ ابتدائی ششّم کے طلباء جو بینک کا کام کرتے ہیں ہر طالب علم کا منافع اس کی رقم پر لگانا چاہتے ہیں۔ استاد ان کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منافع یا سود پھیلائے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ بچے اس کو سیکھتے ہیں اور تمام ممبران کا منافع پھیلاتے ہیں منافع کے جسبٹر میں درج کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو طلباء نے شوق سے سکھا انہیں اس کی ضرورت تھی۔

۲۔ گل دیوار کے کئی پودوں کو باغبانی میں دیکھنے کے لئے خراب کر دیا۔ موتیا کے کئی پودے بھی دیکھنے کی ضرورت ہو چکے ہیں طلباء چاہتے ہیں کہ کسی طرح دیکھ کا خاتمہ ہو جائے تاکہ باقی پودے بچ جائیں۔ کتا بوں اور رسالوں سے دیکھ کو تباہ کرنے کے کئی نسخے انہوں نے معلوم کئے اپنی کاپیوں میں لکھے۔ ان نسخوں میں سے دو کا ہتھکڑ کر کے دیکھ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات بہت مہتر طریقہ پر ان کو معلوم ہو گئی۔ دیکھ کا حال اپنے شوق سے پڑھا۔

۳۔ نیا سال شروع ہوا ہے۔ بچوں کی دوکان میں بچوں کی ضروریات کی تمام چیزیں خریدی جا چکی ہیں۔ ابتدائی پنجم کے طلباء جو بچوں کی دوکان کا کام کرتے ہیں، یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس چیز پر دوکان کو کتنا فی صدی منافع لیا جاتا ہے؟ وہی طریقہ بری صدی نکالنا جانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی ضرورت ہے وہ سو فی صدی اس کیلئے

تیار ہیں جو کچھ ان کو بتلایا گیا انھوں نے سرفی صدی موثر طریقہ پر سیکھ لیا ہے۔

(۴) ابتدائی سٹشٹم کے طلباء رومی کاغذ بنا رہے ہیں۔ کچھ گلدی پکھل رہے ہیں، کچھ کاغذ اٹھا رہے ہیں کچھ چمکا کر رہے ہیں کچھ جو کر بنا رہے ہیں استاد اس دوران میں ان کو یہ بتلاتا ہے کہ سب سے پہلے ہاتھ سے کاغذ کن ملکوں میں بناتا تھا اور اس کو ساحل کے کس طرح دوسرے ملکوں میں پہونچایا؟ ساحل کی کمانیوں سے کچھ ساحل کے حالات بتائے گئے۔

(۵) پاپیروس جماعت کے طلباء چھ پہلو والی کشتی بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بنانے کا طریقہ انھیں نہیں معلوم ہے۔ وہ استاد سے پوچھتے ہیں۔ استاد چھ پہل کشتی بنوانے سے بیشتر طلباء کو چھ پہل شکل بنانا سکھاتا ہے۔ طلباء اسے خوشی سے سیکھتے ہیں۔

(۶) ابتدائی اول کے طلباء ابری بنانے کے دوران میں لٹی ایک دوسرے کے لگا دیتے ہیں درمی میں پوچھ دیتے ہیں ہاتھ نہیں دھوئے یا دھوئے ہیں ٹوڑتے یا شیروانی کے دامن میں ہاتھ پوچھ لیتے ہیں استاد سب کو جمع کر کے صاف رہنے کے متعلق بتلاتا ہے رفتہ رفتہ اس کی عادت پیدا کرتا ہے طلباء اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں صاف رہنا سیکھتے ہیں۔

(۷) لٹی پکانے کے لئے ابتدائی بنجم کے طلباء گھیٹھی میں کوئلہ جلانا چاہتے ہیں۔ کوئلہ کاغذ اور ماچس ملگائی جاتی ہے۔ استاد لٹی پکانے کے دوران میں ماچس کے متعلق تعویذی سی واقفیت دیتا ہے۔ لٹی پکنے کے بعد کمرہ جماعت میں ماچس ہر ایک سبق ان کی کتاب سے پڑھا تا ہے سبق کا مطالعہ پوری دلچسپی سے ہوتا ہے۔ اسی موقع پر پہلی جماعت کا ایک استاد لٹی پکنے کے دوران میں بچوں کو بتلاتا ہے کہ بہت پہلے جب ماچس و فیور کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ آگ کس طرح جالتے تھے اور اس طرح بچوں کو ابتدائی انسان کی کمائی سناتا ہے۔ جسے جتنے تصویروں سے مدد لیتا ہے۔

(۸) ابتدائی اول اور دوم کے بچے لٹی اور پانی کی ابری بناتے ہیں یہ دو طرح کی ابریاں ہیں ایک لٹی اور رنگ سے بنائی جاتی ہے دوسری پانی پر دفنی رنگ چھڑک کر اور فروخت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ کا ایک فل اسکیپ تختہ فروخت کرتے ہیں۔ وہ روزانہ گنتا پیسوں سے آئے بنانا اور آؤں سے روپے بنانا سیکھتے ہیں۔

اور اس کی مشق کرتے ہیں۔ روزانہ اپنی آمدنی کا حساب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ با مقصد طریقہ پر اس کی مشق کرتے ہیں کیونکہ انھیں اس کی ضرورت ہے۔

(۹) آج کل ٹیوب کے رنگ سے ابری نہیں بنوائی جاتی۔ بچے مصروف ہیں کہ ٹیوب کے رنگوں سے ابری بنائی جائے اس لئے کہ ٹیوب کے رنگ سے بچے بہت اچھی ابری بنا چکے ہیں۔ استاد بچوں کو بتلاتا ہے کہ یہ رنگ جرمینی اور انگلستان سے آتے تھے۔ پہلے ایک ٹیوب ۱۲ کرا ملتا تھا اب اول تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو بہت پرانا جس سے ابری اچھی نہیں بنتی اور ایک ٹیوب ۴۰ کرا ملتا ہے۔ استاد نقشہ کا استعمال کرتا ہے اور یورپ کے نقشہ پر جرمینی اور انگلستان دکھلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ بال کس راستہ سے ہندوستان آتا تھا۔ ابتدائی ششم میں اس موقع پر موجودہ جنگ کی وجوہات پر ایک مختصر معلومات دی جاتی ہے۔

میں نے چند با مقصد مواقع کا تذکرہ کیا ہے جہاں تعلیم موثر طریقے پر ہوئی ہے۔ اس پر اور اضافہ کیا جاسکتا ہے اور جماعت میں طلباء کے کام کا ریکارڈ رکھنے سے اس سے اچھے مواقع کی یادداشت ترتیب دی جاسکتی ہے۔ بغیر یادداشت کے اچھے سے اچھے مواقع نظر انداز ہو سکتے ہیں اس لئے موثر تعلیم کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے یادداشتوں کا ہونا ضروری ہے جو بہت با مبالغہ طریقہ پر رکھی جائیں۔

سید احمد علی صاحب

بھبیہ

(ترجمہ مکینڈ ڈاؤن مصنفہ برنارڈ شا)

گلدشتہ سے پیوستہ

دوسرا ایکٹ

ا) اسی دن شام کو۔ وہی کمرہ مانوں کی کرسی میز پر دوبارہ رکھ دی گئی ہے۔ باج میکلس تنہا بیٹھا ہوا ہے وقت کاٹنے کے لئے وہ ٹائپ رائٹر چھونے لگتا ہے اور جانا چاہتا ہے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ دروازہ کھری کی آہٹ سناتا ہے اور چپکے سے کھڑکی کے پاس کھسک جاتا ہے اور کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کچھ کر رہی نہیں رہا تھا اس کا رشتہ ہاتھ میں ایک نوٹ بک لئے ہوئے جس میں دو ماریل کے ارشادات شارٹ ہینڈ میں لکھا کرتی ہے، اندر داخل ہوتی ہے اور آکر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے تاکہ کچھ عبارت ٹائپ کرے۔ کام شروع کر دیتی ہے اور اس قدر مشغول ہوتی ہے کہ یوہین کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن جب دوسری سطر ٹائپ کرتی ہے تو ایڈم رک جاتی ہے اور فریڈین دیکھنے لگتی ہے کچھ گڑبڑ ہے)

پ۔ اچھا باج میکلس تم نے میرے ٹائپ رائٹر کو خراب کر دیا ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس طرح اس طرف دیکھ رہے ہو جیسے تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔

می۔ (ادب کر) مجھے بہت افسوس ہے مں گارنٹ! میں صرف اس سے ٹائپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا نکایت کرتے ہوئے، لیکن ٹائپ ہی نہیں ہوا۔

پ۔ تم نے اس کی روشنائی والے پڑنے کو بدلا ہو گا۔

می۔ (یقین لاتے ہوئے)۔ نہیں میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے بالکل نہیں بدلا میں نے صرف ایک چھوٹا

پیشہ لکھایا تھا۔ وہ کلک سا ہوا

پ۔ اچھا اب میں سمجھ گئی (وہ فعل ہی ٹھیک کر دیتی ہے اور باتیں بھی کرتی جاتی ہے) میرے خیال میں تم اسے آسان
 قسم کی مشین کا بابا سمجھو کہ ذرا ہینڈل گھمایا اور اس نے ایک عشقیہ خط تمہارے لئے لکھ دیا۔ کیونکہ ناہ
 می م۔ (سنبیدگی سے) میرے خیال میں اس مشین سے بھی عشقیہ خطوط لکھے جاسکتے ہیں۔ مشین مشین سب
 برابر ہیں کیوں ناہ؟

پ۔ اچھا اگر ناہ غلط ہو تو گواہ اس قسم کی باتیں اگر تمہارے بھائیوں کو کوئی مضائقہ نہیں دے گا اس قسم کی باتیں کرنا اس کے دستور عمل
 کے خلاف ہے (مجھے کیا معلوم۔ تم مجھ سے آخر یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟
 می م۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہر سمجھدار آدمی خصوصاً وہ لوگ جو دن بھر کاروبار میں لگے رہتے
 ہیں یا معمری قسم کا پیشہ کرتے ہیں ضرور مشغلہ محبت رکھتے ہوں گے تاکہ ان کا داغ خواب نہ ہو جائے۔
 پ۔ (غصہ سے کمرے ہو کر مشرباج مینکس!) (وہ اس کی طرف نہایت سختی سے دیکھتی ہے اور نہایت شان کے ساتھ
 جگ کپکپ کی طرف جلی جاتی ہے)

می م۔ اس کے پاس نہایت عاجزی سے باتے ہوئے مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ شاید مجھے نہ چاہیے
 تھا کہ آپ کے معاملات دل کی طرف اشارہ کرتا۔

پ۔ (الٹاری میں ایک نیلی کتاب رکھتے ہوئے اور اس کی طرف نہایت تیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے) میرے کوئی دلی
 معاملات نہیں ہیں۔ تم آخر اس قسم کی مجھ سے باتیں کرنے کی جرات کیسے کر رہے ہو؟ (کتاب کو اپنی اپٹل میں دبایا
 ہے اور مشین کی طرف اڑتی ہوئی جا رہی ہے، یوحین کے دل میں درد سا پیدا ہوتا ہے اور وہ نہایت ہمدردانہ طریقہ پر
 مخاطب ہوتا ہے)

می م۔ اچھا تو میں سمجھ گیا۔ تم کو بھی میری طرح ہی حیرت انگیز ہے۔ جینیب معلوم ہوتی ہے

پ۔ ہرگز نہیں۔ میں قطعی شرم نہیں کرتی اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

می م۔ (چپکے سے رازدارانہ طور پر) تم محبت کرتی ہو اور یہی تو وجہ ہے کہ دنیا میں اس قدر کم معاملات دلہوتے ہیں
 ہم سب محبت کے بھوکے ادھر ادھر گھومنا کرتے ہیں۔ محبت ہماری نظرت کی اذین سرودت ہے۔ ہمارے

دوں کی اولین خواہش لیکن ہم اپنا شوق اپنی زبان سے کہنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہم سب کو حیا و انگیز رہتی ہے (بڑے غلوں سے) اس کا رنٹ جلا تم ہی بناؤ کہ اس خواہ خواہ کی جھجک، اس ڈر، اس شرم سے نجات پانے کے لئے کیا کیا دل نہ چاہتا ہوگا۔

پ۔ اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے میں سچ کہتی :-

می۔ م۔ افسوس کرتے ہوئے، اؤ اؤ! یہ خواہ خواہ کی باتیں میرے سامنے رہنے دو، یہ سب نقص بناوٹ ہوتی ہے جن میں سے مرعوب نہیں ہوا! آخر ان باتوں سے فائدہ ہی کیا تم اپنی اہلی شخصیت بچ پڑا ہر کرنے سے کیوں ڈرتی ہو؟ میں بھی بالکل تماری طرح ہوں۔

پ۔ میری طرح ایہ آخر بات کیا ہے؟ یہ تم مجھے خوش کر رہے ہو یا اپنے کو میری سمجھ میں نہیں آتا کس کو؟ (دو پیرہ) مانپ (انٹری طرف متوجہ ہونا چاہتی ہے)

می۔ م۔ (اسے چپکے سے روکتے ہوئے) جی، میری سنا میں ہر جگہ محبت کی تلاش میں گھومتا ہوں میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کے سینوں میں بھی یہی چیز طوفانی شدت سے موجزن ہے لیکن جب میں کسی سے اس کی درخواست کرنا چاہتا ہوں تو یہی شرم ہی جیسا میرا گلا پکڑ لیتی ہے اور میں گونگا کھڑا رہ جاتا ہوں بلکہ گونگے سے بھی بدتر۔ بے معنی باتیں اور اجتماعت جھوٹ بکے لگتا ہوں اور پھر طوہ یہ کہ میں دیکھتا ہوں وہی محبت جس کے لئے میں بیتاب تھا، جس کا میں بھکاری تھا کتنے بیسوں اور پرندوں کو دی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ آتے ہیں اور اس کے مطالب ہوتے ہیں۔ ٹانگ سکتے ہیں اور ٹانگ لیتے ہیں (غاموشتی سے سرگوشی کرتے ہوئے) محبت ہر جگہ طلب کرنا چاہئے۔ یہ بالکل ایک جن کی طرح ہے جب تک تم خود اس سے نہ بولو یہ نہیں بولتی لیکن (پھر اپنے اہلی بوجہ میں لیکن ایوی کے ساتھ) وہاں میں محبت ہر جگہ اظہار کیلئے بے قرار و مضطرب رہتی ہے لیکن اظہار کی جرات نہیں کرتی اس لئے کہ وہی شرم، انگیزہ ہو جاتی ہے، حیا مانع آتی ہے بس یہی دنیا کا ایک المناک پہلو ہے (مناسبت) گہری سانس لیتا ہے اور لافانیوں والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا سنا اپنے ہاتھوں سے چھال لیتا ہے)

پ۔ (مناسبت تعجب ہو کر لیکن جوش و جاس قائم رکھتے ہوئے) اور اجنبی نوجوانوں کے سامنے اپنے عفت و عصمت کے احساس کی نمود کرتے ہوئے، لیکن خراب قسم کے لوگ تو اس شرم پر نالاب آ جاتے ہیں۔ کیوں؟

می م۔ رجٹ پٹا اٹھ بیٹھے ہوئے اور نہایت شدت سے کہتے ہوئے (خواب لوگ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کا جذبہ نہیں ہوتا اسی لئے ان کو شرم بھی نہیں ہوتی۔ ان کو محبت طلب کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اور اپنی محبت جتانے کی ان میں طاقت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے پاس ہوتی ہی نہیں (وہ اپنی جگہ پر پختہ ہو جاتا ہے اور حسرت سے کہتا ہے) لیکن ہم۔ ہم لوگ جو محبت واسے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری محبت دوسروں کی محبت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایک لفظ سنو سے نین نکال سکتے (نہایت دب کر) سمجھیں آپ !

پ۔ اچھا سنو! اگر تم نے اس قسم کی باتیں مجھ سے کرنا بند نہ کیں تو میں کمرے کے باقی چلی جاؤں گی مسٹر باجے بیکس میں سچ مچ چلی جاؤں گی یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔
(وہ پھر اپنے نائب رائلز پر چلی جاتی ہے۔ اپنی نئی کتاب کھولتی ہے اور اس سے ایک صفحہ نقل کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔)

می م۔ (ناامیدی سے) ہاں بچی باتیں کبھی اچھی باتیں نہیں ہوتیں (وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمرے میں کھڑا ہوا سا ٹٹلے لگتا ہے)
مس گارنٹ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اور کیا باتیں کروں؟
پ۔ (بے خمی سے) ادھر ادھر کی باتیں کرو۔ موسم کی باتیں کرو۔

می م۔ فرض کرو اگر ایک بچہ قریب ہی بھوک کے مارے چلا رہا ہوتا تو کیا تم اس سے بس ادھر ادھر کی باتیں کرو گے؟
پ۔ نہیں

می م۔ بس اسی طرح میں ادھر ادھر کی باتیں نہیں کر سکتا جب میرا دل اپنی بھوک کی وجہ سے تڑپ رہا ہے
پ۔ اچھا! تو پھر چپ رہو۔

می م۔ ان باتیں ہی تو ہوتا ہی ہے ہم سب اپنی اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں کیا اس سے دل کی دھڑکن بھی خفا ہو سکتی ہے؟ ہمیں دل برابر روکے جاتا ہے۔ ہے نا، ضرور اور قطعی ہی ہوتا ہوگا۔ اگر تم مارے پاس واقعی دل ہے۔

پ۔ (ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے) کئی فائدہ ہی نہیں کریں کام کرنے کی کوشش

کروں جبکہ تم اس قسم کی باتیں کہنے چلے جا رہے ہو میرے اٹک مہلے پر آئیتمیں ہے احساسات متسل ہیں،
تمہیں اس سے کیا مطلب کہ میرا دل روتا ہے کہ نہیں پھر بھی میرا ارادہ ہوتا ہے کہ تم کو بتا دوں۔

می م۔ نہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی سے جانتا ہوں

پ۔ لیکن دیکھو، اگر تم نے ذرا بھی کہیں زبان کھولی تو میں فوراً ابھرا کر دوں گی۔

می م۔ (ہمدردی سے) ہاں، یہ بھی جانتا ہوں۔ اچھا تو تمہاری ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے کہہ سکتیں؛

پ۔ (اچھل پڑتے ہوئے) اس سے کس سے؟

می م۔ وہ جو کوئی ہو۔ میرا مطلب یہ کہ وہ شخص جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ کوئی ہو۔ مسٹر مل شاید۔

پ۔ (خفارت سے) مسٹر مل! خوب وہ بڑا اچھا آدمی ہی ہے کہ جس پر اپنا دل کھو بیٹھوں؟ اس سے زیادہ تو

میں تمہیں پسند کر سکتی ہوں۔

می م۔ (جبکہ پڑتے ہوئے) نہیں، نہیں میں نہیں مجھے بہت افسوس ہے لیکن تمہیں اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہئے میں۔

پ۔ (زنج ہو کر آئندہ ان کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے) اس کی طرف پتہ کر کے، تمہارے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔ وہ شخص تمہیں جو جگہ دراصل کوئی خاص شخص نہیں ہے۔

می م۔ میں جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم اس سے محبت کرو گے جو تم سے اظہار۔

پ۔ (مڑتے ہوئے نہایت غصے سے) مجھ سے اظہار۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم نے مجھے آخر سمجھا کیا ہے؟

می م۔ (ناامید ہو کر) اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سچ جواب کبھی نہ دو گے۔ وہی جیوٹی باتیں کرتی ہو جو ہر شخص کہنے

لگتا ہے (دو صوفے کی طرف جاتا ہے اور انتہائی ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (اچر کر گواہ) اسے خراب لگتا ہے کہ اس باتیں کرنا نہیں چاہتا، اگر تم ہمیشہ نئی اور زبانی باتیں چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے

کہ تم خود اپنے سے تنہائی میں جا کر باتیں کر لیا کرو۔

می م۔ ہاں، یہی تو پھر کرنا ہوتا ہی ہے۔ ہر شاعر ہی کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بلند آوازیں باتیں کیا کرتے ہیں اور

دنیا ان کی باتیں سن لیتی ہے پھر بھی یہ سخت تنہائی کی باتیں ہیں اس لئے کبھی کبھی دوسروں کی باتیں سننے

کو بھی جی چاہتا ہے۔

پ۔ اچھا کو اسٹراڈیل آتے ہوں گے دو تم سے باتیں کریں گے (ارجی رز بانا ہے نہیں تمہارے گھر لانے اور سونے کی ضرورت نہیں ہے دو تم سے بہتر باتیں کر سکتے ہیں کہ تم کو کسے کہنا چاہتا ہے۔)
 داغ درست کر دیں گے لانا لکھو غصہ سے اپنی جگہ جانے کے لئے مڑنا ہے لیکن یوحنا ایک دم چونک پڑتا ہے
 ناش ہو جاتا ہے ڈھنگ لڑتا ہے اور اس کو روک دیتا ہے

می۔ م۔ غاہ! اب میں سمجھا!!

پ۔ (سرخ ہوتے ہوئے) کیا مجھے؟

می۔ م۔ تمہارا ران کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے سچ بتا کیا واقعی اور حقیقتاً یہ ممکن ہے ایک عورت کے لئے کہ اس سے محبت کر سکے؟

پ۔ (گویا بات حد سے گذر گئی خوب)!

می۔ م۔ (جوش سے) نہیں نہیں، سچ مجھے بتاؤ تو ذرا میں جاننا چاہتا ہوں میں قطعی جاننا چاہتا ہوں میری سحر میں یہ بات بالکل آتی ہی نہیں مجھے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے الفاظ کے متبرک خیالوں کے اور وہ بات جسے لوگ الوہیت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن تم ان باتوں سے تو محبت کر نہیں سکتیں؟

پ۔ (تجاہل مارنا نہ اسے اس کی بات کو لے کر کوشش کرتے ہوئے) میری تو بالکل سحر میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

می۔ م۔ (زدستہ) تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم قطعی میری بات سمجھ رہی ہو۔

پ۔ اچھا!

می۔ م۔ تم قطعی سمجھ رہی ہو اور قطعی میرا مطلب تمہاری سحر میں نہیں آتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عورت اس سے محبت کرے؟

پ۔ (اس کی طرف آنکھیں چا کر کہے) ہاں! (وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھوں سے بند کر لیتا ہے) ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا؟
 (وہ اپنے ہاتھوں کو ہٹا لیتا ہے پر راز پان اس کی اس حالت کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور مبتلا دور ہو سکتا ہے ہٹ جاتی ہے لیکن اس کی طرف برابر دیکھ جاتی ہے یوحنا اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اٹھتا ہے اور بچوں والی

کری پر جا بیٹھا ہے نہایت ہی ناامیدی کے ساتھ وہ باہر طرپ جانا چاہتی ہے لیکن جیسے دروازہ کے پاس پہنچی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور برگیں اندر داخل ہوتا ہے اور وہ ایک دم بول اٹھتی ہے، خدا کا شکر ہے آخر کوئی آٹو گیا (اُسے گونہ اطمینان ہو جاتا ہے اور میز پر اپنی جگہ آ بیٹھتی ہے۔ ٹائپ رائٹر میں ایک بنا کاغذ لگا دیتی ہے برگیں یوہین کے پاس چلا جاتا ہے،

ب۔ (دور ملاقاتی کی آؤ بگلت ظاہر کرتے ہوئے، خوب، ٹوکیا اسی طرح آپ تنہا چھوڑ دے جاتے ہیں، مسٹر ایچ بنگکر میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے آ گیا ہوں (یوہین اس کی طرف وحشت سے دیکھتا ہے لیکن وہ اسے نہیں سمجھتا، جیسے کمانے والے کمے میں کسی دفعہ سے باتیں کر رہا ہے اور کینڈی اوپر کسی لڑکی کو کشیدہ کاری سکھلا رہی ہے) ہمدردی جاتے ہوئے، یہاں آپ کی اکیلے اکیلے طبیعت گھبرا گئی ہوگی کہ سوائے ٹائپ کے اور کوئی باتیں کرنے والا نہ تھا (وہ آرام کر سکی کہ اپنی طرف گھسینا ہے اور اس پر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (نہایت ہی برا فروختہ ہو کر) انھیں اب اطمینان ہو جائیگا کیونکہ اب انھیں آغوش سے شریفانہ گفتگو کر سکتا شرف حاصل ہو گیا ہے یہ بھی کیا کم ہے (اتنا کم کہ وہ زور شوشے ٹائپ کرنے لگتی ہے،

ب۔ (اس کی حیات پر تعجب ہو کر) جوان عورت میں تجھ سے باتیں نہیں کر رہا تھا میرا جہاں تک خیال ہے۔

پ۔ مسٹر ایچ بنگکر آپ نے اس قسم کا بھی خراب اخلاق کہیں دیکھا ہے؟

ب۔ (شاندار تنبیہ گت) یوہین ایک شریف آدمی ہے اور اپنی پوزیشن سے بخوبی واقف ہے اور یہ دو خوبی ہے جو لوگوں میں کم ہوتی ہے۔

پ۔ (جھلا کر) اچھا تو گویا نہ تم شریف آدمی ہو اور نہ میں شریف عورت اگر یوہین یہاں نہ ہوتے تو میں تم سے ذرا صاف گفتگو کرتی (وہ اپنی نشین سے ٹائپ کیا ہوا خط اتارے زور سے نکالتی ہے کہ پھٹ جاتا ہے، دیکھا، یہ خط آخر تباہی و برباد خراب ہو گیا اب مجھے دوبارہ پھر اسے ٹائپ کرنا پڑے گا۔ لا حول و لا قوۃ میں اپنے کو ضبط نہیں کر پا رہی ہوں۔ کھوسٹ، احمق، لگدھا۔

ب۔ (اٹھ کھڑے ہر کہ فہم سے اپنے ہوتے، خوب، میں کھوسٹ، احمق اور لگدھا ہوں خوب، خوب، بہت گہری سانسیں لیتے ہوئے) اچھی بات چھو کر ہی، بہت اچھی بات ہے۔ ذرا رک جاؤ تمہارا مالک آئے پھر میں تمہیں بتاؤں گا

بھر دیکھنا، پھر تبتلاؤں گا۔

پ۔ (محسوس کر کے کہ دقتی وہ کچھ زیادہ گھنگنی) میں۔

ب۔ اس کا کلام قطع کرتے ہوئے، انہیں اس اب جو کچھ تمہیں کہنا تھا کہہ چکیں۔ پس اب تمہیں مجھ سے بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بتلا دوں گا کہ میں کون ہوں (اپنا پُر رائیوں دوسرا کاغذ چماتی ہے اور حشرات سے کچھ پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیتی ہے) مسٹر یوجین آپ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے گا۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں (نمائتہ شان سے پھر بیٹھا جاتا ہے)

می۔ بہت پریشان ہو کر اور ہم کی میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا موضوع کلام بدل دیں میرا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مس کا رنٹ کا مطلب آپ کی طرف ایسا نہ تھا۔

پ۔ (مغنی یقین کے ساتھ) میں نے وہی کہا جو میرا مطلب تھا۔

ب۔ ایسی عورتوں کی باتیں سننا میری شان کے خلاف ہے۔
(ایک برقی گھنٹی دو دفعہ بجتی ہے)

پ۔ اپنے کاغذات (ڈونٹ بک) اکٹھا کرتے ہوئے، یہ میرے لئے ہے (وہ جلد ہی سے باہر چلی جاتی ہے)

ب۔ اس کی طرف متوجہ کر کے کہتے ہوئے، خیر جاؤ، ہم لوگ تم کو جاننے کی اجازت دے رہے ہیں (اس بات سے سرزد ہو کر کہ آخری جلد انہیں کارہا اور ہمزرا اور اثر جانے کے لئے آپ کی طرف براہر دیکھتے رہتے ہیں جب وہ بالکل اوجھل ہو جاتی ہے تب اپنی جگہ پر یوجین کے قریب بیٹھ جاتے ہیں اور اس سے رازدارانہ لہجوں میں بات چیت کرنے لگتے ہیں) مسٹر یوجین اب ہم اس وقت بالکل تنہا ہیں میں ایک بات آپ سے دوستانہ مشورہ کے طور پر کہتا ہوں جو اگر کسی سے نہ کہنا۔ اچھا پہلے یہ بتائیے آپ سے اور میرے داماد جس سے کتنے عرصے ملاقات ہے؟

می۔ مجھے یاد نہیں تاریخیں مجھے یاد ہی نہیں رہیں، جہاں تک میرا خیال ہے وہی ایک دو ایک مہینے ہوئے ہونگے

ب۔ آپ کو اس میں کوئی عجیب بات نظر آئی؟

می۔ نہیں مجھے تو نہیں نظر آئی۔

ب۔ موٹو طور پر اور نہ آپ کو نظر آئے گی اور یہی مشکل ہے۔ خیر تو سنئے جیسے پاگل ہے۔

ی۔ م۔ پاگل،

ب۔ بالکل پاگل، ایسا پاگل حیا پاچ میں حرکتیں پاگل ہو جاتا ہے۔ ذرا آپ غور کیجئے گا آپ کو فوراً پتہ چل جائے گا۔

ی۔ م۔ رہے کلی سے لیکن غالباً اس کے خیالات کی وجہ سے وہ ایسا۔

ب۔ اس کے گھنے کواٹل سے چکر دباتے ہوئے تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ رہے، بس بس امیٹراچ بینکس انہیں خیالات سے میرا مطلب تھا۔ اور میری بات یاد رکھیے گا کہ خیالات جب تک محض خیالات رہیں اس وقت تک کوئی حرج نہیں لیکن جب ان پر لوگ عمل کرنے لگیں تو معاملات بہت ابھرم ہو جاتے ہیں لیکن ان باتوں کو دھیان میں لانے کا ارادہ میرا نہ تھا (دراحدہ دیکھتے ہوئے) اگر یقین ہو جائے کوئی اور تو نہیں ہے پورس کے بعد یو جین کے کان کی طرف جھکتا ہے، آپ کو معلوم ہے اس نے آج سویرے مجھ سے کیا کہا؟

ی۔ م۔ کیا!

ب۔ کہنے لگا، اور تین ماہ کے میں آنا ہی سچ کہہ رہا ہوں جیسے یہ بات کہ میں اور آپ یہاں آنے سے سانسے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو مجھ سے کہنے لگا کہ میں ایک بیوقوف آدمی ہوں اور تم ایک بدعاش ہیں اور ایک بدعاش ذرا دیکھئے تو اور بھر بھر سے اس بات پر باتہ لایا گیا اس میں میری تعریف زیادہ ہے کیا آپ ان باتوں کو ہوش و حواس کی باتیں کہہ سکتے ہیں؟

م۔ (ابھرمپ کو بجاتے ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے) ان سب کے نام اور بچے لکھ لینا مس گارنٹ!

پ۔ (دور پر) بہت خوب میٹر ماریل!

(ماریل اندر جاتا ہے۔ وفد کے کاغذات ہاتھ میں ہیں)

ب۔ (یو جین سے الگ) دیکھو وہ آگیا ہے ذرا نگاہ رکھئے گا اور اس بات کا خیال رکھئے گا (یکدم اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) جیسے! مجھے انوس ہے کہ مجھے تم سے ایک شکایت کرنی پڑ رہی ہے حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کرنا چاہئے بلکہ ایک فرض کے۔

- م۔ غیرت کیا بات ہے؛
- ب۔ مٹری م اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں (نہایت خجندگی سے) تمہاری وہ جوانی چھو کر ہی اپنے آپ کو اتنا بول گئی کہ مجھے ایک کھوست، احمق اور گدہ مل گئے تھے۔
- م۔ انہایت شدید سرت سے! اچھا! خوب یہ پرازی نے کما ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دراز باہر صاف گوا اور جیاک ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں روک ہی نہیں سکتی۔ بیچاری! اہلہا۔
- ب۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) اور کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو برداشت کروں گا؟
- م۔ واقعہ: لا حول و لا قوۃ! تم اس کا بالکل کچھ خیال ہی نہ کرو۔ بالکل سنو ہی نہیں (وہ بڑی کڑھٹ چلا جاتا ہے اور کانٹا کو درازوں میں رکھ دیتا ہے)
- ب۔ ہاں میں نے خیال تو واقعی نہیں کیا میں ان معمولی باتوں سے بہت بلند ہوں لیکن یہ اس کی کچھ ٹھیک حرکت نہیں ہے۔ تم ہی بتلاؤ کہ بجلا یہ بھی کونسی حرکت ہے کہاں تک درست ہے؟
- م۔ درستی اور نادرتی کا سوال تو خیر پادریوں کے لئے ہے عوام کے لئے نہیں لیکن کیا اس بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے؟ میرا تو خیال نہیں ہے کہ تمہیں کوئی اذیت پہنچی ہوگی اس لئے اب اس کا خیال ہی چھوڑ دو (وہ اس منہن کوں میں پختہ کر دیتا ہے اور اپنے گلے بڑے میں مصروف ہو جاتا ہے)
- ب۔ (ای م سے الگ) میں نے آپ سے کہا تھا: بالکل اور غلطی پاگل (وہ میز کے پاس جاتا ہے اور ہر کے آدمیوں کی طرح ایک طرح کے گرسنہ ہو میں پوچھتا ہے، کمانے میں کتنی دیر ہے جیس؟
- م۔ ابھی دو گھنٹہ تک تو تیار ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔
- ب۔ (مہر کے لہجہ میں) اچھا تو پھر مجھے جب تک کوئی اچھی سی کتاب دیدہ میں وہاں آتش دان کے قریب پڑوں گا۔ ساتھی بھی عمدہ ہے۔
- م۔ کس طرح کی کتاب چاہئے کوئی دائمی عمدہ کتاب؟
- ب۔ ایک دم شدت سے اٹھا کر کے اٹھے ہوئے) ارے نہیں بس یونہی کوئی دلچسپ کتاب۔ بس وقت کاٹنے کے لئے (داریل میز پر سے ایک تصویر دار اخبار اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے وہ اسے بہت نیاز مندی سے

قبول کر لیا ہے اسٹیکر جیمیں؛ (آنتھان کے قریب اپنی بڑی کرسی پر چلا جاتا ہے اور وہاں نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

م۔ (کھٹا بھی جا رہا ہے) کینیڈا نام لوگوں سے باتیں کرنے کے لئے بس اب آئی ہی ہوگی چھانٹنے سے تو اسے چھٹی لگ گئی ہے لیکن وہ ابھی لیمپوں میں تیل بھر رہی ہے۔

می م۔ (نہایت ہی وحشت زدہ ہو کر دھک دھک پڑتے ہوئے) لیکن اس سے تو اس کے ہاتھ میلے ہو جائیں گے۔ ماریل! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا یہ نہایت شرمناک بات ہے میں جانتا ہوں اور خود بخود روں گا۔ اور دازسے کی طرف بڑھتا ہے)

م۔ بہتر یہ ہے کہ تم نہ جاؤ می م ایک دم رک جاتا ہے) کیونکہ تم سے بجائے اس کے وہ میرے ہونٹ صاف کرانے لگی تاکہ میں اپنے منہ کے اس کام سے بچ جاؤں۔

ب۔ (بست! پسندیدگی سے) جس میں کیا اب تم نوکر نہیں رکھتے؟

م۔ ہاں ہے تو لیکن دو غلام نہیں ہے پھر بھی گھرا یا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے پاس تین چار نوکر موجود ہوں یہی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہے اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پر ازی اور میں ناشتہ کے بعد اپنے کام کی باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور کپڑے بھی دھوئے جاتے ہیں جب (دوا دہی ہوتی ہے تو کپڑے دھونے میں کوئی رقت سلوم نہیں ہوتی۔

می م۔ (بے چہرہ ہو کر) تو اس سے کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہر عورت مس گارنٹ کی طرح گھٹیا ہو جائے۔

ب۔ (زور دے کر) ہاں بس، یہ ایک بات کہی سٹری م گھٹیا بالکل مناسب لفظ ہے گھٹیا وہ واقعی ہے۔

م۔ (خاموشی اور تنہید سے) پلچ جیکس؛

می م۔ کیئے؛

م۔ تمہارے والد کے پاس کتے نوکر ہیں؛

می م۔ (مہمبلا کر) ادھ! مجھے نہیں معلوم (دھونے کی طرف بڑھ جاتا ہے گویا چاہتا ہے کہ ماریل کے سوالات سے چٹنا دور ہو جائے) اتنا اچھا ہے اور نہایت رنج و اکم کی حالت میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تیل ہی کا خیال رہ رہ کر آتا ہے)

م۔ بہت سنجیدگی سے اس قدر کہ تمہیں معلوم نہیں (اور زیادہ بڑھاتے ہوئے) جب کوئی ایسا کروہ کام کرنا ہوتا ہو تو تم میں گھٹنی بجادیتے ہو اور وہ کام دوسرے کے سر ڈال دیتے ہو کیوں نا؟

می۔ م۔ اونچہ، بیکار مجھے پریشان نہ کر دو تم تو گھٹنی بھی نہیں بجاتے بلکہ تماری بیوی کی خوبصورت آنکھیاں وہاں تیل میں تھکتی رہتی ہیں اور تم خود یہاں نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھے ہوئے کچر دیتے رہتے ہو۔ لکچر ہی کچر شیطان کی آنت کچر۔ الفاظ، الفاظ، الفاظ

ب۔ اس جواب سے بے انتہا مسرور ہوتے ہوئے ابا بابا یہ بات کہی، بہت عمدہ (خوشی سے چلتے ہوئے) کہو جیس! اب تم کیسے پھنسنے!

ایکینڈا اندر آجاتی ہے آگے پیش بند خوب صاف لگا ہوا ہے۔ پٹھنے والا بسپ خوب صاف کیا ہوا ہو جی کئی ہوئی پپتیں سے پڑھو میز پر ایل کے نزدیک وہ اسے رکھ دیتی ہے تاکہ اسے جلے،

ک۔ (اپنی آنکھوں کی پرمو ایلز اک صاف کرتے ہوئے) یو مین: اگر تم کو تو میں تمہیں تمام بسپ سپر وکر دوں

می۔ م۔ میں یہاں صرف اسی شرط سے رک سکتا ہوں کہ تمام بجھ سے کام تم میرے سپر وکر دو۔

ک۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے، شاباش! لیکن پہلے میں دیکھ دوں کہ تم کیسے کام کرتے ہو راریل کی طرف رخ کر کے، جیس اتم نے گھر کا انتظام میری غیر موجودگی میں کچر اچھا نہیں رکھا۔

م۔ کیوں، ڈیر کیا میں نے نہیں کیا، کیا بات نہیں ہوئی؟

ک۔ (بچ بچ کی پریشانی سے) میرے ذاتی پسندیدہ برش سے جوتے صاف کرنے کا کام ایسا کیا ہے۔ (می م کے

منہ سے ایک سخت آنکھتی ہے، بگڑ گئی گھر کا دھڑ دھڑ دیکھنے لگا ہے ک صوفے کی طرف دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے کیا تمہاری طبیعت اس وقت نا ساز ہے۔ کیا تم کچر چل ہو؟

می۔ م۔ نہیں کچر بیا نہیں، صرف دہشت، دہشت، دہشت (وہ اپنا سر اپنے اتوں پر رکھ لیتا ہے)

ب۔ (مضطرب ہو کر) کیا کوئی دورہ ہوا میسٹری م۔ یہ بہت برا ہے آپ کی سی عمر پر کسی طرح اس سے ضرور نجات حاصل کیجئے۔

ک۔ اطمینان (الٹنے کے لئے) اونچہ بابا! آپ کی بھی کیا باتیں ہیں، یہ محض شاعرانہ دورہ ہے کیوں نا یو مین؟

اسے سلاتے ہوئے)

ب۔ (شہزادہ ہرگز آئیں؛ شاعرانہ دورو؛ اچھا؛ میں معافی چاہتا ہوں مگر یوہین (اپنا منہ پر تشدد کی طرہ کر لیتا ہے اور اپنی جلد بازی پر متاسف ہے)

ک۔ کیا بات ہوئی یوہین؟ میرا برش؛ (وہ کانپ ماتا ہے) ادھ تو اس میں کیا بات ہے (اس کے قریب بیٹھ جاتا ہے) کیا تم سے پسند نہ کرو گے کہ تم ایک نہایت اچھا سا برش بہت خوبصورت پیش کر دو جس کی پشت ہاتھی دانت کی ہو اور جس میں سیب جڑی ہو۔

ی م۔ (آہستگی اور نرم سے لیکن افسانہ کی طرح نہیں بلکہ ایک کشتی۔ ایک چھوٹی سی کشتی جس میں ہم تم دونوں بیٹھ کر اس دنیا سے الگ کوسوں دور پہلے جائیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں شقائق نگ مرمر کی چٹانیں ہوں جن کو باران رحمت سے نسل دیا جاتا ہو اور جنہیں نیر و خشاں سکھاتا ہو۔ جہاں کے مٹھلیں سبزہ زار کی صفائی نیم سحری کرتی ہو۔ یا پھر ایک ایسا تخت ہواں ہو جس پر ہم تم دونوں مجنونا انسان کی طرف اڑ جائیں جہاں کے شاعر ہمارے سیب ہوں گے اور جس کو روزانہ مٹی کے تیل سے بھرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ (آہستگی سے) اور جہاں کچھ کرنا نہ ہوگا سوائے اس کے کہ کابل، خود غرض اور بیکار بنے بیٹھے رہو۔

ک۔ ادھ جیسے تم نے اس کی شاعری کو کیوں تباہ کر دیا۔

ی م۔ (دانش بجائیں) ہاں، کابل، خود غرض، اور بیکار، یعنی خوبصورت، آزاد اور خوشحال، کیا ہر شخص یہ باتیں اپنے دل و جان سے نہیں چاہتا اس عورت کے ساتھ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ میری معراج تخیل تو یہی ہے تمہاری کیا ہے؟ اور تمہارے جیسے ان تمام لوگوں کی جو ان بھدے بد صورت مکانات کی قطاروں میں رہتے ہیں؛ لکچر، وعظ اور برش، اتمارا معراج تخیل تو بس یہی ہے کہ تم وعظ و یا کرو اور تمہاری بیوی جھاڑو دیا کرے!

ک۔ (دانت سے) یوہین، وہ بھی اپنے جوئے خود صاف کرتا ہے اور اس الزام کے بدلے کل تم کو انھیں صاف کرنا پڑے گا۔

ی م۔ ادھ؛ جوتوں کی باتیں نہ کرو تمہارے مرمریں پیر ہاتھوں پر بھی خوبصورت معلوم ہوں گے۔

- ک۔ لیکن میرے پیریکینی روڈ پر بغیر جوتوں کے خوبصورت نہ معلوم ہوں گے۔
- ب۔ (دوہین کے خلاف باتیں سن کر) ارے کینڈی یہ کیا خلاف تہذیب باتیں کر رہی ہو؟ مشروہ میں اس قسم کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں تم پھر انہیں پریشان کر رہی ہو مجھے نہ ہے کہ پھر انہیں دہشت کا دورہ نہ ہو جائے میرا مطلب ہے شاعرانہ دورو!
- (ماریل خاموش ہے۔ ظاہر اود اپنے خطوں میں مشغول ہے لیکن دراصل وہ اس ادمیٹری میں ہے کہ اس کے مضبوط سے مضبوط اور پختہ سے پختہ تیلے اس چکرے کے سامنے بیکار جا رہے ہیں چنانچہ ایلے شخص سے خوفزدہ ہونے کے خیال سے جس کو وہ اپنا ہونا سمجھتا تھا، حلیف ہونے لگتی ہے اس کا رنٹ ایک تاریک انداز آتی ہے)
- پ۔ (ماریل کو تیار حال کرتے ہوئے) جوابی ہے۔ باہر ڈاکیر جواب کے لئے کھڑا ہے (اپنی نشین پر جا کر بیٹھ جاتی ہے کسے) مسز ماریل! تیسرے بار چرچی خانہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہے اک اٹھکڑی ہوتی ہے، پیاز لگے ہیں می۔م۔ (لاڑتے ہوئے) پیاز!
- ک۔ ایں پیاز! اور دو بھی کچرا چمے تم کے ہپا نو پیاز نہیں معمولی چوڑے تم کے! میدہ ہے کہ تم ان کے پھیلنے میں مجھے مدد دو گے اچھا! دھڑاؤ۔
- (وہ اس کی کلائی بکڑتی ہے اور دوڑاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ برگیں متویش اٹھکڑا ہوتا ہے اور آئندہ ان کے پاس بہت کھڑا رہتا ہے۔ ان دونوں کی طرف نکتے ہوئے)
- ب۔ کینڈی کو نہ چاہئے تھا کہ ایک نواب زادے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ جیس دیکھو تو کیا تم نے اس سے پیشتر اس طرح کی تعجب انگیز بات دیکھی ہے؟
- م۔ (تار لکھنے میں مصروف ہے، مجھے نہیں معلوم)
- ب۔ (دور مندی سے) اس کی باتیں بڑی پیاری ہیں، مجھ کو شاعری تو ہمیشہ سے پسند رہی، کینڈی بھی مجھ ہی کو پڑھا ہے جب کوئی اتنی ہوگی (باتہ کو دو تین فنڈ بچا کرتے ہوئے) تو مجھ سے کمائیاں کسلا یا کرتی تھی۔
- م۔ (مشغول) اچھا! خوب! (تار پر جاذب لگتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

پ۔ لیکن کیا تم وہ کمائیاں خود اپنے دماغ سے سوچ کر کمالتے تھے؟

(برگیں اسے جواب دینا اختیار سمجھتے ہوئے نہایت ہجرت تجارت کا رویہ اختیار کر لیتا ہے)

پ۔ (آہستگی سے) میرا خیال ہے تم ایسا کر ہی نہیں سکے۔ خیر بریگیں تذکرہ میں آپ کو ایک بات سے آگاہ

کر دوں۔ آپ برصغیر کی اس قدر پرستش کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ پاگل ہے

ب۔ پاگل کیا وہ بھی!!

پ۔ بالکل پاگل! بالکل اپرچ کے مست غرگوش کی طرح میں بتلاتی ہوں ابھی توڑا عرصہ ہوا کہ تمہارے

آنے سے قبل اس نے مجھے بے انتہا ڈرا دیا تھا۔ کیا تم نے ان تمام عجیب باتوں کا خیال نہیں کیا

جو وہ بکتا رہتا ہے۔

ب۔ اچھا تو شاعرانہ دورے کا یہی مطلب ہے۔ دراصل یقیناً ان کا اکثر ایک دو دفعہ میرے دل میں خیال

پیدا ہوا کہ وہ کچھ پاگل سا ہے (دو دروازہ ہنگ ٹٹکا، سوچتا ہوا جاتا ہے۔ یہ آواز بلند، دراصل یہ اچھا سا پاگل

ہے جہاں سوائے تمہارے کسی کی کوئی خبر لینے والا بھی نہیں ہے

پ۔ جب وہ اس کے پاس سے گزرتا ہے، ہاں، اگر خدا نخواستہ آپ پر کسی قسم کا حادثہ ہو گیا تو کسی قدر باعث

افسوس بات ہوگی۔

ب۔ (بڑے ہنس سے) خیر وہ مجھ پر، میرے اوپر آپ کسی قسم کے جلے نہ کیئے۔ ذرا میں باغیچہ میں سگار پینے جا رہا

ہوں اپنے مالک سے کھدینا۔

پ۔ (جڑانے ہوئے) آخدا!

(لیکن قبل اس کے کہ برگیں کوئی جواب دے، اریل واپس آ جاتا ہے)

ب۔ (کمزور لہجہ میں) جنس میں ذرا باغ میں سگار پینے جا رہا ہوں۔

م۔ (نیزی سے) اہ، ہاں ضرور! (ایک تھکے ہوئے بڑے کی طرح برگیں باہر چلا جاتا ہے۔ اریل میز پر کھڑا ہوتا ہے

اور اپنے اخبارات کو اپنے پٹے پر ازربائے سے کچھ تفریح کے لمحوں اور کچھ دوسری مخاطب ہوتا ہے) اس پر ازربائی

تم نے آخر میرے غصے کے نام کیوں رکھے؟

پ۔ (چہرے بد سرخی دور لگی۔ تیزی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ڈر کچھ انفس کا اظہار) میں! (رو پڑی)

م۔ اب دروازہ مسرت سے اس کی طرف رخ کر کے میز پر جھکتے ہوئے اور تسکین دیتے ہوئے، اسے ہونگا، ہونگا جانے

بھی دو میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ پر اسی! وہ واقعی کھوسٹ، گدھا تو ہے ہی کیوں نا!

اور نہ کی ایک ہچکلی آئی اور وہ دروازے کی طرف بھاگی زور سے دروازہ بند کیا اور باہر نائب ہو گئی،

ماریل نے اپنا سر ہلایا گویا انفس کیا اور بادل ناخراستہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا جیسے بہت تنکا

ہوا ہوا اور ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہو۔ کینڈڈا اندر آتی ہے۔ اس نے گھر کا سب کام کاج ختم کر دیا ہے۔

پیش بند اب اتر گیا ہے ماریل کی عقلی ہوئی حالت کو فوراً محسوس کرتی ہے اور نہایت خاموشی سے اگڑا ہوا

والی کرسی کے نزدیک کھڑی ہو جاتی ہے اور اسے بہت فور سے دیکھنے لگتی ہے منہ سے کچنیں (ہوتی)

م۔ (ادھر نظر مٹاتے ہوئے لیکن قلم اب بھی انگوٹھوں میں ہے گویا لکھنے کے لئے اب بھی تیار ہے) کیا ہے؟ یوہین

کماں ہے؟

ک۔ نل پر اپنے ہاتھ دھور رہا ہے وہ بڑا اچھا باورچی ہو سکتا ہے لیکن ابھی میرا سے ڈر تا ہے۔

م۔ (غصہ) اچھا! ہاں، بیشک (پھر لکھنا شروع کر دیتا ہے)

ک۔ اس کے قریب جاتے ہوئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر آہستہ سے رکھ کر اسے روکتے ہوئے) بس اب ادھر آؤ

ڈیر، ڈرا میں تمہیں دیکھوں تو روو اپنا قلم چھوڑ دیتا ہے اور خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اسے مخاطب ہو

اور میز سے کچھ اُدھر سے جاتی ہے براہِ رفتاری نظر سے اس کی طرف دیکھے جاتی ہے) ذرا اپنا چہرہ روشنی

کی طرف تو کرو۔ (وہ اسے کھڑکی کے رخ کھڑا کر دیتی ہے) افوہ! میرا پیارا آج کچھ ٹھیک نہیں۔ اس نے

آج حد سے زیادہ کام کر لیا ہے۔

م۔ نہیں تو وہی حسبِ معمول روزانہ کے رہتا۔

ک۔ نہیں اس کا چہرہ آج زرد ہے مہر جابا ہوا۔ تنکا ہوا، بوڑھوں کا سا۔ (ماریل کی اداسی اور گہری ہو جاتی ہے

اور وہ اپنے جلوں کو اور بھی تیز کر دیتی ہے) ادھر آنا! اس کو آرام کرسی کی طرف کھینچتے ہوئے) بس اب آج

مکا کام تم بہت کر چکے۔ بس اب ختم کرو۔ بقیہ پر از جی ختم کر دے گی۔ اب ذرا مجھ سے باتیں کرو۔

۲۔ لیکن۔

ک۔ ہمیں (خدا کرتے ہوئے) میری طبیعت باتیں کرنے کو چاہتی ہے (وہ اسے بخلا دیتی ہے اور خود ہی تالین پونچھنے لگتا ہے بل بیٹھ جاتی ہے، ہاں بس اب (اس کے ہاتھ کھینچتے ہوئے) تم اچھے گلے لگے ہو یہ آخر میں کہتی ہوں کہ تم ہر روز رات کو وعظ و کچر دینے کیوں چلے جاتے ہو؛ مجھے مشکل سے ایک ہفتہ میں ایک شام مل جاتی ہے ہاں مسیح ہے کہ جو کچر تم کہتے ہو وہ بالکل ٹھیک ہے اور بہت نیک کام لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یہی وہ لوگ جن سے تم یہ سب باتیں کرتے ہو ذرا بھی تو تمہاری باتوں کو خیال میں نہیں لاتے تمہاری بات وہ ان لیتے ہیں لیکن ان کے ماننے سے کیا فائدہ۔ جب وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے بلکہ ادھر تمہاری سنتے ہیں اور مان لیتے ہیں اور ادھر تھوڑی ہی دیر بعد جہاں تمہاری بیٹی پھر ہی بالکل اس کے خلاف کرنے لگے ہیں۔ تم اپنے سینٹ ڈومینک ہی کے لوگوں کو دیکھو اتنا زور مذہب کی باتیں کیوں ہر اتوار کو سننے آتے ہیں؛ محض اسی لئے کہ ہفتہ کے چار دنوں میں وہ روپیہ ادھر کاروبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک دن چاہتے ہیں کہ یہ سب باتیں بھول جائیں اور ایک روز کم سے کم آرام کر لیں۔ تو بس مجھے وہ اسی آرام کے لئے آتے ہیں تاکہ تروتازہ ہو کر پھر اور دھڑلے سے روپیہ پیسہ پیدا کریں۔ گو یا اس طرح روکنے کی بجائے تم انھیں اور سگ دنیا بناتے ہو۔

م۔ (پر زور سنجیدگی سے) کمینڈاؤم جانتی ہو کہ اکثر نہیں ان کو اس امر پر زور دار نمائش بھی تو کرو دیا کرتا ہوں لیکن اگر وہ محض تفریح ہی کے لئے آتے تو ادھر بھی چلیں ان کے لئے کھلی تھیں اس سے زیادہ دلچسپ اور مجھ لطف آؤ کوئی بات تو ہوگی کہ وہ سینٹ ڈومینک ہی کو اتوار کے دن دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ک۔ نہیں خراب چلیں اس دن کھلی نہیں ہوتیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تو یہی وہ نہیں چاہتے کہ انھیں کوئی ان مقامات پر دیکھے اس کے علاوہ جہیں پیارے تم وعظ اس عمدہ طریقہ سے دیتے ہو کہ وہ ان کے لئے اتنی ہی تفریح کا باعث ہوتا ہے جتنا کوئی کھیل تماشہ۔ اور یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ عورتیں تمہارا وعظ سننے اس قدر جوق جوق کیوں آتی ہیں؛

م۔ (گھبرا کر) کمینڈاؤ!

ک۔ ہاں مجھے معلوم ہے، سیدے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب تمہاری سوشلزم اور مذہب کی وجہ سے ہے اگر ایسا ہوتا تو بجائے تمہیں بار بار دیکھنے آنے کے وہ اس پر مل کر تمیں جو تم ایک دفعہ کلمتیت حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو پر اسی والی شکایت ہے۔

م۔ پر اسی والی شکایت کیا مطلب ہے تمہارا کینڈا؟

ک۔ ہاں بڑی اسی اور ان تمام سکریٹریوں کو جنہیں تم ملازم رکھ چکے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ پر اسی اتنا سب کام ہم لوگوں کا کر دیتی ہے آخر کس لئے؟ آؤ چلیں ہے۔ چیزیں صاف کرتی ہے اور تمام ادنیٰ کام کر دیتی ہے محض چھ شنگ نی ہنٹ پر حالانکہ شرمیں وہ اس سے زیادہ پاتی تھی جس قصہ اہل میں یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا کام کر دیتی ہے اسی طرح لکچر سننے والی تمام عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں اور تم کو اپنے وعظ سے محبت ہے کیونکہ تم اسے نہایت خوبصورتی سے ادا کرتے ہو۔ میرے سیدے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب ان کا یہ اشتیاق تمہارے نظریہ ربانی بادشاہت کی وجہ سے ہے یا وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اسی میں یقین کرنے لگتی ہیں مجھے میرے نادان۔

م۔ کینڈا کیا خوفناک باتیں کر رہی ہو! اس قدر روح فرسا مذاق تو نہیں کر رہی ہو؛ یا یہ تو نہیں ہے کہ شاید تم کو حسد ہوتا ہو۔

ک۔ (مجیب طرح سوچتے ہوئے) ہاں مجھ کو واقعی بعض اوقات تھوڑا سا حسد ہوتا ہے۔

م۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) پر اسی سے؟

ک۔ (ہنستے ہوئے) ارے نہیں، نہیں نہیں! اسی خاص شخص سے نہیں بلکہ کسی اور شخص کی طرف سے حسد ہوتا ہے جس سے کہ اتنی محبت میں کی جاتی تھی کہ اس سے کی جانا چاہئے۔

م۔ میرے متعلق؟

ک۔ تمہارے متعلق، نہیں، تم تو بلکہ محبت اور پریشانی سے خراب کر دئے گئے ہو تمہیں تو محبت اتنی ملتی ہے جتنی تمہارے لئے مفید نہیں میرا مطلب یہ ہیں سے ہے۔

م۔ (چٹک کر) یوہین!

ک۔ یہ نا انصافی معلوم ہوتی ہے کہ سب محبت صرف تمہاری طرف چلی جائے اور اسے کچھ نہ ملے۔ حالانکہ اسے تم سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے (ایل کے بدن میں باوجود ضبط کے بھی ایک کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے؟ کیا میری باتوں سے تم کچھ پریشان ہو رہے؟

م۔ (جلدی سے) نہیں بالکل نہیں۔ (اس کی طرف تکلیف و دھوش سے دیکھتے ہوئے) تم جانتی ہو کہ مجھے تم پر بالکل اعتماد ہے کینیڈا۔

ک۔ اللہ سے غرور کیا تم کو اپنی کششوں پر اس قدر ناز ہے؟

م۔ کینیڈا تم مجھ کو سخت تکلیف دے رہی ہو میں نے اپنی کششوں کا کبھی خیال نہیں کیا مجھے ہیئت تمہاری نیکی، محبت اور عفت و عصمت کا خیال البتہ رہا ہے اور اسی میں مجھے اعتماد رہا ہے اور رہتا ہے۔

ک۔ اوجھ مجھ سے یہ کیا فضول کی باتیں کرتے ہو اتم بس پادری ہی ہو۔ پورے پادری۔

م۔ اس کی طرف منہ پیر کر دلی تکلیف سے یہی پوچھیں بھی کتا ہے۔

ک۔ (نہایت اشتیاق سے سوزیل کی طرف جھکتے ہوئے) اس کے گھٹنوں پر دو دونوں بازو رکھ کر (پوچھیں ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ وہ نہایت عجیب و غریب لڑکا ہے جتنے غصہ میں باہر رہی میرا اشتیاق اس کی طرف بہت بڑھتا

ہی گیا۔ ہمیں معلوم ہے ہمیں، حالانکہ وہ خود نہیں جانتا لیکن وہ مجھ پر عاشق ہو جانے کے لئے بری طرح تیار ہے؟

م۔ (سنبیدگی سے) اچھا! لیکن اسے خود نہیں معلوم کیا واقعی؟

ک۔ بالکل نہیں! (دو پٹا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر سے ہٹا لیتی ہے اور انہیں اپنی گود میں رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے، لیکن

ایک زمانہ آئے گا کہ اسے معلوم ہو جائے گا یعنی جب وہ بڑا ہو جائے گا اور تمہاری طرح تجربہ کار راور

تب اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ضرور یہ جانتی ہوں گی۔ میں کتنی ہوں کہ تب وہ میرے متعلق کیا خیال

کرے گا؟

م۔ کوئی غاس بات نہیں۔ وہ ہمیں بڑا گرگزنہ خیال کرے گا۔

ک۔ (شک سے) یہ دوسری بات پانچویں ہے۔

م۔ نگہار، کیا انحصار؟

ک۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہاں۔ ہاں اس بات کا انحصار تو اس بات پر ہوگا کہ اس پر کیا گذرتی ہے (وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) اس کا انحصار اس پر ہو کہ وہ اس بات کو کیسے جانتا ہے کہ دراصل عشق کیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس عورت پر منحصر ہے جو اس کو عشق سکھائے۔

م۔ (بالکل نہ سمجھتے ہوئے) ہاں، انہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

ک۔ (سمجھانے ہوئے) اگر اس نے عشق کسی اچھی عورت سے سیکھا تب تو ٹھیک ہے۔ پھر وہ مجھے معاف کر دے گا

م۔ معاف؟

ک۔ لیکن اگر فرض کر دو کہ اس نے عشق کسی خراب قسم کی عورت سے سیکھا جس طرح عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں خصوصاً شاعر قلم کے لوگ جو ہر عورت کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ فرض کر دو اگر محبت کی قدر اسے اس وقت معلوم ہوئی جب وہ اسے برا دیکھ چکا ہو اور اپنی نادانیت کی بنا پر خود کو تباہ کر لیا ہو تب بھی کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟

م۔ معاف! اسے بھی کس بات پر تمہیں معاف کر دے گا؟

ک۔ (حسوس کرتے ہوئے کہ وہ کس قدر مجبوت ہے اور کچھ ناامید ہو کر پھر بھی نہایت ہمدردانہ لہجہ میں) اسے کیا تم نہیں

سمجھو؟ (وہ اپنا سر فنی میں ہلاتا ہے) وہ اس کی طرف پھر مڑ جاتی ہے اور نہایت ہی محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتی

ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ کیا مجھے وہ اس بات پر معاف کر دے گا کہ میں نے خود اسے کیوں نہیں سکھایا

اور انہی بچی، محبت و محبت اور پاک کی وجہ سے بیباک تم کہتے ہو خراب قسم کی عورتوں پر اسے چھوڑ دیا جس تم میری

اچھائی اور پاکدہنی کی باتیں کرتے ہو کس قدر نا اچھی کی بات ہے۔ میں ان دونوں چیزوں کو خوشی یو جین کو دیدیتی

اگر کوئی بات مانع نہ ہوتی، بالکل اسی طرح میں کسی غریب محتاج فقیر کو جو سردی سے مر رہا ہو تا اپنا دوشالہ دیدیتی

جس تم اپنے لئے میری محبت پر یقین رکھو کیونکہ اگر یہ اعتبار تمہارا میری طرف سے جاتا رہا تو پھر ان خطبات اور

وطنوں میں قطعی مجھے ویسی نہ رہے گی محض لفظی گو رکھ دھندے جن سے تم ہر روز خود کو نیز دوسروں کو دہکا

دیا کرتے ہو (اتنا کہ وہ اسے کوہوتی ہے)

م۔ اُس کے الفاظ !

ک۔ (اُنھے ہوئے رک کر اُس کے الفاظ ؛

م۔ یوحین کے !

ک۔ (خوش ہو کر) وہ ہمیشہ سچی بات کہتا ہے۔ وہ تم کو، مجھ کو اور پراسی سب کو خوب اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے لیکن

پیارے تم کچھ نہیں سمجھتے (ہنسنے لگتی ہے اور دل ہی کے لئے اس کا منہ چوم لیتی ہے) وہ منہ ہٹا لیتا ہے گویا جیسے کوئی چیز بزمک دی گئی ہو اور اٹھ کر اٹھ رہا ہو جاتا ہے)

م۔ آخر یہ تم نے پیار کس طرح کر لیا۔ اُن کینڈ ڈا (ہلین سے) بہتر یہ تھا کہ تم میرے دل میں پھلنا ہو اور اڈا دلیر بن جائے اس طرح پیار کرنے کے۔

ک۔ (منجوب ہو کر) پیار سے میرے کیا بات کیا ہوئی ؟

م۔ (عجزاً نظر اُٹارتے ہوئے) مجھے نہ چھوڑو مجھ سے الگ رہو۔

ک۔ جیسے !!

» تنے میں یوحین اور برگیس اندر داخل ہوتے ہیں لیکن دروازہ کے قریب ہی رک جاتے ہیں ہنسا ہنکا

ی۔ م۔ کیا کوئی بات ہو گئی ؟

م۔ (ایک دم سفید لیکن طبیعت پر ڈلا دی تاہم کہتے ہوئے) نہیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آج صبح یا تو تمہاری باتیں سب صحیح تھیں یا کینڈ ڈا پاگل ہو گئی ہے۔

ب۔ (بہت ہی زور سے) کیا! کینڈی بھی پاگل (اے، اے، اے) (وہ گڈرتا ہوا، بڑبڑاتا، آتش دان کے پاس چلا جاتا ہے اور اپنے پائپ کی راکھ آتش دان کے پتھروں پر بھرا لئے لگتا ہے،

» ازل تنگ آ کر اپنی میز پر بیٹھ جاتا ہے آگے کو جب کہ تاکہ اپنے چہرے کو چھپالے۔ ہاتھوں کی انگلیاں یک

دوسرے میں پھنسا لیتا ہے تاکہ مستحکم رہیں،

ک۔ (جیسے مطمئن ہو کر اور ہنسنے ہوئے) تم کو محض میری بات کا صدمہ ہوا کیوں ناؤ تم سب غیر تری لوگ بھی کس قدر تری ہوئے ہو! (انہایت خوشی سے کرسی کے ہتھ پر بیٹھ جاتی ہے)

ب۔ کینیڈی، ذرا ہنسل کر باتیں کر۔ آخر مسٹر یوہین تیری نسبت کیا خیال کریں گے۔

ک۔ جیس نے مجھے ہمیشہ اپنے متعلق خود غور و فکر کرنا سکھایا ہے اور یہ بھی کہ کبھی اس بات سے نہ ڈروں کہ دھکر میری نسبت کیا خیال کرتے ہیں اور یہ اس وقت تک کو ٹھیک رہتا ہے جب تک میں بالکل اس کے خیالات کے مطابق سوچتی رہوں لیکن دیکھو میں نے ذرا ہی غفلت سوچا تھا کہ صورت دیکھ لو۔ ذرا دیکھو تو حالت (دو) جیس کی طوف بڑی خوش طبعی سے (اشارہ کرتی ہے)

(یوہین دیکھتا ہے اور ذرا اپنے ہاتھ سے اپنا دل تمام لیتا ہے گویا ایک دم ٹپس اٹھی ہو۔ وہ مومنہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورت سے جیسے کوئی المیہ سین دیکھ رہا ہو)

ب۔ آئندہ ان کے پاس سے ہمیں آج تم قدرے سست نظر آ رہے ہو۔ روز کے سے چست نہیں۔

م۔ ایک بلکہ قہقہہ کی کوشش کرتے ہوئے حالانکہ وہ قہقہہ رونے کی ہچکلی معلوم ہوتا ہے، نہیں تو میرا خیال تو ایسا نہیں خیر مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھے اس کا احساس نہ ہو کہ آپ صاحبان کو تکلیف دے رہا ہوں (غور کو نبھاتے ہوئے) خیر۔ خیر۔ خیر۔ خیر۔ خیر! (نہایت مضبوط ارادے کے ساتھ بظاہر خوش ہو کر وہ اپنے کاندھات لیکر پھر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ (دھرنے کے پاس جاتے ہوئے اور یوہین کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ اب بھی اسی مذاق اور شوخی حالت میں) یوہین کیوں تم اس قدر افسردہ کیوں ہو۔ کیا پیاز چھیننے سے آفونکل آئے؟

می م۔ (چپکے سے) یہ تمہارا ظلم ہے اور ظلم سے مجھے نفرت ہے میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ ایک شخص دوسرے کو اتنی تکلیف دے۔

ک۔ (اس پر طنز سے دست شفقت پھیرتے ہوئے) بچا ہے! یا میں نے واقعی ظلم کیا؟ کہ ان چھوٹے سرخ پیازوں کو تم سے خرشوا یا؟

می م۔ (سنجیدگی سے) اوغہ! یہ بات نہیں، یہ نہیں میرا مطلب اپنی ذات سے نہیں مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے بے انتہا تکلیف دی ہے۔ اس کے درد اور اس کی تکلیف کو میں خود اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ میں بانٹتا ہوں کہ یہ تمہاری خطا نہیں یہ ایک بات تھی جو آخر کبھی نہ کبھی تو ضرور ہو کر رہتی لیکن اس کا مذاق نہ اڑانا چاہئے، نہ اس کو یوں بلکا بنا کر مٹی میں اڑانا چاہئے میں کانپ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ تم اس کو یوں

اور اس قدر اذیت دیتی ہو اور اس پر ہنستی ہو۔

ک۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) میں اور جس کو اذیت پہنچاؤں! کیا فضول کی باتیں کرتے ہو یوحین۔ تم کس قدر بے باغ سے کام لے رہے ہو جو وقت (وہ) بھٹی ہے اور مین کی طرف جاتی ہے کچھ تشکرات اور قدرے پریشان ہو کہ میں اب زیادہ کام نہ کر چکا ہوں ذرا آؤ اور ہم لوگوں سے باتیں کرو۔

م۔ (محبت سے لیکن تلخ لہجہ میں) نہیں نہیں میں بات چیت کر ہی نہیں سکتا میں تو صرف وعظ دے سکتا ہوں۔
ک۔ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے! اچھا خیر! آؤ وعظ ہی دو

ب۔ (دند سے انکار کرتے ہوئے) نہیں کمینڈی! ہٹاؤ بھی وعظ وغیرہ۔

(لیکسی مل گمبر یا بوا اندر آتا ہے صورت سے معلوم ہوتا ہے کسی اہم کام کے لئے آیا ہے)

ل۔ (کمینڈا سے محبت ہاتھ ملاتے ہوئے) مزاج تو اچھا ہے منراہیل آپ کی واپسی سے بے حد مسرت ہوئی۔
ک۔ شکریہ لیکی۔ یوحین کو تم جانتے ہو گے؟

ل۔ ہاں! ہاں! کیا مزاج ہے آپ کا مسٹر یوحین؟

ی۔ م۔ بالکل اچھا ہوں مشکوہ۔

ل۔ (ماریل سے) میں ابھی سینٹ میٹرو انجن (گیلڈ) سے چلا آ رہا ہوں۔ وہ لوگ آپ کے تار کی وجہ سے نہایت شش و پنج میں ہیں۔

ک۔ (جیس اتم نے آخر کا بے کے متعلق تار دیا؟)

ل۔ (کمینڈا سے) آج آپ کا ان لوگوں کے وہاں وعظ تھا اور چنانچہ انھوں نے میرا سٹریٹ میں ایک بڑا سا بال لے رکھا تھا اشتہار وغیرہ میں بچہ روپیہ خرچ کیا تھا لیکن مین وقت پر آپ کا تار پہنچا کہ آپ نہ سکیٹنگ ان لوگوں پر تو گویا بجلی ہی گر پڑی سب کیا کیا باس فاک میں ملا جا رہا ہے۔

ک۔ (تعجب و پریشان ہو کر کہ جس کو کچھ ہو گیا ہے) کیا لکچر کا وعدہ۔ اور توڑ دیا!

ب۔ میرے خیال میں تو اس کی زندگی میں یہ پہلا ایسا واقعہ ہے بلکہ میں اس پر شرمناک سا کہتا ہوں کیوں نہ کمینڈی؟
ل۔ (ماریل سے) ان لوگوں نے آپ کو ایک جوانی تار دیا تھا کیا آپ اپنا رادو بدل نہیں سکتے کیا آپ کو دوبارہ ملا تھا؟

م۔ (بے چینی کو ضبط کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مجھے مل گیا تھا۔

ل۔ وہ جوابی تھا۔

م۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے اس کا جواب دے دیا کہ میں نہیں آسکتا۔

ک۔ لیکن کیوں نہیں آئیں؟ آخر یہ کس لئے؟

م۔ اقریب قریب غضب آگ ہو کر اس لئے کہ میں نہیں چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں اور

یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا میں کوئی بوسنے والی شین ہوں جو ہر شام کو ہن کی تفریح کے لئے چلا دی جا یا کر

یعنی آخر کیا میں ایک شام بھی اپنی بیوی، اپنے دوستوں کے ساتھ نہ گزاروں۔ آخر مطلب کیا ہے؟

(سب کو اس تقریر سے تعجب ہوا ہے لیکن یو میں پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ جب چاہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہے)

ک۔ جس میں تم کو ہرگز اس بات کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے جو میں نے کسی تھی اور دیکھو اگر تم آج نہ جاؤ گے تو

کل تمہارا ضمیر اس پر بلا مت کرے گا۔

ل۔ ہسا ہوا لیکن بات اہم ہی ہاں صاحب یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ آپ پر بجا اور نازیبا بار ڈال رہے ہیں لیکن یہ سمجھ لیجئے

کہ بچا بچے ہر جگہ تاہم بھیج چکے ہیں اور ان بچاروں کو دوسرا دوا عطا دستیاب نہیں ہو رہا ہے سوائے

لاڈوری کلیڈا کے صدر کے۔

م۔ (جلدی سے) ہاں وہ تو بہت عمدہ آدمی ہیں بس اس سے جو جمع کر انھیں کیا جائے؟

ل۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سوشلزم اور عیائیت کو جدار کھٹنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس طرح جو کچھ اب تک ہم لوگوں نے

کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ تو خیر آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں (اپنے شانے ہلاتا ہے اور

آتش دان پر برگیں کے پاس چلا جاتا ہے)

ک۔ (مناتے ہوئے) جاؤ ضرور جیسے ضرور ہم سب بھی چلیں گے۔

ب۔ (بڑبڑاتے ہوئے) دیکھو کینڈی! میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو تو ہمیں گھر میں آگ کے قریب نہایت

اطمینان سے ٹھہرنا چاہئے۔ اس کو بس دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

ک۔ نہیں وہاں جلسے میں بھی آپ کو اسی قدر آرام ملے گا جتنا کہ یہاں ہم سب لوگ پلیٹ، فارم پر بیٹھیں گے

اور گویا بڑے آدمی ہو جائیں گے۔

ی م۔ دسم کر انہیں نہیں بھی ہم لوگ پلیٹ فارم پر نہیں جائیں گے۔ وہاں سب کی نظریں ہماری طرف اٹھیں گی میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا میں پیچھے کے کمرے میں بیٹھوں گا۔

ک۔ ڈر مت، وہ سب لوگ جس کی طرف دیکھنے میں اس قدر مشغول ہوں گے کہ کوئی تمہاری طرف خیال بھی نہ کرے گا۔
م۔ پر اسی والی شکایت کیوں کیئنڈا؟

ک۔ (بٹان ہو کر) ہاں پر اسی والی شکایت!

ب۔ (پریشان ہو کر) پر اسی والی شکایت، جس کی کیا مطلب ہے تمہارا؟

م۔ اس کی طرف کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اٹھتا ہے، دروازہ کھاتا ہے، اُسے کھولتا ہے اور ٹھکانا لہجہ میں پکارتا ہے اس کا گھر!

پ۔ (دور پر) جی! مسٹر ماریل حاضر ہوئی۔

(سب لوگ انتظار کرتے ہیں سوائے برگین کے جو نہایت آہستہ سے لیکسی کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ب۔ ادھر سنو! مسٹر ماریل، پر اسی والی شکایت کیا چیز ہے؟ آخر وہ کیا بنا رہا ہے؟

ل۔ (درازا راہ طرے) حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے لیکن آج صبح اس نے مجھ سے اس عجیب و غریب طرز سے گفتگو کی تھی کہ میرا خیال ہے اس کے دماغ میں کچھ فتنہ کبھی کبھی آجاتا ہے۔

ب۔ (گہرا کر) خوب! پھر تو یہ مرض متعدد معلوم ہوتا ہے ایک گھر میں چار چار!

پ۔ (درازا پر آتے ہوئے) کیا بات ہے مسٹر ماریل؟

م۔ انجمن سینٹ میٹھو کو تار دید و کہ میں آ رہا ہوں۔

پ۔ تعجب ہے، مگر وہ لوگ تو آپ کا خود انتظار کر رہے ہوں گے۔

م۔ (ٹھکانا) کچھ کہتا ہوں وہ دکر و۔

(درازا پائین سم کر ٹاپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے اور تعمیل حکم کرتی ہے۔ ماریل اب بے حد مستعد اور پر جوش ہے برگین کے پاس جاتا ہے۔ کینیڈا اس کی حرکات کو بہت تعجب اور بے عینی سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے)

م۔ (گہرے) تو انہیں...

ب۔ نہیں جس اس طرح نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آج اتوار تو ہے نہیں کہ فرصت کامل ہو۔

م۔ مجھے بہت افسوس ہے خیال تھا کہ تم اگر چلو گے تو میں وہاں کے صدر سے تمہاری ملاقات کرا سکوں گا۔ ورنہ اس وقت تک کہ تم وہاں سے نہ آؤ گے تو میں یہاں سے نہ آؤں گا۔

ب۔ (جوش سے) ہاں، ہاں، ضرور چلوں گا جس تم دعوت بھی خوب دیتے ہو۔ دائمی تمہارا وعظ ہمیشہ عمدہ ہوتا ہے۔

م۔ (پرہیزی کی طرف گھومتے ہوئے) اس گارنٹ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں پر کچھ نوٹس لکھ لو۔ اگر تمہیں کوئی اور کام نہ ہو تو چلو (دوسرا بتاتی ہے) اور ڈر کی وجہ سے دل نہیں سکتی، لیکس تو آہی رہے ہو جہاں تک میرا خیال ہے؛

ک۔ جس میں سب لوگ چل رہے ہیں۔

م۔ نہیں تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوہین کی تم کو یہیں رہنا چاہئے اور اس کی خاطر مدارات کرنا چاہئے گھر واپس آنے کی کچھ تو خوشیاں منالو (یوہین کی سانس نہیں ماتی) (ٹھٹھکا ہوا ہے)

ک۔ لیکن جیس.....

م۔ (حکیمہ) میں اصرار کرتا ہوں نہ تو تم آنا چاہتی ہو نہ وہ، (کینڈڑا کچھ لکھنا چاہتی ہے) نہیں اپنی فکر نہ کرو، وہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تمہاری خالی کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے اور چونکہ وہ لوگ ابھی تک میرے خیالات سے ناواقف ہوں گے لہذا ان کا بیٹھنا زیادہ مفید ہوگا۔

ک۔ (پریشان ہو کر) کیا یوہین تم چلنا نہیں چاہتے؟

م۔ میں یوہین کے سامنے وہاں دل نہیں سکتا۔ وہ میرے وعظوں پر اس قدر متعزز ہوتا ہے (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اور وہ یہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں آج صبح یہ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا تو کینڈڑا آج میں اس کو تمہاری حفاظت میں چھوڑ کر دکھا دوں گا کہ میں اس سے کس قدر ڈرتا ہوں۔

می۔ (خود سے خوشی اور جذبہ سے) یہ واقعی مالی ترقی ہے، بہت خوبصورت۔

ک۔ (پریشان اور تشویشناک ہو کر) لیکن۔ لیکن۔ جیس کیا کوئی بات ہو گئی؟ بہت عجیب ہو کر میری سمجھ میں نہیں آتا۔

م۔ (اس کو محبت سے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے اور اس کی پیشانی پر ہاتھ پڑھتے ہوئے) اچھا! پیاری میں تو سمجھتا تھا کہ میں

(باقی آئندہ)

(بدردہ)

ہی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہوں۔

مترجمہ نور الحسن اشقی

دہر آشوب

ابتری عام وز میں گیسر نظر آتی ہے خواب ابلیس کی تعبیر نظر آتی ہے
عافیت بستہ زنجیر نظر آتی ہے زندگی موت کی تفسیر نظر آتی ہے

امن کے جسم پہ ہے جنگ کا خونیں غالب روح اقوام پہ ہیں مرگ و تباہی غالب
خاک اور خون میں لہڑائی ہوئی ارض مغرب نقش عریاں پہ ہے تشبیر نظر آتی ہے

طرب آموز تھا آغاز جہاں پیسیرس درد انگیز ہے تصویرِ آل پیسیرس
نازک اندام و حسیہ شیم غزال پیسیرس خوں میں ڈوبا ہوا پنجیر نظر آتی ہے

لٹ گئی رونق و تمکینِ شبستانِ نظر مسٹ گئی زینت و آرائشِ ایوانِ نظر
لعبتِ پین کر تھی حاصلِ ارمانِ نظر زخمی خمستہ و دلیگیر نظر آتی ہے

موجِ نیل پھر آما وہ طغیانی ہے چین پرور پھر ابوالہول کی پیشانی ہے
مصر پھر منتظرِ ہادیِ عمرانی ہے روحِ فرعونِ عنانِ گیسر نظر آتی ہے

دل جا پانِ نظرِ روس ہے از آلودہ در لعنتِ چہ بنیں ہیں نیسا ز آلودہ
ترکی و روم و فلسطین و حجاز آلودہ آتشِ جنگ جہاں گیسر نظر آتی ہے

فتنہ در سر ہیں شر اور ہوا آج، بگر حشر و برہیں قدر اور قضا آج سگر

قمر پر در ہیں بشر اور خدا آج مگر صدر پھٹک جانے میں تاخیر نظر آتی ہے

لہذا محمدؐ کہ نزدیک ہے وہ روز سعید عشق و بن جائے گی جب ہر تم ایجاد کی عید
حق کو مشرود ہو کہ بالائے سر شمر و یزید تیغ منظوم شبیر نظر آتی ہے

انقلاب آیا ہے یوں چاند کی ہر منزل پر چھا گیا ہے شفق زنگ فلک کے دل پر
اک نئے دور کے آئینہ مستقبل پر دیکھ وہ سرخی تحسیر نظر آتی ہے

جان باقی ہے سکتی ہوئی تہذیب میں بھی شر و صدق ہے خاکستر کذب میں بھی
یعنی اس سلسلہ غارت و تخریب میں بھی اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

شرح صدرِ رحم و دیر ہوا چاہتی ہے فاش تزدیر شر و خیر ہوا چاہتی ہے
عقل آزاد و سبک سیر ہوا چاہتی ہے پائے ادہام میں زنجیر نظر آتی ہے

ہے بدلنے ہی کو نظم و نسق چرخِ کبود باغ بن جانے کو بیتاب ہے نارِ نمود
ننگی قلب براہیم ہے سرگرم شود آگ میں برن کی تاثیر نظر آتی ہے

پھر ہم آگئیں ہیں شر و شعلے میں شبنم آلود پھر دل آہن و خار میں ہے نرمی کی نمود
شاعر مشرق کو بخشا گیا عینِ داؤد سنگ میں موم کی تاثیر نظر آتی ہے

حق ہوا چاہتا ہے پردہ باطل سے عیاں کفر کے دل میں ہے تابندہ شرارِ ایاں
ہو بشارت کہ ضمیرِ شبِ غم میں غلطاں صبحِ نور و روز کی تصویر نظر آتی ہے
(بہر شخص عسکری مطالبائی بی۔ اے لکھنؤ)

نوائے سخن

تیری فرقت سے جو انگلیں کبھی ہو جاتا ہوں طفل نادان کی طرح سوچ میں کھو جاتا ہوں
رات بھر دیکھتا رہتا ہوں تاروں کی راہ صبح دم تھک کے تری یاد میں سو جاتا ہوں

بانگِ فطرت کا ترنم ہے جنوں سا زابھی ضوِ نفاں ہے مرے دل میں شررِ راز ابھی
زندہ ہے خاک کی آغوش میں احساس کی آگ گو نجی ہے تری شب میں مری آواز ابھی

ظلمتِ دہر سے بیتاب نوا ہوتا ہوں کشتِ ہستی میں تری دانہ غم ہوتا ہوں
دردِ دل سے اتنی درگاہ میں ہنگامِ سخن اکثر اک طفلِک تنہا کی طرح روتا ہوں

فکرِ مجوس ابھی طالبا لب پر داز نہیں اس کا ہنگامہ بکسیرِ شررِ ساز نہیں
ظلمات میں غمِ امر و زنا سنا ہوں تجھے کہ ترے دہر میں میرا کوئی ہمراز نہیں

شیشہ عمر مئے تند سے لبسِ یزید نہ کر دہر میں یوں مری فطرت کو جنوںِ یزید نہ کر
فکرِ ہستی کے لئے فرست یک لحظہ تو دے موجِ دم سے یہ دلی آگ ابھی تیسرے نہ کر

یہ جہاں تنگ ہے کوتاہ دل پر شور کو آہ ! سخت مشکل ہے شب و روز میں فطرتِ بے باہ
اک نخی سی خطا پر تو خفا ہے اور ابھی کروٹیں لیتا ہے دل میں مرے اک حشرِ گناہ
فضلِ حسین صاحبِ کیف

مے مکنہ

آسے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
 طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک مال
 کھلی ہے خانہ صیاد میں ہماری آنکھ
 مشتاق درو عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
 آئینہ دیکھنے کا گذر تا نہیں خیال
 یہ کھلا آتش عناصر سے دل دیوانہ کو
 آباد میرا خانہ ویراں ہے ان دنوں
 کعبہ و دیر میں وہ خانہ برآمد از کساں
 بننے والا نہیں ہے رونے پر
 صورت شمع ہوں ہر چہ فروغِ محفل
 موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
 کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ کو جا چکے
 زیر زمین بھی چین کی صورت نہیں نصیب
 میری تعظیم نے مجلس سے نکالا مجھ کو
 بلسل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
 بت خانہ کھو ڈالئے مسجد کو ڈھاپئے
 طریق عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گذرے گا
 وہ گریباں آگ میں رکھ دیکھئے

میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رو گیا
 ہم سے خلافت ہو کے کرے گا زمانہ کیا
 قفس کو جانتے ہیں آشیاں نہیں معلوم
 کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ
 اپنی خبر نہیں انھیں میری خبر کہاں
 چار دیواریں اکٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں
 سیلاب مجھ غریب کا ہماں ہے ان دنوں
 گردش کا فرو دیندار لئے پھرتی ہے
 مجھ کو غربت وطن سے بہت رہے
 بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کھلتی ہے
 ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے
 کیا کیا نہ اس دورا ہے یہ ہم پھیر کھا چکے
 آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے
 اٹھتے اٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جاباقی
 ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لئے
 دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے
 گریباں میں کبھی ہے جب لگی ہی رگ داماں میں
 موسمِ گل میں ہوں جو بے چاک کے

(آتش لکھنوی مرحوم)

غزل

کچھ اپنا آشنا کیوں اسے دل ناداں نہیں ہوتا
ریاض دہر میں جو بی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
سہا پاتا رہنا نور کا آساں نہیں ہوتا
ابھی تک حسن بک جاتا ہے بازار محبت میں
کسی کے حسن سے ناداں کبھی انکار بھی کر لے
کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہو
تجھے پا کر بھی اہل شوق تجھ کو پا نہیں سکتے
نظر سے گدگدائے جا، ستم سے دل دکھائے جا
فنا اپنی بقا اپنی ہے جس کو عشق کہتے ہیں
ہر اک شے کے پہ نظر ہو جیسے نور کا حامل
فضائل لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جس میں
یہ دنیا سر بسر گویا پرستیاں بنتی جاتی ہے
ہمارا تجسہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبت میں
مزاج حسن کی مجبوریوں کو کیسا کرے کوئی
اٹھے ہی جاتی ہیں موصیٰں تبسم ہائے پنہاں کی

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ ساز دہیں لیکن

یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

(فراق صاحب گورکھپوری)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

منتخب داغ: منتخب حسن مارہروی مرحوم مطبع انوار احمدی الہ آباد قیمت حصہ اول و دوم سر روپے صفحات ۴۴۴ کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

داغ کے دو ایک انتخابات کھل چکے ہیں لیکن ایک مفصل انتخاب کی ضرورت پھر بھی باقی تھی اس انتخاب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ان کے ایک محبوب اور مشہور شاگرد کا کیا ہوا ہے حصہ اول میں داغ کی غزلوں کے ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو فارسی عطف و اضافت سے خالی ہیں حصہ دوم میں یہ قید اٹھا دی گئی ہے اور ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جن میں فارسی عطف و اضافت موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہلے حصے میں قہم کے اشعار لے گئے تھے۔ دوسرے حصے میں صرف بہتر اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔ گویا پہلا حصہ ہندوستانی اردو کا نمونہ ہے دوسرا حصہ خالص اردو کا۔ ابتدا میں ۱۲ صفحوں کا حسن صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس میں داغ کی شاعری پر تبصرہ ہے نیز ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے جو اس وجہ سے اور بھی مستند ہیں کہ حسن صاحب کے اپنے دیکھے ہوئے ہیں۔ داغ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے حسن مرحوم نے ایک پارے میں ان کی خصوصیات کو اس طرح بند کر دیا ہے ”داغ نہ صرف تھے نہ منی، صرف ایک شاعر تھے اور شاعری غزل کے اور غزل بھی ایسی جس میں شوخی، شرارت، جلی کٹی طعن، تشنیع، رشک، برگمانی، چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ، جھین جھپٹ کے سوا کچھ نہیں..... داغ نے سیدھی سادی باتوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلے ہیں کہ بڑے بڑے کھلاڑیوں کو نیچا دیکھنا پڑا ہے۔“

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مقدمہ سے پہلے حسن مارہروی مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب بھی دس بارہ صفحات میں دے دیا گیا ہے۔

غرضکہ یہ انتخاب بہ ہر نوع مکمل ہے اور کیا باعتبار معنی اور کیا باعتبار بندش شاید ہی کوئی اچھا شعر باقی رہ گیا ہو جو احساس انتخاب میں نہ آ گیا ہو۔

پھر سری :- از عظیم بیگ صاحب چغتائی ملنے کا پتہ کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ ممبئی نمبر ۱۱۰ قیمت ملے۔ سائز ۱۱x۱۴ کاغذ کا بت طباعت عمدہ۔

یہ چغتائی صاحب کے چودہ افانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں اور ان خوبیوں اور خامیوں کے حامل ہیں جو چغتائی صاحب کی خصوصیات رہی ہیں چغتائی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے کسی نہ کسی واقعہ پر ضرور مبنی ہوتے ہیں۔ زریب داستان کے لئے افسانہ نگار البتہ ان میں تغیر و تبدل ترمیم و تنسیج کر لیتا ہے یہ خصوصیت جہاں اتنی خوبیاں کمیتی ہے وہاں اس میں یہ خامی بھی ہے کہ اکثر افسانے افسانہ نگار کی کم توجہی کے باعث محض واقعات کی ایک ڈائری ہو کر رہ جاتے ہیں چغتائی صاحب کے بعض افانوں میں یہ کھردری واقعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے بعض افانوں کی طرز نگارش میں رشید صدیقی اور بطرس کا رنگ پایا جاتا ہے ”ہمارا پرنس“ والے افسانے میں انگریزی طرز معاشرت کی بہت دلچسپ تصویر کھینچی ہے بقیہ افسانے زیادہ تر چغتائی صاحب کے پر شرارت پلاٹوں سے مزین ہیں۔ دلچسپ چیز ہے۔

گرام سدھار :- مصنفہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۳ روپے کا پتہ۔ سکریٹری شری کانن جی آئٹرم شاہدرہ لاہور۔

یہ ایک چھوٹی فیقٹیل پر ۲۸ صفحہ کی کتاب ہے جس میں دیہی اصلاحات کے سلسلہ میں گاؤں وادوں کی طرز زندگی اور معاشی حالات کا نامتر جائزہ لے کر ان کی ملاح دیہود کی خاطر عملی اور فائدہ مند تدابیر نہایت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ زراعت و گھریلو صنعت کی ترقی اور برصغری ہونی بیروں کا رسی کو دور کرنے کے لئے نیز صحت عام اور تعلیم عام کی طرف حکومت کو اس کے فرائض بتا کر متوجہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قوم کو اپنے جائزہ ضروری مطالبات کو نمٹنے سے منوانے کی پر زور ترغیب دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر کام کی بات لوگوں کو اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے اور اپنی ضروریات خود پورا کرنے کی ہے۔ یہ وہ زین اصول

ہے جو زمانہ قدیم میں ہندی تمدن کا خاص انخاص طرز امتیاز رہا ہے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے سے اُن تمام برہمنی چیزوں سے چھٹکارا ہو جاتا ہے جن سے آج کل ہندوستان کے بازار بھرے پڑے ہیں اور جو روزمرہ کی ضروریات میں بھی دوسروں کا محتاج کئے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں اس مفید کتاب کے اضافہ کرنے پر اُس کے لائق و مخلص مصنف قابل مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اچھا سبق حاصل کریں گے۔ دراصل اس کتاب کو بجائے گرامر سدھار کے قوم سدھار کا زیادہ موزوں ہے۔

منگل پر بھجات :- مترجمہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت اڑھائی روپے۔ اسکرپٹری شری گاندھی سیدا آشرم شاہدہ لاہور۔

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے اُن چند ہندی خطوط کے مجموعہ کا ترجمہ ہے جو ہر مہنتہ منگل منگل انھوں نے اپنے قائم کردہ سابرمتی آشرم کے رہنے والوں کو لکھے تھے۔ ان سے مہاتما گاندھی کے مذہبی اعتقادات، پاکیزہ خیالات اور نفع اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح یہ اُن کے معتقدین کے لئے پیام تعلیم اور رہنمائے ہدایت ہیں اُسی طرح عام ہلک کے لئے بھی معلومات مذہبی و بلند خیالی میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ اس کتاب میں حق اور حق پرچار کا اظہار کیا گیا ہے اور معیار انسانیت بلند کرنے کے لئے جن اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ کی ضرورت ہے ان کو مختصر بیان کیا گیا ہے چنانچہ حق پرستی بے غوفی، عدم ایذا دہی، تزکیہ نفس کے لئے ریاضت، مذہبی رواداری اور انسانوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ان خطوط میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے اردو دہا حضرات کو واقف کرنے کے لئے مترجم کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ جا بجا بعض ٹیپٹھ ہندی الفاظ محتاج تشریح ہیں جنھیں طبع ثانی کے دقت ملحوظ رکھا جائے تو مناسب ہے۔ (دم سح)

جغرافیہ دنیا (میسور ایڈیشن) :- مؤلفہ سید شرف الدین قادری۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کچھڑا ٹیچرز ٹریننگ اسکول اورنگ آباد دکن ملے کا پتہ سید عبد القدیر اینڈ سنس کتب فروش چارمینار حیدر آباد دکن قیمت چھ روپے ساڑھے ۲۰ روپے کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

شرف الدین صاحب نے یہ جغرافیہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کیلئے ترتیب دی ہے۔ شروع میں طبعی جغرافیہ بھی ہے اس کے بعد ہر ملک کی جغرافیہ مختصر بیان کی ہے مختلف تصویریں اور ضروری نکتے بھی دئے گئے ہیں نقشوں میں موجودہ جنگ سے قبل جو حدود تھیں وہی برقرار رکھی گئی ہیں۔ مشہور ہندوستانی ریاستوں کی جغرافیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ طالب علموں کیلئے بہت مفید کتاب ہے اور یورپی کے اسکولوں میں حجازہ و جغرافیہ رائج ہے اس سے یہ بہتر ہے۔

رسالہ ہندوستانی ادب :- چپنل گورڈھ حیدر آباد دکن۔ زیر ادارت غلام محمد خاں صاحب ایم اے (دہلی) چند سالانہ لٹریچر پرچہ ۶/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۶۴۔

جون ۱۹۴۷ء سے یہ ماہوار رسالہ غلام محمد خاں صاحب نے نکالنا شروع کیا ہے۔ ہر قسم کے ادبی مختصر مضامین کے علاوہ دنیا کے سائنس، معلومات، دلچسپیاں اور فنی معلومات بھی دی گئی ہیں۔ رسالہ کی ترتیب اچھی ہے ہر قسم کے ذائقہ کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے مضامین مختصر ہو گئے ہیں۔ تنوع اور اختصار اور دلچسپی کو مد نظر رکھنا ہے تو بہتر یہ ہوگا اگر غلام محمد خاں صاحب تمام ہندوستانی رسالوں یا کم از کم تمام اردو کے رسالوں کے بہترین مضامین کا اختصار دیدیا کریں یہ اردو کے لئے ایک نئی چیز ہوگی۔ دلچسپ بھی، انوکھی بھی اور آسان بھی۔ ورنہ ایسے رسالے تو بہت سے نکلتے رہیں گے۔

رسالہ پیام اسلام :- مدیر محمد احمد خاں صاحب ذرا گریٹن کا پتہ دار القرآن۔ جالندھر۔ صفحات ۴۸۔ چند سالانہ سے رطلبہ سے علیٰ فی پرچہ ۴

در اصل یہ رسالہ مدرستہ البنات کی طالبات کے لئے نکالا گیا ہے لیکن عام عربی پڑھنے والے طالب علموں اور عربی زبان سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس میں عربی اسباق کے علاوہ قرآن اور حدیث اور تفسیر کے بھی عام فہم اقتباسات ہیں۔ طالب علموں کے لئے بہت مفید چیز ہے۔

اقبال

گلدستہ ہے پیوستہ

آٹھواں منظر

وادعی ظلمت

(آدمی رات۔ شاعر قبل کی روح ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی تصویر کے گھٹاں کھلا رہی ہے۔ آدمی رات اس سے کہتی ہے)

آدمی رات: ایک مشعل جاں جو مری فطرت کی سیاہی
 اٹھائے نگہ شوخ کے خاموش پرستار
 ہے دست درازی کے لئے دہن عالم
 میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی چاک
 روح شاعر: مرے فروغ تغزل کا فیض ہے عالم
 تو دیکھنی نہیں تخلیق جاوداں کا حرم
 مرے رسول ہیں یہ دلبران حسن جمال
 کھلے ہیں میرے لئے جبریل کے بازو
 اگر میں چاہوں تو پیدا کرو جاں اپنا
 آدمی رات: اگر ہے دعویٰ تخلیق مجھ کو اسے شاعر
 مری نگاہ پہ چلتے نہیں فقط دعوے
 روح شاعر: خشک تھی یہ سرزمین فیضانِ قدر کا
 دیکھ اس وادی میں اک بتا ہوا چشمہ مل

(ایک شفات چشمہ بتا ہوا نظر آتا ہے)

چشمہ - ہر حسن اضافی ہے ہر حسن تماشہ ہے
 بتا ہوا دنیا میں دریائے تنہا ہے
 جاری رہے عالم میں اک انجمن آرائی
 تخلیق مسلسل ہی نظرت کا آقا تماشہ ہے
 روح شاعر تیرے پہلوئے کلام میں نے اک چھڑا سا باغ
 دیکھ اس پرناچتے ہیں کتنے پھولوں کے ایاغ
 (پھولوں کا ایک شاداب باغ چشمے کے کنارے آؤ گتا ہے اور لہکتا ہے)

باغ - لے گئی باغ میں طوفانِ محبت کو بہار
 ڈالی ڈالی مرے محبوب کا افسانہ ہے
 ہر طرف بادِ ہستی کے چھلکتے ہیں جسام
 پھر بھی اک چیز سے خالی مرا پیمانہ ہے
 روح شاعر - اچھا تو اپنی چھاؤں میں اک طائرِ خیز
 اپنی صدائے درد سے ہے نغمہ بار دیکھ
 (شاخ پہ ایک بیسیا - پی کماں - پی کماں کی آواز دیتا ہے)

روح شاعر - جو ہو کر گاتی ہے -

تو کبھی دینِ کیم، از صحبتِ ما چیت
 بر شاخِ گلِ این طائرِ ک نغمہ سرا چیت

مقصود نوا چیت؟

مطلوبِ صبا چیت؟

این کمنہ سرا چیت؟

شاید کہ چینِ رزمِ حیات ہمہ جوئی است
 بزمِ است کہ شیرازہ او ذوقِ جدائی است

دم؛ گرمِ لذائی است

جاں؛ چہرِ کشائی است

این رازِ خدائی است

پیمپا کی آواز بہرِ بغیرِ دل از صحبتِ دیرینہ بہ پروا
 بالالہ خورشیدِ جہاں تابِ نظر از

اہلِ نظر ساز

چوں من بہ فلک تاز

داری سپرِ پرواز

ایک گارہ پیا اڑ جاتا ہے۔ روح شاعر پیچھے کو آسان کی طرف اڑتا ہوا کہتی ہے۔ اس کی نظر جھلکتے ہوئے
تاروں پر پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیا تارہ سرطان کے سامنے نذر گریا۔ روح شاعر کی نظر
تارہ سرطان پر جم جاتی ہے اور بیتاب ہو کر جواب دیتی ہے)

روح شاعر غالی سر پر وا نہیں قوت جاں بھی یہ وسعت افلاک بھی یہ کون و مکان بھی
اڑتے ہوئے میں شعلہ انجم کو ہوا دہلا بجھتے ہوئے سیاروں کی آنکھوں کو جنگا دہلا
پیچھے مرے آتا رہے یہ گنبد و دار آگے مرے چلتا رہے ہر ثابت تیار
ہر عظمت گرداں کے تگ ناز و سحرلوں طوفان سے بکھلوں کبھی آواز سے بکھلوں
ہو جائیں تبسلی کی بہت تیز ہوا میں دیکھیں جو مجھے اہل فلک قص میں آئیں!
شاعر کی روح آسان کی طرف اڑتی ہے۔ تارہ سرطان خود بھی قریب آتا ہے۔ اس کے اطراف چکر
لگانے والا محور نور صاف نظر آنے لگتا ہے۔ سرطان اس طرح دعوت دیتا ہے)

آ۔ اے نظرافروز تجسلی پہ کھڑا ہو اس مرکز انوار کا آئینہ بنا ہو
پی آنکھ سے یہ بادہ پیا نہ افلاک چل پاؤں سے بالائے طرخانہ افلاک
انجم کی نگاہوں سے اڑا ذوق تماشنا دیکھ آنکھ سے آئینہ ایوان تجلے
کس شان سے ہوتی ہیں گروں گروں سن غور سے سیاروں کے فنونیکاماطم
آنکھوں کے مقابل ہیں چرخ کی رفت نزدیک نگاہوں کے ہر کوئین کی وسعت
جو دور تھانہ دیکھے، جو سر و تھاروشن دہن سو لگا ہے تھے افلاک کا دہن!

(روح شاعر سرطان کے محور نور پر کھڑی ہوئی قص کرتی ہے اور وہ میں اگر گاتی ہے)

روح شاعر۔ میں تمیر و تخلیق کی نا خدا ہوں بڑی خود نما ہوں، بڑی خود نما ہوں
بہت حیرت افزا ہیں گویہ نظائے بہت دلربا ہیں یہ سب ماہ پارے
مگر مجھ کو ہوتی نہیں اس سے تسکین سلامت رہے روح کا غنہ تسکین
اضافہ کروں خود نمائی میں شاید ابھی کچھ کمی ہے خدائی میں شاید!

ایکھا تے ہی سرطان کا مور زور تیز گردش کرنے لگتا ہے اور اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ روح شاعر اس پر سے
تنگے کی طرح اڑ جاتی ہے اور ایک وسعت بے کنار کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے یا لاکھوں
کے فسطے گردش کی ہوائیں، رقص کی آوازیں شور مارتی ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے روح شاعر
کارواں و کارواں تاروں کو تیزی سے گزرتا ہوا دیکھتی ہے انجم کا یہ سر و سناٹا دیتا ہے،

جلوہ گہ شود را	بت کدہ نمود را
رزم نمود و بود را	کش مکش وجود را
عالم دیر و زود را	می نگریم دی رویم
خواجہ ز سروری گذشت	بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت	دور سکندری گذشت
شیوہ بتگری گذشت	می نگریم دی رویم

روح شاعر اب ایک ایسی غفلت بے جہت میں آ جاتی ہے جہاں اسے خود اپنے وجود کا احساس
نہیں رہتا۔ اس غفلت میں وہ زور کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے دریا میں ڈال دی جاتی ہے جس کی
موجیں قیامت خیز ہزاروں کے ساتھ آٹھ رہی ہیں۔ سوائے دریا کی سرخ موجوں اور ان کی آتشیں
دنداں نائی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ دریا ئے آتشیں کتا ہے،

دریا ئے آمری آغوش میں تلکین کے اے نا خدا	تجہ پہ شاید نہیں رہی ہے غفلت دنداں نا
آتشیں آناز تھا اے بے خبر اپنے تصور پر تجھے	صبر کرنا ہے یہاں اپنے تمسیر پر تجھے
الہاب شعلہ تمکین قلب جاں ہوں میں	امتحان کفر ہوں آئینہ ایاں ہوں میں
میری موجوں میں اہل سے بھی زیادہ آتشا	میرے پانی میں جنوں سے بھی زیادہ احتشام
کم نظر کی رہنا ہے شعلہ آتشی مری	بے لبر کا راستہ ہے آتش افشاں مری

(روح شاعر دریا ئے آتشیں میں غوطے کھاتی ہے غفلت سے ایک آواز آتی ہے،

چو موج می تپدا دم بہ جستجئے وجود • ہنوز تابہ کمر در میا نہ عدم است

روح شاعر نے فروغ چشم دل جرنے چرخ قلب جا
الاں اسے ظلمت دریا سے آتش الاں
جور اتنا کس لئے اولاد آدم ہوں ناین
شور اتنا کس لئے انسانہ غم ہوں ناین؛
ڈوبتی جاتی ہے میری کشتی عقل و خرد
المدد اسے شاعر حسن خدائی المدد!
روح شاعر کے سامنے ایک مہیب شکل و صورت کی پھلی جس کا چہرہ دیونا ہے ظلمت سے دوسرخ آنکھیں

چمکاتی ہوئی ابھرتی ہے اور اسے پشت پر بٹھا کر کھینچ لے جاتی ہے مدد سہری آواز آتی ہے،
بے زور و سیل کشتی آدم نمی رود
ہر دل ہزار عہدہ دار و بد و ناصدائے
از من حکایت سفر زندگی مہر س
در خاتم بہ در و گذشتہ فرل سر اسے
(روح شاعر بکارتی ہے)

انے ظلمت حیات مرے دل پر جم کر
اک دادی فنا میں مجھے اس طرح نہ کھینچ
تیسری آواز پیش نگر کہ زندگی راہ بہ مالے برد
از سر آنچہ بود و رفت در گذشتہ تہا طلب
روح شاعر۔ فنا کی طرف مجھ کو لے جا رہی ہے
مری انتہا مجھ کو دکھلا رہی ہے
چو کھتی آواز بہ آن تاب تا لبہ کہ فطرت بہ بخشد
در خشم چو بر قے بہ ابر سیاہ ہے

(روح شاعر تڑپ کر پھلی کی پشت پر سے کود جاتی ہے۔ کو تے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کا پانی تم
لے گیا اور شاعر کو توڑی دیر کے لئے سکون کی ایک چٹان سی مل گئی اس وقت روح اقبال کی یہ مدائے لگی،
انجم بہ گریباں ریخت این دیدہ تر مارا
بیردن ز سپہر انداخت این ذوق نظر مارا
شام و سحر عالم از گردش ماخیزد
دانی کہ نمی سازد این شام و سحر مارا
شایان جنون ماہنائے دو گیتی نیست
ایں راہ گذر مارا، آں راہ گذر مارا

(توڑی دیر بعد موجد کی رفتار دومی دہی شروع ہوتی ہے۔ روح شاعر ان سے کل نہیں سکتی۔ تھوڑی دیر
جا کر میں بند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روح شاعر بھی مدہوش ہو جاتی ہے۔ عالم سکوت پوں گویا ہٹتا،

عالم سکوت یہ سکوت بند ہے یا اجل کا دام ہے
ناشناسائے خدائی کا یہی انعام ہے
اے خیال مضطرب تیری نگ دو دکھا ہوئی
اے نگاہ بے مہا تیری وہ رو کیا ہوئی؟

کیا ہوا وہ زندگی کا ذوق و شوق بے حجاب کیا ہوئی وہ گرم رو بہم صدائے انقلاب ؛
 کیا ہوئی غافل وہ شوخی تیری چشم نازکی کیا ہوئی ناداں وہ لڑش گرمی آواز کی ؛
 تیرے سینے میں جو برپا تھا وہ طوفان کیا ہوا ؟ کوہ و صحرا کیا ہوئے صحن گلستاں کیا ہوا ؛
 تم گئی تہ شفتگی عقل و عرفاں کس لئے ہو گیا بے حس و حرکت قلب لرزاں کس لئے ؛

ارفع شاعر ہندو ریائیں بے حس پڑی ہوئی ہے۔ مدتوں پڑی رہنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک آواز اُلے لگتی ہے یہ ایک نوی ہیکل کشتی بان کی آواز ہے جو ایک عجیب و غریب کشتی میں بیٹھا ہوا ہے،

اٹلے غنچے خوابیدہ چو زگر گراں خیز کا شانہ مارفت بہ تاراج خزاں خیز
 از نالہ مرغ چمن از بانگ اذان خیز از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز
 از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
 از خواب گراں خیز

ناموس ازل را تو ایمنی تو ایمنی دارائے جہاں را تو یاری تو یمنی
 اے بندہ خاک کی تو رمانی تو رمینی صبا کے یقین دکرش و از دیگر گماں خیز
 از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
 از خواب گراں خیز

کشتی بان روح شاعر کشتی میں بٹا کر لے چلتا ہے اور گاتا ہے،

سفینہ دو جہاں کا ہے، یہ دریا لامکاں کا ہے یہ موجیں زندگی کی ہیں، یہ طوفان آساں کا ہے
 ملے گونا خدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ چلیں آہستہ آہستہ چلیں آہستہ آہستہ
 نظر ہے بادباں اپنی، تصور ہے ہوا اپنی ہے آغوش خدائی میں بت اپنی فنا اپنی
 ملے گونا خدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ چلیں آہستہ آہستہ چلیں آہستہ آہستہ
 دل درد و آشناساقتی تو یائے ازل بہر ہر اک موج رواں کے ہاتھ میں عرفان کا ساغر
 ملے گونا خدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ چلیں آہستہ آہستہ چلیں آہستہ آہستہ

میاں ہے صبر پیمانی، میاں ہے حوصلہ کا ہی
گمراہ امتحاں سے ڈرنے والے طوفان کے رہی
لے کر خدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ چلیں آہستہ آہستہ

(روح شاعر کو جوش آتا ہے لیکن پوری طرح نہیں اس کے کانوں میں یہ شیریں نغمہ گونجتا ہے)

بیلی جہاں را، خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی

نور قدیمی شب را، برافروز
دست کلیے در آستینی

بیروں قدم نہ ازدور آفاق
تو پیش ازینی تو بیش ازینی

از مرگ ترسی لے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تو در کینہی

جانے کہ بخشید دیگر نہ گیرند
آدم بہ میر و از بے یقینی

(روح شاعر جاگ اٹھی اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کیا یک ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا پرندہ جس کے

پرندوں کی ہوا سے دادی ظلمت کے کنکر تھڑاڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے بچوں میں اٹھائے ہوئے

پرندے کرتا ہے۔ یہاں بھی ظلمت کا دل ہے۔ روح شاعر اپنے آپ کو معلق عروس کے کانپنے لگتی

ہے۔ کوہ پیکر پرندہ کتا ہے)

کوہ پیکر پرندہ ظلمت کی روح ہستی فانی پر جاگئی
ٹھنڈی ہوا چراغ محبت بجھا گئی

بے باکی خیال قیامت اٹھا گئی
احساس نور ظلمت ہستی مٹا گئی

اڑتا ہے کوئی راگنذر جانتا نہیں

دہر ہے ساتھ اور اسے پہچانتا نہیں

میرے پرندوں میں موت کا ہولناک
میری ہوا سے بجھنے لگی شمع لالہاں

میری نظریں جذب ہوا رنگ آساں
میری صدا میں ڈوب گیا شور الالہاں

بے جہت ظلمتوں میں اظہار ہا ہوں میں

کسار میں عدم کے چلا جا رہا ہوں میں

(کسی گونے سے آواز آتی ہے)

آتش از ناله مرغان حرم گیر و بوز
آشیائے نغمہ نادی بہ نہال دگر
در جهان بال و پر خویش کشودن آمو
کہ پر میں نہ توں با پروبال دگر
ایہ آواز سننے ہی روح شاعر تڑپتی ہے اور پرندے کے چگل سے چوٹ جاتی ہے اور بندی کا ایک
مہر آزا خلائے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں کے بعد ایک جگہ ٹراتی ہے۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہو
اور آفتاب وغیراں چلتی ہوئی ہر چیز کو چھونے لگتی ہے۔ اس وقت آواز آتی ہے۔

از خود اندیش و دریں باد یہ ترساں گذر
کہ تو ہستی و وجود و وہاں چیزے نیست
ایہ شاعر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہے بہت دور سرخ روشنی کی ایک کلی سی دھار اس طرح دکھائی
دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے خود فراموشی دور ہوتی اور احساس جاگنے لگتا ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ
روح شاعر اوپر چڑھ رہی ہے۔ پہاڑ صمد ادا ہے،

پہاڑہ اندیشہ کر کسی کے مقام حجاب کا
جلوہ فروش کون ہے قصر خیال میں
کس کا فروغ ہے نگہ بانال میں؟
بیکار دل کی بزم میں دست اہل ہیکل؛
ارمان کے حصار میں کس کا خیال ہے؟
کھلتے ہیں کس کے سامنے جذبات کے علم؟
چلتی ہے روح؟ عقل؟ دُور رہتا تو ہیں
منصف ہے کوئی دورہ کے عشر بیا تو ہیں

ایہ سن کر روح شاعر پر ایک لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن وہ سنبھل کر پہاڑ سے کہتی ہے

روح شاعر طے کرے گی ظلمتوں میں بھی نہیں میری دیتا
یاد اہل ہے مجھے خضر محبت کا پیام
سامنے تو چاہے تفتنی سیڑھیاں پیدا کرے
سینہ مضطرب میں جو برق رواں پیدا کرے
پہلے اپنے پیکر غامی میں جاں پیدا کرے
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
رات کے آروں میں اپنا لڑواں پیدا کرے
سوئے گردوں نالہ شکر پہلے بھیجے سفیر

روح شاعر ہاڑ پڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک نارسے آواز آتی ہے،

ہست ایں میکدہ و دعوت علم است اینجا قسمت بادہ بہ اندازہ جام است اینجا
حرف آں را کہ بگیا نہ صوت است ہنوز از لب جام چکیدہ است و کلام است اینجا
ماکہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم علم جاں را بد میدیم و عمل ساختہ ایم
(روح شاعر یہ آواز سن کر سوچنے لگتی ہے اور کہتی ہے،)

روح شاعر ہر ذرہ حیات ہے اک روح ارتقا، اس خود و و ازل کا کوئی نہا بھی ہے
حیرت کا آئینہ ہے بیابان کائنات ظلمت کی وادیوں میں کوئی رشتا بھی ہے
موت و حیات کھیل میں طوفان و قحط کے یاں ابتداء ہے اور کوئی انتہا بھی ہے
امید پر قیام وجود و عدم ہے کیسا سامان زندگی میں علاج قضا بھی ہے؟
اک پروہ نظر میں ازل اور ابد کے ناز کیسا عالم شہو کوئی دیکھتا بھی ہے؟
فرد بشر نے پائی ہے تہذیب زندگی دنیا میں امتیاز ثواب و خطا بھی ہے؟
بیگانگی کی آگ میں جھونکے ہوئے غریب میں پوچھتا ہوں دہریں اپنا خدا بھی ہے؟

(روح شاعر ہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ دور سے پیغام آتا ہے،)

از دُشَل کرشمہ کار نمی شود تم سلم عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب،

دب شاعر کو ادھر سے کچھ آجالا قریب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایک نہایت تنگ
منزگ سے گزرتا ہوتا ہے۔ جہاں باتہ بیپیلانے کی جگہ بھی نہیں ملتی اور نہ سراٹھا کر چلنے کی۔ اسے سرجھکا
ہوئے پیروں سے ٹکراتے ہوئے گزرتا ہوتا ہے۔ اسے منگ سے آخری گشتے پر پھر روشنی
دکھائی دیتی ہے جو تیرتج بڑھتی جا رہی ہے۔ روح شاعر تیزی سے دروازے پر پہنچتی ہے۔ سننے
سے دو جین پیکر روح شاعر کی طوت سکراتے ہوئے دیکھتے اور گزرتے ہیں۔ ان کے تابوں پر عمل

اور "خود می" لکھا ہوا ہے۔ دونوں گاتے ہیں،

پیکر عمل چو خورشید سحر میدا نکاہے می تو اں کردن ہمیں خاک سیر را جلوہ گاہے نیتوال کردن

لے پیام مشرق ص ۱۱۱۔ لے زہر بسم ص ۱۱۱۔

نہیں عالم جالب را، نہ آں عالم جالب را اگر تاب نظر داری نگاہے میتواں کردن
 پیکر خودی ہم چہیت؟ پیام است شنیدی نہ شنیدی در خاک تو یک جلوہ عام است ندیدی
 دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز
 واسوختہ یک شر را ز داغ بگر گیر یک چند بہ خود بیچ و نیتاں ہمہ در گیر
 چوں شعلہ بہ خاشاک دویدن دگر آموز
 (روح شاعر غفلت سے بکمل کران کے پیچھے پیچھے پڑتی ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے دل پر یقین کا کچھ
 اٹھا ہونے لگتا ہے)

نواں منظر طوفان تجلی

(صل اور غوی کے پیکر تھوڑی دو چل کے شفق کے ایک جھروکے میں داخل ہو جاتے ہیں، اب
 روح شاعر فردوں سے زیادہ لطیف نور کے دھوپ میں اپنے آپ کو محصور دیکھتی ہے۔ آگے کچھ
 نظر نہیں آتا۔ اس وقت سامنے سے ایک عجیب قسم کا دیوہیکل جاذبہ نمودار ہوتا ہے جس کا آدھا جسم
 گوشت کا اور آدھا سخت وحاشات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کی ایسی تیز
 دھاریں دوڑتی ہیں کہ شبہی نور میں ان کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ وہ آڑو بے کی طرح چار پاؤں
 سے ریٹکتا ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز سامنے آیا۔ اس کی چال
 میں مایوسی ہے اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ روح شاعر کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور
 انسانی لب و لہجہ میں کہتا ہے)

جانور۔ خاکدان آب دگل میں عقل کا زنداں ہوں میں
 پیکر سنگیں میں میرے جذب نور فنا رہے
 سرحد افلاک کا عزم سفر تھا رہ گیا
 تھاکر لہجہ روح و دل اور دشمن جوش چہل
 غفلت و گم گشتگی کا آہنی سماں ہوں میں
 میری چشم دوڑیں اک روزن دیوار ہے
 آنا ورنی ہو کے ہلکی جنبشوں میں بہ گیا
 کر دیا اسرار نے اس بزم میں خوار و زبوں

نور کے بادل میں کوئی رہنما ملتا نہیں جہانگتا ہوں دیکھتا ہوں راستہ ملتا نہیں
 سانس رک جاتی ہے جب اپنا بڑا ہوں قلم منہ مجلس دیتی ہے میرا گرمی لوح و قلم
 آہ اتنی منزلیں طے کر کے بھی ناکام ہوں آہ اپنی روشنی کی ظلمت انجام ہوں
 دیکھو مقل کا دیو پیکر رنگتا ہوا گذر جاتا ہے ایک ایوان کے ریشی پردوں سے چند ایسی آوازیں آتی
 ہیں جیسے کوئی زور سے ذکر و شغل کر رہا ہو۔ یہ روح اقبال کا ذکر و شغل ہے،

پہلی آواز۔ عشق نا پید و خرومی گزشتہ صوفیاء عقل کو تاج فرمان نظر کرنے سکا
 ذہن بند نے والاتاؤں کی گذر کا ہنکا اپنے انکار کی دنیا میں سفر کرنے سکا
 اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا لیا آج تک فیصلہ نشع و ضرر کرنے سکا
 جس نے سوچ کی شاعری کو گزشتہ قاریا زندگی کی شب تار ایک سحر کرنے سکا
 دوسری آواز۔ میری متلع حیات علم و ہنر کا سرور میری متاع حیات ایک دل ناصبور
 معجزہ اہل فکر فلسفہ تیج و تیج مسیح معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور
 ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور
 فیض نظر کے لئے ضبط سخن چاہئے حرف پریشاں نہ کہ اہل نظر کے حضور
 تیسری آواز۔ یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو مقام وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الہام
 مقام ذکر کمالات رومی و عطار مقام فکر و کمالات بوعلی سینا
 مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکاں مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

روح شاعر میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک جست میں ٹپٹپتی پردوں سے گذر جاتی ہے۔ تھوڑی
 دو تیر روشنیوں میں چلنے کے بعد اس کے سامنے ایک نور کی چادر سی ہوتی آتی ہے۔ چادر پر اتنی
 چمک ہے کہ راستہ نظر نہیں آتا۔ روح شاعر دیکھتی ہے کہ پانی میں سے ایک حور سرخ رنگ کی نکلتی ہے
 اس کے زرجاہی سینے میں ایک زمریں تیر چھا ہوا ہے اور اس سے دل کی شکل کا ایک ایک خوں میں جلو
 گزرتا ہے جس سے نور کی چادر سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ حور و زمریں آوازیں یہ ترانہ گاتی ہے،

لے ضرب کلیم صفت ضرب کلیم صفت ضرب کلیم صفت

حورِ دل ہے جلوہ گاہِ عرش کی نگاہ میں تجلیاں
خود کی ہرق تیز رو ہے زلف تابدار میں
نظرِ مٹاکے جب چلوں تو ممتیاں نثار ہوں
قدمِ ترم پہ جامِ مے لٹھکائے شونیاں مری
ازل کی تابشوں سے ہے رخِ حین تابدار
قیامتِ آفریں یہ دلِ بزمِ آرزو سے ہے
مری ہتیلیوں میں ہیں فلکِ ماہِ و آفتاب
مری فضاے زسیت میں جنوں کا احتضام ہو
اس کے پیچھے ایک روح اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور قدم قدم پر اپنے آگے چلنے والی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے
قصہ دار و رسن بازیِ طفلانہ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا آنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ دل،
روح شاعرِ مہلاب نور میں سے آگے بڑھتی ہے۔ اب اس کے سامنے ایک زرین تختہ ہوتا ہوا آتا ہے
جس پر ایک نازنین بیوش پڑی ہوئی ہے۔ ہاتھ پانی کو چھو رہے ہیں اس کا لباس آئینوں اور تاروں
سے بنا ہوا ہے۔ جگر جگہ سبز شامیں تیر کی طرح نکلتی ہیں اس کے پیچھے ایک ایک بیتاب پیکرِ بال
پریشان ہاتھ پیرا رہے ہوئے تختہ کو تھامنے کی کوشش کرتا ہے مگر تختہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے
بیتاب پیکر بکا رہتا ہے،

بیتاب پیکرِ گرجی قلب و نظرِ غضب سے اب کام لے
اے مری دیوانگی اس کو ذرا تعام لے
تھو کرین کھاتی ہے گو میرے لئے کائنات
ہل نہیں سکتا کبھی عشق کا پائے ثبات
رقص میں لاتی جب وقت کی گردش مجھے
ملتی ہے کوئین میں قلب کی لرزش مجھے
مشیشہ عقل و خرد، ساغرِ چشم و نظر
آئینہ زندگی پر وہ شام و دھسہ
منزل امن و سکون بفضلِ علم و عمل
مستی کون و مسکاں، بزمِ ابد و ازل

لذت ایمان دول، دولت شوق وصال
 بنگدہ خوش بنگاہ، ہیکدہ لازوال
 سب مری دشت کے قید سب سے ساغر میں ہیں
 سب مری ٹھوکر میں ہیں سب مری ٹھوکر میں ہیں
 گرمی طلب و نظر جذب سے اب کام لے
 اسے مری دیوانگی اس کو ذرا اتھام لے
 (تحفہ نازین کو لے رہا ہوا چلا جا رہا ہے اور کتا ہے)

بگاہ شوق کو سیلاب ناز لے کے چلا
 صدائے عشق کو طوفان ساز لے کے چلا
 رواں ہے حق نظر نور کے سیف سے پر
 عروس ناز کو اک بے نیاز لے کے چلا
 نظر عروس ہے اور قتل و دل خراب نظر
 جو جوتو میں ہوا سرفراز لے کے چلا
 جنوں کی دست و دمازی سے بچ گیا شاید
 حسین جلو کے کو آئینہ ساز لے کے چلا
 (روح شاعر کو نظر رہ جاتی ہے اوپر سے دو فرشتے چاند تارے اوڑھے ہوئے گذرتے ہیں ایک فرشتہ گاتا ہے)

فرشتہ نکونہ جا اس سحر و شام میں لے صاحب ہوش
 دوسرا فرشتہ عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام
 اک جہاں اور بھی ہر جہں کا نہ فردا ہونے دوش
 یہ لکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں انخلاق
 کسے خبر کہ جنوں بھی ہو صاحب ادراک
 (روح شاعر یہاں سے گذر کر ایسے مقام میں آتی ہے جہاں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا ہے خوشبو جسم
 مٹوم ہوتی ہے۔ رنگ کی دیواریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس طوفان سے دو خوبصورت پہول رقص
 کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔)

پہول۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی وہ سادون کے جو لے
 وہ حوروں کے قد بولا سے گلزار پہولے
 ٹی ننھی کیلون کو اک خوش بنگاہی
 وہ کوئی بیکاری الہی الہی
 ہاروں کی مستی بنگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

جوانی کی ٹھوکر میں چاند اور تارے
کنواری صداؤں سے کوئی پکارے
وہ زریں کسر لڑکیاں کلمکلائیں
وہ ہنس ہنس کے جھولے کی پیٹلیں بڑھائیں
بہاروں کی مستی بنگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

ہر اک بھولی صورت دھبی زندگی کی
ہر اک پاک صورت کھلی زندگی کی
وہ رنگیں ادائیں مستاع جوانی
وہ بھولی صداہیں مئے لن ترانی
بہاروں کی مستی بنگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

ان کے پیچھے نہیں سی قوس قزح ہاتھ میں لے لے اور ہاتھ سر پر بلند کئے ہوئے فشنی پریاں رنگین قبائیں پہنے
ہوئے گذرتی ہیں اور گاتی ہیں

دنگ اور بو کے دریا جاگے دوڑے تارے آگے آگے
بادل بادل رنگت چھائی جوگن بن کر قدرت آئی
آؤ سکی تاروں سے کھیلیں
آؤ سکی تاروں سے کھیلیں!

اس نگری میں پیت بھری ہو ڈالی ڈالی دل کی ہری ہے
اپنے آگے نور کا پر وہ اللہ اللہ اللہ اللہ

آؤسکی تاروں سے کھیلیں آؤسکی تاروں سے کھیلیں

اسانے سے حضرت جبریلؑ اڑتے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا سے سیارے تنکوں کی طرح دور ہو جاتے
اور فضا ایک نیلگوں نور بن کر رہ جاتی ہے۔ روح اقبال لنگانی ہوئی گذرتی ہے،

سینہ کشادہ جبریل از بر عاشقان گذشت تاثر سے بہ او فتنہ آتش آرزو سے تو
ہم بہ ہوائے جلوہ پا رہ کہم حجاب را ہم بہ نگاہے نارسا پردہ کشم زر سے تو،
روح شاعر اقبال کے پیچھے رواں ہوتی ہے۔ وہ حیرت کے ساتھ بلند اور نیلگوں فضا کی طرف دیکھتی ہے
جس کی رنگینی وسعت اس کی بلندی کو پوری شان کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کروڑ ہا
میل اوپر گہری فضا میں فرشتوں کا قوس ہو رہا ہے۔ حلقوں کے حلقے ہاتھ میں ہاتھ ملائے اڑ رہے ہیں
ان کے سامنے رنگین تاروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ فضا نے نیلگوں سے روح اقبال آواز دیتی ہے،

لطیف کہ خاویاں نقش تازہ بستند دگر مرد بطواف بتے کہ بشکستند
چہ جلوہ ایست کہ ولما بہ لذت بنگھے ز خاک راہ مثال شرار و برجستند
تو ہم بہ ذوق خودی رس کہ صاحب طراقتی بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند
غلام محبت بیسار آں سوار انم ستارہ را بہ سناں سفتہ دگر کہ بستند

روح شاعر چاروں طرف دیکھتی ہے اور فکر میں ڈوب جاتی ہے،

روح شاعر۔ یہ تماشائے نظر اور یہ تجسلی کا، ہجوم نیلگوں وسعت افلاک میں یہ رقص نجوم
یہ ملائک کی سرچرخ منور پرواز حر و غلماں کی سراپردہ جاں سوا آواز
انغریں بحر میں یہ نور کا سیلاب رواں کشتی حسن میں بیٹھی ہوئی حوراں جہاں
اور اس اوج نظارہ پہ مرا ذوق سفر ہر قدم پر دل بیتاب کو اک خوف و خطر
قاصد شوق ہے کیا محفل ہستی کے لئے ساغر عشق ہے کیا حسن پرستی کے لئے
کیا مجھے منزل آخر کا پتہ ملتا ہے کیا مجھے وادی حیرت میں خدا ملتا ہے؟

(سامنے سے دو فرشتے یہ گاتے ہوئے گزرتے ہیں)

ایک فرشتہ تینوں دل کے مراد آدمی لبریز نقیصہ بادا
دوسرا فرشتہ جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہوا نقیصہ
ایں جام جہاں بنیم روشن ترازیں با
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں

(یہ گاکر فرشتے نیلگوں بلندی کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ روح شاعر اب ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں
ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ مقام نہایت بلند ہے اور آگے قدم کی طرح عظیم اشار
سوائے اڑنے کے چارہ نہیں۔ روح شاعر بہت گھبراتی ہے، ایک آواز آتی ہے،

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یا حیرت خارا بی یا تاب و تب رومی
یک رنگی و آرا آدمی اسے ہمت مرد
یا فکر کلیکمانہ یا جذب کلیکمانہ
(روح شاعر اڑنے کے لئے کسی فرشتے کی مدد کی طالب ہوتی ہے، پھر آواز آتی ہے)

دور دست جنوں من جبریل زبوں صید
ایں سن کر روح شاعر پر ایک وجد طاری ہوتا ہے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتی ہے لیکن ہمارا اور ساتھی کوئی نہ
ایک ٹکٹش میں پڑ جاتی ہے اور کہتی ہے،

آہ کیا بیگانگی ہے اس ظلم عرش کی
پائے ماندن نہ جانے فتن انطوفاش
کوئی میری دستگیری کے لئے آتا
جذبہ توفیق بھی یاں ناز فرماتا نہ
(فرشتوں کا ایک جھرمٹ گاتے ہوئے گزرتا ہے)

عقل ہر بے نام ابھی عشق ہوتا تمام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام
جو ہر زندگی ہے عشق جو ہر عشق جو خودی
روح شاعر دیکھتی ہے کہ پیچھے سے ملنا بولکچ رہے ہیں اور اس کے کھڑے رہنے کا مقام تنگ
ہے۔ وہ چیختی ہے اور کہتی ہے،

لئے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر
ذرہ و زرد و فرو پیچیدہ بیابانے نگر

لے ہاں جبریل مہر و مہ زبرد و زرد

حسن بے پایاں درون سینہ خلوتِ نیت
آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر
بر دل آدم زدی عشقِ بلا انگیز را
آتشِ خود را بہ آغوشِ نیتا نے نگر
(روحِ اقبال کی آواز آتی ہے)

دلِ زندہ و بیدار اگر ہے تو بتدریج
احوال و مقامات پہ پوقوف میں سب کچھ
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
ہر خطہ میں سالک کے زماں اور کہاں اور
(روحِ شاعر بوجھتی ہے)

اے رہبرِ حیات مرے بالِ دگر کو دیکھ
جی چاہتا ہے قوتِ پرواز کے لئے
مصرعِ رنگ و نور پہ میری نظر کو دیکھ
بے چین دل ہے گرنی دساز کے لئے
لیکن یہ غزمِ سوزِ تجلیِ خدا گواہ
کم کر رہی ہے ذوقِ نظرِ شوقی نگاہ
اس اوجِ منتی پہ رسانی ہو کس طرح
اور آشکارا رازِ خدائی ہو کس طرح
(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

مٹی شود پر دو چشم پر کاہتے گاہے
وادیِ عشقِ بے دور و دراز است رہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہت گاہے
سے شود جادو صد سالہ بہ آہت گاہے

(روحِ شاعر ایک آدھار فائدہ کھینچتی ہے جس سے اس میں قوتِ پرواز آ جاتی ہے اور دو چشمِ زندہ ہیں
ساروں سے آگے فضائے نیگاؤں میں پہنچ جاتی ہے۔ قریب پہنچنے کے بعد اسے ایک ایسا اور عظیم
روح پر شاندار حرون میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ مقامِ عشق = روحِ اقبال ایک پردہ رنگیں سے آواز دیتی ہے،
تو اے اسیرِ مکاں لا امکاں سے دوڑ نہیں
وہ مرغزار کہ بیمِ جہاں نہیں جس میں
غیم نہ ہو کہ ترے آشاں سے دوڑ نہیں
فضا تری مہ و پردیں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھایہ مقامِ آسماں سے دوڑ نہیں)

(یہاں روحِ شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلیں تو رہی ہے لیکن اس کے پاؤں کسی چیز سے نہیں چپتے
بدھ نظر ڈالتی ہے اسے کوئی مضامینی قوت اپنی طرف کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ساری فضا کا رنگ

نیگلوں سے۔ دور دور زمردیں دھتوں کی چاؤں میں زجاجی مینار گنبد اور محل نظر آتے ہیں۔ فضا میں جو چیز اڑتی ہے وہ ہری نظر آتی ہے۔ ڈالی پر درخشاں پیور کے جوڑے چھپاتے ہیں۔ روح شاعر کا یہاں اس طرح خیر مقدم ہوتا ہے۔

مینار۔ وحدت کی صدائیں دیتا ہوں الفت کی فضا میں دیتا ہوں

نبلی ہے قبا ایوانوں کی آتی ہے صد ارمانوں کی

ہر گام پہ زینہ نور کا ہے ہر جلوہ برق طور کا ہے

جلتا ہے مے سینے میں چراغ تھامے بے ہوشوں میں دل کا ایانغ

آ اور یہ شمع عشق اٹھ اُحسن ازل کی آگ لگا

ہم یہاں چتر شادمانی ہیں زینت فرق آسمانی ہیں

نقش نگین ہیں ان فضاؤں پر خواب شیریں ہیں ان ہواؤں پر

عشق مضطر کا دل بہاتے ہیں روشنی نظر بڑھاتے ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی نگاہ میں کھوجا چاؤں میں رنگ و نور کی سوچا

اڑتے ہیں گاتے ہیں برق دل چمکاتے ہیں

قدس جاں دکھلاتے ہیں تجسیریں برساتے ہیں

بلوریں گنبد۔

پیوڑ آسمانی۔

اللہ ہو اللہ ہو

رنگ و بو پائے جا جاں بن کر چھائے جا

اپنا دل بہلائے جا مستی سے یہ گائے جا

اللہ ہو اللہ ہو

(روح شاعر کے سامنے ایک زرنکار تخت مرصع دھت کی چاؤں میں نظر آتا ہے۔ پتے جب ہلتے ہیں

تو ان سے بیک وقت نغمہ رنگا رنگ اور نسیم سحر کی موجیں نکلتی ہیں۔ روح شاعر تخت پہ بیٹھ کے مستاق

ہے اور اس کا دل بے اختیار گنگنا ناچا ہوتا ہے)

روح شاعرِ نغمہ کی چھاؤں نگہمت بیدار کی ہوا
 تنہائی و سکون میں شیریں لطافتیں
 ہر جنبش نگاہ میں رنگین نواکتیں
 امید کی شعاع تصور کا ہستیار
 ہر بات میں خیال ازل قبلائے شوق
 انوار کے خروغ میں رنگینی خیال
 الطاف کے رباب میں اک نغمہ وصال
 ہشتے ہوئے فراق کا غم جھپکتا ہوا
 جذب و کشش سے خون جگر کھیلتا ہوا
 ہستے ہوئے فراق کا غم جھپکتا ہوا
 کون دکان چلتے ہیں لیتے ہیں نامِ عشق
 روح شاعر یہ لگاتار تے ہوئے سو جاتی ہے۔ مدتوں تک سو رہنے کے بعد جاگتی ہے تو عالم ہی کچھ اور
 ہے۔ سوائے تنہائی اور چند دور کے نمود کے اور کچھ نہیں ہے۔ لفظ بہ لفظ روشنیاں تیز ہوتی جاتی
 ہیں۔ نور کے پردوں میں پہنی ہوئی روح اقبال گاتی ہوئی گذرتی ہے،

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
 عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ
 عشق ہے اصل حیات موت ہو اس پر حرام
 عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
 عشق ہے ابنِ اسماعیل اس کے ہزاروں مقام
 عشق ہے ابنِ اسماعیل اس کے ہزاروں مقام
 (پھر آگے بڑھ کے)

صدقِ ظیل بھی ہو عشق، صبرِ حین بھی ہو عشق
 تازہ مرے ضمیر میں مسرکہ کہن ہوا
 معرکہ وجود میں بدرِ خونین بھی ہے عشق
 عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولسب
 عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
 (روح شاعر کہتی ہے،)

دلِ ایروس کا امید بھی غم کھائے گی
 اس سفر کی کوئی منزل بھی نظر آئے گی؛
 (آواز آتی ہے،)

۱۰ غلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
 کرتے ہیں خطاب آخر، اکتھا ہے حجاب آخر،

روح شاعر نظر ادا پر اٹھاتی ہے اور عالم محبت میں لپکتی ہے،

”چند برسے خوشی پر دھج و شالم“ چہرہ کشا تمام کن جلوہ ناتمام را،

اس وقت جو ہم کلی سونگنا تیز ہو جاتی ہے۔ لوز کی چادریں سیلاب در سیلاب آئے لگتی ہیں۔ روح شاعر اپنی

آنکھوں کو خیرہ ہوتی ہوئی دیکھتی ہے۔ کیا ایک چادر زوں سے ایک علم لراتا ہو گا؟ تاہم جس پر لکھا ہوا تھا ہی

سقوط از کوہ شاندر و بہ کا ہے بخشند کلہ رجم بہ گدائے سر را ہے بخشند
گاہ شاہی بہ جگر گوشہ سلطان ندمند گاہ باشد کہ بہ زندانی چاہے بخشند

(اس طوفانِ تجلی سے ایک بڑا فرشتہ نکل آتا ہے جس کے پروں پر سارے ناپختہ ہیں۔ وہ کہتا ہے)

مرکب عشق ہوں انوار کے پر رکھتا ہوں سطوت کون و مکان زیر و زبر رکھتا ہوں

مر جا تجھ کو ملا ذوقِ یقیں، لذت عشق دیکھ آئینہ کونین میں اب شوکت عشق

سوز و ساز و نظر و لذت دیدار جگا نگہ عشق کی اب چشم طلب گار جگا

پاک کرتا ہر مشعاع نگہ حن طلب جان آلودہ کو دھو گویں بے بخشش رہ

گرم کر غفل دل سوز تجلی کی طرح مست ہو لذت آواز تجلی کی طرح

جو صابہ توفیق کی نگہ پاک سے دیکھ جلوہ عشق کو اپنے دل بے باک سے دیکھ

تیری آہ دل مضطرب میں انرا آئے گا جلوہ شاہد تجھے رحمت کا نظر آئے گا

(یہ اگر فرشتہ روح شاعر کو لے اڑتا ہے۔ دونوں شفق سے بھی زیادہ رنگین بادلوں سے گزرتے ہیں۔ پھر وہ

ریح کا ایک بہت بڑے ایوان میں چوڑ دیتا ہے۔ ایک طن تاروں کی طرح جھاڑا اور دوسری طن چاند کا

غلاں آدیاں ہے۔ روح اقبال ایک مصلے پڑھتی ہوئی گارہی ہے)

میں بندہ آزاد و م عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

جہاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود متانہ نوا باز و در حلقہ دوام من

اسے مالم رنگ و بویاں صحبت آتا چند مرگ است دوام تو عشق است دوام من

پیدا یہ ضمیر م او پنہاں بہ ضمیر م او ایں است مقام او، دریا ب مقام من

ایہاں روح جدم نظر ڈالتی ہے دیواروں میں چلیوں کے آئینے نصب کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر جب ان کے سامنے جاتی ہے تو ان میں اپنا مکس نظر نہیں آتا تھلی الٹ کر اس کے منہ پر زدگانی ہے۔ روح شاعر کہتی ہے)

برجہان دل من تاختنش را نگرید کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید
روشن از پر تو آں نور مے نیست کہ نیست باہزار آئینہ پرواختنش را نگرید

ایوان تھلی میں اب نور کے اتنے سیلاب آنے لگے ہیں کہ روح شاعر اپنے آپ کو اس میں بھی ہوئی پاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں آفتاب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ایوان کے چاروں طرف دکھیتی ہے لیکن راستہ نظر نہیں آتا۔ ایوان کتاب ہے)

عشق میں نور کا غبار عشق میں نور کا فثار

عشق میں نور کا حصار عشق میں نور کا منار

حیرت صد گاہ ہے، حیرت صد گاہ ہے

ظرف نہیں تو دید کیا گوش نہیں شنید کیا

رنج نہیں نوید کیا سوز نہیں امید کیا

ایچ یہ جلوہ گاہ ہے، ایچ یہ جلوہ گاہ ہے

سوزیقین جگا ابھی درو جگر بڑا ابھی

عشق کو جگہ گگا ابھی حسن کے گیت گگا ابھی

یاں کی یہ رسم و راہ ہی، یاں کی یہ رسم و راہ ہو

دیدے بے بلند حسن عشق کی ہے کند حسن

سوز سے ارجمند حسن عشق کی قید و بند حسن

سردیاں نگاہ ہے، سردیاں نگاہ ہے

اس وقت نور کی ایسی موجیں اٹھتی ہیں کہ ایوان تھلی اور روح شاعر دونوں اس میں بہ جاتے ہیں۔

بے انتہا مسافت طے کرنے کے بعد روح شاعر ایک بلند مینار سے ٹکراتی ہے جب روح شاعر منہل ک
مینار پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا کلس نگاہ کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا ہے حتیٰ کہ نیگلوں رواق سے بھی گزر
جاتا ہے۔ روح شاعر اس مینار پر چڑھ جاتی ہے فوراً طوفان نیچے ٹکراتا ہے چڑھتے ہی وہ اطراف کی
فضا کو دیکھتی ہے۔ جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشوق ازل اس کی طرف آ رہا ہے۔ یہ مقام امید ہے۔

روح شاعر امید کی رنگ میں مشوق ازل کی آمد کے تصور کے گاتی ہے

نہ تو اندر حرم گنجی نہ دربت خانہ می آئی لیکن سوئے مشتاقان چہ شتاقانہ می آئی

قدم بے باک تر نہ در حرم جان شتاقان تو صاحب خانہ آخر چرا در زمانہ می آئی

مینار کے کلس پر جلوہ رانی کو نہ لگتا ہے اور روح شاعر یہ سمجھتی ہے کہ چاروں طرف ایک چکا چوند کرنے

والا کلس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اس طرح برق در برق جلوہ در جلوہ پیدا ہو رہا ہے۔ روح شاعر کی آنکھیں

چند ہی جاتی ہیں۔ کچھ نظنیں آتا۔ وہ آنکھ بند کر کے جھونے لگتی ہے (دکھتی ہے)

از چشم ساقی مست شرابم بے سہ خرابم بے سہ خرابم

شو قم فزوں ترا ز بے حجابی بنیم نہ بنیم در تیج و تابم

از من برون نیست منز لگہ من من بد نصیبم را ہے نیام

اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مینار اور روح شاعر دونوں گھمائے جا رہے ہیں۔ اس پلک میں وہ عرش کے

نیچے ایک ایسے ازل میں ایدان میں آنکھ کھولتی ہے۔ جہاں فرش شامی اور وسعت لا انتہا کے سوا کچھ

نہیں رہتا۔ بہت دور نور کی ایک لکیر پر یقین اور عشق کے پیکر ستاروں کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔ روح شاعر یہ کہتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے

ما را از مقام ما خبر کن مائیم کب دو تو کجا بی؟

پیردہ

خطابِ آخریں

شاعرِ مستقبل کی روح :-

رازِ ازل عیاں ہوا سینہ جبریل سے
 دستِ کلیم کی قسم، نور کا فیض عام تھا
 قدس کی نیک زندگی روحِ حبیب بن گئی
 آئینہ سازِ عشق تھیں، غارِ حرا کی خلوتیں
 چاند تاروں کی چمک حق کا علم نبی ہوئی
 روزِ ازل سے اس کا تھا کون دمکائیں اہتمام
 عرشِ خیال پر وہی نورِ ازل عیاں ہوا
 دقت کے آنے والے دورِ ذوقِ یقین کو کام لے
 جلوہ روح و عقل و دل آئینہ خودی میں دیکھ
 حکمت و علم و فلسفہ، خارجِ حیات ہیں
 عالمِ حسنِ دوست میں عشق کی پرفشانیاں
 عشق کا بادہِ ازل درختِ جبریل ہے

بچے زندگی سے تاب و تبِ فیل سے
 خنجرِ دوستِ پنجہ عشق میں بے نیام تھا
 اوجِ پہ عشق آگیا، ایک صلیب بن گئی
 ڈٹ رہی تھی اک نظرِ حسنِ ازل کی دلیتیں
 کون دمکائیں کی سرورِ نقشِ قدم نبی ہوئی
 صبرِ حسین پر ہوئی عشق کی زندگی تمام
 آج پیامِ حسن و عشقِ نغمہ جاوداں ہوا
 قمرِ عمل نہ کر سکے عرشِ نشین سے کام لے
 مستیِ سوزِ جاوداں سا غلبے خودی میں دیکھ
 تیری سیاتیں نہیں ظلمتِ شش جہات ہیں
 دور کریں گی دہر سے روح کی ناتوانیاں
 عشق کی بزمِ آتشیں گل کدہِ ظلیل ہے!

(پیرِ دلا)

محمد عبد القیوم خاں صاحبِ باقی

دہی صنعتیں

۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن کا بیان ہے کہ اس وقت جبکہ جدید صنعتی نظام کا جنم یورپ میں مغربی یورپ غیر متہد قبائل سے آباد تھا، ہندوستان کے بادشاہوں کی دولت اور اس کے صنایعوں کی پاکدستی کا شہرہ تھا اور اس کے بہت عرصہ بعد بھی جبکہ مغرب کے الو العزم تاجروں نے پہلی بار ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس ملک کی صنعتی ترقی یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مگر آج وہی ہندوستان اپنی بیشتر صنعتی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ قدیم زمانے میں ہندوستان کی صنعتوں کی شاندار ترقی اور انیسویں صدی میں ان کا انہوشناک زوال ہیں۔ دعوت فکر دیتا ہے اس حالات کے ذمہ دار کئی اسباب ہیں۔ نامساعد حالات بھی، اہل ملک کی غفلت اور باہر والوں کی ریشہ دوانیاں بھی۔ ذیل میں ان اسباب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی صنعتوں کے زوال کا سبب یورپ میں طرین پیدا نشیں تبدیلی تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد کاروبار کے سیدھے سادے طریقوں کی جگہ پیدا نشیں برجانہ مکسیمیہ ترقی تقسیم عمل، اعلیٰ تنظیم اور بڑی بڑی سکوں نے لے لی۔ ذرائع نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، ذرائع معاش کی افزائش اور نوآبادیات کی دریافت نے یورپ والوں کے آگے صنعتی ترقی کا میدان پیش کیا اور ہندوستان میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی پستی بھی پھیلی۔ حکومت اور عوام کسی لئے بھی صنعتی ترقی کی کوشش نہ کی۔ ہمارے ہاں کا کاروبار اسی پرانی ڈگر پر چلتا رہا۔ قدیم درباروں کے تباہ ہو جانے اور مضربرونی اثرات کی وجہ سے صنعتوں کا حال پہلے ہی خراب ہو رہا تھا اور بقول مشرقت ”یورپ میں مشین کی بنائی کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کی آخری منزل بھی پوری کرادی“

(۲) دہی دربار ملک کی مصنوعات کے سرپرست تھے سیاست کی کروٹ نے ان کو تباہ کر دیا۔ عوام میں افلاس پھیل گیا۔ جدید حاکموں کا مذاق دوسرا تھا۔ وہ قدیم درباری مصنوعات کے قدردان نہ تھے۔

اور عوام میں جو لوگ کچھ استطاعت رکھتے تھے ان پر جاگوں کی تقلید اور مغربی تعلیم کا اثر مذاق کی تبدیلی میں نمودار ہوا۔ غرض یہ کہ مصنوعات بے آسہ کے رہ گئیں تباہی یقینی تھی۔

(۳) برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش اور حکومت ہند کی غفلت بھی دہی صنعتوں کے زوال کا بہت بڑا سبب ہے۔ ایچ ایچ، ٹن صاحب کی رائے ہے کہ اگر اس قدر بھاری محصول اور مافوق قوانین نہ ہوتے تو باوجود دغائی قوت کے پہلی اور انچسٹر کے کارخانے شاید ہی چل سکتے۔ برطانوی صنایع نے سیاسی ناانصافی کے ہتھیار کو اپنے حریف کے نیچا دکھانے کے لئے استعمال کیا کیونکہ برابر کے مقابلہ میں وہ اس سے عہدہ برآئیں ہو سکتا تھا۔ غرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا یہاں کے صنایعوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ کمپنی کی حکومت کے زمانے میں اس کے وٹاں ملک کے ہتھیار بن گئے۔ سیاسی قوت کے اثر سے انھوں نے دیں کے بے بس صنایعوں کو مجبور کیا کہ کمپنی کے سود گسٹوں کے دین نہ رکھیں۔ کمپنی کے کارندے اجارے کے سامان کی من انی قیمتیں مقرر کرتے۔ صنایعوں سے زر پرستی معاہدہ کراتے کہ کمپنی ہی کا کام کریں گے۔ اگر وہ وعدہ خلافی کرتے تو ان کو قید میں ڈال دیا جاتا۔ بد نصیب صنایعوں نے تنگ آکر زراعت کی طرف رجوع کیا۔ گمان کی قسمت سے ان کو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔

باوجود اس قدر زبردستی کے بھی ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کے بازاروں میں کبھی نہیں آخر کار انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محال مائدہ کئے گئے۔ کئی ایک صنعتوں کی درآمد انگلستان میں بالکل ہی بند کر دی گئی۔ غنیل میں چند محال کی کیفیت واضح کی جاتی ہے جو کہ نمونہ مشقے از خردارے ہے۔

اشیا	برطانوی مال پر ہندوستان کا محصول	ہندوستانی مال پر انگلستان کا محصول
روئی کی مصنوعات	۳ ۱/۲ فی صد	۱۰ فی صد
اونی مال	۲ فی صد	۳۰ فی صد
کچا لوہا	x	۵۰ ٹنلک فی ٹن

(۴) انگلستان نے اٹھارویں صدی میں خود تائین تجارت کی بدولت ترقی کی تھی اور اب جب

اس کی صنعتی حالت محکم ہو گئی تو اس نے دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لئے تاکہاگریہ ملک اور خاص کر ہندوستان تائین کے طریقے بوجھل پیرا ہونے تو انگلستان کے مال کی کھپت ممکن نہ ہوتی۔ پہلے برطانیہ نے آزاد تجارت کی طلبہ داری کی۔ باجسٹراور لنکا شائر کے کارخانہ داروں کے دباؤ سے حکومت ہند نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ برطانیہ کے بغیر کسی روک ٹوک کے مصنوعات ملک میں درآمد ہونے لگی اور ہندوستان کے سپرد خام پیداوار پیدا کرنے کا کام ہوا۔

۱۵) ضرورت تھی کہ برطانوی مال ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر ہندوستانی مصنوعات کا گلا گھونٹنے اس کے لئے برطانوی سرمایہ داروں نے سب سے پہلے ریلوں میں روپیہ لگایا۔ اگرچہ یہ کام شروع میں منافع بخش ثابت نہ ہوا مگر چونکہ حکومت ہند نے برطانوی سرمایہ داروں کو منافع کی ایک خاص شرح ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے انہوں نے اندھا دھند روپیہ لگایا۔ ولیم پیس صاحب نے جو دائرے کی کونسل کے وزیر الیات تھے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کے آگے برطانیہ کے سرمایہ داروں کی روش کے متعلق بیان دیا کہ انہیں "اس چیز کی پروا نہیں کہ جو روپیہ انہوں نے قرض دیا وہ کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا ہے یا دوسرا ہنگی میں خرچ کیا جا رہا ہے نتیجہ ہوا کہ روپیہ کثیر تعداد میں خرچ کیا گیا اور ایسٹ انڈین ریلوے میں فی میل ۳۰۰۰ روپے خرچ ہوئے" بہر حال اس طرح ریلوں کا جال سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ شین کی بنی ہوئی سستی پر دنی مصنوعات کے مقابلے میں دیسی صنعتیں پنب نہ سکیں۔ ریلوے کے حامل اس انداز سے مقرر کئے گئے کہ باہر کا آیا ہوا مال ملکی مال سے کم خرچ میں منتقل ہو سکے۔

۱۶) دیسی صنعتوں کو کسی قسم کی مالی امداد نہ مل سکی حکومت ہند نے ہندوستان کے زر کے ذخیروں سے انگلستان کے کارخانوں کو روپیہ قرض دیا مگر ملک کی سعی صنعتوں کی سرپرستی نہ کی حکومت کے بنکاری کے اداروں یعنی پرنسپلٹی بینکوں اور امپیریل بینک نے اہل ہند کے مفادات کی طرف سے ہمیشہ مجسراہ غفلت برتی۔

۱۷) معاہدہ اٹاوا میں شاہی ترجیح کا اصول تسلیم کیا گیا جس سے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت برآمد کو نقصان پہونچتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ یا برطانوی مقبوضات

کے مقابلہ میں دوسرے مالک ہندوستان سے زیادہ سامان منگاتے ہیں۔ ترجیح ہمارے لئے صرف اسی صورت میں مفید ثابت ہوگی جبکہ برطانیہ کی مانگ ہماری مشہور اشیائے برآمد کے لئے زیادہ ہو جائے اور غیر مالک کی مانگ بھی کم نہ ہو۔ ترجیح کا فائدہ مثبت ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ غلطی کو ہماری اشیائے برآمدہ کے زیادہ مقدار میں جانے کی امید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں غیر ملکی مال کی درآمد کی کمی کے باعث ان مالک میں ہندوستانی اشیاء کی مانگ یقیناً گھٹ جائے گی۔

(خیالات پروفیسر برج نرائن صاحب)

غرض یہ کہ ان سب اسباب نے مل کر ہندوستان کی صنعتوں کو موجودہ حالت پر پہنچا دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلابی دور میں حکومت اور اہل ہند کو صنعتوں کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے کیا انھوں نے اور امریکہ کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں بھی اسی طرح کی صنعتی ترقی کے حصول کی کوشش کی جائے؟ یا جدید طرز کی صنعتوں کی طرف سے بالکل بے نیازی برتی جائے؟ یا پھر جاپان کی طرح جدید صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔

صنعتی ترقی کی نوعیت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ جس پر ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ صنعتی ترقی محض ایک ذریعہ ہے جس کا مقصد تمام قوم کی معاشی خوش حالی ہے۔ یورپ کے جدید صنعتی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں ذریعہ کو مقصد قرار دے لیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے اکثر سیاسی جھگڑے اسی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ہاں مٹین آرمیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جدید انتظام کی بدولت جسے (Rationalization) کہتے ہیں۔ امریکہ میں چالیس فی صدی بیکار ہو گئے۔ البتہ رسالہ ہندوستانی اقتصادیات، مضمون متعلقہ معاشی تعلقات ازماتا گاندھی، علاوہ اس کے ان مالک میں جو پیداوار جو ترقی ہے وہ اپنے ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جس کی بیکاسی کے لئے ان کو دوسرے مالک کو اپنی منڈی بنانا پڑتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صد بڑے پیمانے کی صنعتوں میں مشغول ہے اور ہندوستان دنیا میں آٹھویں درجے کا صنعتی ملک تصور ہوتا ہے۔ اگر موجودہ صنعتی پیداوار کو دوگنا کر دیا جائے تو یہ بھی ترقی ہوگی۔ مگر ہندوستان کی آبادی ہی کا اضافہ ایک فی صد سالانہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی ترقی کا

یہ اضافہ آبادی کے افسانے کی وجہ سے بیکار ہو جائے گا اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جو تمام ملک کے باشندوں کے لئے روزگار فراہم کرنا ہے۔

پھر اگر بالفرض ہم اپنی تمام آبادی کو بھی بڑے پیمانے کی صنعتوں میں لگا دیں تو ہماری صنعتی پیداوار آتی بڑھ جائے گی کہ ہمیں برطانیہ اور امریکہ سے بھی کہیں زیادہ بڑے علاقے کو اپنی منڈی بنانا پڑے گا اور یہ چیز خود کفالتی اور معاشی بے نیازی کے چرچوں کی وجہ سے بالکل نامکن ہے۔ ہندوستان محض برآمدی ملک بھی نہیں بن سکتا کیونکہ آج کل تجارت خارجہ مبادلہ اشیاء کے طریقے پر چلتی ہے۔ یعنی قیمت کا مال ہم برآمد کریں جس کی مقدار مفروضہ بالا میں بے انتہا ہوگی، اتنا ہی مال درآمد بھی کرنا پڑے گا لیکن اگر ملک میں اسکی طلب اور مصرف نہ ہو تو تجارت خارجہ سرے سے بند ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ محض جدید پیمانے کی صنعتوں کا چلانا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف قدیم وضع کی صنعتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا یہ ماننا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان میں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی کا رواج تھا۔ ملک خود کفیل تھا اور خوشحال۔ مگر آج کل حالات بدل چکے ہیں مسابقت کے اس دور میں یہ طریق کار نہیں چل سکتا۔

بہترین حل اس مسئلے کا یہ ہے کہ قدیم اور جدید صنعتوں کو پہلو بہ پہلو چلایا جائے۔ جاپان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اہل جاپان نے بعض ایسے کاموں کو جو تمام کے تمام مشین سے ممکن تھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں تقسیم کر کے گھریلو دستکاروں کو دیدیا۔ دستکار کارخانوں کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں اور بعد میں اپنے نتائج کارخانے کو دیدیتے ہیں جہاں مشین کے ذریعہ ان کی تکمیل کر دی جاتی ہے دیا سلائی اور پارچہ بانی فیمو صاؤشیم کی صنعت اور بہت سی دوسری صنعتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی طریقہ کامیاب بن سکتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ایک ہی پیشہ کی مسابقت سے چھوٹے دستکاروں کو نقصان کا زبردست اندیشہ ہے لیکن اگر مندرجہ بالا طریقے سے گھریلو صناعتوں اور بڑے بڑے کارخانوں میں اشتراک عمل پیدا کر دیا جائے تو بہترین نتائج کا حاصل ہونا یقینی ہے۔ حال یہ کہ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینی چاہئے لیکن طریق پیداوار میں اصلاح کر کے جدید مصنوعات سے ان کا ربط

قائم کر دینا چاہئے۔

اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ کیونکر ان دستکاریوں کو ترقی دی جائے۔ ان کی امداد اور اصلاح کیسے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۱) قدیم صنعتوں کی امداد اور ترقی کے لئے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہئے کہ ملک کی تمام گھریلو دستکاریوں کی مکمل تحقیقات کی جائے اور جو صنعتیں ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کی ممکنہ امداد کی جائے۔

(۲) گھریلو دستکاریوں کی کامیابی کے لئے پہلی ضرورت دستکاروں کی تعلیم کی ہے۔ ان کو عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں ہم پہنچانی چاہئیں جبکہ صنعتی اسکول کھول دینے چاہئیں اور اگر ممکن ہو تو عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں بھی دستکاریوں کی تعلیم بحیثیت ایک لازمی مضمون کے دی جائے تاکہ بڑھ چڑھ کر ہمارے نوجوان بیکاری کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔

(۳) ضرورت ہے کہ تحقیقات فنی کا ایک ایسا ادارہ کھولا جائے جو گھریلو دستکاریوں کے کاروبار کی اصلاح اور ان کی دست کے امکانات پر غور کرے اور دستکاروں کے آگے بہتر سے بہتر لائحہ عمل پیش کرے۔

(۴) عمل پیدا نش میں کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ چھوٹے پیانے کے کاروباروں میں تقیم عمل کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن جدید آلات اور زیادہ عظیم کی بدولت تقیم عمل کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ جدید آلات کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خام پیداوار کی بھی ضرورت ہے تاکہ تیار شدہ اشیاء کی قیمت بہتر بنائی جاسکے۔ سستی قیمت پر اعلیٰ درجے کی خام پیداوار اور جدید آلات دستیاب نہیں ہو سکتے بغیر معقول مالی امداد کے یہ کام ناممکن ہے۔

۵۔ مالی امداد۔ صنعتی کیشن کی رائے ہے کہ صنعتوں کے ناظم کی وساطت سے دستکاروں کو مہسل کی ضروریات کے واسطے قرضے دئے جائیں۔ بالاقساط طریقہ خرید پر آلات تقیم کئے جائیں لیکن بہترین حل اس مسئلے کا شاید امداد باہمی سے ممکن ہے۔ اگر صنعتی بینک کھول دے جائیں تو وہ نہ صرف بڑے پیانے کی صنعتوں کو مدد دے سکیں گے بلکہ اپنی شاخوں کے ذریعہ چھوٹے پیانے کی صنعتوں کی بھی امداد کر سکیں گے۔ بہت سے صوبوں میں صنعتوں کو حکومت کی مالی امداد دینے کے متعلق قوانین بھی بن چکے ہیں لیکن ابھی حکومت کی امداد کو بڑھانے کی بہت ضرورت ہے۔

(۶) دستکاروں کی حالت اور ان میں کسی تنظیم کا نہ ہونا بھی گھریلو دستکاریوں کی بہت مالی کاہل سبب ہے۔ کارخانہ داری کا طریقہ قابل اعتراض ہے۔ کارخانہ دار ملازمین سے کام تو لیتا ہے لیکن ان کی صلاح کا زیادہ خیال نہیں رکھتا۔ ضرورت ہے کہ امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ دستکار خود اپنے کارخانے قائم کر لیں۔

(۷) جب تک فروخت پیداوار کی سہولتیں نہ ہوں یہ سب انتظام بیکار ثابت ہوگا۔ منظم بازار نہ ہونے کی وجہ سے دستکار اپنی چیزوں کی پوری پوری قیمت وصول نہیں کر سکتا۔ فروخت پیداوار کے لئے انجمنہائے فروخت کا وجود ضروری ہے۔ ہمارے پاس بیرونی بازار تو ہیں ہی نہیں اور اندرونی منڈیوں کی حالت بھی قابل اصلاح ہے۔ بیہی کے سودشی اسٹورز میں ملکی پیداوار کی فروخت کے لئے قابل تنقید نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ محکمہ صنعت کو اس قسم کے تجارتی اداروں کے ساتھ کام کر کے ہندوستان کی دستکاریوں کو اندرون ملک و بیرون ملک کے گاہکوں تک پہنچانے میں مدد کرنی چاہئے۔ بکری ہوئی دیہی صنعتوں کے اتحاد اور وسیع ترین ممکنہ منڈی کے مائل کرنے کے لئے مرکز میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنا چاہئے۔ لائسنس یافتہ گوداموں اور امدادی فروخت گاہوں کی بھی ضرورت ہے جہاں دیہی پیداوار کے ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کا انتظام ہو۔

(۸) ایک عام شکایت یہ ہے کہ پبلک کا مذاق بگڑ گیا ہے اور وہ گھریلو دستکاریوں کی طرف توجہ نہیں دیتی اس کے لئے ضرورت ہے کہ دستکاروں کو کام کرنے کے لئے جدید قسم کے نمونے فراہم کئے جائیں نیز ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ دیہی فن کاری کے نمونوں کی تہنیر کی جائے۔ نا انشیں منفقہ کی جائیں اور ہر طریقہ سے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا جائے۔ پروپیگنڈے کی ضرورت ہر جگہ ہے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی ہر کوشش میں اس سے کام لینا چاہئے۔

اگر ہم گھریلو صنعتوں کو مکمل طور سے ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے تو یقین ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مسئلے یعنی بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آیت اللہ بیگ صاحب عارف

جرمنی اور سوویت کی جنگ

لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ

اس مضمون کا مواد ٹروٹسکی کی مشہور کتاب *THE REVOLUTION BETRAYED* سے لیا گیا ہے جو ہر صاحب

ٹروٹسکی کے معتقدین میں سے ہیں یہ مضمون انہوں نے جنگ کے شروع ہونے پر لکھا تھا اگر کوئی صاحب

اس کا جواب لکھنا چاہیں تو وہ بخوشی حاضرہ میں چاہا جاسکتا ہے۔ (تقریر)

لینن۔ آج تو عجیب خبر سن رہا ہوں ٹروٹسکی!

ٹروٹسکی۔ کیا خبر؟

لینن۔ کہ جرمنی اور سوویت میں جنگ شروع ہو گئی کیا تمہیں اس کا کچھ علم ہے؟

ٹروٹسکی۔ جب میں دنیا میں تھا اس وقت تو جرمنی اور سوویت میں ایک معاہدہ آشتی ہوا تھا اور میں اسی وقت سمجھا

تھا کہ اس معاہدہ کی عمر شاید ہی دو برس ہو بہت ممکن ہے کہ جنگ شروع ہو گئی ہو میں ابھی معلوم کر کے

آتا ہوں۔ (ٹروٹسکی جاتا ہے اور کچھ دیر بعد معلوم کر کے واپس آتا ہے)

لینن۔ کیوں ٹروٹسکی کیا معلوم ہوا؟

ٹروٹسکی۔ وہاں تو لاکھوں سپاہی آگے ہوئے ہیں جنگ بڑے زور شور سے جاری ہے۔ روسی افواج سپاہ

ہو رہی ہیں جنگ شروع ہوئے ۱۶ دن بھی نہیں ہوئے ہیں کہ جرمنی کی فوجیں اسکو کی طرف بڑھ رہی

ہیں۔ سننا ہوں کہ سوویت فوجیں مقابلہ تو کر رہی ہیں لیکن جرمنی کا پلہ جاری ہے۔

لینن۔ یہ کیسے ہوا ٹروٹسکی میں تو سمجھتا تھا کہ میرے بعد بھی ترقی جاری رہے گی اور سوویت ایک طاقتور

پر دلتاری حکومت ہو جائے گا لیکن جرمنی کی کامیابی سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوویت کی جو

مالت میرے زمانہ میں تھی شاید اس سے بھی اتبر ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہو

ٹروٹسکی۔ وہاں کی اقتصادی حالت؛ کیا حالت بتاؤں! مجھے تو سنا کہ روس سے نکال دیا تھا اس لئے جو کچھ

اخباروں اور دوستوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتا رہتا تھا وہی جانتا ہوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے سوڈیٹ کی تیل کی صنعت کا افسر علی لکھتا ہے۔
 ”ہماری صنعت میں وہی مشینیں استعمال ہوتی ہیں جو امریکہ میں لیکن ہمارے یہاں ماہر کارگر کم ہیں اس لئے مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت ہوتی جو کام کرنے والے لاہور و اہل اور ماہرین اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرتے۔
 مولوٹف لکھتا ہے۔

”ہم عمارت کے کام میں بہت پیچھے ہیں۔ عمارت کا کام پرانے طریقہ پر پانی وضع کے اوزاروں سے کیا جاتا ہے۔“

اس قسم کے بہت سے جملے سوڈیٹ کے سربراہ و ردہ اصحاب کی زبان سے نکلتے رہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کام تیل بنش نہیں ہو رہا ہے۔ اگرچہ روس میں خام مٹیوں کی پیداوار میں کافی ترقی ہو گئی ہے لیکن جب تک ملک میں اعلیٰ قسم کی مشینیں نہ تیار ہوں اس وقت تک روس کے کوئلہ وغیرہ کی پیداوار بہت کم سنی گئی ہے۔ ملک کی صنعت و حرفت زیادہ ترقی محکمہ کا کام کرتی رہتی ہے لیکن محکمہ فوج کا اہل افسر ریٹوٹف لکھتا ہے۔

”جس قسم کی اشیاء فوجی محکمہ کے لئے تیار کی جاتی ہیں ان کی مضبوطی وغیرہ قابل اطمینان نہیں ہوتی۔ یہ کافی محذور شایان ہے۔ ریل و رسائل بڑی خراب حالت میں ہیں۔ ریلوے میں اتنی خراب ہیں کہ بڑی شاہراہوں پر موٹر گھنٹے میں صرف ۶ میل چل پاتی ہے۔ ملک میں ریلوے بہت کم ہیں۔ ۱۰۰ آدمیوں کے لئے جرمنی میں ۴۰۰ کلو میٹر اور روس میں صرف ۵۰ کلو میٹر ریل ہے۔ سوڈیٹ میں ریل کی پٹری تمام ترقی یافتہ ملکوں سے کم ہے۔ فرانس میں ۱۰۰۰ آدمیوں کے پاس ۵۰۰ موٹر ہیں لیکن روس میں صرف ۶۰ ہیں۔ سوڈیٹ میں ایک سال میں مال کی موٹر امریکہ کی مال کی موٹر کی نسبت صرف ۱/۵ سفر طے کرتی ہے۔ ۱۰۰۰ میں سے ۵۰ مشینیں اس قابل نکلتی ہیں کہ کچھ عرصہ کام کر سکیں باقی کو کچھ کام کے بعد مرمت خانہ جانا پڑتا ہے۔ مرمت کا خرچہ نئی مشین تیار کرنے سے دو گنا ہے

حکومت اس نقش کا احترام کرتی ہوئی کہتی ہے۔

”سوٹر کے ذریعہ سے ریل و رسال کا خرچ منس بنانے کے پڑنے کو بہت بڑا عائدیتا ہے۔“

بقول Council of People's Commissary ریل میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوڈیٹ میں اہم کاریگروں کی بہت کمی ہے۔ اس کی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ کجلی کی سوئچ صاف رکھنا ایک ایسا مشکل کام ثابت ہو رہا ہے کہ ان کی صفائی کے متعلق کرملین کے سب سے بڑے افسروں کو رپورٹ کی جاتی ہے۔ پروا واد اخبار لکھتا ہے۔

”کپڑے کی صنعت بڑی ردی حالت میں ہے۔ مال اکثر ناقص ستا اور صرف دو چار نمونہ کا ہوتا ہے۔“
لوہے کے روزمرہ کے استعمال کے برتن اور فنیچر بڑا جھوٹا تیار ہوتا ہے۔ ملک کی مام پیمانگی کا یہ عالم ہے کہ روس میں اچھے قسم کے ٹیٹن ملنے مشکل ہیں۔ دارا غلاف اور دوسرے تجارتی شہر اپنے آپ کو ٹیٹن اور خوشناسینا ٹیٹن اور کلب گھروں سے تو مزین کر رہے ہیں لیکن رہنے کے مکاؤں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اخبار اسوتسکیا لکھتا ہے۔

”ہم کافی خرچ کرنے کے بعد بھی ایک خراب عمارت بنایا تھے ہیں۔ عمارتیں مرست نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خراب حالت میں ہیں۔ مرست اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی تو بڑی ہی طع اور ناگاہی۔“

ملک کی صنعت و حرفت کا چوکہ ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک صنعت کی پیمانگی کا اثر دوسری پر پڑتا ہے اور دوسری کا اس اور پڑ اس طرح ملک کی تمام صنعت و حرفت آشوبی ہو کر رہ گئی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سوڈیٹ میں ایک مزدور دن میں کوئلہ نکال پاتا ہے اور جرمنی میں ۸ ٹن نکالتا ہے۔ ایک مزدور سوڈیٹ میں ۶ کیلو گرام فولاد نکال پاتا ہے اور امریکہ میں ۵۰ کیلو گرام نکالتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں سوڈیٹ یونین میں فی کس ۵۳ اکلواٹ بجلی حصہ میں آتی ہے اور جرمنی میں ۴۲۴۵۲۳۵ء میں سوڈیٹ میں ایک میٹر کپڑائی کس حصہ میں آتا تھا۔ اولی کپڑا صرف سربر آوردہ طبقہ کے لوگوں کو میسر آتا تھا عوام جاڑوں میں بھی سوئی کپڑا استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ سوڈیٹ یونین میں جتنے لوگ سنگے پیر رہتے ہیں شاید ہی دوسرے ملکوں میں رہتے ہوں سوڈیٹ میں

ہر ۱۰۰ اور جنسی میں ہر ۶ آدمیوں کے پاس گائے ہے اور ماگروودہ کی مقدار کا حساب لگایا جائے تو جرمنی کی ایک گائے روس کی دو گائیوں کے برابر ہے کاغذ کے اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں کیونکہ یہ کسی ملک کی تہذیب و تمدن و ترقی کا پتہ دیتے ہیں ۱۹۳۵ء میں روس میں فی کس ۴۴ کیلوگرام کاغذ خرچ ہوتا تھا۔ اور جرمنی میں ۷۷ کیلوگرام امریکہ میں ایک سال میں فی کس ۱۲۰ پینسلین استعمال کی جاتی ہے اور سوویٹ میں صرف ۴۴ اور وہ چار بجی امریکہ کی ایک پینسل کے برابر کام دیتی ہیں۔ انباروں میں اکثر اس قسم کی چیزیں پڑھنے میں آتی ہیں کہ کاغذ اور پینسل کی کمی کی وجہ سے اسکول کے کام میں بہت وقت محسوس ہوتی ہے لیٹن۔ ٹوٹسکی تماری باتیں سن کر تعجب ہوتا ہے اگرچہ یہ حالات ۱۹۳۵ء کے ہیں لیکن اس سے روس کی ۱۹۳۵ء کی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ سننا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں دو کروڑ کھایا جڑاٹا لیں ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔ مجھے احساس ہے کہ روس اپنی پہچاندگی اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے چل رہا ہے۔ ہر قوم کو اپنا ماضی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ اشتراکی ملکیت قائم کرنے اور ترقی کے مطابق اقتصادی زندگی کو ترتیب دینے کا یہ اثر جو گاگاردوس دس پندرہ سال ہی میں سرمایہ دار ملکوں کے دوش بدوش آجائے گا۔

ٹوٹسکی۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور اس ترقی کا امکان بھی تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پارٹی کمزور ہو گئی اور حکومتی طبقہ کو دبانے کیلئے ہم نے جو کنٹرول کمیشن مقرر کیا تھا حکومتی طبقہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنے طبقہ کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے یہاں آنے کے فوراً ہی بعد اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ شوٹلزم ایک ملک میں جاری کیا جاسکتا ہے جس کو دوسرے ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے کوئی سروکار نہیں۔ جب میں نے یہ کہا کہ سوویٹ کو اقتصادی دوزخ میں بین الاقوامی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رفتار کو بہت تیز کرنا چاہئے تو مجھ سے کہا گیا کہ میرا بین الاقوامی نقطہ نگاہ غلط ہے۔ جب میں نے بجلی کا ایک بڑا اسٹیشن بنانے کی تجویز پیش تو اسٹالین نے کہا کہ بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لئے ایسا ہے جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا۔ سوویٹ میں اقتصادی ترقی کچھ سے کی جا رہی ہے حالانکہ دنیا

کی اقتصادی حالت دیکھتے ہوئے ہرن کی رفتار روکا رہے۔

لینن۔ یہ ایک ملک کا نظریہ کیا ہے؟

ٹروٹسکی۔ کہ ہم صرف سوویت میں اشتراکی نظام قائم رکھ سکتے ہیں یہیں بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کرنے کی سہ

کی ضرورت نہیں ہے۔ اسٹالین نے ایک نامہ نگار رائے ہو دور کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

”دنیا میں انقلاب کرنا نہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اس کی تدبیر کرتے ہیں یہ ایک بڑی تکلیف دہ

اور مشکل خیر غلط فہمی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہم تمام ممالک میں اشتراکی انقلاب کرنا چاہتے ہیں ہمارا

ہم کہیں انقلاب کرنا ناپسند ہے۔ ہاں اگر کوئی ملک خود انقلاب کرنا چاہے تو کرے۔ ہم انقلاب کرنا

چاہتے تھے چنانچہ ہم نے انقلاب کر دیا۔“

لینن۔ اس پر نامہ نگار نے اسٹالین سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر ایک ملک میں انقلاب کا نظریہ درست

ہے تو ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کس مقصد کے لئے قائم ہے؟

ٹروٹسکی۔ بھلا نامہ نگار اس قسم کے سوالات کیسے کر سکتا تھا۔ اس قسم کے سوال وجواب تو ملی جھگٹ ہوتے ہیں

لینن۔ جب ہم نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی تو پکار پکار کر کہا کہ مختلف ملکوں کی پروتاریہ جماعتوں

کو ایک دوسرے کی مدد زبانی نہیں بلکہ تعمیرادوں سے کرنی چاہئے۔ ہم نے خود فلسفینڈ، لٹویا، استونی،

جارجیہ کی مدد لال فوج سے کی تھی جب پولینڈ کی پروتاریہ جماعت نے انقلاب کرنا چاہا تو ہم لال فوج

لے کر وارسا پر جا دھکے۔

ٹروٹسکی۔ ۱۹۲۷ء میں ہم نے چینی کمیونسٹ کی مدد کے لئے کمانڈر او تو غزیم کسے دے دے روانہ کئے اور اسی

سال لاکھوں ڈالر انگلستان کے ہر تالی مزدوروں کو روانہ کئے کسی زمانہ میں بین الاقوامی انقلاب کا

تخیل ہمارا بنیادی سیاسی تخیل تھا آج وہ اسٹالین کے نزدیک ایک تکلیف دہ اور مشکل خیر غلط فہمی

ہو گیا ہے۔ سنا ہوں کہ موجودہ جنگ میں یوگوسلاویا پر حملہ ہوا جہاں اشتراکیوں کا زور تھا لیکن سوویت

کا حکومتی طبقہ باوجود معاہدہ ہونے کے ان کو تباہ ہوتے دیکھتا رہا۔

لینن۔ اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے جب ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنا چاہا تو پروتاریہ جماعت

اور ہماری پارٹی کے عام ممبروں نے مخالفت کیوں نہیں کی؟

ٹوٹوسکی۔ پارٹی کے عام ممبر اور پروتاری جماعت کیا مخالفت کرتی۔ آپ کے سامنے ہی خود پارٹی میں ایک اونچے لوگوں کی ذات پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کے دنیا سے روانہ ہوتے ہی اس ممبر پر آوردہ طبقہ نے آپ کی یادگار میں Leninist levy کی یعنی پارٹی کے دروازے کھول دئے جس کی نے درخواست کی اسی کو پارٹی کا ممبر بنا لیا اپنا نچہ پارٹی میں بے اندازہ پروجازی اور ٹٹ پونجیا پروجازی داخل ہو گئے یہ دو لوگ تھے جنہوں نے انقلاب کرنے میں توجہ نہیں لیا تھا لیکن جو انقلاب سے فائدہ اٹھانے میں پیش پیش تھے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر حکومتی طبقہ سے جاملے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پارٹی میں حکومتی طبقہ کی بہت بڑی اکثریت ہو گئی اور بلاخوف مخالفت حکومتی طبقہ اپنے مفاد میں حکومت چلانے لگا۔ حکومتی طبقہ نے آہستہ آہستہ نہ صرف مرکزی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اعمال کو بدل دیا بلکہ دوسرے ملک کی کمیونسٹ پارٹی کے احوار کو بھی اپنے اثر سے بدل ڈالا اور بجائے انقلابی لوگوں کے ایسے لوگوں کو لیڈر مقرر کروا جو سوڈن کے حکومتی طبقہ کی پالیسی کے مطابق چلیں سوڈن کی پالیسی اسٹالین کے محدود انقلاب کے نظریہ کی بموجب صلح کل تھی ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنے کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو مدد نہیں دی گئی اور وہ تباہ ہو گئیں ان کی تباہی کا روس کی پروتاری جماعت پر یہ اثر ہوا کہ ان کا دل بیٹھ گیا میرے ہم خیال لوگوں کی بابت حکومت نے یہ کتنا شروع کر دیا۔

”یہ لوگ بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پیش کر کے سوڈن کو دوسرے ملکوں سے لڑوانا چاہتے ہیں۔ ہم کافی زخم کھا چکے ہیں۔ اب ہمیں حق ہے کہ کچھ عرصے آرام کریں۔ ہم اپنے ملک میں اشتراکی نظام رکھیں گے سب کو چاہئے کہ لیڈروں کی رہنمائی پر اعتبار کریں۔“ حکومتی طبقہ کا آرام کا نظریہ اکثریت کو بھاگیا۔ بین الاقوامی پروتاری متحد ہو جائے گا نظریہ پیچھے جا پڑا۔ اسٹالین کی سیاست بین الاقوامی نظریہ سے بہت کرملکی اور قومی نقطہ پر آٹھری اور دوسرے ملکوں کی پروتاری تحکموں کی متاوت بقا کا معیار یہ ٹھہرا کہ روس کا مفاد کس میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہم کہ ہر ملک میں قومی اور ملکی مفاد کا نظریہ زور پر کڑ گیا اور سوویت منجمد اور سلطنتوں کے ایک سلطنت ہو گیا سوویت کی ملکی اور قومی سیاست کا یہ اثر ہوا کہ تمام یورپ میں نسٹائی رجحانات زور پر کڑ گئے اور نسٹائی ڈکٹیٹر برسرِ اقتدار آ گئے۔ میں برابر یہ اعلان کر رہا تھا کہ بین الاقوامی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرو اور دوسرے ملکوں کی سرمایہ دارانہ معاہدہ کرنے کے بجائے ان ملکوں کی پروتاریہ جہت سے اتحاد عمل رائج کرو اور ان کو ہر امکانی کوشش سے طاقتور بناؤ تاکہ اگر کوئی سرمایہ دار حکومت دوس پر حملہ بھی کرنا چاہے تو مقامی پروتاریہ جماعت کے خوف سے سوویت پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے اگر آج جرمنی میں کیوسٹ پارٹی طاقتور ہوتی اور اس کا طمع نظریہ ملک اور قوم کا بچانا نہ ہوتا بلکہ ان اصولوں کو بچانا ہوتا جو ہمارے اکتوبر کے انقلاب کے حامل ہیں تو دس کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ستم تو یہ ہو رہا ہے کہ سوویت کے احرار کی تقریروں میں بھی حوام سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ اور وطن کو بچاؤ سوویت کی ایک ایجنڈا زمین کے لئے خون بہاؤ سوویت قوم کے دشمن کاؤٹ کر مقابلہ کرو وغیرہ۔ دراصل کتنا یہ چاہئے کہ اشتراکی ملکیت کو بچاؤ غریب کی آزادی کو بچاؤ۔ اشتراکی ملکیت پیداوار کو بچاؤ اب سوویت کے ملکی طبقہ کا بھی دی ٹھیل ہے جو سرمایہ دار ملکوں کا واقعہ یہ ہے کہ جرمنی سے قبل ہی سوویت میں ڈکٹیٹری حکومت قائم ہو گئی تھی اور برجوازی اثرات اتنے نمایاں ہو گئے تھے کہ حوام میں ایک لفظ (Sov Born) عام ہو گیا تھا یہ لفظ Soviet Bourgeois کا مخفف ہے۔

لینن۔ پارٹی نے بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پس پشت ڈال کر روسی انقلاب کو فنا کر دیا۔ ہماری توجہ لیٹن ہی بین الاقوامی انقلاب کی مہم میں منت ہے شروع زمانہ میں آسٹریا اور جرمنی کی فوجیں اس وجہ سے ہم پر حملہ نہ کر سکیں کیونکہ ان ممالک میں خود انقلابی حالات پیدا ہو گئے تھے کوئی چار ماہ کے اندر ہی اندر جرمنی آسٹریا اور ہنگری میں بلوے ہو گئے اور برست لٹسک کا معاہدہ جو ہمارے مفاد کے خلاف تھا خود بخود کا اہم ہو گیا۔ سلطنتیں کالے سمندر میں لالحوں نے بلوہ کر کے فرانس کو مجبور کیا کہ روس سے فوجیں ہٹائے۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں مزدوروں کی جدوجہد سے مجبور ہو کر انگلستان نے

اپنی فوجیں روس سے بنائیں جب کہ ۱۹۲۰ء میں دارساک پر شکست ہوئی تو یہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پروتاریہ جماعت کی جدوجہد تھی جس نے سرمایہ دار ملکوں کو پولینڈ کی مدد پر آنے سے روکا اور اہل سوویت کی طاقت کا انحصار دو قسم کی فوجوں پر ہے ایک تو سوویت فوج اور دوسرے ہماری وہ فوج جو سرمایہ دار ملکوں میں ہے یعنی سرمایہ دار ملکوں کی پروتاریہ جماعت وہ بھی ہماری فوج ہی ہے اس فوج کو طاقتور بنانا بھی ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ سوویت کی فوج کا پروتاریہ جماعت خفیہ سازشوں سے دشمن کو سوویت فوج کی نسبت زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ٹروٹسکی۔ لیکن آج کل تو ایک تیسری فوج کو طاقتور بنایا جا رہا ہے۔

لنین۔ وہ کونسی؟

ٹروٹسکی۔ خفیہ پولیس (۱۹۰۷-۱۹۱۷ء) جس نے روس میں ایسا اندر بچایا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے اور سب انقلابی لوگ ساہرا پہنچا دے گئے ہیں۔ میں بھی اسی پر زور دیتا تھا کہ یورپ کی پروتاریہ جماعت اور دنیا کی محکوم قوموں سے اتحاد عمل پیدا کرو لیکن روس جمیٹہ الا قوام میں داخل ہو کر موجودہ ملکی تقسیم کا حامی ہو رہا تھا اور وہ موجودہ ملکی تقسیم کی پالیسی اس قسم کی تھی کہ جب آٹلی نے جبر پر حملہ کیا تو آٹلی کے بیڑے کو باکو سے تیل جاتا رہا جب جاپان نے مشرقی چین پر قبضہ کر لیا تو سوویت نے کان ہنگ نہ ہلایا کہ میں دنیا کی صلح ختم نہ ہو جائے۔ اس رویہ سے جاپان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی جرات اور بھی بڑھی اور جاپان نے منگو لیا پر بھی آنکھ ڈالی سوویت کے حکومتی طبقہ کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا تضاد سرمایہ دار ملکوں میں جنگ برپا کر دے گا۔ اور جس نسبت سے سرمایہ دار ملک تباہ ہوں گے اسی نسبت سے سوویت طاقتور ہو جائے گا اور پھر ان ملکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی انقلاب کرنا آسان ہو جائے گا میں نے امریکہ میں بیان دیتے ہوئے صاف صاف کہا تھا کہ سرمایہ دار حکومتیں آپس میں خواہ کتنا ہی کشت و خون کریں لیکن دوران جنگ میں ایک ایسا موقع ضرور آئے گا جبکہ وہ آپس میں لڑنے کے بجائے سوویت پر حملہ کر دیں گے۔

لینن۔ ٹروٹسکی یہ توجہ و مال فوج کا کیا حال ہے۔

ٹروٹسکی۔ ۱۹۳۷ء میں جبکہ جرمنی کی طرف سے خطرہ نہیں تھا اس وقت کل فوج ۶۲۰۰۰۰ تھی جرمنی سے خطرہ ہوا تو ۳۰۰۰۰۰۰۔ اگر دی گئی تھی لیکن اب فوجی نظام بدل دیا گیا ہے۔ آپ کے زمانہ میں تو فوج میں جمہوری طریقہ پر انتخاب کے بعد انفرم قرار کئے جاتے تھے جس طریقہ کار کی یہ خوبی تھی کہ لائق اور تجربہ کار لوگ انفرم قرار ہوتے تھے لیکن اب حکومتی طبقہ اپنے مفاد کو مد نظر رکھ کر انفرم قرار کرتا ہے۔ ہم نے فیلڈ مارشل جنرل، کمانڈر وغیرہ کے خطابات اڑا کر مساوات قائم کی تھی لیکن اب وہ سب خطابات از سر نو جاری ہو گئے ہیں اور فوجی انسروں کی ذاتیں بن گئی ہیں۔ دراصل فوج بھی ساج کا ایک جز ہوتی ہے جب ساج میں ذاتیں بن گئیں تو فوج کہاں بچ سکتی ہے۔ چنانچہ نابل لوگ فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر آ گئے ہیں جس کا نتیجہ اس جنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سوویت فوج میں کہیں سپاہی تو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔ سامان حرب جس قسم کا بنا ہوا ہے اس جنگ سے اس کا بھی پردہ فاش ہو گیا۔ جب میں ان امور پر تنقید کرتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ ٹروٹسکی تو سائین کار قریب ہے اس لئے تنقید کر کے بٹلے دل کے پھپھو لے پھوڑتا ہے لیکن اب سنتا ہوں کہ سامان حرب کے لئے انگلستان اور امریکہ سے احتجاج ہو رہی ہے اور فیلڈ مارشل بدلے جا رہے ہیں۔

لینن۔ ٹروٹسکی۔ آخر اس جنگ کا کیا نتیجہ ہو گا؟

ٹروٹسکی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں خواہ سائین فوج پائے یا شکست سوویت کا جو کچھ بھی بگڑا ہوا نظام ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اگر دوسرے ممالک میں پرولتاری انقلاب ہو جائے تب تو البتہ اسید ہے کہ اشتراکی نظام اور محکم ہو جائے بہت ممکن ہے کہ جیسے پہلی جنگ میں سرمایہ داری کی رنجیر کی سب سے کمزور کڑی ٹوٹ گئی تھی اسی طرح اس جنگ میں شاید سرمایہ داری کی کوئی مضبوط کڑی ٹوٹ جائے۔ اس وقت ہمارے اشتراکی اصولوں کی فتح ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کی مدد سے اگر سوویت کو فتح بھی ہو گئی تو وہ ملک سوویت کو مجبور کریں گے کہ اشتراکی نظام کو خیر باد کہے بلکہ شاید حکومتی طبقہ ان کی مدد کی احسان مندی میں خود ہی اشتراکی اصول چھوڑ دے۔

لینن ساگر سرمایہ دار ملکوں کو فتح ہو گئی اور جنگ کے دوران میں پروتاری انقلاب نہیں ہوا تو پھر سرمایہ داری کا تقاضا دوبارہ رنگ لائے گا اور دوبارہ جنگ ہوگی

ٹروٹسکی یقیناً اب دنیا کے سامنے دو راستے ہیں یا تو اشتراکی اصولوں کو اختیار کرے ورنہ تباہ ہو جائے انسان نظر تازہ اپنی بربادی نہیں چاہتا۔ اس لئے لازمی ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان ایک دوسرے کی بربادی سے متاثر ہو کر اشتراکی اصول قبول کرے۔ ہم اسٹالین اور سوویٹ کی حکومت کی طرف سے مایوس ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی پروتاری جماعت سے قوی امید ہے کہ وہ دنیا کو بربریت کی طرف جانے سے روکے گی۔

لینن۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسٹالین اور سوویٹ روس تباہ ہو سکتے ہیں لیکن وہ اشتراکی اصول دنیا میں ہو سکتے۔ اور سرمایہ داری کا تقاضا دنیا کو اس پر مجبور کرے گا کہ پھر اکتوبر کے انقلاب کو زندہ کیا جائے۔

م۔ م جوہر صاحب میرٹھی

زندگی اور موت

سنس کی روشنی میں

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا
(پمکت)

جب ہم اپنے جسم اور اس کی ساخت پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو داغ ایک سوال پیدا کرتا ہے
وہ یہ کہ ہم کیا ہیں کیوں بنے اور کیسے بنے؟
کیا واقعی ہمارا تعلق کسی طرح سے ایک خلیہ کے جانور اتیبا سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق ہے تو اس کی
کیا شہادت ہے؟

یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم انسانی وجود کی ابتدا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم کو صاف طور سے اس امر کا پتہ چلتا ہے
کہ ضرور ہمارا تعلق دنیا سے وجود کے کسی نہ کسی زمانہ میں اس ایک خلیہ کے جانور ایبیا سے تھا۔ ہم اور ہم کیا تمام
عالم حیات اپنی زندگی ایک خلیے سے شروع کرتے ہیں۔ انڈا ایک خلیہ ہے اور مادہ منویہ کے وہ چھوٹے خوردبینی
کہر حیات (SPERMS) بھی ایک خلیے کے جانور ہوتے ہیں۔ انہیں دو خلیوں یا ان کے نواہ کے
آپس میں ایک خاص طریقہ کے اختلاط (ملاؤ) سے ہمارا وجود عالم ہستی میں آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انڈے یا سنی کے اجزاء کے تولید و ناسل (SPERMS) ایک خلیے کے جانور
ایبیا سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً۔

- (۱) دونوں ایک خلیے کے بنے ہوئے ہیں۔
- (۲) دونوں میں ایک ایک نواہ موجود ہوتا ہے۔
- (۳) دونوں اجماع حیاتیات کی طرح کھاتے ہیں۔ ہوا اپنے جسم کے اندر لیتے ہیں اور بیکار اجزاء اپنے
جسم سے خارج کرتے ہیں۔

(۴) اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں میں حیات، مع اپنے رازمات کے موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ حیات ہے کیا شے؟

یہ ہیں معلوم ہے کہ ہر کیمیاوی مرکب کی ایک خاص خاصیت ہوا کرتی ہے مثلاً پانی دو ہواؤں کا مرکب ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ معمولی درجہ حرارت پر رقیق ہوا جاتا ہے۔ اونچی جگہ سے نیچی جگہ کرہتا ہے اور جس برتن میں رکھا جاتا ہے اس کی سطح کو گیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے مادہ حیات (Protoplasm) میں بھی چند خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

(۱) یہ مادہ حیات بھی ایک کیمیاوی مرکب ہے۔ اس میں کاربن، گندھک، آکسیجن اور پانی وغیرہ ایک خاص کیمیاوی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

(۲) ہر ایک جاندار غلیہ میں مادہ حیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسی مادہ حیات کی بدولت ہمارے جسم کا ہر غلیہ ہوا لیتا ہے جو کہ زندگی کی ایک نشانی ہے

(۴) ہر غلیہ کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی غذا مادہ حیات کی زلیست کو برقرار رکھتی ہے۔

(۵) فضلہ کاہن یا غلیہ کے باہر نکلنے کی خاصیت بھی مادہ حیات ہی کی ایک ادنیٰ اسی خصوصیت ہے۔

(۶) تولید و تاسل بھی مادہ حیات کی خصوصیات کا ایک کرشمہ ہے۔

ہم نے یہ دیکھا کہ ہماری حیات کا دار و مدار اسی حیات پر ہے جو کہ ہمارے جسم کے ہر غلیہ میں موجود ہوتا ہے لیکن اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی صرف مادہ حیات کی خصوصیات ہی کا نام ہے یا اس میں کوئی اور راز بھی پنہاں ہے یاوں کیسے کہ مادہ حیات میں یہ حیات آئی کہاں سے اور ہے کیا شے؟

اگر ہم حیات کو ایک طبعیاتی نظر سے دیکھیں تو ہم اس کو ایک برقی طاقت کہہ سکتے ہیں بکلیہ لینڈ کے ڈاکٹر کراٹزل نے تو اپنے تجربات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حیات بجلی کے چارج ہی کا نام ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی یہ رائے کسی طبعیاتیہ یا خیالی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ رائے ان کے مشاہدات و تجربات پر منحصر ہے ڈاکٹر موصوف نے ایک کتے کا توڑا سا بھیج بکلی کے ذریعہ سے جلا کر خاک کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

ادہ فناء تو ہونیں سکتا ہاں ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے یہی عجیب کو فکا

کی اصل میں تبدیل کر کے اس خاک میں سے کچھ نکال اور دوسرے اجزاء کو کیمیاوی تحلیل سے علیحدہ کیا اور پھر اس میں کچھ لحمیات اور کچھ اور چیزیں ملا دیں۔ اب اس سفوف کو بجلی کے ذریعہ تحریک دینے سے ڈاکٹر صاحب مصنوعی زندہ خلیوں کے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کامیاب تجربہ نے ان کی امیدوں کو بڑھادیا اور کئی اور تجربوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایسا پر ایک تجربہ کیا جس نے ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا یقین دلادیا کہ حیات بجلی کی لمبی کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک بڑے جانفشاں تجربہ سے معلوم کیا کہ ایسا میں منہی (۱) قسم کی بجلی ہوتی ہو ہے۔ انھوں نے صرف بجلی کی قسم ہی معلوم کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے اعلیٰ تجربات کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس ایسا میں ایک دولت کے سانچوں (پ) حصہ کے برابر منہی بجلی ہوتی ہے۔ یہ معلوم کر کے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوردبینی بجلی کے تار سے مثبت (۲) بجلی جس کی مقدار بھی پ (پ) دولت تھی اس ایسا میں داخل کی طبعی اصول کے مطابق نتیجہ یہ ہوا کہ دو متضاد اور ہم مقدار قسم کی بجلیوں کے ملنے سے دونوں قسم کی جلیوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اور وہ ایسا جو کہ پہلے تیزی سے چلتا پھرتا تھا کھلتا پھلتا تھا اور نل کو بڑھاتا تھا حیات کی یہ تمام خصوصیات کھو بیٹھا اور آخر میں اس دنیا سے فانی سے عالم بے لگائی طرف رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تجربات سے یہ بھی معلوم کیا کہ اگر مثبت (۲) قسم کی بجلی کی مقدار اس اصلی منہی (۱) قسم کی بجلی کی مقدار سے کم یا زیادہ ہو جائے تو ایسا نہیں مڑتا۔ اس کو اصل ہاگمونٹ جب ہی پینا پڑتا ہے جبکہ دونوں قسم کی جلیوں کی مقدار یکساں ہو۔ اگر ایک قسم کی بجلی دوسرے قسم کی بجلی سے زیادہ یا کم ہو جائے تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متضاد ہم مقدار بجلیاں تو ایک دوسرے کا اثر زائل کر دیتی ہیں اور بچی ہوئی بجلی حیات کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا جسم ایسا جیسے سیکڑوں بلکہ لاتما خلیوں سے بنا ہے اور ہمارے جسم کا ہر خلیہ ایک قسم کی بیڑی ہے کہ عمر اور نوجوان خلیے بہت تیز بجلی پیدا کرتے ہیں لیکن زیادتی عمر کے ساتھ اس بجلی کی طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ اسی بجلی کی طاقت کا بالکل زائل ہو جانا جیسے کہ تھک بجلی اور دیگر بجلی کے کام کا دار و مدار پاؤں اس کی بجلی کی مقدار پر منحصر ہوتا ہے اسی طرح ہمارے افعال اور حرکت

وغیرہ کا دار و مدار بھی انہیں غلیہ نابیڑیوں پر منحصر ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی حیات اور موت کی تعریف پوچھے تو ہم یوں کہہ سکیں گے کہ حیات جانور کے عالم وجود میں آنے کا وہ زمانہ ہے جبکہ بجلی کی طاقت یا اور زیادہ صحیح الفاظ میں بجلی کا پوٹنشل موجود ہو اور موت اسی وقت یا potential کے ضائع یا منتشر ہو جانے کا نام ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ پانی ایک اونچی سطح سے نیچی سطح کو بہتا ہے اسی طرح سے بجلی یا برق ایک اونچے potential سے نیچے potential کو بہتی ہے۔

روس کے دو سائنسدانوں نے کہتے کا ایک سر اور انسان کا دل ان کی موت کے کئی گھنٹے بعد تک زندہ رکھا ہے۔ امریکی کے ڈاکٹر اسے کیمرے کے دارالانجریہ میں بیس سال کے مرے ہوئے مرغی کے بچوں کے جسمانی غلیے زندہ اور تندرست موجود ہیں۔ حالانکہ مرغی کی زندگی عام طور سے پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے جسمانی غلیات کو ایسی نضا میں رکھا کہ وہ ۲۰ سال سے زندہ ہیں۔

یہ سن کہ ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ہمارے جسم کے زندہ غلیات بجلی کی تڑیا potential کے لحاظ سے حیات ابدی رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے جانور اور اشرف المخلوقات انسان کو اہل کام چننا پڑتا ہے؟

در اصل یہی ایک مسئلہ ہے جس نے سائنسدانوں کے داغ کے پر لپچے اڑا دیے ہیں اور مذہب اور عالم ارواح کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا ہے ورنہ اگر حیات دائمی ہوتی تو نہ تو کوئی مذہب کا نام لیتا اور نہ جنت و دوزخ کا خیال اس کو خوشی یا رنج بخشتا۔

یہ تو جملہ مستترضد تھا لیکن ہاں اگر واقعی دارالانجریہ میں ایسے حالات اور نضا پیدا کی جاسکتی ہے جس میں کہ انسانی جسم کے کٹے ہوئے اعضا زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انسان کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتے؟

ڈاکٹر کیرن صاحب اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے جسم کے غلیات اگر علیحدہ علیحدہ کر لئے جائیں تو وہ غیر فانی ہیں لیکن جب وہ دیا دوسے زیادہ ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے جسم کو

ترتیب دیتے ہیں تو ان کا تعلق بڑوس کے دوسرے خلیوں اور بھیجے سے ناقابل علیحدگی ہو جاتا ہے اور یہی خلیوں کا اچھا دیا ایک جگہ جمع ہونا ہماری موت اور بر بادتی کا باعث ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک زندہ خلیہ جیسے ایسا اپنے زہریلے اندرونی فضلہ کو اپنے جسم سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے لیکن ان اجسام زندگی کو جن کا جسم کئی خلیوں کا بنا ہوتا ہے ان زہریلے اجزائے فضلہ کو جس کی کہ ہمارے جسم کو قطعاً ضرورت نہیں ہوتی جسم سے باہر پھینکنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ زہریلے اجزاء جسم کے باہر نہیں نکلتے برخلاف اس کے ایسا میں یہ اجزاء جسم باخلیہ سے باہر نکل جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے جسم میں زہریلے اجزاء کا قیام ہماری موت کا باعث ہو جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیہ کا جانور مثلاً ایسا کبھی اپنی قدرتی طاقت سے نہیں مرنے دیتا۔

قدرت کے اس قانون کو سن کر ہمیں اپنی بگچتی پر نہایت ہی انوس ہوتا ہے اور فوراً ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش کیا اچھا ہوتا اگر ایسا کی طرح ہم بھی غیر فانی ہوتے لیکن موت تو انسان کے اعلیٰ دائرے ہونے کی دلیل ہے اور بغیر اس کے زندگی کا مزا ہی کیا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

موت تجب یہ مذاق زندگی کا نام ہے

غلاب کچا پرے میں بیداری کا ایک پیغام ہے

جلد تحفہ صاحب
شعالم سلم ریونیورسٹی

بھید

(ترجمہ کینڈا ہر صنفہ برنارڈ شا)

(گزشتہ سے پرست)

تیسرا ایکٹ

رات کے دس بج چکے ہیں، پردے کھینچے ہوئے ہیں اور لمپ روشن ہیں، ٹاپ رائٹر اپنے کس میں کھٹا ہوا ہے۔ بڑی میز بالکل صاف کر دی گئی ہے۔ ہر بات سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کی مصروفیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کینڈا اور راجہ بیکس آتشان کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں، پڑھنے کے لئے لمپ ٹیبل پر یوہن کے سر کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ وہ خود چھوٹی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی کتاب زور زور سے پڑھ کر سنا رہا ہے۔ کچھ مسودات اور شاعری کی دو تین کتابیں پاس ہی قالین پر رکھی ہوئی ہیں کینڈا آرام کر سی پڑی ہوئی ہے، پیل کی آگ کریدنی اس کے ہاتھ میں ہے۔ آرام سے جھکی ہوئی ہے اور آگ کریدنی کو اٹھانے بہت محنت سے اس کی نوک دیکھنے میں مشغول ہے۔ پیر آگ کی طرف پھیلے ہوئے ہیں، جاگ تو رہی ہے مگر بالکل کھوئی ہوئی سی خیالات اپنے ماحول سے میلوں دور ہیں۔ یہاں تک کہ یوہن کی موجودگی کا بھی ہوش نہیں ہے،

میام۔ (پڑھتے پڑھتے رکتے ہوئے) دیکھو ہر شاعر نے اس خیال کو باندھا ضرور ہے بلکہ اسے باندھنا پڑتا ہے۔ وہ مجبور ہے اس کے لئے وہ کینڈا کی طرف رائے لینے کے لئے دیکھتا ہے لیکن کیا دیکھتا ہے کہ وہ کریدنی میں کوئی جوتی ہے کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟ (کوئی جواب نہیں) مسز ماربل!

ک۔ (چونک کر) کیا؟

میام۔ کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟

ک۔ دکانی سے زیادہ اخلاق ظاہر کرتے ہوئے، ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھی نظم ہے آگے پڑھو یوحین ہیں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اُس فرشتہ کا کیا حشر ہوتا ہے

می م۔ (مسودہ کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہوئے) معاف کیجئے گا کہ میں نے آپ کو خواہ مخواہ اس قدر زحمت دی۔

ک۔ لیکن تم نے مجھے بالکل زحمت نہیں دی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ میں سن ہی تھی۔ مہربانی سے اور آگے پڑھو۔

می م۔ مگر میں نے وہ فرشتہ دالی نظم تو کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ختم کر دی۔ اس کے بعد سے اور بہت سی نظمیں بھی پڑھ چکا ہوں۔

ک۔ (شرمندگی سے) اچھا تو پھر مجھے واقعی افسوس ہے۔ یوحین خیال ہے کہ اس کریدنی نے مجھ پر پشیمان کر دیا ہوگا (وہ اسے نیچے رکھ دیتی ہے)

می م۔ مجھ کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی

ک۔ تو پھر تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہیں دیا میں اسے فوراً رکھ دیتی۔

می م۔ لیکن میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ کوئی اسلحہ ہے۔ اگر میں پرانے زمانہ کا کوئی ہیرو ہوتا تو میں اپنی تلوار اپنے اور آپ کے درمیان رکھ دیتا۔ اگر ماربل آجاتا تو وہی سمجھتا کہ آپ نے کریدنی اسی لئے نکالی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تلوار نہیں تھی۔

ک۔ (تعجب ہو کر) کیا؟ (عجب کی نظر سے اسے دیکھ کر) میں سمجھ نہیں پاتی تمہاری نظروں نے میرا دماغ بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ آخر ہمارے درمیان تلوار کیوں ہوتی؟

می م۔ (نالتے ہوئے) یونہی، کچھ نہیں (اپنا مسودہ اٹھانے کے لئے جھکتا ہے)

ک۔ نہیں یوحین! بس اب رہنے دو۔ آخر میرے شوق شاعری کی کمی کوئی حد ہونی چاہئے۔ وہ خواہ تمہاری شاعری ہی کیوں نہ ہو تم دو گھنٹے سے زیادہ یعنی جب سے جیس گیا ہے۔ پڑھتے رہے ہو۔ اب میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

می م۔ (اٹکھڑا ہوتا ہے) ذکر نہیں مجھ کو باتیں نہیں کرنی چاہئیں (وہ ادھر ادھر بھولا ہوا سا دیکھتا ہے اور پھر اکیم

کئے گئے تھے، میں جاتا ہوں ذرا باہر جا کر پارک میں دو ایک چکر لگاؤں دور درازہ کی طرف بڑھتا ہوں۔
ک۔ بیوقوف پارک تو کبھی کا بند ہو گیا ہو گا۔ ادھر آؤ اور قالین پر بیٹھ جاؤ اور اپنی وہی شیخ پٹی والی باتیں
 اڑاؤ۔ میں اب ذرا تفریح چاہتی ہوں تم بھی تو چاہتے ہو گے؛

می۔ (ڈرتے ہوئے اور خوش ہوتے ہوئے) ہاں!

ک۔ اچھا تو پھر ادھر آؤ (دو اپنی کرسی کچھچھ دبا لیتی جوتا کہ اس کے لئے جگہ ملے آئے۔ وہ پہلے تو کچھ ہچکچاتا ہے پھر
 ڈرتے ڈرتے آتش ان کے قریب بچے ہوئے کبل پر لیٹ جاتا ہے اس کا سر کینڈا کے گھنٹوں پر ہے اور
 نظراس کے چہرے پر)

می۔ آج میں دن بھر اس قدر پریشان رہا ہوں کہ کیا بتاؤں اور وہ سب اس لئے کہ قاعدہ کی باتیں
 کر رہا تھا اور اب جبکہ بے قاعدہ باتیں کر رہا ہوں میں خوش ہوں۔

ک۔ (اسکا کوششت سے) ہاں میرے خیال میں تم اب اپنے کو بڑا پختہ شہید اور تجربہ کار کامیاب فریضی
 سمجھ رہے ہو گے اور خود پر نازاں! کیوں نا؟

می۔ (اپنا سر ملدی سے اڑھاٹاتے ہوئے اور اس کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے) ذرا ہوشیار رہیے گا میں آپ سے
 بہت زیادہ تجربہ کار اور عمر میں کاش آپ کو معلوم ہوتا گھنٹوں پر ات جاتا ہے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے
 ہاتھ میں پڑی ہوئی ہیں اور ہاتھ اس کی گرد میں ہیں۔ آواز میں جذبہ آ جاتا ہے اور خون میں گرمی! کیا میں چند شہید
 باتیں کہہ سکتا ہوں؟

ک۔ (دبیز خوف اور سنجیدگی کے گہرے جذبات کا کافی احترام کرتے ہوئے پھر بھی اور اذیتنا طرز میں نہیں۔
 لیکن تم ہر وہ بات کہہ سکتے ہو جسے واقعی اور سچے دل سے محسوس کر رہے ہو وہ کوئی بات ہو۔ کوئی
 چیز جو مجھے ڈر نہیں ہے لیکن ہونا چاہئے حقیقت کوئی وقتی حالت ہو، شہر پر زلزلہ، شاعرانہ حالت
 نہ ہو۔ میں تم کو تماری عزت و صداقت کی قسم دلاتی ہوں کہ کسی وقتی حالت کا ذکر نہ کرنا اب کہو جو کچھ
 تم کہنا چاہتے ہو۔

می۔ اس کے چہرے سے وہ شوق کی رنگ آمیزی جو پیدا ہو گئی تھی ایک دم غائب ہو جاتی ہے آنکھیں اور اس کو ٹکلی

ک۔ بہت ہی خوب۔ چندہ کتاب جمع ہوا؛

م۔ یہ میں پوچھنا بھول گیا۔

ک۔ (یوہین سے) مسٹر ماریل مفور آج بہت ہی اچھا بولے ہوں گے ورنہ وہ ایسی باتیں کہیں نہیں بھولتے (ماریل سے) اور دوسرے سب لوگ کہاں ہیں؟

م۔ وہ لوگ تو مجھ سے بہت پہلے چل چکے تھے۔ مجھے تو چھٹا راہی نہیں ملتا تھا خیال ہے وہ لوگ کھانے کے لئے کہیں رک گئے ہوں گے۔

ک۔ اپنے گویا کام کاج کے لیے ہیں، تب تو پھر میں میرا سے کدوں کو وہ سونے کے لئے جائے میں جا کر اس سے کہے دیتی ہوں (وہ اور چرچا خانہ کی طرف چلی جاتی ہے)

م۔ (یوہین کی طرف تیرنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے) کیسے؟

می م۔ اکبل پر اکڑوں بہت ہی مضحک بے ڈھنگے پن سے بیٹھے ماریل کی طرح نہایت مطمئن بلکہ ہونٹوں پر شرارت کھیلتی ہوئی کیسے؟

م۔ کچھ کیسے گا؛

می م۔ مرن اتنا کہ جب تک تم وہاں پبلک میں خود کو بیوقوف بناتے رہے ہیں یہاں تخلیق میں خود کو بیوقوف بناتا رہا۔

م۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بالکل ہی ایک دوسرے کی طرح نہیں۔

می م۔ (متحدی سے اچھی طرح اٹھ بیٹھے) بالکل، بالکل، بالکل ایک دوسرے کی طرح، بالکل تمہاری طرح میں یہاں ایک نیک آدمی کا پارٹ ادا کرتا رہا جب سے تم بلند ہمتی کا مظاہرہ کر کے کینیڈا کو یہاں میرے پاس چھوڑ گئے۔

م۔ (بے اختیارانہ چونک پڑتے ہوئے) کینیڈا!

می م۔ ہاں میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں لیکن ڈروست بلند ہمتی متعدد ہوا کرتی ہے مجھ کو یہ بھاری تم سے لگ گئی۔ میں نے تم سے قسم کھائی تھی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی ایسا لفظ کہیں نہ کہوں گا جو تمہارا

موجودگی میں کم از کم ایک ماہ بیشتر نہ کہہ چکا ہوں گا۔

م۔ اور کیا تم نے اپنی قسم پرتو قرار رکھی؟

می م۔ ایک دم کسی کی پشت پر بیٹھے ہوئے، اہا کوئی دس منٹ تک تو کسی نہ کسی صورت سے برقرار رہی یعنی اس وقت تک تو میں برابر اور لگا تا رہا اپنی اور ہر شخص کی نظریں سنا رہا تاکہ بات چیت کا موقعہ ملتا رہے۔ میں گویا جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا لیکن اندر جانے سے انکار کر رہا تھا۔ تم سمجھ نہیں سکتے کہ کس قدر بلندی کی یہ بات تھی اور کس قدر تکلیف دہ۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔

م۔ اپنے ضبط کو بہ جبر روکتے ہوئے، اس کے بعد؟

می م۔ دہشت بدمزگی اور زہریلی طریقہ سے کسی میں بیٹھے ہوئے، اس کے بعد اس نے کہا کہ بس اب تمہارا پڑھنا دڑھنا میں نہیں سن سکتی۔ بند کرو۔

م۔ اور تم چنانچہ جنت کے دروازہ کی طرف آنکھ مار بیٹھے؟
می م۔ ہاں۔

م۔ اچھا؛ (غضبناک ہو کر) آگے بول۔ مرد خدا کیا میرے جذبات کا تجربے کچھ احساس نہیں ہے؟

می م۔ (زہری اور بدیہیت کے ساتھ منہ لے لے کر بیان کرتے ہوئے) اس کے بعد وہ ایک فرشتہ ہو گئی، اس کے علاوہ ایک ملتی ہوئی تلوار تھی کہ ہر طرف گھوم رہی تھی چنانچہ میں اندر نہ جاسکا کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ دراصل دوزخ کا دروازہ تھا۔

م۔ (سرت سے بھول کر) یعنی اس نے تم کو مسترد کر دیا۔

می م۔ (دھت حقارت سے) اؤ کھڑے ہوتے ہوئے، نہیں جو قوت آدمی اگر وہ ایسا کرتی تو مجھے کبھی معلوم ہی نہ ہوتا کہ میں درحقیقت جنت ہی میں تھا۔ مسترد کر دیا تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح ہم لوگ بیچ جاتے! کیا خوب اطمینان کا پہلو! اسے تم کو اس دنیا میں اس کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہو رہا وہ نہایت حقارت سے کہتے کہ دوسری طرف چلا جاتا ہے،

م۔ (جو اسے ہی جگہ کھڑا بغیر کچھ حس و حرکت کے برابر دیکھتا رہتا ہے) کیا تم سمجھتے ہو بوجہن کہ تیرا اس طرح کا رونا

دینے سے اپنے کو بہتر ثابت کر سکتے ہو۔

می م۔ یو گیا آپ کی آخری دعا عطا نہ نصیحت ٹھہری۔ اریل میں تمہارے غفلوں کا قاتل نہیں ہوں۔ وعظ تو میں سمجھتا ہوں تم سے بہتر میں خود دے سکتا ہوں لیکن اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں جس سے کینڈا ڈانے شادی کی۔

م۔ وہ آدمی جس سے۔ تمہارا مطلب مجھ سے ہے نا؟

می م۔ میرا مطلب مالی جانب جیس میو ر اریل سے نہیں جو کہ محض ناصح اور ہوا کا ایک پھلکا ہے بلکہ میسر مطلب اس اعلیٰ شخص سے ہے جو مالی جانب کے سیاہ کوٹ میں کہیں پوشیدہ ہے اس شخص سے جس سے کینڈا ڈا محبت کرتی تھی۔ تم کینڈا ڈا جیسی عورت سے محض اس بات پر محبت نہیں کرنا سکتے کہ وہ محض تمہارے کار کو پار یوں کی طرح بجائے سامنے کے پیچھے بند کیا کرے

م۔ (ہمت و استقلال سے) جب کینڈا ڈانے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا تب بھی میں ایسا ہی ناصح اور بقول تمہارے ہوا کا پھلکا تھا تب کیا کہ اب تم دیکھتے ہو۔ اس وقت بھی میں سیاہ کوٹ پہنتا تھا اور میرا کار بجائے آگے کے پیچھے سے بند کیا جاتا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اگر اپنے پیشے میں فریب سے کام لیتا تو وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی؟

می م۔ (صوفی کے اوپر اپنے گھٹنوں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے) نہیں، اس نے تمہیں معاف کر دیا جس طرح اس نے میرے بزدل اور کمزور ہونے کو معاف کر دیا بلکہ جیسا تم کہتے ہو کہ رونے کتے کے پٹے ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا (وعیت میں آکر) اس قسم کی عورت ملکوتی عقل و ہوش کھیتی ہے وہ ہماری روجوں سے محبت کرتی ہے نہ کہ ہماری بیوقوفیوں سے یا مغالطوں سے یا ہمارے فضول خیالات سے نہ ہمارے کوڑوں سے نہ ہمارے کاروں سے اور نہ ہمارے طرح طرح کے فضول پتھروں سے جس میں ہم اپنے آپ کو پیٹنے رہتے ہیں (اس بات پر وہ کچر دیتا ہے اور بتاتا ہے اس کے بعد اریل سے بڑے شوق سے سوال کرنے لگتا ہے) ہاں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم اس آتشیں تلواریں سے کینڈا بھر بیج کر کھل گئے جس نے مجھے روک لیا۔

م۔ غالباً اس لئے کہ دس منٹ بعد کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔

می م۔ (تسجب ہو کر) کیا!

م۔ آدمی بلند سے بلند چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں دیر تک رہ نہیں سکتا

می م۔ (آپک پڑتے ہوئے) یہ جھوٹ ہے۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ عمر بھر وہیں۔ یہ تو دوسرے

لمحات ہوتے ہیں جب اس کو آرام نصیب نہیں ہوتا اور اُسے زندگی کے پرسکون جمال کا احساس نہیں ہوتا۔ آخر مجھے تم سمجھتے کیا ہو۔ میں اگر اعلیٰ بلندیوں پر اپنے لمحات نگزاروں گا تو کہاں نگزار دیکھا

م۔ باورچی خانہ میں۔ پیاز پھیلنے میں اور لمپ میں تیل بھرنے میں۔

می م۔ یا ممبر کلیسا کی میز پر معمولی ذلیل مٹی کی روجوں کی گرد جھاڑنے میں۔

م۔ ہاں یوں بھی لیکن ایسے ہی لمحات تھے جب مجھ کو وہ سنہرا موقعہ حاصل ہوا اور اس بات کا حق بھی کہ میں

اس سے محبت کی التجا کروں میں نے ایسے لمحات کسی سے قرض نہیں لئے اور نہ میں نے ان میں کسی دوسرے آدمی کی مسرت چمانے کی کوشش کی۔

می م۔ (بے انتہا اسید ہو کر) آتش دان کی طرف بھلت جاتے ہوئے، مجھے اس کا بالکل یقین ہے کہ تم نے معاملت

بالکل ایا ندرامی سے کی ہو گی۔ بالکل اسی ایا ندرامی سے جس طرح کہ سیر آدم سیر پیر خریدنے میں کجباتی

ہے۔ وہ آتش دان رائے قالمین کے کنارے پر رک جاتا ہے۔ اریل کی طرف پڑے کچھ سوت چاہے خود سے

غافل ہو جائے ہالبتہ میں صرف بطور ایک فقیر کے اُس سے مانگ سکتا تھا۔

م۔ (چمکنے پر) ایک ایسا فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ انگ رہا ہو!

می م۔ (غیب سے طرے ہوئے، ہشکرے) کہ تم نے میری شاعری کی تکمیل کر دی۔ ہاں اگر آپ کا جی چاہے تو یہی

کہہ لیجئے ایک فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ انگ رہا ہو!

م۔ (جوش سے) اور اس نے انکار کر دیا کیا میں نہیں بتلا دوں کہ اس نے کیوں انکار کر دیا میں خود ہی

کے الفاظ میں بتلا سکتا ہوں۔ اس نے انکار اس لئے کر دیا کہ —

می م۔ اس نے انکار نہیں کیا۔

م۔ نہیں کیا!؟

می م۔ اس نے سب کچھ دیا جو میں نے مانگا۔ اپنا دوشالہ دیا۔ اپنے پردے۔ اپنے ہاتھ کے تار دیے۔ اپنے ہاتھ کے سوتی پھول دیے۔ اپنے قدموں کے نیچے کا ہال دیا۔

م۔ (اس کو بکرتے ہوئے) بیچ بول بیچ آدمی! میری بیوی میری بیوی ہے۔ میں تمہاری یہ شاعرانہ فضولیات کچھ نہیں سنا چاہتا یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اگر اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجھ سے باز نہ نہیں سکتا۔

می م۔ (بھگت سے بڑی کئی غنم دھجک کے) ماریل امیرے تمہیں کے کار سے مجھے بیکار پڑتے ہو۔ وہ پھر آکر ٹینک کر دے گی جیسے اس نے بیج کیا تھا (غاموش سرت سے) اور پھر مجھے اسی طرح اس کے ہاتھ چھونے کو ملیں گے۔

م۔ شیطان کے بچے تجھے نہیں معلوم کہ اسی باتیں میرے سامنے کرنا کہاں تک روا ہیں؟ یا شک کرتے ہوئے، کچھ ایسی بات ہو گئی ہے جس نے تجھے اس قدر زبرد بنا دیا ہے۔

می م۔ مجھ کو اب ڈر بالکل نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا اور اسی لئے پہلے تمہارے چھونے تک سے گھبراتا تھا لیکن آج صبح کو جب وہ تمہیں پریشان کر رہی تھی میں نے دیکھا کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ اس وقت سے میں اب تمہارا دوست ہو گیا ہوں۔ اب جی چاہے میرا گلہ گھونٹ دو مجھے ڈر نہیں۔

م۔ (داسے چھوڑتے ہوئے) اگر وہ میں تم یہ ظالمانہ کمرے نہیں کہ رہے ہو اگر تم میں انسانی اسامات کی ایک چنگاری بھی باقی رہ گئی ہے تو کیا مجھے بتاؤ گے کہ میری عدم موجودگی میں کیا ہوا؟

می م۔ کیا ہوا! ہوتا کیا وہی آتشیں تلوار ادا رہی ہے جیسی ہے اپنا پاؤں پگھلا ہے۔ اچھا تو خیر سیدھی سیدھی نثر میں یہ کہ میں نے اس قدر اعلیٰ طریقہ کی محبت کی کہ مجھے کسی بات کی آرزو نہ رہی سوائے اس کے کہ میں اسی محبت کی حالت میں رہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی بلند ترین بلندیوں سے نیچے آتا ہوں آگئے

م۔ بے انتہا بھلیں سے اٹھو گویا یہ بات اب بھی ناتمام رہی۔ پھر بھی شک و شبہ کی مصیبتیں۔

می م۔ مصیبت اچھے سے بڑھ کر اب خوش کوئی نہیں ہے مجھے اب کسی بات کی آرزو نہیں سوائے اس کی خوشی کی (مذہبیں اگر) اریل حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں کو اسے چھڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے نمایاں شان نہیں ہیں۔ میں ایک چھوٹا کمزور عصبی مرلین، تم ایک نہایت احمق پادری۔ پلوہم دونوں دنیا کے سفر کو طیلین تم مشرق جاؤ اور میں مغرب اور اس کے لئے ایک نہایت لائق نہایت مناسب اور اس کی جوڑ کا بر ملاش کر کے لائیں کوئی ایک نہایت ہی خوبصورت فرشتہ جو جس کے احمق شہپر۔

م۔ یعنی کوئی یو قوف! انوس اگر وہ اتنی پاگل ہو گئی ہے کہ مجھے چھوڑ کر تمارے ساتھ جانے پر تزل گئی ہے تو پھر اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کون اس کے لئے محنت کرے گا؟ کون اس کے بچوں کی نگہداشت کرے گا؟ وہ مرنے پر پریشان ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ گھٹنوں پر کھیناں ہیں اور اپنے منہ کو ہاتھوں سے دبا لیتا ہے)

می م۔ بے تماشا اپنی انگلیاں چٹانے ہوئے، وہ تو اس قسم کے بیکار سوالات نہیں کرتی۔ اصل میں وہ مرد نہیں چاہتی بلکہ وہ خود کسی دوسرے کی حفاظت کرنا اور اس کیلئے محنت کرنا چاہتی ہے اسے احمق وہ خود کسی دوسرے کے بچوں کی نگہداشت، ان کی مدد اور ان کیلئے کام کرنا چاہتی جو کوئی ایسا بڑھا آدمی جو دوبارہ بچہ ہو گیا ہو۔ اسے یو قوف ایسا شخص میں ہوں۔ اریل ایسا شخص میں ہوں (جو شمسرت سے انکار اپنے گلتا ہے اور کتاب ہے) تم نہیں جانتے کہ عورت کیا چیز ہے اریل اسے فوراً بلا بھیج اسے بلا بھیج اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے دو۔ (دروازہ کھاتا ہے اور کینڈیڈا اندر داخل ہوتی ہے۔ یوین ایک دم ناچتے ناچتے سم کر جاتا ہے)

ک۔ (تعجب ہو کر) بلز پر ہے، یوین یہ آخر تم کیا کر رہے ہو؟

می م۔ (انکے پن سے جیس اور ہم دونوں وعظ دینے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہ بار بار ہے۔ کینڈیڈا اریل کی طرف کھتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ برٹان معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طرف بہت

فکر مند ہو کر بڑھتی ہے،

ک۔ تم اس کو پریشان کر رہے تھے یوہین میں اسی باتیں پسند نہیں کرتی سنا تم نے؟ (اپنا ہاتھ مار لے کے کندھے پر کھتی ہے اور اپنے غم کی وجہ سے اپنا اہلیانہ ہنر بھول جاتی ہے، میرے پیارے کو بس اب پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میں اس کی حفاظت کروں گی۔

م۔ (غصے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) حفاظت! ک۔ (اسکی بات نہ سنتے ہوئے یوہین سے) آخر تم کیا کہہ رہے تھے؟

می م۔ (ڈر کر کچھ نہیں۔ میں۔)

ک۔ یوہین کچھ نہیں؟

می م۔ (دروسا ہو کر) میرا مطلب یہ۔ میں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں اب ایسا پھر نہ کروں گا۔ سچ اب نہ کروں گا میں اسے بالکل چھوڑ دیا کروں گا۔

م۔ (غصہ سے یوہین کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے چھوڑ دے گا! شیطان کے۔

ک۔ (اسے روکتے ہوئے) نہیں۔ رُک جاؤ جیس، میں دیکھو اسے ٹھیک کئے دیتی ہوں۔

می م۔ کیا آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ک۔ (انگنی سے) ہاں میں تم سے بے حد خفا ہوں اور میرا قطعی ارادہ ہے تم کو گھر سے باہر نکال دوں۔

م۔ اکیڈمک ڈاکٹر جرات سے تعجب ہو کر پھر بھی یہ نہ چاہتے ہوئے کہ کسی مرد کے مقابلہ میں اس کی بیوی اسے بچائے نرمی سے کینیڈا ڈاکٹر نرمی سے کینیڈا ڈاکٹر! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔

ک۔ (اسے تصدیق کرتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں پیارے لیکن تم کو اب پریشان کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ کرنے دوں گی۔

می م۔ (تقریباً روتے ہوئے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے) تو اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ نہیں تمہارے جانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے آئی رات گئے تمہیں گھر سے باہر نہ نکالوں گی (دروارے) تمہیں شرم نہیں آتی بے شرم!

می م۔ شک انکار لیکن میں نے کیا کیا ہے؛

ک۔ مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا ہے اور اس قدر گویا کہ میں خود یہاں موجود تھی تم نے بہت ہی لائق بات کی ہے تم بالکل بچوں کی طرح ہوا اپنی زبان کو روک نہیں سکتے۔

می م۔ مجھے ایک چوڑا دس موٹیں آجائیں! اگر میں آپ کو ایک لمحہ کی بھی تکلیف دینے کا خیال کروں۔

ک۔ اس لڑکپن کی بات پر سخت تنفر ظاہر کرتے ہوئے تمہارے مرنے سے مجھے بڑا فائدہ ہی ہو جائے گا۔

م۔ کینیڈا ڈیرہ سوال و جواب بالکل بیکار اور نامناسب ہیں۔ دراصل قصہ یہ دو آدمیوں کا ہے اور میں ہی اسے بہتر طے کر سکتا ہوں۔

ک۔ دو آدمیوں کا کیا تم ایسے شخص کو ایک آدمی سمجھتے ہو؟ (روبین سے) شریک ہیں کا؛

می م۔ اس لامتناہی خودیوں ایک عجیب بہت عوس کرتے ہوئے، اگر مجھے لڑکوں ہی کی طرح برا بھلا کا جا رہا ہے تو

پھر لڑکوں کا سا جواب بھی دوں گا جھگڑا اصل میں اس نے پہلے شروع کیا اور یہ مجھ سے بڑا لڑکا تھا

ک۔ (درد پریشان ہوتے ہوئے) کیونکہ ادیل کی شان پر دھبہ آتا تھا، یہ صحیح نہیں ہو سکتا (ادیل سے) ہمیں تم نے ایسی

باتیں شروع نہ کی ہوں گی۔ کیوں ناچیں؟

م۔ (معارف سے) نہیں۔

می م۔ غصہ سے، آئیں!

م۔ (روبین سے) تم نے خود آج صبح اس قسم کی، تبدیلی (کینیڈا ۱۱۵) اس سے فوراً وہ سر پہرہ والی گم بات سمجھ جاتی

ہے کہ سو پرے گئی آؤں سے تعلق ہے۔ چنانچہ وہ شک سے اور تیزی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور اپنا

سطح کلام جاری رکھتا ہے اس لمحہ میں گویا اس کی برتری کو مدد پہنچ رہا ہے، تمہاری دوسری بات البتہ

درست ہے کہ میں بڑا لڑکا ہوں اس لئے زیادہ مضبوط ہیں۔ کینیڈا ۱۱۶ تم یہ معاملہ بس میرے ہاتھ میں

چھوڑ دو۔

ک۔ (اچھڑائے تسکین دیتے ہوئے) ہاں پیلا دے کیوں نہیں ہیں مزدور چوڑے دوں گی۔ لیکن (پریشان ہوا)

میری سچ میں نہیں آتا کہ آج صبح کیا معاملہ تھا۔

م۔ اس کی بات کو زہی سے ٹالتے ہوئے، پیاری تمہیں اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
 ک۔ لیکن جیس میں (باہر گھنٹی بجتی ہے)۔ اونہ تو یہ وہ لوگ آرہے ہیں وہ دروازہ کھولنے کے لئے جلی جاتی
 می م۔ مارٹن کی طرف دوڑ کر جاتے ہوئے، مارل، مارل، ایکس قدر خطاب بات ہوگئی کہ وہ ہم لوگوں سے
 خفا ہوگئی ہے۔ مجھ سے تو اسے نفرت ہی ہوگئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟
 م۔ (مجیب پریشانی کی حالت میں کہہ میں ادھر ادھر ٹھٹھتے ہوئے) یوجین میرا سر چکرا رہا ہے میں تھوڑی دیر
 میں کہیں پاگلوں کی طرح ہنسنے نہ لگوں۔
 می م۔ (فکرمند ہو کر اس کے ساتھ ٹھٹھتے ہوئے) نہیں انہیں ایسا نہ کرنا اور نہ وہ سمجھے گی کہ تم کو میں نے پاگل
 بنا دیا ہے۔ ہننا مت۔

داخل شورا اور قہقروں کی آوازیں قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں بیکس ل کی آنکھیں جھک رہی ہیں
 طرز عمل سے غیر معمولی شگفتگی عیاں ہے لیکن ہوش و حواس بجا ہیں۔ برگیس کے ساتھ داخل ہوتا ہے
 برگیس بدستور اپنی جگہ مطمئن ہے اور یکنی چپڑی باتیں کر رہا ہے۔ اس کا رنٹ اپنی بہترین ڈپٹی اور
 بہترین جیکٹ جلتے ہوئے ان دونوں کے پیچھے آتی ہے۔ حالانکہ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ
 جھک رہی ہیں لیکن بظاہر ابھی خود کو بد ہوش نہیں سمجھتی۔ اپنے نائب رائٹر والی میز کی طرف پیٹھ کر کے
 بیٹھ جاتی ہے۔ ایک ہاتھ میز پر خود کو سارا دینے کے لئے رکھتی ہے۔ دوسرا پیشانی پر رکھتی ہے
 جیسے کچھ تھک گئی ہو یا کچھ جکڑا ہوا ہو۔ رنٹ برگیس کو پھر اپنے شریٹلے پن کا شدید احساس
 ہوتا ہے اور کھڑکی کی طرف جہاں مارل کی کتاہیں رکھی ہیں چپکے چپکے کھٹکنا شروع کرتا ہے،

ل۔ (انتہائی شگفتگی سے) مجھے آپ کو ضرور مبارکباد دینی چاہیے (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) آپ نے کتنے
 عمدہ کس قدر اعلیٰ درجہ کا وجدانی خطبہ دیا ہے آپ تو خود اپنے سے بڑھ گئے۔

ب۔ اس میں کوئی شک نہیں جیس میں تو تمہارے آخری خطاب تک برابر جاگتا رہا اکیوں نامس کا رنٹ؟

سپ۔ (اجنبجا کر) مجھے کیا معلوم مجھے تو تمہارا خیال بھی نہ تھا میں تو اپنے نوٹس لکھ رہی تھی اپنی نوٹ بک کھلتی
 ہے اور اپنی حقیر نوٹیں کو دیکھتی ہے اور دیکھ کر تفریبا اس ہو جاتی ہے،

م۔ پیماس کیا میں بہت تیز ہوا؟

پ۔ بہت ہی تیز آپ جانتے ہیں کہ میں نوے اعشاری منٹ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی چنانچہ بہت کچھ چھوٹ گیا، غصہ میں نوٹ بک کو اپنی مشین کی طرف پھینک دیتی ہے کہ دوسرے دن دیکھا جائے گا اور اب مطمئن ہو کر بیٹھتی ہے،

م۔ تکلیف دیتے ہوئے، خیر، خیر کوئی حرج نہیں۔ جانے دو، جانے دو اچھا یہ بتاؤ کیا تم سب لوگ کھانا کھا چکے؟

ل۔ مسٹر برگیس نے آج ہم لوگوں کو بلگر ہوٹل میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی دعوت دی۔

ب۔ (دبا منہ شان سے) مسٹر ل یہ بھی کوئی کھنے کی بات ہے، انکساری سے آپ لوگوں کی ہمیشہ ایسی ہی خاطر تواضع کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پ۔ ہم لوگوں کو شہین پینے کو ملی۔ میں نے تو اس سے پہلے اسے چکھا بھی نہ تھا۔ مجھے چنانچہ ذرا چکر محسوس ہو رہا ہے۔

م۔ (عجب سے شہین کے ساتھ دعوت) یہ تو واقعی بہت اعلیٰ رہی۔ کیا بات تھی برگیس۔ یہ میری فصاحت کا اثر تھا کہ جس کے سبب تم اس قدر خرچ پر آمادہ ہو گئے؟

ل۔ (خطبات تک جاتے ہوئے) آپ کی فصاحت اور مسٹر برگیس کی دریا ولی انتہائی شگفتگی کے جوش میں آکر اور اریل صدر بھی کیا الاحباب آدمی تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔

م۔ (توجہ نکال کر برگیس کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا آ۔ آ۔ ص۔ (تو اب میں سمجھا

دو برگیس انکساری کے طور پر کھانے لگتا ہے یہ چھپانے کے لئے کہ اپنی چالاک پرمسروطن ہے۔

لیکن اپنے بازوؤں کو پیٹ کر ایک شان کے ساتھ صوفے سے لگ کر کھڑا ہوتا ہے۔ ایک چکر آتا

ہے لیکن خود کو سنبھال لیتا ہے۔ کینڈا ڈا ایک کشتی میں لگاں، لیو اور گرم پانی کا ایک جگ لاتا ہے،

ک۔ لیونید کون پنے گا؟ تم لوگ ہمارا قاعدہ جانتے ہو یعنی شراب سے قطعی پرہیز رکھنی کو نیز پر رکھ دیتی ہو

اور لیونید جوڑنے والی مشین اٹھاتی ہے اور ہر ایک کی طرف دیکھتی ہے،

م۔ کوئی ضرورت نہیں اس کی کیڈ ڈا یہ سب لوگ شپین پی کرتے ہیں۔ پراس لے بھی اپنا عدد تڑوڑا
ک۔ (پاراپائن سے) کیا واقعی تم نے بھی شپین پی ہے!

پ۔ (زور دے کر) ہاں میں نے پی۔ میں نے تو صرف بیر کے متعلق تو بہ کی تھی۔ بیر کو میں سخت ناپسند کرتی
ہوں مسٹر اریل آج اب اور کوئی خط تو میرے جواب لکھنے کے لئے نہیں ہے؟

م۔ ہاں بس اب آج کوئی نہیں۔

پ۔ اچھی بات تو میرے سب لوگ خدا حافظ!

ل۔ (ہمت مردانہ سے) مس گارنٹ کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں آپ کو آپ کے مکان تک چھوڑ آؤں؟

نہیں شکریہ میں خود کو اس وقت کسی پرچہ پڑھیں سکتی۔ کاش کہ میں وہ ذلیل شے ذرا بھی نہ ہیتی۔ وہ
لوکھڑاتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے اس سے ٹکرا جاتی ہے اور ٹھٹھل گرتے گرتے بجتی ہے،

ب۔ (غصہ سے) ذلیل شے! لڑکی جانتی بھی نہیں کہ شپین کیا چیز ہے۔ پامری اور گرینو کپنی کی ساڑھے باو
شلنگ کی ایک بوتل! اور وہ پورے دو گلاس پی گئی!

م۔ اس کے متعلق فکر مند ہو کر لیکسی جاؤ اور اسے حفاظت سے گھر ہو چکا آؤ۔

ل۔ (دو گلاس سن کر) ہنسنہ ہو کر لیکن اگر وہ واقعی — یعنی فرض کیجئے اگر وہ مڑک پرگانے لگے یا اسی
طرح کی کوئی اور حرکت —

م۔ ہاں یہی مجھے بھی ڈر ہے کہ شاید وہ ایسا کر بیٹھے۔ اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ جا کر اسے حفاظت
سے گھر ہو چکا آؤ۔

ک۔ ہاں لیکسی ضرور شاباش! (وہ اس سے باتہ لاتی ہے اور آہستہ سے دروازہ کی طرف ٹھٹھل دیتی ہے)

ل۔ ہاں جانا مجھ پر فرض ہے گر مجھے امید ہے اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ پڑے گی خدا حافظ!

مسٹر اریل (سب سے مخاطب ہو کر) خدا حافظ! (وہ چلا جاتا ہے اور کیڈ ڈا دروازہ بند کر دیتی ہے)

ب۔ وہ خود بھی دو گھنٹوں کے بعد بڑی احتیاط سے پی رہا تھا لوگ اب اتنی پیہتے نہیں جتنی کہ اگلے

زمانہ والے پیا کرتے تھے (آتش دان کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا جیس ہیں اب گھر کے دروازہ بند کر لیئے گا

وقت آگیا ہے میسٹراچی بنکیس آپ بھی مکان چل رہے ہیں نا؟ کیا میں راستہ میں کچھ دور تک آپ کی شرف ہمراہی سے سرفراز ہو سکتا ہوں؟

می م۔ (ڈر کر) ہاں، ٹھیک اب مجھ کو وقتی جانا چاہئے (دو دروازہ کی طرف بڑھتا ہے لیکن کینڈا سامنے آکر کھڑا ہو جاتی ہے اور اس کا راستہ روک لیتی ہے)

ک۔ (غاموش ٹھکانہ لہو میں) تم ادھر بیٹھو چل کے۔ تم ابھی نہیں جا سکتے۔

می م۔ (اٹھ کھڑے ہوتے) نہیں، میں — میرا مطلب جانے کا نہیں تھا (اگرچہ سے سونے پر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ پاپا میسٹراچی بنکیس آج ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے۔

پ۔ اچھا اچھا تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ! جس (ماریل سے معاملہ کرتا ہے اور یوہین کی طرف آتا ہے) میسٹراچی بنکیس تم اپنے بستر کے قریب ان لوگوں سے ایک لیمپ رکھو لیتا کیونکہ ممکن ہے تم کو وہی دوڑ

پڑے تو وقت نہ ہو۔ اچھا خدا حافظ

می م۔ حکمران میں ضرور ایسا کروں گا خدا حافظ میسٹراچی بنکیس (دو دفن معاف کرتے ہیں۔ برگیس دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ ماریل کو روک دیتے ہوئے جو برگیس کے پیچھے اسے پہنچانے جا رہا ہے، ذرا رکنا ڈیر میں پاپا کو ان کا

اڈور کوٹ تو پسنا دوں (دو برگیس کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے)

می م۔ (پچکے سے اٹھ کر ماریل کے پاس جاتے ہوئے) ماریل بس اب ایک زبردست منظر پیش ہونے والا ہے

تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟

م۔ ذرہ برابر بھی نہیں۔

می م۔ تمہاری ہمت پر اس وقت البتہ رشک معلوم ہوتا ہے (دو تعریف کے طور پر اپنا ہاتھ ماریل کے ہاتھ پر

رکھ دیتا ہے) میرے قریب رہنا۔ رہو گے نا؟

م۔ (اسے ہٹاتے ہوئے) نہیں یوہین ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرے۔ بس آج اس وقت اس کو ہم

دونوں میں سے کسی کو ہمیشہ کے لئے انتخاب کر لینا ہے۔

کینڈا (واپس آ جاتی ہے۔ یوہین ایک خطا دار اسکول کے بچے کی طرح چپکے سے دکھا ہوا پھر صوفے پر

واپس آتا ہے)

ک۔ (ان دونوں کے درمیان آکر یوہین سے مخاطب ہوتے ہوئے) ہمیں اپنے کئے پر مذمت ہے؟

می م۔ (عدالت سے) ہاں، ولی تکلیف۔

ک۔ اچھا خیر تو بہتر تم ممان کئے جاتے ہو۔ اور بس اب ایک اچھے چھوٹے لڑکے کی طرح جا کر بستر پر سو تو رہو۔ میں جس سے کچھ تمنا کرنے منتقل باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

می م۔ دخت انتشار سے اٹھتے ہوئے) انیں ماریل میں ایسا نہیں کروں گا میں میں رہوں گا تم اس سے سب کچھ کہو۔

ک۔ (اپنے ٹوکڑ مچ پاتے ہوئے) مجھ سے کیا کہو؟ (یوہین کی نگاہیں اس سے پار نہیں ہوتیں وہ مڑتی ہے اور ماریل کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

م۔ (انجام کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے) مجھے اُس سے کچھ کہنا نہیں ہے سوائے اس کے کہ (یہاں اس کی آواز نرم و گلوگیر ہو جاتی ہے) وہ دنیا میں میرا بہترین خزانہ ہے۔ اگر واقعی وہ میری ہی ہے۔

ک۔ (اس کے اس حلیہ و لہجہ کو برا مان کر نیز اس بات کو بامانتے ہوئے کہ وہ اس سے گریا سینٹ میٹر کا بچہ سمجھ کر مخاطب ہو رہا ہے) میرا خیال یہ ہے کہ اگر صرف اتنا ہی کہنا تھا تو یوہین بھی اس سے کچھ کہ نہیں کہہ سکتا

می م۔ (ناامید ہو کر) ماریل وہ ہم دونوں پر نہیں رہی ہے

م۔ (جزبہ ہو کر اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کینیڈا کیا تم ہم پر نہیں رہی ہو۔ کینیڈا؟)

ک۔ (دراستے ہوئے غصہ سے) ہمیں یوہین بہت تیز لڑا کا ہے۔ ممکن ہے کہ میں ہنسنے لگوں لیکن یہ زیادہ ممکن ہے کہ مجھے سخت غصہ آجائے (وہ آتش دان کے پاس پٹی جاتی ہے اور وہاں ٹیل پر اپنا بازو رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک پیرا آتش دان کے سنجوں پر ہے۔ یوہین ماریل کے پاس پچکے سے جاتا ہے اور آہستہ سے اس کی آستین پکڑ کر چومکھتا ہے)

می م۔ (پچکے سے کان میں کہتے ہوئے) دیکھو ماریل۔ ہم لوگوں کو کوئی بات زبان سے نہ بھائی چاہئے۔

م۔ (یوہین کو جلاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے) کینیڈا، تم یہ دھکی دے رہی ہو۔ مجھے امید تو ایسی نہیں ہے۔

ک۔ (روزے دہکاتے ہوئے، ہاں جیس غالباً، یوہین میں نے تم سے جانے کو کہا تھا۔ جالتے ہو کہ نہیں؟

م۔ (اپنا پیر زین پر زور سے اسے ہمتے) نہیں وہ نہیں جاسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہیں رہے۔

ی م۔ نہیں میں چلا جاؤں گا جو کچھ تم مجھ سے کوئی دہی کروں گا: وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ (رکاوہ رک جاتا ہے) کیا تم نے ہمیں کا کنا سنا نہیں کہ وہ نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ یہاں کا مالک ہمیں ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم؟

ی م۔ (ایک نوجوان شاعر کی طرح غلم کے خلاف برا فروختہ ہوتے ہوئے) لیکن وہ مالک ہے کس حق سے؟

ک۔ (آہستہ سے) اسے بتلاؤ دو جیس!

م۔ (چونکہ کمر میری پیاری، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا ایسا حق ہے جس سے میں یاں کا مالک ہوں میں تو اس قسم کا کوئی حق نہیں جانتا۔

ک۔ (سخت لامت کے لہجہ میں، تم نہیں جانتے جیس۔ اسے جیس! (یوہین کی طرف متوجہ ہو کر یوہین تمہیں تو معلوم ہوگا: وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے لیکن اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا، ہاں تم ابھی بہت بچے ہو۔ خیر! اچھا تو اب تمہیں یہاں رکھنے کی اجازت دیتی ہوں تاکہ تم یہ باتیں سیکھ لو، جان لو وہ کتنا اچھے کے پاس سے آتی ہے اور ان دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو جاتی ہے) اچھا جیس! اب یہ بتاؤ واقعہ کیا ہے؟ بتاؤ، مجھ سے کہو!

ی م۔ (ایل کی طرف پچکے سے کہتے ہوئے) ہمت بتانا۔

ک۔ (بوسہ سے کہو تو!)

م۔ (آہستہ سے) میں چاہتا تھا کہ تمہارے صانع کو رفتہ رفتہ تیار کروں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔

ک۔ ہاں، ہاں پیارے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم نے ایسا کیا لیکن ان باتوں کا خیال نہ کرو مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔

م۔ اچھا تو۔ (رک جاتا ہے، اس سلسلہ کا ایک لمبی تشریح کرنا چاہتا تھا لیکن انعام نہیں ملے،

ب۔ اچھا تو؟

م۔ (ایک دم صاف صاف بول اٹتا ہے) یوہین یہ کتا ہے کہ تمہیں اس سے ملتی ہے۔

ی م۔ (جلدی سے اور اتھالی گھبراہٹ سے) نہیں، نہیں، نہیں، نہیں کبھی نہیں، بشرط ایل یہ میں نے کبھی نہیں کہا یہ صحیح نہیں ہے میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے اور میں نے یہ کہا تھا کہ میں تم کو خوب سمجھا رہا ہوں اور یہ نہیں سمجھا رہا تھا اور یہ سب اس وقت نہیں کہا تھا جب وہ تمام باتیں آگ کے سلسلے ہوئی تھیں میں تمہیں کتا ہوں آج صبح صرف یہ بات ہوئی تھی۔

ک۔ (واقف ہو کر) آج صبح!

ی م۔ ہاں (دو کینڈ ڈاکی طرف دیکھتا ہے مگر یقیناً ان سے اور پھر آگے کتا ہے) میرے کالہ خواب ہو جانے کی وجہ یہی تھی۔

ک۔ تمہارا کالہ! (مطلب سمجھ کر فوراً ایل کی طرف مڑتی ہے۔ غصیدہ اور تنبیہ) اسے ہمیں کیا تم نے —! (رک جاتی ہے)

م۔ (غور سے دیکھ کر کینڈ ڈاٹم جانتی ہو کر مجھے اکثر غصہ آ جاتا ہے) اور یہ یک رہا تھا (کانپ کر) کہ تم مجھ سے سخت نفرت رکھتی ہو۔

ک۔ (جلدی سے یوہین کی طرف مڑتے ہوئے) کیوں کیا تم نے، یہ کیا کتا تھا؟

ی م۔ (ڈر کر) نہیں۔

ک۔ (تقریباً غضبناک ہو کر) تو اس سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہمیں مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔

ی م۔ نہیں، نہیں میں (بہت ہمت کر کے) وہ داؤد علیہ السلام کی بیوی کا قصہ تھا اور وہ واقعی مجھ میں نہیں ہوا تھا بلکہ ان سے خفا ہو گئی تھیں اور نفرت کرنے لگی تھیں جب انہوں نے ان کو دوسرے لوگوں کے سلسلے میں خطیبانہ قص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

م۔ (معاذ اللہ کرنے والوں کی طرح اپنا موقع پانے ہوئے) شکینڈ ڈاٹم لوگوں کے سامنے قص کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اپنی ان سرکوتوں سے تمام لوگوں کے دل مرہ کران کی اصلاح کر رہا ہے حالانکہ وہ

سب پر اسی والی حکایت میں مبتلا تھے اکنید فاکچے کہ ہوتی ہے لیکن وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیتا ہے، انہیں تین غصہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ڈا۔

ک۔ ظاہر کرنے کی!

م۔ (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) یوہین صحیح کہتا تھا جیسا کہ تم نے بھی چند گھنٹے گزرے کتنا کہ یوہین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کو خود تم اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ شاعر ہے اور ہر بات سمجھ جاتا ہے میں صرف پادری ہوں جو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

ک۔ (آست کے بوج میں) جو کچھ ایک بیوقوف لڑکا کہے تم اسے مان لو گے اگر وہی بات میں نے بھی مذاق میں کہی ہو۔

م۔ یہ بیوقوف لڑکا ایک معصوم بچے کی طرح المائی گفتگو کر سکتا ہے لیکن اس میں ایک فنی کی سکری شامل ہوتی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تم دراصل اس کی ہونہ کی میری۔ اور سچ یا غلط مجھ کو یہ شک پیدا ہو گیا ہے کہ شاید ایسا ہی ہو میں یہ نہیں چاہتا کہ شک و شبہ میں مبتلا ہو کر ادھر ادھر پر پلٹا مارا مارا پیروں میں ایسی بھی زندگی برداشت نہیں کر سکتا کہ زہوں تو ساتھ ساتھ لیکن دل میں غبار بھرے رہوں میں حسد کرنے کی ناقابل برداشت ذلت اپنے لئے روا نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ہم دونوں اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تم ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ اب میں تمہارا انتخاب کا انتظار کرتا ہوں۔

ک۔ (آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹتی ہے) اس عبارت آرائی سے اس کا دل خنث ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ یہ الفاظ بچے جذبات سے کہے گئے ہیں، اچھا تو مجھے انتخاب کرنا ہے؟ کیوں نا؟ تو میرے خیال میں غالباً تم دونوں میں یہ مسئلہ بالکل طے ہو گیا ہے کہ کس دو میں سے ایک کی ہوجائیں

م۔ (استغلا سے) بالکل اس تم اب قطعی طور سے اپنا انتخاب کر لو۔

ی۔ (پریشانی سے) ماریل تم سمجھ نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود آپ اپنی الگ ہے۔

ک۔ (اس کی طرف مڑتے ہوئے) اہ میاں یوہین میرا یہ مطلب یہی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جوابی تم دلو۔

کو معلوم ہو جائے گا۔ اچا میرے مالکین و نابضیں ذرا یہ تو مجھے بتائیے کہ آپ لوگ اپنے انتخاب کے لئے اپنا اپنا کیا عطیہ مجھے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت میں بیلام پر چڑھی ہوئی ہوں۔ اچا بولو جس تم کیا قیمت پیش کرتے ہو میرے لئے؟

م۔ (اتما کی تکلیف سے) کینڈا — (اس کی آواز کام نہیں کرتی آنکھیں اشک آ رہی جاتی ہیں) اور آواز گونگ رہی۔
خطیب ایک نرمی جانور ہو کر رہ جاتا ہے، میں بول نہیں سکتا۔

ک۔ (بے اختیار ہو کر اس کے پہلو میں جاتے ہوئے) آہ! میرے پیارے —

می م۔ (دنگہ کر کے) کو! یہ معاملہ کی صفائی نہیں ہے۔ ایل تم یہ نہیں دیکھا کہ تم پر تکلیف ہے میں خود سخت مجروح ہوں لیکن اپنی جراحت دل دکھا کر اس کو اپنی طرف ہمدردانہ رغبہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نہیں روتا۔ اس کے جذبہ رحم کو نہ ابھارو جو کچھ نہیں کنا ہے کو — مردانہ وار کہو۔

م۔ (اپنی تمام قوتیں جمع کر کے) ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو مجھے رحم کی قیمت لگانا مطلوب نہیں ہے (اپنے کو کینڈا سے چڑا لیتا ہے)

ک۔ (اداس ہوئے ہوئے رکھائی سے، صاف کرنا جس میں تم سے مس ہونا نہیں چاہتی تھی، اچا اب میں تمہاری قیمت سننا چاہتی ہوں۔

م۔ (غور و نگاہی کے ساتھ) کینڈا ڈا میرے پاس تمہاری قیمت کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اپنی طاقت تمہاری حاصلت کے لئے۔ اپنی امانداری تمہارے اطمینان کے لئے۔ اپنی محبت و نیاقت تمہاری معاش کے لئے اور اپنا اثر و اقتدار تمہاری شان کے لئے بس یہی چیزیں ایک مرد ایک عورت کو پیش کر سکتا ہے۔

ک۔ (بہت ہی غامضی سے) اور تم یو جین؟ تم کیا پیش کرتے ہو؟

می م۔ اپنی کمزوری، اپنی بے بسی، اپنی احتیاج دلی۔

ک۔ (ستارہ جگر) یو جین یہ قیمت اچھی ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اپنا انتخاب کس طرح کروں۔

(وہ کچھ دیر کھتی ہے اور ہر دو کی طرف دیکھتی ہے گویا دونوں کو قتل رہی ہے۔ ایل جس کا زور غوری پڑتا

کی قیمت سن کر ایک دم شکست ہو گیا ہے اب اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکتا۔ یوہین شدتِ اضطراب و بے چینی سے بالکل بت کی طرح ساکت ہے)

م۔ اچاری گوگلی گریہ آواز میں اس کی روح سخت ترین تکلیف کی وجہ سے بے اختیارانہ التجا کر رہی ہے (کنیڈ ڈا)

می م۔ (الگ محارت کے لہجوں) بزدل!

ک۔ (معنی خیز انداز میں) میں تم دونوں میں سے کمزور ترین شخص کو اپنے میں حوالہ کرتی ہوں۔

(یوہین فوراً اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور اس کا چہرہ مٹی کے لوہے کی طرح سپید پڑ جاتا ہے)

م۔ (اپنی نکتہ سنجہ کو تسلیم غم کرتے ہوئے) کنیڈ ڈا میں تمہارا فیصلہ قبول کرتا ہوں۔

ک۔ تم سمجھو یوہین؛

می م۔ اے میری تو دنیا تباہ ہو گئی۔ وہ اس خوشی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

م۔ (یقین کرتے ہوئے) اپنا سر ایک دم ٹھنک انداز میں اٹھاتے ہوئے کیا تمہارا مطلب مجھ سے ہے کنیڈ ڈا؛

ک۔ (کچھ سکا کر) اب ہمیں بیٹھ کر بالکل دوستوں کی طرح اس گفتگو کو ختم کر ڈالنا چاہئے (داریل سے) بیٹھ جاؤ

پیاریے (داریل بالکل خود فراموش آئندہ کے پاس سے لوگوں والی کرسی اٹھاتا ہے) یوہین میرے لئے وہ

کرسی اٹھا تو لینا (آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوہین بہت خاموشی سے کرسی لانا ہے اور داریل کے پاس

اس سے کچھ چپچپ کر دیتا ہے خود نماز والی کرسی لے لیتا ہے اور ہنستے اس پر بے حس بیٹھ جاتا ہے جب سب

لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے متین، خاموش اور ہلکے ہجوں سے ان پر ایک سکوت کا عالم طاری کر دیتی ہے انہیں یاد ہو گا

یوہین جو کچھ تم نے اپنے متعلق مجھے بتایا تھا کہ جب سے تمہاری بوڑھی دایہ فوت ہوئی کسی نے تمہارا

طرف التفات سے نہیں دیکھا ہے اور کس طرح تمہارے نعین اہل بھائی اور بہنیں، تمہارے باپ

اور ماں کے جیتے تھے اور کس طرح تم آئین میں تکلیف اٹھاتے تھے اور کس طرح تمہارا باپ

آکسورڈ میں تم کو جبراً بھیجنے کے لئے تم کو مالی تکلیف دے رہا ہے اور کس طرح ٹکڑے پریشان، بے آسہ

اور بے ٹھکانے رہنا پڑا ہے۔ ہمیشہ تمہا بے یار و مددگار نفرت اور بدگمانی کا شکار رہے جا رہے!

می م۔ (اپنی غوطہ قیمت کو کھل کرتے ہوئے) میرے لئے میری کتابیں تھیں میرے سامنے مظاہر قدرت تھے اور آخر کار

تم سے ملاقات ہوئی۔

ک۔ خیر اس کافی الحال ذکر چھوڑو۔ اب میں تمہیں اس بڑے لڑکے کے متعلق بتانا چاہتی ہوں اسکو شروع ہی سے لاڈ و پیار نے خواب کر دیا۔ ہم لوگ ہر ہفتہ کم از کم دو مرتبہ اس کے والدین کے وہاں جاتے ہیں تم کبھی پوچھیں آنا تو میں نہیں اس گھر کے پرانے ہیر کی تصویریں دکھاؤں گی۔ جیسے کہ بچپن کی تصویر جس میں وہ تمام بچوں کو عجیب و غریب ہے۔ جیسے کی آٹھ سال کی عمر کی تصویر۔ جب اس نے اسکول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ جیسے کی گیارہ برس کی تصویر جب وہ اپنی ٹیم کا کپتان ہوا تھا۔ جیسے اپنے پہلے فزک کوٹ میں غرض کہ جس کی مختلف شاندار حالتوں کی تصویریں ہیں تم جانتے ہو کہ جیسے کس قدر مضبوط آدمی ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس نے تمہیں زیادہ اذیت نہ پہنچائی ہوگی کتنے ہوشیار ہے کس قدر خوش و خرم (خجندہ ہوتے ہوئے) جیسے کی ماں اور اس کی تینوں بہنوں سے پوچھو کہ ان لوگوں نے اسے صرف مضبوط، بہادر، ہوشیار اور خوش و خرم بنانے میں کس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ مجھے کس قدر تکلیف اٹھانا پڑتی ہے جبکہ تم مجھے اس کی ماں اس کی بہنوں اور اس کی بیوی اور اس کے لڑکوں کی ماں سب کا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پر اسی اور تیریا سے پوچھو کہ گھر کے کاموں میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور خاص کی جب ہمارے ہاں کوئی ملاقاتی ہم کو پیاز پھیلے میں مدد دینے کے لئے نہیں ہوتا۔ ان سوداگروں سے پوچھو جو جیسے کو پریشان کرنے اور اس کے دلچسپ خطبے خواب کرنے آیا کرتے ہیں کون ہے جو ان کو دور رکھتا ہے؟ جب ہم لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو جیسے انہیں دیتا ہے جب نہیں ہوتا تو ان سے معافی میں مانگتی ہوں میں اس کے آرام آسائش اور محبت کی خاطر گھر کو ایک قلعہ سا بنائے رکھتی ہوں اور دروازے پر ہیشہ ایک نگراں کی طرح کھڑی رہتی ہوں کہ معمولی قسم کی فکر میں اندر نہ آنے پائیں۔ میں اس کو یہاں الگ بناتی ہوں حالانکہ وہ خود اسے نہیں جانتا اور ابھی کچھ دیر ہوئے تمہیں تبلا بھی نہیں سکھاتا کہ وہ کس طرح الگ ہے (شیریں طنز سے) اور حالانکہ جب اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو پہلی فکر اسے یہ ہوئی تھی کہ — میرا کیا حشر ہوگا اور میرے یہاں قائم رہنے کیلئے

جانتے ہو اس نے کس چیز کی ترغیب دی اس کی طرف جھک کر اور ہر جہ پر اس کے باروں کے پھیر کر دیکھا
ہوئی، اپنی طاقت میری حفاظت کے لئے، اپنی محنت میری زندگی کے لئے، اپنا وقار میری
شان کے لئے (زم پڑتے ہوئے، نہیں میں تمہارے دلکش نغمہ کو غلط ترتیب سے خراب کئے دے
رہی ہوں کیوں نہ پیا رے (محبت سے) اپنا گال مار لی کے گال سے ملا دیتی ہے)

م۔ بالکل از خود رفتہ ہو کر اس کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اور اس سے بالکل ہولے چوں کی طرح

ہم آغوش ہوتے ہوئے، جو کچھ تم نے کہا بالکل صحیح کہا ایک ایک لفظ صحیح جو کچھ میں ہوں تمہارا ہی بنایا
ہوا ہوں تمہیں نے مجھے اپنے ہاتھوں کی محنت اور دل کی محبت سے بنایا ہے۔ تم میری بیوی
بھی ہو، میری ماں بھی اور میری بنیں بھی۔ ہر ایک کی محبت اور خبر گیری تم میں ملی ہوئی موجود ہے
ک۔ اس کے بازوؤں میں ہلتی ہوئی یوہین سے، کیا یوہین میں تمہارے لئے بھی تمہاری ماں اور تمہاری بنیں ہوں

می م۔ (ہٹتے ہوئے سخت حقارت کے انداز میں) نہیں کبھی نہیں! اچھا تو بس اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ (ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) نہیں یوہین کیا تم اتنی رات گئے چلے جاؤ گے؟

می م۔ (اس کے الفاظ میں اب ایک دم مردانہ لہجہ آگیا ہے) لوگوں والا لہجہ نہیں رہا، مجھے معلوم ہے کہ کونسا وقت کس
بات کے لئے مناسب ہے۔ جو کچھ مجھے کرنا ہے اس کو کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔

ک۔ (دوہمی کھڑا ہو گیا) کینڈا ڈاسے کوئی عجلت کی بات نہ کرنے دینا۔

ک۔ (پلٹ کر یوہین کی طرف مڑتے ہوئے) نہیں اس کا ڈر نہیں ہے۔ وہ بغیر خوش ہوئے زندہ رہنا سیکھ گیا جو

می م۔ مجھ کو اب خوشی کی تمنا نہیں رہی۔ زندگی خوشی بہت بہتر اور برتر چیز ہے۔ پادری جیسے میں دونوں
ہاتھوں سے اپنی خوشی تم کو دیتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے اس لئے کہ تم نے اس عورت کو
آسودہ کر دیا ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔ خدا حافظ۔ (دو دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ اچھا ایک آخری بات اور سن لو (دھڑک ہاتا ہے لیکن بغیر اس کی طرف مڑے ہوئے کینڈا ڈاس کے پاس جاتی
ہے) تمہاری عمر کیا ہے یوہین؟

می م۔ اس قدر جتنی کہ اس وقت دنیا کی عمر ہے۔ مالا لفظ صبح میں صرف اٹھا رہا ہوں کا تھا۔

ک۔ اٹھارہ! اچا تو تم میری خاطر زاد و جہلوں کو ایک نظم میں نظم کر دینا اور مجھ سے وعدہ کر دو کہ جب کبھی میرا خیال آئے گا ان کو ضرور کہہ لیا کرو گے۔

می۔ ام۔ (بغیر کوئی حرکت کئے) جلتے جاؤ کیا ہیں؟

ک۔ جب میری عمر تیس برس کی ہوگی اس کی پینتالیس کی جیب میں ساٹھ کا ہوں گا تو وہ پچھتر کی ہوگی۔

می۔ ام۔ اس کی طرف مت دے ہوئے یہ تو کوئی بات نہیں ایک سو برس میں ہم دونوں عمر کی ایک ہی منزل میں ہوں گے لیکن اس سے بہتر مجھے ایک بھید معلوم ہو گیا ہے جو میرے دل میں محفوظ ہے

اچا بس اب مجھے جانے دو۔ رات بہت جا رہی ہے اور موسم اب بہت خراب ہے۔

ک۔ خدا حافظ۔ (اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے سوہ اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور زور انگٹوں کے بل ہوتا ہے وہ اس کی پیشانی چوم لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے چل دیتا ہے کینڈڑا ماریل کی طرف واپس آتی ہے اپنے بازو پیلائے ہوئے آؤ جمیں!

(دونوں ہلکا ہوجاتے ہیں لیکن دونوں یہ نہیں سمجھ پاتے کہ شاعر کتنا بھیدا اپنے دل میں لے کر گیا،

(پیر ۵۵)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

نوید فردا

اب غم دل ہی علاج غم دوراں ہوگا	دور کونین ہی اب مژدہ دریاں ہوگا
دور تاریکی بیہوش ہے تو غم کیا ناداں!	پیش زینت اگر کم ہے تو غم کیا ناداں!
شعلہ مرگ جو برہم ہے تو غم کیا ناداں!	شعلہ مرگ ہی اب سر بگریباں ہوگا
یہ تباہی ہے اک آبادی نو کی تقریب	غرق کرے گی مشیت طلسم تخریب
خواب ہو جائے گا آلام کا سیلاب مہیب	سرد آتش کدہ فتنہ دوراں ہوگا
یہ جولا کے اٹھا ہے افق اسکاں سے	پھول برسیں گے اسی ابر شرافاں سے
کیوں ہے تجھ کو غم طوفاں کہ اسی طوفاں سے	اک نیا ساحل امید نمایاں ہوگا
اک نئی صبح کی تعمیر ہے تاریکی شام	لمحہ لمحہ ہے یہاں قاصد تحبہ یہ نظام
یہی شعلہ کہ جلائے ہیں خزاں کا پیغام	انہیں شعلوں سے چراغان مہراں ہوگا
خود ہی اٹھ جائیگے سراپا فحشت کے سحر حجاب	رخ گیتی نظر آئے گا برا فکندہ نقاب
جلگے گا دے گا جہاں کو نفس مالتاب	پروردہ ابر سے خورشید نمایاں ہوگا
عدل و انصاف و مساوات کا پرچم لے کر	ابن آدم کے لئے جنت آدم لے کر
زندگی آئے گی تسکین دو عالم لے کر	یہ جہاں غیرت کا شانہ رضواں ہوگا
سینہ دہر سے ہٹ جائے گا سنگ بیداد	کر کے گانہ کوئی روح بشر کو ناشاد
مازگی قلب کو بخشے گا غمیں سر آزاد	ذوق پر وازہ بصد ناز پر افشاں ہوگا
برسند ہو جائے گا دروازہ کرد و زویر	نہ سنے گا کوئی افسانہ دار و زنجیر
دل شکن ہی نظر آئے گا نہ کوئی دلگیر	دل انساں ہی نثار دل انساں ہوگا
جلوہ گر ہوگی زمانے میں وہ تہذیب عظیم	ہمہ تن شوق ہے جس کیلئے ہر قلب سلیم
جس کی مہجوں سے رواں کوثر و تسنیم نسیم	تازہ و تر فیض سے جس کے چین جاں ہوگا

شعلہِ غم کو بجھا دے گی ہوائے دوراں | سرِ آلام جھکا دے گی ہوائے دوراں
 پھول کا تھل کو بنائے گی ہوائے دوراں | دامنِ دہر گلِ افروز گلِ افشاں ہوگا
 خود پرستی کا جہاں سوزِ ترانہ کب تک! | امتیازاتِ تمدن کا بہانہ کب تک!
 نسل اور رنگ کا تاریکستان کب تک! | عامِ اب ہر شرفِ عالم امکان ہوگا
 یہ تمدن جسے پندار خود آرائی ہے | یہ تمدن کہ جو پروردہ دارائی ہے
 یہ تمدن کہ جو انسان کی رسوائی ہے | یہ تمدن ہی اب اک خوابِ پریشاں ہوگا
 عافیت خانہ جمہور بنے گی دنیا! | سوزِ دل سے ہمہ تن نور بنے گی دنیا!
 ہم نشیں شہ و مزدور بنے گی دنیا! | کو کب امن و مساوات درخشاں ہوگا
 خاک ہو جائے گی کندن انھیں میدانِ نوکی | غلبہ بن جائے گی دنیا انھیں دیوانوں کی
 اب بدلنے کو ہے تقدیرِ بیابانوں کی | اور ہی رنگِ رخِ گردشِ دوراں ہوگا
 صبحِ نو عرش سے پیغامِ بقا لائے گی | بہارِ بابِ وفا، روحِ وفا لائے گی
 مژدہ خدمتِ مخلوقِ خدا لائے گی | خدمتِ خلقِ خدا مذہبِ انساں ہوگا
 بھوک اور غم کے مظالم نہ رہے گا انساں | اب نہ افلاس کی موجوں میں بے گام انساں
 کسی انساں کا بھکاری نہ رہے گا انساں | ہر بشرِ نازکشِ رحمتِ یزداں ہوگا
 شمعِ بیداری افکارِ فروزاں ہوگی! | آگئی جراتِ احساس پہ آزاں ہوگی!
 زندگیِ نمِ آزاد می انساں ہوگی! | دہسہ گوارہ آزاد می انساں ہوگا
 کم نگاہی کی ضرورت نہ رہے گی باقی | یہ سنگتی ہوئی نفرت نہ رہے گی باقی
 یہ چین سوزِ سیاست نہ رہے گی باقی | ایک ہی مرتبہ لالہ و ریحیاں ہوگا
 اب جسے دولتِ عرفان میں حاصل ہے | چشمِ بیدارِ دول درونیں حاصل ہے
 سوزِ دل سوزِ وفا سوزِ یقیں حاصل ہے | وہی تاباں و درخشاں و فروزاں ہوگا
 (بر اجازتِ آلِ انڈیا ریڈیو اسٹیشن، دہلی) | روش صاحبِ صدیقی

راہنما تھاکر ٹکور

ترمی نو اتھی کہ ایک سحر کا کرشمہ تھا؛ تراکام تھا یا ایک طلسم زندہ تھا؛
خمار عشرت عرفاں سے نفس پر کیف وہ تیرے گیت نہیں سادگی کا مجزہ تھا؛
وہ سوز و درو کی لذت ترے بیان میں تھی

جو ریشہ ریشہ میں ہر دل کے کل جہان میں تھی
سرد گیتی کے تاروں کو کیسا ملایا تھا؛ دلوں کے چنگ میں اک زمزمہ جگایا تھا
خزاں نصیبوں کو مژدہ بہار نو کا دیا؛ پیام کیا تھا جو تو نے انھیں سنایا تھا؛
گداز و سوز کا کیسا راز آشکار کیا؛
زمین سوختہ بجھی کو لالہ زار کیا؛

بنوڑ کر فلک نیلی کا سوسنی رنگ؛ سمیٹ کر شفق لالہ گوں کی بھولی ترنگ
ہلال صبح کی سیسے ششما میں ٹپکا کر؛ ملا کے برق طرباٹ صوت بے آہنگ
وہ کھینچی عیش ترنم کی جانفسند اصبا
مرد رستی سے لبریز کر دیا مینا؛

توسو نے مندروں میں پھولوں کی جمل لایا تو اچڑے باغوں میں شادابی کی لک لایا
لکھائے تو نے شگوفوں کو کس جہاں کے گیت گویا باغ کا جن سے اڑا چمک لایا؛
دہ بھول ہوئی کے جھٹلے تھے قمری زمزمی سو
جو بھیجی بھیجی صداؤں کا روپ برتے تھے؛

شہزاد لالہ سے آتش کدے بنائے ہیں تبسم گل انجم سے گل کھلاتے ہیں؛
چراغ پھولوں کے روشن صنم کدوں میں کئے جاں صبا نے شگوفوں کے گیت گائے ہیں
شیم نامہ ترے مطرب چین کا بنی
شیم پیک ترے پھولوں کے وطن کا بنی

وہ لوریاں سی تھیں تیری ریلی باتوں میں پہیلیوں کی سی جوہن وہ سیدھی باتوں میں
وہ چنگیاں سی اچھوتے ترے تراؤں میں وہ میٹھا میٹھا سا لک در میٹھی باتوں میں

یہ کہنا "دل میں تو آتے ہو سانسے بھی تو آؤ"

جو گنگنا تے ہو وہ گیت مجھ کو بھی سکھلاؤ

برہ کی آگ سے دل کے دئے کو سلگنا دکھوں کی بنیاں ایک ایک کر کے آگنا
کبھی یہ پوچھنا "پو جا یہ کب قبول ہوگی؟" غموں کے داغوں کو تاروں کی طرح گنونا
یہ کہنا "آتے لکھ رہے ہو یہ بتاؤ مجھے؛

کو ازل کے حے کھول کے دکھاؤ مجھے؛

کبھی وہ ہتوں کی تلافی سرسراہٹ پر کبھی وہ بچوں کی ششدریلی چلبلاہٹ پر
کبھی وہ دور کے دھبے سروں کے جھونکے پر کبھی ہوا کے دبے پاؤں کی آہٹ پر
یہ کہنا چونک کے دیکھو وہ آنے والے ہیں؛

کہہ رہے جہانگوں اندھیرے بھون میں تالے ہیں؛

جو گیت چھڑے رباب حیات پر تو نے ازلے ہزموں سے پہلوں کے سورج خوشبو نے
بادائے وہ نئی آس اور اُنگوں سے جو دل کی یاس میں مدت سے تھے پڑے ٹوٹنے
ساگئی ترے نغمہ کی نے زمانہ میں؛

کہ جیسے چاندنی گردوں کے آستانہ میں؛

بے دلوں میں ترے گیت جیسے پھول ہیں بو سرور و کیف سے لبریز جیسے مے سے بہو
کرن خیال کی تیرے جہاں میں پھیل گئی کہ جیسے بزم میں خوشبو سے نافس آہو
سب کشتی نے نغمہ ترا زمانہ ہوا

تو می فوا سے کوئی تھا جو آستانہ ہوا؛

سر پہ ترے گیتوں کے دل میں کھبتے تھے جو نشتروں کی طرح جاں کی گہ میں چھبتے تھے

نومطاب ۱۸۰۶ء ان تینوں بندوں میں مگور کے گیتوں کے کم و بیش لفظ اور خیال دوہرائے گئے ہیں۔

کبھی چراغ سے پٹ بچپنوں کی روشنی کے خیال تیرے چمکتے تھے اور بجتے تھے
 وہ نوریاں سی تھیں تیرے اچھوتے خواب کی
 کہ جن میں چاندنی اور رات مل کے ہتی تھی!
 سما گیا تھا تیرے دل میں کس جہاں کہاں جو دل کے پردوں میں بھی چپکے رہ گیا تھا خیال!
 سروں میں پھرتی تھیں پرچھائیاں سی شرمیلی! جو ہو گیا کبھی بی ستائی نظر کا سوال!
 وہ کون تھا کہ جو چپ چپ کے گنگناتا تھا!
 وحنوں میں صحن کے تری راگ کس کا آتا تھا!
 شفق کے پہول تھے یا جن ترے ترانہ کی جو ٹہنیوں میں صبح شام کے لگتی تھی!
 تری زامیں نہ جانے کہاں کا جادو تھا ہر ایک بات کلیجہ مسوس لیت سی تھی!
 سروں میں مین کے کیا بجلیاں سی کو مڈتی تھیں!
 جو از عشق کے کون و کہاں کو روندتی تھیں!
 فضا کے سوز کا تو آفتاب ہو کے رہا جان درو میں تو آفتاب ہو کے رہا
 نشاط عشق کا کیا راز تو نے کھول دیا! کہ روئے حسن ازل بے نقاب ہو کے رہا!
 سرور کیف دو عالم ترے کلام میں ہے
 ظار بادۂ وحدت ترے پیام میں ہے
 وہ شعلہ عشق کا بھر دیا خاک انساں میں رفو کی جگہ نہ چھوڑی فنا کے داماں میں
 چراغِ احک سے الفت کا راز ڈھونڈیا جان سوز کی ہر شمع شعلہ سااں میں
 نقاب تو نے اجل کا اٹھا کے دیکھ لیا
 کہ زیست ماہ ازل پر کتاں کا پردہ تھا!
 تارے اب بھی وہی ہیں جو تھنے دیکھے تھے! وہ پہول آج بھی کھلتے ہیں کل جو کھلتے تھے!
 نیم صبح وہی، بلبلوں کے گیت وہی وہ اب بھی ملتے ہیں جو پہلے وقت ملتے تھے!
 جو کارواں وہی منزل وہی ہے، راہ وہی وہی جو عشق وہی جن، دل کی آہ وہی!

دہی جہاں دہی ساز اور دہی نغسہ دہی ہے مطرب عشق اور درو کا خسر

دہی ہمارو خزاں ہے، دہی حیات و ممات دہی ہے بزم، دہی شمع و سوز پر و اندہ

ظروف میکہ میں جام و شیشہ و مینا

ہوئے گار کوئی بزم میں ہے دہی صبا!

دہی ہیں جن کے گیسو اور عشق کا شانہ دہی ہے ذوق خود آرائی اور آئینہ

دہی لباس بدلنا ہمارا ہر بار دہی تمہید خزاں کا ہے شاہد غنچہ

سبونئے سہی ہے بھی نئی، نیا ساقی

ہیں کیف روح کے سامان تو دہی باقی

نظر دہی ہے نظر ارہ ہزار تازہ ہو دہی ہے رنگ گل نو ہزار تازہ ہو

دہی خموشی و غنچہ دہی تبسم گل ہے دل میں داغ دہی لالہ زار تازہ ہو

ہزار پر لگیں، لیکن دہی ہے روح غنیم

پیام صبح ازل کا دہی ہے پیکانِ نسیم

ہے نقش فانی ازل کے نقاب کے باہر کہ جیسے سایہ منہ و آفتاب کے باہر

نہ کیف بادہ ہے پیانہ میں نہ شیشہ میں ہے نغسہ زخمہ و مار و رباب کے باہر

دوام کا ہے ترے راز تیرے گیتوں میں

ہو جسم خاک، مگر تو رہے گا جیتوں میں

نئے کہن ترے ابدیق عنبریں میں نہ تھی بھری تھی بکلیوں میں ماہتاب کی مستی!

کبھی جو مشک ملا کر وہ بادہ تند کیا تو درد و نوشوں میں کرتی تھی رقص مہوشی!

اسی جان کا صبا کی وہ جہان بھی ہے

اسی غار کی انگڑائی آسمان بھی ہے!

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)
انجمن تاریخی تحقیقات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رسالہ ماہ اپریل ۱۹۷۷ء (انگریزی)
مدیر شیخ عبد الرشید صاحب ایم اے نے کاپتہ نمبر ۷۷ بجی روڈ علی گڑھ قیمت فی پرچہ پچاس روپے ۲۲-۱۸، کاغذ
و لماعت بہت عمدہ۔

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کو ایک عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوا کہ کسی
ملک کی آئندہ نسلوں کی وصلہ افزائی کے لئے اس کی سچی تاریخ لکھی جائے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں
کو پڑھ کر اور ہر پہلو سے دیکھ کر سمجھ سکیں کہ دنیا کی سلطنتیں صرف قوت پر قائم نہیں رہیں بلکہ رعایا پروری پر
ہندوستان کی زمانہ وسطی کی تاریخ جو انگریزی زمانہ میں لکھی گئی ہے اس میں زیادہ تر سیاسی پہلو دکھایا گیا ہے
اور معاشی رخ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑہ علی گڑھ کی انجمن نے اٹھایا ہے اور چار ماہ
کے بعد یہ تحقیقی رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ خدا کرے اس جدوجہد میں دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان کی زمانہ
وسطی کی تاریخ جو مسلمانوں نے لکھی ہے وہ فارسی زبان میں ہے اور اس زمانہ کے علمی مذاق کے مطابق ادب و
اخبار کو جدا نہیں کیا گیا ہے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات ادب کے استعارات اور مضمون نگاری کی
بلند پروازیوں میں آجھ گجھ گئے۔ انگریزی مورخوں کو یہ اچھا موقع ملا کہ واقعات کو انجھساؤ سے نکال کر انھوں
نے اپنی پالیسی کی اشاعت کے لئے ان پر رنگ آمیزی کی۔ بہت سے واقعات ہندوستان کے زمانہ وسطی
کی تاریخ میں موجود ہیں جن کے نفس مطلب کو انگریز مورخوں نے صرف منقوہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ جن پر اچھی طرح
رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ ضرورت اس کی شدید تھی کہ اساتذہ مسلم یونیورسٹی جو اس کام کے اہل ہیں اور جن کے
پاس لٹن لائبریری کا بیش باذخیرہ موجود ہے وہ پورے تجسس کے بعد ہندوستان کی زمانہ وسطی کی ایک
ایسی تاریخ لکھیں جو سچے واقعات سے معمور ہو اور اس بات کو ثابت کر دے کہ مسلمانوں کی ہفت صد سالہ

سلطنت صرف تلوار کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ زیر نظر اشاعت میں ہمہنی حکومت کے واقعات، ممد علیہ کی ڈائریاں، مسلمانین دہلی کا طریقہ اطلاق جاگیردارانہ تعلیق کا نظام زراعت، اورنگ زیب کی پالیسی، وغیرہ مضامین بہت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ رسالہ کی چھپائی اور کاغذ باوجود آج کل کی گرانی کے قابل تحسین و قیمت میں کمی کی گنجائش اس وقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ اس کی ضرورت ہے کہ ایسے رسالہ کی اشاعت ملک میں دینے ہونا لازم ہے کہ قیمت میں کمی ہونی چاہئے۔

البیان (جون و جولائی نمبر، قیمت ۱۲ صفحات ۱۱۴۲، دفتر امت مسلمہ امرت سر۔)

البیان کا یہ خاص نمبر اور اشاعت فی القرآن نمبر ہے۔ اس میں وراثت کا مسئلہ قرآن سے اخذ کر کے ثابت کیا گیا ہے اور بعض مروجہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فردوس : قیمت فی پرچہ ۱۷ سالانہ لکھنؤ کے کاپتہ دفتر رسالہ فردوس جوں کا مذکور کتابت اچھی طباعت معمولی صفحات ۱۱۲۸ بزم اردو جوں کا یہ ماہنامہ رسالہ جون ۱۹۲۸ء سے لکھنا شروع ہوا ہے پیش نظر جولائی نمبر میں مدیر کا نام درج نہیں مضامین کا دروبست اچھا ہے۔ سرورق اور آخری صفحہ پر شہر کے چند نظارے ہیں۔ اور ختار جلد کا مضمون ہم محبت کیوں کرتے ہیں، بہت اچھا ہے۔ ویسے بھی دیگر نثر و نظم کے مضامین خاصے ہیں صفحات کے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ شہر کی بزم اردو کی اس اولین سعی کی ہر کن طرح سے ہمت افزائی کی جائے۔

جدید اردو (سالانہ) قیمت ۱۲ صفحات ۲۰۸، ملنے کا پتہ نمبر ۳۷، مارٹن اسٹریٹ کلکتہ۔
کلکتہ سے یہ رسالہ عرصہ سے نکل رہا ہے اور اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ زیر نظر نمبر میں اچھے اچھے مقالے، ادبی شہ پارے نظمیں اور افسانے ہیں۔ لکھال میں اردو کا چرچا جس محبت اور خوبی سے اس نے قائم کر رکھا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

رسیدہ۔

مجلہ نظامیہ (خصوصی شمارہ) ہر یادگار فرم ملاحظہ لیتو، مرتبہ ابو الخیر کبچہ نشین۔ صفحات ۱۹۲ قیمت ۷۰۰
ملنے کا پتہ۔ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی۔ حیدر آباد دکن۔

دارالاسلام (خاص نمبر یعنی پارہ عم مرتبہ تفسیر و معانی الفاظ مرتبہ شبہ اشاعت قرآن ادارہ دارالاسلام)
متصل ٹیجان کوٹ پنجاب، قیمت فی پرچہ ۷۰۰

احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
(دیسرے) کوہ رہیں گونا گونا برسوں لیکن اب فرما دہیں

مولانا سید غنی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صد ہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں شعبہ کو ان سے بڑی تقویت ملی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہران کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر پیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیشروں سے ان تک پہنچے تھے بایں ہمہ وہ اردو ادب شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دستان کے نقطہ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جدا لگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مقبول و مردح ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات اور تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے دوسرے کے نقطہ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے اس اعتبار سے ان کو ترقی پذیر اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پذیر اور ترقی پسند کا مفہوم انہیں تو سہے کہ جرات کے ساتھ اپنی کے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سننے

رعلت کے وقت مرحوم کا سن ۶۵-۶۶ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بیماری بھر گئے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوشدلی اور تواضع فنی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منع کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلقاً تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی محبت یا عمل استعمال پر اختلاف آ رہا ہو فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی درجہ گردانی کرتے مطلب ہراری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ اور تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ میں رہے۔ بالاخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتائے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و اجتہاد کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنگو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنگو کے عالم تبصر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منع ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔ پروفیسر کرنگو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بڑے ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم لبا تد، مینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی وقت ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے اکثر لائبریری پہنچتے ہیں۔ پروفیسر کرنگو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے ہوتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سن کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنگو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ Model de Luxe

بہت کم لوگ کہہ پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ سے کم تھی

زبان و بیان یا شعرو شاعری سے متعلق باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الغور پڑھتے۔ کہتے تھے استاد دماغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے ملحقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکرہ و تائید یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے دماغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شیعہ آرہے تھے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرتے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول تعمیل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کرتے کہتے تھے دو چوریاں ہاں تھیں ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی تہر کی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے غلوں اور گفتگو کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے ان میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے استقام کہتے تھے زبان کی غلطی کیلئے سن لوں اساری عمر ہی میں گزرائی۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی ستم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔

ایک دن شبہ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورو اہلو میں ریلوے میں ملازم تھے۔ سودا کا بستہ ساتھ تھا اردو شعر کا موطا تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی آئنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نوار دکان سے تعارف کرایا گیا۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا غیر حاضر سے ہیں۔ نوار دسے کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض کچھ دیر بعد وہاں عزیز نے مولانا کی قلعیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ سودہ کی طرف مائل ہو۔ مولانا نے مطلق التفات نہ کیا اس سے متون نوار دسے دل بھی ہوئی نہ حاضرین کو تفریح۔ جہان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی تذکرہ کا کہ سودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کہولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کر۔ یہ لکھ سودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ جیہی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بنیران کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! جیہی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا کانا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وجہ تہ ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چلے نہفت میں پلوا دیں!

مولانا نے بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نوار دسے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ نکتہ نہ رو سکتا تھا نہ راز نہ کٹر لکھتا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سائی نہیں اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا

ایک دوست نے مولنا کو انتہائی رازدار سمجھ کر ایک معاملہ میں فخر یک کار بنایا تو ٹوٹے ہی عرصہ بعد مولنا میرے پاس آئے عجیب حصیں ہمیں میں بتلائے تھے میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی برہنہی سے مولنا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب ”سینہ بیل سے پر نشان“ نکلتا چاہتا تھا۔ میں نے حماد دوسری باتیں شروع کر دیں مولنا سنی ان مخی کرتے جاتے تھے اور جب انہیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انہوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھر کم جسم کو اس طرح تولایا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور مکان میں اگر پھر نکلیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کسی سے قریب کر لی اور کچھ کھانا چاہا۔

میں ان کے ارادہ سے واقف ہو گیا میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انہوں نے قریب کی تھی۔ مولنا کچھ ایسے ذہنی غلغلہ میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا و نفیس مضمون پر آنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولنا اس دفعہ پابند ہونگے چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اٹھ کر بھاگا۔ مولنا باآں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی فرمایا: رشید صاحب ارے وہ بھی سائیں بھاگنے کی سانس و آرٹ یعنی Rearguard action ”ریو گارڈ اکشن“ (جنگ پسپائی) سے پورے طور پر پردہ تھا۔ میں نے بھاگتے ہی ہوئے جواب دیا: جی ہاں مولنا میں ابھی آتا ہوں مولنا نے دیکھا کہ شکا نہ بھلا جاتا ہوں میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولنا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا دی دی میں گریبا مولنا نے راز فاش کر دیا تھا

مولنا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرو تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے

لے اس سلسلہ میں غالب کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا

اہل ہوس کی فتح ہے ترک ہوس و عشق جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

چنانچہ مرحوم کے عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا مترن ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خاندانہ برکات یہ کام نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتیٰ الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملنے لگتے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن مطلقاً اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور سے وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجالاتے اور جو کچھ کہتا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت ہے۔ یہ ہیں چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی طریقہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سید سترے پاجامے۔ سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے پہنے ہوئے میں ایک طرح کی شگفتگی و شانگلی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پہرنے یا انواع اقسام کے ٹکڑاؤں و قمیصیں پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طوطا تیار سمجھا جاتا ہے، مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے بعض لوگ اس پر کمر اٹھیں گے کہ یہ قل آعوذیت تھی، قل آعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن انسانیت یا شہدین کے مقابلہ میں قل آعوذیت کو اگر دن زدنی بھی نہیں قرار دیا جاسکتا لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بھڑکنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن، رہن، مرنے، جینے، نفع یا بانی نفع رسائی کا تعلق ہو۔

پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خارہ میں نہیں ہیں نہ ان کو لازم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی دنیا زمانہ مجموعہ صدکامات ہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور نباتات کے لئے زیادہ باعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی عقل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ زہر بار بھی بہت ہو گئے تھے۔ تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

ننگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کرگذاڑنے میں کبھی تال بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے مستحق رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی ان پر فقر سے بھی چپٹ کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا، بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جبکہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تاشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو مسترخص کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم بستاں کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری تصنیف و تالیف تھیں و تدقیق میں گزار دی اپنے استاد کے سلم البیوت پر رہے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شہرخی نہیں تھی و عدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا تانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا زبان، محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے

سمجھنے پر کھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد مٹتے جا رہے ہیں صحت زبان اور مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو نکر و فرصت ہے اور کوئی کسے بھی تو کس برتنے پر کرسے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جا رہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں فنی تجربہ بڑی چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتر وں میں جادو جگاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولنا حبیب قادری الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گذرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ شعر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو بالکل خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع ساخ و فات پر ہوش بگڑامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولنا آجں مرحوم نے ان مضامین کو شٹوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا عالم یہ تھا کہ شبہ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں ہر طرح کے طلباء اور نقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے۔ عملی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں فنی مذاق میں بھی شریک ہیں اور شنوی بھی لکھی جا رہی ہے مشکل سے مین چار دن گذرے ہوں گے کہ شنوی مکمل ہوگی۔ مولنا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ شنوی (موسم بہ شاہکا عثمانی، لفظاً و معناً ماخوذ ہے) پیش نظر ہوں ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برہیل تذکرہ فرمایا کہ آصف کوٹھوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دیدیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولنا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے آواز میں گھٹکتی تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آ جاتے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا مل کا ڈھیل آئین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستینیں چومالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میان ہوش میں آؤ، یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں سہانے ہیں، آصف صاحب کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس سحرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تا بڑ توڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو دیکھیں

کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی بڑی کاہل نظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر درجے پڑے تو میں نے عرض کیا، مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقہ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے شاعروں میں نافذ کر دئے جائیں تو کیا ہو مرحوم فقہہ مارکر کرسی پریٹ گئے، کتنے لگے بڑا اچھا ہو کجنت گویوں سے نجات ہو جائے! مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں فصل "میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تنہا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شرکت تھے صف اول میں وہ سب کچھ تھاجس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بازوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرع مجھے یاد ہے

کہاں لے جاؤں دل دوڑوں جہاں میں سخت ٹھکل ہے

مولانا کی باری آئی بھلے مانوں کے سید سے سادے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

فرمائیں معاف فوجا نام سخن بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہبہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو صف اول کو مد نظر رکھ کر پڑھا گیا، مجمع سے وہ نعرہ تحمیں و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

بٹی ہے امیروں میں ترے سخن کی دلتا یہ معرفت خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و اہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعرا و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے یہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی جہل پہل کے گزرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

انہی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا جسنا منجہ

زحمت لے کر پہن گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ زحمت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع زحمت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں پر وہاں چائسل ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولنا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولنا کے ساتھ ساتھ شعبہ کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی، مکالمہ سنئے۔

صاحب۔ (سرخ ہو کر اور مدہم کی میری طنز کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں۔ (متعجب و سراپہم ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب؟

صاحب۔ (چہرہ پر ہنس ہو کر) بے شک مولنا صاحب نے کیوں درخواست دی، ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولنا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو دیا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہئے۔

صاحب۔ (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کتا ہوں وہ آؤ گئے کیوں؟

میں۔ شر پڑنے

صاحب۔ شر!

میں۔ شر، جناب والا!

صاحب۔ اپنے شر!

میں۔ مولنا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا؟

میں۔ ہوتا ہوا کچھ نہیں مالا جیسا لیکن ماننا کوئی نہیں۔

صاحب۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انداد کیوں نہیں کرتے؟

میں۔ جناب والا میں اپنی مالاغی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرمائیں بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب۔ بہت خوب مولنا کو میرے ہاں لانا کسی قدر زہر خند فرما کر مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

(دوسرا منظر)

پرو دوائس جانلہ صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولنا حاضر ہوئے۔ صاحب ایک ٹخت چمکے لیکن فوراً ہی سرود قد ہو کر مولنا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پر سی فرمائی۔ پذیرائی میں کچھ کچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرساں حال نہ تھا۔ البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کوئٹہ بجالانے میں زیادہ اہتمام مولنا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے۔ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سرود کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب دوائی معاف ہو گا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔

(ڈراپ سین)

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے مولنا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ کتب میں ملحوظ رکھ چکے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولنا کلاس سے سخت آزرہ و برہم چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے معلوم ہوا بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے۔ مولنا کو یہ بات بہت آلا ر ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔

مسافر رفت و گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولنا سے گفتگو ہوئی فرمایا۔ رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزارنے اور تفریح و تہنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہیں کہیں علم تو ان کو ملے گا نہیں میں نے عرض کیا مولنا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کچھ لگا۔ یہ طلبا کا تصور نہیں ہے نیا کا اپنی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدرو قیمت رکھتی تھیں اب وہ مروود

ہر چکی ہیں حفظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ اعتاب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کرہ ہے نہیں لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کا فکار ہیں۔

مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا۔ بے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجئے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوڑ دیں کی نالافتی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالافتی انگیز کر لیتے ہیں۔ مولانا دیکھ پڑ گئے اور کسی قدر مدغم سروں میں انا اللہ۔ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ سات مہینوں سے لڑ جاتے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کاربیکل سے دو چار کیا اور کاربیکل نے انہیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا لایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے قوت ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ زندوں میں زندہ، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے رہنے کیسی کیسی مٹھلیں اور صحتیں دیکھے اور برتے ہوئے، یہ ہمہ جہت شخصیت بالا خرم سرا گشت ۱۹۴۵ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۵ء کا نابالہ پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی کہ مولانا آج صبح کاربیکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہجر کر بولے اور کہیوں

حضور، سنتا ہوں خدا اس شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدا
تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ بڑھ کر داپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب اور کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مہبوت
ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان وزمین کی ساری پنائیں پر مرعض کی شخصیت
مستولی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات
پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدا را کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی
لگن اسے کہتے ہیں!

عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

رشید احمد صدیقی

سلہ راقم الحروف کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ جو اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

گرانی اور ہندوستان

وہ زمانہ تو بہت دور گیا جب سیاسی جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ اب تو معاشی لڑائیوں کا زور ہے ہر فریق دوسرے کو معاشی زک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے اثاثوں کو ضبط کرنا بحری ناکہ بندی، سامان لانے اور بیچانے والے بد رقوم پر حملے، دشمن کے کارخانوں اور گوداموں پر گولہ باری اور اپنے علاقوں کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے پہلے خود ہی ہر طرح تباہ کر دینا کامیابی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ نازیت، فاشیت، اشتراکیت، جمہوریت، شہنشاہیت اب صرف سیاسی اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ ان میں معاشی مفہوم بھی پنہاں ہیں۔ بلکہ ہر "یت" کا بذات خود ایک مکمل معاشی نظام ہے اور ان ہی مختلف نظاموں میں کشمکش جاری ہے۔ پھر چونکہ ذرائع حمل و نقل کی آسانیوں صنعتی ترقیوں اور تجارت خارجہ کی سہولتوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک بین الاقوامی معاشی نظام کے دائرے میں آگئی ہے اس لئے کشمکش اور زیادہ شدید نظر آنے لگی ہے کوئی ملک اپنی روٹا کی استعمال کی معمولی چیزوں کو بے لے اور دیکھے کہ وہ کہاں کہاں سے آرہی ہیں، ربر، بنیل، پالش کی ڈبیاں۔ استروں کے بلیڈ، مابن تیل، رومال وغیرہ دیکھنے میں کس قدر حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر دنیا کے دور دراز ملک ان چیزوں کو مہیا کرتے ہیں جب بھلا معمولی چیزوں کا یہ حال ہو تو پھر اہم اور ضروری کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ لڑائی دو ملکوں کے درمیان ہوتی ہے مگر اس کا اثر ساری دنیا پر پڑتا رہتا ہے۔

موجودہ جنگ کی طرح تو آج تک دنیا میں کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ اس جنگ میں ساری دنیا کے ملک تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک محاکر نے والے اور ان کے ساتھی۔ دوسرے مدافعت کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ تیسرے غیر جانبدار، یہ تقسیم کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ہر بڑی لڑائی میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر دوسری لڑائیوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تعداد زیادہ رہا کرتی تھی لیکن اس لڑائی کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں غیر جانبداروں کی تعداد کم ہے اور نسبتاً روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں بھی بعض نام نہاد طور پر غیر جانبدار ہیں ورنہ وہ کسی ایک فریق کے ساتھ ہیں مثلاً امریکہ آئینی طریقہ پر تو امریکی میں شریک نہیں لیکن وہ کھلے بندوں اتحادیوں کا ساتھ دے رہا ہے یا اسپین علی الاطلاق محوری طاقتوں کی طرفداری کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ملک ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حقیقی معنوں میں غیر جانبدار ہیں۔ اس طرح یہ دائرہ بہت ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ایسی صورت میں دنیا جنگ کے معاشی اثرات سے جتنی بھی متاثر ہو کم ہے۔

جنگ کا ایک عام معاشی اثر گرائی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم گرائی کے اسباب اور ہندوستان پر اس کے اثرات کو ظاہر کرنے کی حد تک محدود رہیں گے۔

گرائی کے اسباب اگر ان کیوں ہوتی ہے؟ اس مختصر سے سوال کا جواب دو چار لفظوں میں نہیں دیا جاسکتا گرائی کے اسباب معلوم کرنے سے پہلے ہیں اپنی ضروریات کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ جو دوسرے ملکوں میں پیدا یا تیار ہوتی ہیں اور وہاں سے ہمارے ملک میں آتی ہیں دوسرے وہ چیزیں جو خود ہمارے ملک کے اندر پیدا یا تیار کی جاتی ہیں۔ اب باہر سے آنے والی چیزوں کو لیجئے ان کی قیمت اس لئے گراں ہوتی ہے کہ

(۱) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دشمن یا ان کے ساتھی ہیں اس لئے مال وہاں سے نہیں آسکتا۔

(۲) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دوست ہیں۔ گرائی کی وجہ جنگ کی طرف ہے اس لئے وہ ذخائر

حرب زیادہ تیار کرتے ہیں اور دوسرے مال بہت کم تیار کرتے ہیں اور جب ان کے یہاں مال ہی کم تیار ہو تو وہ باہر بھی زیادہ مقدار میں نہیں بھیجا جاسکتا۔

(۳) اس زمانہ میں غیر جانبدار ملک نئے بازاروں پر قبضہ جانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر سمندری خطروں، بحیرہ کی شرح میں اضافوں، ریلوں اور دوسری چیزوں کے کرایوں میں اضافہ کی وجہ سے اس مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مگر اس وقت دنیا کا کوئی بڑا ملک ایسا نہیں جو جنگ میں شریک نہ ہو (یا سہلے متحدہ براہ راست

جنگ میں شریک نہیں مگر بالواسطہ طریقہ پر اس کی ساری توجہ جنگ اور ضروریات جنگ کی طرف لگی ہوئی ہے، اب رہ گئے چھوٹے چھوٹے ملک تان کے یہاں نہ ایسی صنعتی ترقی ہوئی کہ وہ نئے بازاروں پر قبضہ کر سکیں اور نہ اتنے جہاز کہ دوسرے ملکوں کو سامان بھیج سکیں۔ دراصل یہ فزیت تو یورپ کے چند چھوٹے چھوٹے ملکوں مثلاً ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک وغیرہ کو حاصل تھی کہ وہ باوجود رقبے میں چھوٹے ہونے کے اور آبادی کی کمی کے بین الاقوامی تجارت میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ جنوبی امریکہ اور ایشیا کے اکثر ملک رقبے اور آبادی میں ان سے کافی بڑے ہیں لیکن ان کو یہ بات میسر نہیں گویا اس طرح ہندوستان کی درآمد کو بڑا نقصان پہنچا اور باہر سے آنے والی اشیاء کی مقدار گھٹ گئی اور ان کی قیمت بڑھ گئی۔

دوسری طرف خود اندرون ملک پیدا ہونے والی چیزوں کو لیجئے ان کو بھی دھنوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وجہ ان کی نہیں بھی ضرورت ہے اور وہ جنگی اغراض و مقاصد کے لئے بھی ضروری ہیں مثلاً پٹرول تیل، روئی، دھاگہ، کپڑا، ادن، کھل، چمڑے کا سامان، وہے اور لکڑی کا سامان، زرعی پیداواریں، ربڑ، شکر وغیرہ اب جو کارخانے فوجی اغراض کے لئے ان کو استعمال یا تیار کر رہے ہیں انکی ضرورت اہم اور شدید ہے اور ان کے پاس ایسے خریداری ہیں جو اس سامان کی قیمت بھی زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ ایسے کارخانے خام مال کی قیمت زیادہ دے سکتے ہیں یہ مزدوروں کو بھی زیادہ اجرت دیتے ہیں اور ان کا مال باوجود گرانی کے فروخت بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام کارخانوں سے خام مال اور مزدور ادھر آنے لگتے ہیں مگر دوسرے کارخانے بھی اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں، مجبوراً وہ بھی زیادہ قیمت اور زائد اجرت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں یعنی اس طرح عام اشیاء کی لاگت بڑھ جاتی ہے لہذا ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر یہ اضافہ ایسا ہے جو باہمی النظر میں ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے لیکن عوام اور نادان لوگوں کو اس وقت حیرت اور تعجب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو ان کے ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں مثلاً پان یا دھپل، ترکاریاں، پھلی و دودھ فلی وغیرہ جو کہیں باہر نہیں جاتے مٹی کے برتن، گھرے، منگیاں، اگلے وغیرہ ان چیزوں کی بھی دو قیمتیں ہیں ایک وہ جو ہندوستان کے کسی

ایک حصہ میں پیدا ہوتی ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں میں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ مزدوروں کی اجرت، اخراجات نقل و حمل اور بار برداری بڑھ جاتے ہیں۔ نئے نئے ٹیکس لگاتے ہیں۔ ان چیزوں کا بار ایشیا کی قیمتوں پر پڑ کر ان میں اضافہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ چیزیں ہیں جو بالکل مقامی طور پر بنتی ہیں اور وہیں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی اچھی مثال مٹی کے برتن ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی نیا ٹیکس لگانا یہاں مزدوروں کی اجرت بڑھی کیونکہ یہ سب کام کھار اور اس کا خاندان کرتا ہو اور وہ ان چیزوں کو ادھر سے ادھر منتقل کرنے میں اخراجات بڑھتے ہیں۔ نیز ان کی بنوائی پر اتنا ہی وقت اور محنت صرف ہوتی ہے جتنی کہ پہلے ہوتی تھی۔ پھر ان کی قیمت میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں روپیہ کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ یعنی جو چیز پہلے ایک روپیہ میں خریدی جاسکتی تھی اب اس کے دو روپے دینا پڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر روپیہ آٹھ آنے کی برابر ہو گیا ہے۔ لیکن غریب کھار ان نکتوں سے ناواقف ہے البتہ وہ یہ جانتا ہے کہ پہلے وہ دس گھڑے روز بناتا تھا اور ان کو ایک آنہ فی گھڑے کے حساب سے فروخت کر کے دس آنے روز کما لیتا تھا اور ان دس آنوں میں وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھی بھر لیتا تھا اور کچھ آنے بچا بھی لیتا تھا جو اس کے کپڑے لتوں سے تھوڑوں اور تقریبوں پر کام آتے تھے۔ اب بھی وہ دس گھڑے بناتا ہے اور ان کو دس آنے میں بیچتا ہے۔ مگر اب اس رقم کو جب وہ اپنی ضرورتوں پر صرف کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ بچت تو درکنار اس کے روزمرہ کے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے گھر ٹوٹا کر تھکاد بڑھا دے تاکہ اس کو اتنی رقم ملنے لگے کہ اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں مگر ایک تو یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ روزانہ میں گھڑے بنا لیا کرے۔ دوسرے اس کو اتنے خریداری نہیں ملنے جو یہ گھڑے خرید لیا کریں۔ تیسرے طبعا ہر انسان آرام پسند ہوتا ہے یعنی وہ کم کام کر کے زیادہ نفع حاصل کرے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا آسان نسخہ یہی ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی قیمت میں اضافہ کر دے۔ چنانچہ یہاں ہی ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے عام چیزوں کی قیمت بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی گھڑوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس تجربہ پر غور کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں ان چیزوں

کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جن کو جنگ سے دور رکابی واسطہ نہیں۔

گرانی کا دوسرا سبب اضافہ اجرت ہے یعنی جب جنگ کے زمانہ میں چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگتی ہیں تو مزدوروں کو نقصان پہنچنے لگتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور ان کی پہلی اجروں سے ان کی ساری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں لہذا وہ اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں ابتدا میں ان کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ابھی چیزوں کی قیمتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا کہ اجرت بڑھانی جائے۔ مگر جب مطالبات شدید ہوتے جاتے ہیں اور ہڑتالوں اور در بندیوں کی قوت آنے لگتی ہے تو اجروں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح لاگت بڑھ کر چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے۔

گرانی کا تیسرا سبب حقیقی دولت کی پیدائش میں کمی کا ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں سارے ملک کی توجہ سامان حرب یا جنگی اغراض کے لئے ضروری سامان تیار کرنے کی طرف رہتی ہے۔ کپڑے، روپے، فولاد، چمڑے کے دو کارخانے جو پہلے ملک کی عام ضرورتوں کے لئے چیزیں تیار کرتے تھے اب جنگی اغراض کے لئے سامان بناتے ہیں یا ان کی تیار کردہ چیزوں کی بڑی تعداد جنگی اغراض کے لئے خریدی جاتی ہے اس وجہ سے ملک میں ضرورت کی عام چیزوں کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مقدار کی کمی باقی ماندہ اشیاء کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ اب اس زمانہ میں چونکہ نفع کافی ہوتا ہے اس لئے نئے نئے کاروبار کھلنے کی توقع کی جاسکتی ہے مگر جنگ کے زمانہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ خام مال کی قیمت کی زیادتی، اجروں میں اضافہ، شرح سود کی زیادتی، مقدار زر کی کمی اور سب سے بڑھ کر خریداروں کی کمی کی وجہ سے نئے کاروبار چلا کر نفع حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اور ہر معاشرہ میں ایسے اہم افراد در بلند حوصلہ آؤں کم ہوتے ہیں جو غیر معمولی خطرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کا مقصد جنگی اغراض کو پورا کرنا ہوتا ہے کیونکہ اسی شعبہ میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں میسر آ جاتی ہیں اس وجہ سے نئے کاروبار کھلنے کے باوجود اس کی کمی کو پورا نہیں کیا جاسکتا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

گرانی کا چوتھا سبب تجارت خارجہ میں تخفیف ہے یہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے جس کا ذکر

ابتدا میں کیا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہمارے حلیف یا غیر جانبدار ملک باوجود خطروں، بیہوشیوں اور کراہیوں کی شرحوں میں اضافہ کے زیادہ سے زیادہ مال درآمد کرنے کو تیار ہیں تو خود ہمارے پاس بھی اس قیمت کا مال یا خدمات ہونا چاہئیں یعنی قیمت کا مال باہر سے منگوا یا جا رہا ہے، تجارت خارجہ کا یہی اصول ہے کہ وہ زریا سکوں کی بدولت نہیں ملتی بلکہ ہر ملک اسی قدر مال درآمد کر سکتا ہے جتنا کہ وہ برآمد کرنے کے لئے تیار ہو یعنی اصولاً ہر ملک اپنی زائد اشیاء یا خدمات کو ہی برآمد کرتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں جب ملک کی حقیقی دولت کی پیدائش ہی گھٹ جائے تو اس کے پاس زائد اشیاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہیں خدمات یا ہندوستان جیسے زرعی ملکوں میں زرعی پیداواریں تو ان کا رخ بدل جاتا ہے مثلاً وہ لوگ جو جنگ سے پہلے حملہ کرنے والے ملکوں میں بینکاری یا بیمہ یا دوسرے کام کرتے تھے اب ان خدمتوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور خود ملک میں ان کی خدمات منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب رہیں زرعی پیداواریں تو وہ پہلے ان ملکوں کو برآمد کی جاتی تھیں جہاں سے ہم کو اپنی ضرورت کے مطابق مختلف سامان کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اب وہ حلیف ملکوں کو جاتی ہیں پھر بعض وقت حلیف ملک ان کی قیمت (ان کے مساوی دوسری اشیاء) بھی فی الوقت ادا نہیں کرتے چنانچہ مسئلہ ۱۲۴ کی جنگ میں ہندوستان کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا یعنی اس طرح ہم اپنی رہی سہی زائد چیزوں کے منافع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

گرمائی کا پانچواں سبب نفع کمانے کی ناجائز خواہش ہے موماً شخص ہر وقت (اگر اس کو موقع ملے) ناجائز منافع حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ مگر جنگ کے زمانہ میں بعض امکانات اس توقع کو بڑھا دیتے ہیں اور اس وجہ سے خوب نفع ثانی ہوتی ہے۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں جنگ نے طول کھینچ لیا تو ملک میں باہر سے آنے والی چیزوں کی مقدار گھٹ جائے گی اور ان کی قیمت بڑھ جائیگی اور اس وقت جن لوگوں کے پاس مال ہوگا ان کو خوب نفع ہوگا لہذا وہ ابھی سے اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دیتے ہیں اور یہ ظاہر کر کے کہ ان پاس بہت تھوڑا مال ہے اس کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک جہل عرصہ تک وہ ناجائز منافع حاصل کرتے رہتے ہیں ایسا کرنے والے بڑے بڑے تھوک فروش تاجر

اور دوکاندار ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ریڈیو، بحری تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے سارے حالات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ نیز جس طرح حکومتیں کسی آنے والی جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی پہلے سے غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں مثلاً بین الاقوامی حالات سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ عرصہ میں دو ملکوں کے تعلقات خراب ہو جانے والے ہیں لہذا وہ پہلے ہی سے وہاں سے کثیر تعداد میں منرو دی سامان منگوا لیتے ہیں اس طرح اپنے ذخیرہ کی مقدار بڑھا لیتے ہیں پھر ہر متعین فروش کے پاس ایسا سامان کثیر مقدار میں ہوتا ہے جو کم قیمت پر خرید لیا گیا تھا مگر حالات میں تبدیلی ہوتے ہی وہ ایک دم چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً جس دن حکومت برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں اور مقبوضوں نے جاپانی اثاثوں کو ضبط کیا اس کے دوسرے دن بمبئی میں بعض جاپانی چیزوں کی قیمت دو گنی ہو گئی اس قسم کی من مانی کارروائیاں ملک پر بڑے بڑے اثرات ڈالتی ہیں اور بعض اوقات صورت بہت ہی نازک ہو جاتی ہے جیسا کہ اس مرتبہ ہندوستان میں ہو رہا ہے اور حکومت کو کوشش کرنا پڑتی ہے کہ اس ناجائز منافع کی روک تھام کرے۔ چنانچہ اس مرتبہ جنگ شروع ہوتے ہی انگریزوں نے ایشیا کے سلسلہ میں دو ایک نسل ہندو لائبریاں ہونے لگیں جن میں سارے برطانوی صوبوں اور اکثر بڑی بڑی ریاستوں نے اشتراک کیا۔ بعض صوبوں میں حکومت کی جانب سے چیزوں کے نرخ مقرر کئے گئے بعض جگہ سرکاری دوکانیں قائم ہوئیں۔ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں مگر ان ماضی بندشوں سے منافع ستانی کی حقیقی روک تھام نہ ہو سکی اور یہ شکایت اب پھر بڑھ گئی ہے چنانچہ پھر حکومت ایک کانفرنس کے انعقاد پر غور کر رہی ہے۔ گمانی دراصل ایک پیکر ہے یعنی جب ایک چیز گراں ہوتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی گراں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ گیہوں یا چاول کی ہندوستانی فوجوں یا دوسری فوجوں کے لئے باہر بھیجنے کی ضرورت ہوئی اس لئے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اب ملک کے وہ غریب لوگ جو پہلے گیہوں یا چاول کھاتے تھے ان کے بجائے دوسرے معمولی اور ارزاں غلے مثلاً بجا، جوار، اجرو، رائی، کرودوں وغیرہ کھانے لگے گویا اب ان چیزوں کی مانگ بڑھی اور یہ غلے

کہ جب کسی چیز کی انگ بڑھتی ہے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہذا ان چیزوں کی قیمت بڑھ گئی۔ یہی اصول دوسری تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے اور ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسی کو عام گرائی کہا جاتا ہے جس کے اثرات بہت شدید اور اہم ہوتے ہیں۔

گرائی کے اثرات گرائی کے اسباب معلوم ہونے کے بعد اس کے اثرات معلوم کرنا ضروری ہیں۔ گرائی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ معین آمدنی پانے والوں کو نقصان ہونے لگتا ہے۔ اس طبقہ میں تین قسم کے آدمی شامل ہیں ایک کارخانوں کے مزدور اور دوسرے متفرق مزدوری کرنے والے اور تیسرے حکومت کے ملازم، پہلا طبقہ بہت کچھ منظم ہے اس پر حکومت کی بھی کوئی بندش نہیں۔ ان کی انجمنیں اور سہا میں بھی ہیں ان کے جلتے اور کانفرنسیں بھی ہوتی رہتی ہیں یہ شروع میں آئینی اور پرمان طریقوں پر اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان کے مطالبے تسلیم کر لئے جاتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے ورنہ ہڑتالوں اور در بندیوں کی نوبت آتی ہے بالخصوص جب جنگی مقاصد کو ان سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو اور نازک حالات میں حکومت کی مداخلت ضروری ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو حکومت کو کارخانوں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا ہے جیسا کہ آج کل ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکثر مقامات پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں اب تک صورت حال کبھی اتنی نازک تو نہیں ہوئی لیکن پولیس کی گرائی اور سپروائزی چارج مزدوروں کی گرائیاں اور سٹریکٹس اور مزدوروں کے کارخانوں اور مظالم پر حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو تھوڑی بہت مداخلت بھی کرنا پڑتی ہے بہر حال ان متحدہ کوششوں سے ان کو فائدہ پہونچ جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ متفرق مزدوروں کا ہے نہ ان کی کوئی انجمن ہے نہ رہنما، پھر یہ مختلف پیشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ آئے دن ان کے آقا اور مالک بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی منظم کوشش کر کے اپنی اجرت نہیں بڑھا سکتے لیکن عام حالات کے ساتھ ساتھ تدریج ان کی اجرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب تک ان کی اجرت اس معیار پر پہونچتی ہے ان کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس گروہ کے نیکے اور کام چور آدمی اس مجبوری دور سے تنگ آکر محنت سے جی پرانے لگتے ہیں اور جائز طریقوں کے بجائے ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں جیسا کہ جوہری، کوکیتی، لوٹ مار، قتل، خون اور طبقہ داری فسادات

میں اضافہ ہونے لگتا ہے جس میں بعض وقت دوسری پریشان حال اور غیر منظم جماعتیں بھی مل جاتی ہیں۔ چنانچہ پہلی میں حال ہی میں ایک ایسا فساد ہوا جس میں ایک طبقہ کی دوکانیں اور سامان ٹوٹ گیا اور باقی چیزوں میں آگ لگا دی یہ صورتیں ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں اور حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ سرکاری ملازموں کا ہے یہ عجیب گلگش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گرائی کی وجہ سے ایک طرف اس کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے، دوسرے نئے نئے ٹیکسوں یا چندوں کا بار بھی اس پر پڑتا ہے۔ بھرپور نہ تو ہڑتال کر سکتا ہے اور نہ کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ دوسرے غیر آئینی طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ البتہ درخواستوں پر درخواست دے جاتا ہے اور جب حکومت یقین کر لیتی ہے کہ اس کی حالت قابلِ حرم ہے تو وہ اس کو گرائی الاؤنس یا بھتہ کے نام سے کچھ رقم دینے لگتی ہے مگر جس کی مقدار عموماً کم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرائی کا اخذ زراعت پیشہ طبقہ پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنی پیداواروں کی قیمتیں زیادہ ملنے لگتی ہیں مگر ہندوستانی کاشتکار کو گرائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ وہ خود فروشنده نہیں ہے بلکہ اس کے اور اہل خریدار کے بیچ میں بہت سی آمدی مثلاً ماحول بننے، دلال آرٹھیے اور تھوک فروش بطور درمیانی آدمیوں کے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نفع کی بڑی تعداد ان لوگوں کی جیب میں چلی جاتی ہے اور کاشتکار کو جو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے وہ عام گرائی کی نذر ہو جاتا ہے۔

گرائی کی وجہ سے حکومتیں اپنے محکموں میں، آجر اپنے کارخانوں میں تخفیف شروع کر دیتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے لوگ اس زمانہ میں گرائی کی وجہ سے اپنے مجوزہ کاموں کو ملتوی کر دیتے ہیں اس طرح ملک میں بیروزگاریوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جنگ اور اس کے متعلقہ کاموں میں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح بہت سے تخفیف شدگان اور بیروزگاریوں کو کام مل جاتا ہے اور ان لوگوں کو اجرتیں بھی زیادہ ملتی ہیں مگر عام گرائی کی وجہ سے ملک کی مادی خوشحالی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ جنگ کے خاتمہ پر اس ماضی پھل پھل اور رونق کے بڑے وسیع ایک انہماک

مرتب ہوتے ہیں۔

گرانی میں حکومت بھی متاثر ہوتی ہے جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کو طرح طرح سے مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنگی اغراض کے لئے بڑی بڑی رقمیں قرض لینا پڑتی ہیں اور چونکہ یہ رقمیں فیر پیدا اور ہوتی ہیں اس لئے ان کے اہل اور سود کا بار حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے جن چیزوں کی خریداری کی ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ دینا پڑتی ہے سرکاری ملازموں کو گرانی کا الاؤنس دینا پڑتا ہے۔ پھر ملک سے باہر جانے والی فوجوں کی تنخواہوں میں اضافہ نئی فوجوں کی بھرتی، مقتولین کے وارثوں کو انعام، ناقابل کار مجروحین کو دینیے سپاہیوں کے لئے عہدہ قہم کی غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام اور سب سے بڑھ کر اسلحہ کی تیاری کا خرچ ایسا ہے جو اچھے سے اچھی حکومت کی کمزور دیتا ہے۔ ایک طرف تو اخراجات بڑھتے ہیں دوسری طرف اندرونی اور بیرونی تجارت میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کمزور گیری اور دوسری مددوں کی آمدنی کم ہونے لگتی ہے۔ ان کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے تین طریقے ہیں، تعمیری اور مفاد عامہ کے کاموں میں تخفیف کر دی جاتی ہے نئے نئے محصول لگائے جاتے ہیں اور سب سے اہم قرضہ لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ملک کے باشندوں پر گرانی کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک طرف ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے دوسری طرف نئے نئے محصولوں کا بار بڑھتا ہے تیسرے ان کو مختلف فنڈوں میں چندہ یا امداد دینا پڑتی ہے۔ اس طرح ملک کا عام معیار زندگی پست ہو جاتا ہے بہت سی تعیضات اور تقریحات کم ہو جاتی ہیں اور باوجود ظاہری گرم بازاری اور رونق کے اندر ہی اندر گمن گمنا رہتا ہے جو نہ معلوم ساری محکم اور مضبوط عمارت کو کس وقت منہدم کر دے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ جنگ میں فتح بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہو سکتی اور قربانی جس قدر زیادہ اور بڑی ہوگی اسی قدر فتح و نصرت قریب اور آسان ہوگی ہذا حکومت سے لے کر ایک معمولی باشندہ تک کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اسی وجہ سے گرانی کے منائب کو نبی خوشی سے برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

محمد احمد سہنوار ایم۔ اے

استحصا

استحصا کا مفہوم انگریزی لفظ ایکسپلوئیشن (Exploitation) کے لئے استحصا کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ استحصا سے مراد دوسروں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ساہوکار اور کاشتکاروں کو لیجئے۔ ان کے حالات ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ ساہوکار بالعموم بڑے کھٹے ہوشیار معاملہ فہم اور مالدار ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے کاشتکار بالعموم انچھ اور غلط و غلامی ہوتے ہیں۔ آئے دن انہیں قرض کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور قرض بے بغیر چاہ نہیں لندا ساہوکار ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔ سود وصول کا حساب جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حاصل کردہ اصل کی قلیل مقدار تقویٰ ہی مدت میں بڑھتے پڑتے سود کی اجتماع کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاشتکار اس کی ادائیگی سے قاصر ہوتے ہیں اور یہیں سے ساہوکار کے ظلم و زیادتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ کاشتکار انتہائی محنت کے ساتھ ہل چلاتے ہیں۔ پانی دیتے۔ فصل کی نگہبانی کرتے اور جب وہ تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹتے اور غلہ صاف کرتے ہیں۔ غلہ کو بھی مکان میں منتقل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ساہوکار یا اس کے گمانشے آہو بچتے ہیں کہ کاشتکار غلہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور سارا غلہ ساہوکار کے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ساہوکار کو اس کی پروا نہیں کہ کاشتکار کے بیوی بچے بھوکوں مر رہے۔ اسے تو بس اپنے اصل اور سود کی ہی فکر ہوتی ہے۔ ساہوکار کے اس طریقہ کو عمرانی اصطلاح میں استحصا کہتے ہیں کیونکہ وہ کاشتکاروں کے غلامی۔ شدت احتیاج اور حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو مستند بناتا اور انہیں غلامی کے عین غار میں دھکیل دیتا ہے۔

اسٹھ استحصا کے متعلق رسکائین یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر عمرانیات ایڈورڈ اور تھرس نے زیادہ تحقیق کی ہے۔ استحصا کے مفہوم اور اس کی مختلف قسموں اور طریقوں کے متعلق اس نے اپنی کتاب اصول عمرانیات میں بحث کی ہے۔ اس میں مضمون کی تیاری میں مذکورہ کتاب سے مدد لی گئی ہے۔

وہی میشت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی قدر خوشحال کسان بھی غریب اور نادار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں جب کبھی کوئی مفلس اور حاجت مند مزدوران کے ہاں جاتا ہے اور قرض کی درخواست کرتا ہو تو کسان بہت ہی معمولی رقم قرض دے کر ان سے زیادہ مدت تک کام کرنے کا وعدہ دیتے ہیں۔ مزدور چونکہ مجبور ہوتا ہے لہذا جو بھی شرائط پیش کئے جائیں قبول کر لیتا ہے۔ سو روپیہ دے کر تین یا چار سال تک کام کرنے کا وعدہ لینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ غریب مزدور باہموش شادیوں کے لئے قرض حاصل کرتے ہیں اور نتیجہً حسب معاہدہ تین یا چار سال تک قرض ملتا ہے۔ غریب مزدور کے ساتھ ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کسانوں کا مزدوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی استحصال پر مبنی ہے۔

استحصال کا جذبہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک حیوانی جذبہ ہے جو انہماکی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب انسان استحصال پر اترتا ہے تو وہ دوسروں کی بھلائی یا برائی اور نفع و نقصان کا یا تو خیال ہی نہیں کرتا یا خیال کر لے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص جو جماعت یا جو قوم جس قدر زیادہ خود غرض ہوگی اس میں استحصال کا مادہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ہمدردی اور ایثار کے جذبات استحصال کے بالکل سناپی ہیں۔ یہ جذبات جس قدر زیادہ کارفرما ہوں گے استحصال کی قوت اسی قدر کمتر نظر آئے گی۔

استحصال کوئی نئی چیز نہیں ظلم و زیادتی اور حق تلفی (خود وہ معاشی ہو۔ سیاسی ہو یا معاشرتی) کا دوسرا نام استحصال ہے۔ استحصال کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ بنی نوع انسان کی تاریخ۔ تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور سے لے کر صد حاضر تک ہر زمانے، ہر دور، ہر خاندان، ہر قبیلہ اور ہر قوم میں اس کی میسوں مثالیہ طبع کی فرقہ واریت، طبقہ واریت، بین الاقوامی کشمکش، اپست تاجرانہ ذہنیت، Commercialization

اور اپست پیشہ ورانہ ذہنیت Professionalization جذبہ استحصال ہی کا نتیجہ ہیں۔ فرقہ وارانہ منافقتا طبقہ واری کشمکش اور بین الاقوامی لڑائیاں محض اس وجہ سے نمودار ہوتی ہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی، اور ایک قوم دوسری قوم کی حق تلفی کرنا چاہتی ہے۔ ایک فرقہ طبقہ یا قوم کی جانب سے حق تلفی کی کوشش اور دوسرے فرقے طبقے یا قوم کی جانب سے تحفظ اور دفاع کی جدوجہد اور بالآخر ایک

کے غالب آنے اور دوسرے کے مغلوب ہونے سے استحصال کے مواقع پھل آتے ہیں
 استحصال کی تین اقسام استحصال کی اہمیت پر غور کریں تو اس کا دائرہ بہت وسیع نظر آئے گا چنانچہ سہولت تقسیم
 کی خاطر استحصال کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔

- | | |
|-------------------|------------------------|
| (۱) جنسی استحصال | Sexual Exploitation |
| (۲) معاشی استحصال | Economic Exploitation |
| (۳) مذہبی استحصال | Religious Exploitation |
| (۴) انانی استحصال | Egotic Exploitation |

۱۔ جنسی استحصال: جنسی استحصال، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کا مقصد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ
 اٹھاتے ہوئے جنسی حظ اور لطف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذاتی عیش و آرام کی خاطر ایک سے زائد بیویاں
 رکھنا ان کے آرام و سہولت کا خیال نہ کرنا اور صرف لطف اندوزی کو اپنا مقصد قرار دینا جنسی استحصال پر
 مبنی ہے۔ اس لئے کہ مرد کو انشاء عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیاتی خواہشات کو پورا
 کرنا ہوتا ہے۔ لہذا یہاں رکھنے کا طریقہ بھی جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ لہذا یہاں سے نہ صرف محنت شاقی جاتی
 تھی بلکہ جنسی جذبات کی تکمیل کے لئے انھیں معاشی آسائشیں دینی پڑتی تھیں۔ اگرچہ غلامی کا طریقہ بہت بڑی حد
 تک سدود ہو چکا ہے تاہم اب بھی روپے اور پیسہ کا لالچ دے کر نفس و نادانوں کو شریف عورتوں
 کی عصمت دری کا طریقہ جاری نظر آتا ہے جو کہ استحصال کے سوا کچھ نہیں۔ قدیم زمانے میں غلامی کا اقامہ کے
 پیش نظر وہ پیسہ کے علاوہ خوبصورت عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں جن کا مقصد مغربیوں کی بے بسی اور بھاری
 لہ آس سے استحصال کی جو قسمیں بیان کی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان سے استحصال کے دائرہ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر ہم جنسی، مذہبی اور انانی استحصال کے بجائے معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کہیں تو تقسیم زیادہ منطقی اور
 اصولی ہوگی اور اس سے استحصال کی اولیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا جنسی، مذہبی اور انانی استحصال کو معاشرتی استحصال
 کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ سیاسی استحصال سے ایسا استحصال مراد لیا جاتا ہے جو سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کی
 خاطر کیا جاتا ہے۔ معاشی استحصال کا مقصد معاشی مفاد ہوتا ہے اور معاشرتی استحصال معاشرتی خود غرضی کی بنا پر ہوتا ہے۔

جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضعیف جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ اکثر مرتبہ خراج میں نہ صرف مال و اسباب بلکہ
 حین اور خوبصورت عورتیں بھی طلب کی گئی ہیں۔ بعض ایسے تاریخی واقعات بھی موجود ہیں کہ بادشاہ کے
 حکم سے ملک کی حسین ترین عورتوں کو نعل میں داخل ہو جانا پڑتا تھا عورتوں کی مرضی کے خلاف انہیں اس
 طرح عمل میں داخل کر دینا بھی جنسی استحصال ہی کی ایک شکل ہے۔

۲۔ معاشی استحصال: جس طرح ضعیف استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
 جنسی حظ و لطف حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح معاشی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے معاشی استفادہ
 کرنا ہے۔ دوسروں کو ان کی محنت کے حقیقی مبادلے سے محروم رکھنا اور اس سے خود استفادہ کرنا معاشی
 استحصال ہے معاشی استحصال کی بہترین مثال سرمایہ داری سے ملتی ہے سرمایہ دار غریبوں کی ناداری
 اور افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی
 آمدنی کا دار غریبوں کی محنت پر ہوتا ہے سرمایہ دار غریب مزدوروں کو ان کی محنت کا حقیقی معاوضہ نہیں
 دیتے۔ وہ جس قدر محنت کرتے ہیں انہیں اس سے کم معاوضہ ادا کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

معاشی استحصال صرف سرمایہ داروں تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی متعدد مثالیں
 ملیں گی۔ اکثر خاندانوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک کتا ماں ہے اور دس کھاتے ہیں دیگر اکین خاندان میں اسلئے
 محنت کرنا نہیں چاہتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں۔ لہذا ایسی صورت میں کتا جائے گا کہ
 غیر پیداوار اکین کتا ورنہ کا استحصال کر رہے ہیں۔

اکثر اصحاب میں خاطر مدارات کا ادہ بہت زیادہ ہوتا ہے لہذا بعض خود غرض دوست احباب ان
 کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر وقت ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور ان کی آمدنی کا قابل قدر
 حصہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے خرچ کر دیتے ہیں۔

بچہ بچوں کے بعض سست اور کابل مرد شخص اپنی بیویوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں و محنت
 کرتی ہیں اور یہ اس کا بیل کھاتے ہیں۔ وہ مصیبت اٹھاتی ہیں اور یہ آرام سے رہتے ہیں۔

افراد اور جماعتوں کے علاوہ قومیں بھی ایک دوسرے سے استحصال کرتی ہیں۔ جنگ اور لڑائی میں

باموم مساشی اغراض: مفادات کا فراہم ہوتے ہیں طاقتور حکومتیں کمزور حکومتوں پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں اور سن بسنے ان سے استحصال کرتی ہیں انھیں ان سے کوئی سروکار نہیں کہ مفتوح اور زیر اقتدار مالک کے باشندے غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتے ہیں کہ انھیں کس قدر دولت مل رہی ہے۔ خود غرضی کے تحت ہمدردی اور ایثار کے جذبات پائمال ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کریں تو معاشی استحصال کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ استحصال کی دوسری قسموں کے مقابل معاشی استحصال کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ہر طائفہ اسی کا عمل درآمد وسیع پیمانے پر نظر آتا ہے۔

۳۔ مذہبی استحصال :- مذہبی استحصال سے مراد کسی ایک مذہب کے افراد کا دیگر مذاہب کے افراد کو خود و اقتدار کے ذریعہ اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ مذہب کی اشاعت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک جبر و تشدد کے ذریعہ اور دوسرا بذریعہ تشہیر۔ دوسری صورت میں افراد کو تبدیل مذہب کا اختیار ہوتا ہے لیکن پہلی صورت میں وہ مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں جبر و تشدد کا عنصر شامل ہوگا وہیں استحصال کی صورت نمودا ہوگی۔ فاتح اقوام کا مفتوح اقوام کو اس امر پر مجبور کرنا کہ وہ ان کا مذہب اختیار کریں مذہبی استحصال ہے۔

۴۔ انانی استحصال :- اس سے مراد ایسا استحصال ہے جو اپنی انانیت۔ شان و شوکت اور عظمت و سطوت کو ظاہر کرنے کیلئے کیا جائے۔ اکثر وفاتر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آئین جب کبھی مثلیں اور کاروائیاں لے کر حاکم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انھیں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے کیونکہ کارروائیوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں اور انھیں بیٹھنے کی اجازت نہ دینا اور اسی کو اپنی بڑائی سمجھنا انانی استحصال ہے۔ اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے دوسروں کی تذلیل اور مصیبت کا خیال نہ کرنا انانی استحصال کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انانی استحصال کی تشریح کرتے ہوئے راس نے کوئی چہارہم کے باب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے محل میں درپیکہ دجے آکس ٹی Ox Eye کہتے تھے، تھا بادشاہ جب بیدار ہوتا یا آرام کرنے جاتا تو اس دو پیکہ سے گدڑا اور اپنے دغا و درباریوں سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اس درپیکہ کے پاس جمع ہو کر اس کے خوابگاہ کو جانے یا خوابگاہ سے باہر نکلے گا مشاہدہ کریں مطلق انسان بادشاہوں کے حالات زندگی سے انانی استحصال کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں شیخت کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور اس کو پرکار کرنے کے لئے وہ انانی استحصال

پڑا تھا ہے

استعمال کے مختلف طریقے۔ روزمرہ زندگی میں استعمال کے مختلف طریقے نظر آئیں گے ذیل میں ہم چند اہم طریقوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) بچوں کا استعمال والدین کے ذریعہ۔ موجودہ زمانے میں پیدائش برپائہ کبیر اور شین کے وسیع استعمال کی وجہ سے عورتوں کے ملاوہ بچوں سے کام لینے کے بھی زیادہ مواقع نکل آئے ہیں چنانچہ غریب اور نادار والدین غربت اور افلاس سے مجبور ہو کر کس بچوں کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں ملازم کر دیتے ہیں اور اس طرح خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں بعض والدین تو محض چھوٹے بچوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اولاد کی تربیت ان کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں قبل از وقت ذریعہ آمدنی بنانا استعمال ہی کی ایک نوعیت ہے چونکہ چھوٹے بچے کلیشہ والدین کے قابو میں ہوتے ہیں لہذا وہ ان کی ہدایت کے مطابق محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں غریب اور مظلوم گھراؤ میں بچوں کی کثرت کسی قسم کا بائیس تصور کی جاتی بلکہ زائد بچوں کی خواہش محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

(۲) عورتوں کا استعمال مردوں کے ذریعہ۔ روزمرہ زندگی میں ہیں اس کی میسوں شاملین ملتی ہیں کہ مرد عورتوں کی مجبوریوں کی سے ناجائز استفادہ کرتے ہیں۔ بالخصوص غیر تعلیم یافتہ اور غیر مذہب طبقوں اور جماعتوں میں بالعموم عورتوں کے ساتھ بہت زیادتی کی جاتی ہے۔ انھیں طرح طرح سے دکھ دیا جاتا ہے اور ان کے آرام کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں علی العموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت محض مرد کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے چونکہ عورت کی پرورش کا مار مرد کی کمائی پر ہوتا ہے لہذا مرد اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ بیچ طبقوں کے بعض خود غرض مرد ایک سے زائد بیویاں بھی اس غرض سے رکھتے ہیں کہ وہ آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں انھیں ملازم کر دیتے ہیں اور ان کی آمدنی خود حاصل کر لیتے ہیں۔

(۳) غریبوں کا استعمال امیروں کے ذریعہ۔ امیروں کے پاس دولت ایک ایسا اہم حربہ ہے جس کے

ذریعہ وہ غریبوں پر کامل تسلط جمالیتے ہیں اور ان سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دولت کے ذریعہ انھیں ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ ان سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ غریب عورتوں کی مصمت دری کجاتی ہے اور ہر طرح کی معاشی سیاسی اور معاشرتی زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ غریب کمزور اور بے زبان ہوتے ہیں امیروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مجبوراً ان کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں

(۴) اقلیت کا استحصال اکثریت کے ذریعہ۔ چونکہ اکثریت کی قوت زیادہ ہوتی ہے لہذا وہ اقلیت پر حاوی رہتی ہے اور اس سے استحصال کرتی ہے۔ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہایت شدید ہے۔ یہاں کی اقلیتیں اکثریت سے بدگمان ہیں۔ ان کا خیال ہے اگر حکومت اکثریت کے ہاتھ میں چلی جائے تو وہ ان کی حق تلفی کرے گی اور ہر طرح کے استحصال کو روا رکھے گی۔ لہذا وہ قبل از وقت اپنے حقوق کی حفاظت چاہتی ہیں۔

(۵) محنت پسندوں کا استحصال غیر محنت پسندوں کے ذریعہ۔ فقیروں کی قابل لحاظ تہ ادا لیے افراد کی نظر آتی ہے جو تنومند قوی بیکل اور کام کرنے کے قابل ہوتی ہے لیکن محض اس وجہ سے محنت کرنا پسند نہیں کرتی کہ سختی اور جفاکش لوگ اپنی کمائی کا ایک جزو اسے بطور خیرات دیدیتے ہیں۔ فقیروں کا یہ حوصلہ استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ مشترک خاندانوں میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر محنت پسند راہبین محنت پسندوں کے ہمارے زندگی بسر کرتے ہیں کام تو کر سکتے ہیں لیکن کام کرنا اس لئے نہیں پسند کرتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں۔

(۶) نادانوں کا استحصال ہوشیاروں کے ذریعہ۔ یہ ایک مسئلہ امر ہے کہ نادان اور فقیہ تعلیم یافتہ افراد ہوشیار اور تعلیم یافتہ افراد کے پنجے میں بہ آسانی آسکتے ہیں۔ ہندوستانی کانوں کو محض اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے میسوں جگہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دیہات میں ٹیل پٹاری اور ساہوکار منڈی میں دلال اور دفاتر میں منشی محرر اور وکیل ان سے استحصال کرتے ہیں۔ کسان انتہائی محنت سے غلہ پیدا کرتے لیکن جہالت اور لاعلمی کی بنا پر حقیقی معاوضہ سے محروم رہتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبہ کو بھیجے ہر جگہ ہوشیار اور چالاک افراد نادان اور سیدھے سادے افراد سے استحصال کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

۷، فیہ منظم افراد کا استحصال منظم افراد کے ذریعہ: منظم قوت اور طاقت کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ جو جس قدر زیادہ منظم ہوگا وہ اسی آسانی کے ساتھ فیہ منظم افراد پر اختیار اور تسلط حاصل کر سکے گا۔ تسلط اور اقتدار کے ساتھ ہی استحصال کے مواقع مل آتے ہیں۔

۸، مریدوں کا استحصال مرشدوں کے ذریعہ: مرید اپنے مرشدوں کے بہت معتقد ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھتے اور ان کا کما ماننا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں لہذا مرشد، پادری اور بہن اپنے عقیدت مندوں کی اس خصوصیت سے ناجائز طریق پر مالی اور دیگر قسم کا فائدہ حاصل کرتے ہیں جو استحصال ہی کی ایک قسم ہے

۹، مفتوحین کا استحصال فاتحین کے ذریعہ: جنگ اور لڑائی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ جماعتوں یا اقوام سے استفادہ کیا جائے۔ ہر زمانے میں مختلف اقوام سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کو ردارکھا ہے۔ فاتح اقوام کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوح اقوام پر ظلم و زیادتی ہی نہیں سمجھتیں بلکہ مفتوحین بے بس اور کمزور ہوتے ہیں اس لئے فاتحین کو ہر طرح کی آزادی اور استحصال کا موقع حاصل رہتا ہے۔

۱۰، حاکموں سے استحصال حاکموں کے ذریعہ: قوت و اقتدار کے ذریعہ ہر جائز چیز بھی روارکھی جاتی ہے محکوم اپنے حاکم کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس طرح حاکمین کے لئے ظلم و زیادتی۔ حق تلفی اور استحصال کے کافی مواقع مل آتے ہیں۔

استحصال کے قوانین | طبیعت یا فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے استحصال کی طرف زیادہ یا کم رجحان ہوتا ہے مثلاً (۱) لعنہ جو افراد طبعتاً سست کاہل اور تن آسان ہوتے ہیں ان میں استحصال کرنے کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف استحصال کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ وہ استحصال کرنے میں نہایت مستقل مزاج ہوتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ (۲) اسی طرح جن افراد میں ہمدردی اور ایثار کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ یا تو استحصال سے قطعی پرہیز کریں گے یا بہت کم اس کی طرف مائل ہوں گے (۳) جو افراد جن قدر زیادہ غور و خوض ہونگے وہ استحصال کی طرف اسی قدر زیادہ مائل ہوں گے۔ (۴) جن افراد میں ظلم و زیادتی کرنے کی بجائے ظلم و زیادتی سے کام لیا جائے گا وہ جن قدر زیادہ ہوگا اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے ذریعہ استحصال روارکھیں گے۔

۱۲۱ شورہم جنسیت استحصال کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے۔ شورہم جنسیت سے مراد وہ حالت ہے جس کی بنا پر ہم دوسرے افراد کو اپنا ہم جنس سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ جن افراد میں شورہم جنسیت پایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے مقابلاً محدود رہانے پر استحصال کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن افراد میں شورہم جنسیت نہیں پایا جاتا وہ ایک دوسرے سے وسیع پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ہم جنس افراد کے مابین فیہم جنس افراد کے مقابل محدود رہانے پر استحصال ہوتا ہے۔

۱۲۲ استحصال کی بدلتے ہوئے جنس اور ہم جنس جاعتوں اور گروہوں کی جدا جدا تکمیل عمل میں آتی ہیں جن جاعتوں یا گروہوں کے خادات ایک ہوتے ہیں وہ آپس میں متفق اور متحد ہو جاتے ہیں تاکہ دوسری جاعتوں یا گروہوں سے استحصال کریں یا انھیں اپنا استحصال کرنے سے روکیں۔ آجروں یا مزدوروں کی انجمنوں کا قیام استحصال یا استحصال سے بچنے کی خاطر عمل میں آتا جو مزدور جب دیکھتے ہیں کہ آجروں سے استحصال کر رہے ہیں تو وہ اپنی انجمن قائم کر لیتے ہیں تاکہ منافعت کی سبک جب آجری محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد کی وجہ سے مزدور تنگی قوت بڑھ گئی ہو تو وہ بھی اپنے استحکام کی خاطر علیحدہ علیحدہ انجمن قائم کرتے ہیں تاکہ منفعت طور پر مزدوروں کا مقابلہ کیا جاسکے۔

۱۲۳ استحصال اور قوت استحصال لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ جب تک کسی فرد، جماعت یا قوم میں استحصال کی قوت باقی رہتی ہے اس وقت تک استحصال کو برابر روا رکھا جاتا ہے لیکن جب یہ قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ استحصال سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب قوت اقتدار جاتا رہتا ہے تو انسان ظلم و زیادتی کو چھوڑ کر عجز و انکساری اور محبت و ملنساری کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ استحصال کے لئے استحصال کے موقعوں کا ہونا ضروری ہے۔ جب مواقع خالی ہوں تو استحصال کنندگان اپنے فعل سے کبھی نہیں چوکتے۔ جن افراد یا جاعتوں کا وہ استحصال کرتے ہیں ان کی زبوں حالی، آفت اور مصیبت سے پورے طور پر واقف ہوتے ہیں بظاہر ہمدردی بھی جھلکتے ہیں لیکن اس کے باوجود استحصال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

۱۲۴ بیرونی تسلط، اندرونی اور مقامی استحصال کے منافی ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی ملک پر دوسری قوم کا قبضہ اور تسلط ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اندرونی اور مقامی استحصال کرنے

وائے اداروں کے مواقع مارے جاتے ہیں۔ بیرونی قوت اندرونی اور مقامی استحصال کرنے والی مختلف اکائیوں کو یا تو ختم کر دیتی ہے یا کمیتہ اپنے زیر اقتدار لے لیتی ہے۔

۶، استحصال کی راہ میں جو افراد یا جماعتیں رکاوٹ ڈالتی ہیں اگر انہیں بھی اپنا شریک کار بنالیا جائے تو پھر استحصال علیٰ حالہ جاری رہ سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کر رہی ہے۔ اب اگر تیسری قوم مداخلت کرے اور اول الذکر کو استحصال سے روکنے کی کوشش کرے تو اس کا بہترین حل یہی ہوتا ہے کہ محل ہونے والی قوم کو بھی شریک استحصال بنالیا جائے۔ خاندانی زندگی سے قومی زندگی تک مختلف اداروں کے مابین اس قانون کا عمل درآمد عام نظر آئے گا۔

۷، بین استحصال (Open Exploitation) کے مقابل مخفی استحصال (Masked Exploitation)

زیادہ دیر پاؤں خطرناک ہوتا ہے مخفی استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جس کے حقیقی مضرات نام پورے طور پر واضح نہ ہوں۔ یہ استحصال بظاہر شدید نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں کرد و فریب کو زیادہ دخل ہوتا ہے، برعکس اس کے بین استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جو علانیہ طور پر کیا جائے اور جس کے اثرات پورے طور پر واضح ہوں مثلاً بچہ سوغہ کا چند روزہ ساج بین استحصال پر مبنی تھا۔ نادار شاہ کی لوٹ اور غارت گری بھی بین استحصال ہی پر مبنی تھی، برعکس اس کے پنچو ریا سے جا پانچوں کا ناجائز استغناء مخفی استحصال پر مبنی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر محکوم قوموں کی حقیقی صنعتی اور تجارتی ترقی کو روکنا اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی مصنوعات اور دیگر قسم کی پیداواروں کے لئے وہاں پر وسیع بازاریات فراہم کرنا یا اپنے مالک کے باشندوں کو قابل لحاظ تعداد میں غیر ضروری طور پر محض ان کی پرورش کی خاطر محکوم مالک میں ملازم رکھنا یا محکوم مالک کے باشندوں کو عام ادنیٰ و درنیٰ تعلیم سے محض اس وجہ سے محروم رکھنا کہ جاہل اور ان پڑھ محکومین سے بہت آسانی کے ساتھ استحصال کیا جاسکتا ہے، مخفی استحصال کی مثالیں ہیں کیونکہ اس تمام جدوجہد کا مقصد محکوم قوم سے مخفی طریق پر استحصال کرنا ہوتا ہے۔ استحصال کے یہ طریقے اس لئے زیادہ دیر پا ہوتے ہیں کہ ان کے مضرات ان سے عوام پورے طور پر واقف نہیں ہوتے۔ ان طریقوں سے بین استحصال کے مقابل زیادہ استحصال ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود استحصال

کی شدت ظاہر نہیں ہونے باقی مخفی استحصال کے لئے انگریزی میں اسکلڈ کپلائٹیشن کے جوائنٹ استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔

(۸) معاشرتی حالات جوں جوں پیچ در پیچ ہوتے جائیں گے اور جوں جوں ہماری زندگی کا انحصار ایک دوسرے پر بڑھتا جائے گا تو مخفی استحصال کے مواقع زیادہ نکلتے جائیں گے مثلاً ابتداً باہمی جھگڑوں اور مناجات کے تصفیوں کے لئے پنچایت کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اور اس میں استحصال کے زیادہ مواقع نہ تھے لیکن جب عدالتیں قائم ہوئیں بڑے بڑے عملے کام کرنے لگے منشی عمر، وکیل اور ہیر سٹرنو دار ہوئے اور معمولی سے جھگڑے کا فیصلہ مدتوں میں ہونے لگا تو ساتھ ہی ساتھ استحصال کے موقعوں میں بھی بہت زیادہ ہو گئی غرض مندوں کی شدت احتیاج سے فائدہ اٹھانے، رشوت لینے اور طرح طرح کے ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے بیسیوں مواقع نکل آئے۔ اگر طرز معاشرت سیدھا سادا ہوتا تو یہ سب مواقع دستیاب نہ ہوتے ایک وہ زمانہ گذرا ہے جبکہ لوگ اپنی غذا آپ تیار کر لیتے تھے لیکن تقسیم عمل کی وجہ سے جب ہوٹلوں کا طریقہ مروج ہوا اور ان کی کثرت ہوئی تو پست تا جرانہ ذمیت رکھنے والے مالکان ہوٹل کے لئے استحصال کے مواقع نکل آئے خالص گھی کے بجائے چربی استعمال کرنا تازہ گوشت کی بجائے باسی گوشت استعمال کرنا زعفران کی بجائے رنگ دینا باہمی اور بد بودار سالنوں کو دوبارہ گرم کر کے مرتبہ سالے دینا اور پھر تازہ سالنوں کی طرح فروخت کرنا۔ چائے میں افیون کا حقیف جزو شامل کرنا تاکہ گاہک مخصوص چائے کے عادی ہو جائیں اور صرف انھیں کے چائے خانے میں آئیں تاکہ ان کے لئے زیادہ منافع کمانے کے مواقع مہیا ہو سکیں یہ سب باتیں ہی لئے ممکن ہوئیں کہ ہماری اجتماعی زندگی زیادہ پیچ در پیچ ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے تقسیم عمل کے طریق کو ہماری معاشرت میں زیادہ سے زیادہ دخل ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ ہماری معاشرت کا ناگزیر عنصر بن گیا ہے موجودہ زمانے میں اس طریق کے وسیع ترین استعمال کی بدولت ہماری معاشرت خاندانی قبیلہ واری اور قومی مدارج سے گزرتے ہوئے بین الاقوامی رتبہ حاصل کر چکی ہے اب نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کا ایک خاندان دوسرے خاندان کا ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا یا ایک فرقہ دوسرے فرقہ دوسرے فرقے دوسرے کا

محتاج نظر آتا ہے بلکہ ایک قوم دوسری قوم کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح معاشرہ کا ایک رکن دوسرے رکن کی امداد کا محتاج ہوتا ہے قیمتم عمل کی درجہ بدرجہ ترقی کے ساتھ ساتھ استحصال کے دائرے بھی وسیع تر ہوتے گئے حتیٰ کہ شخصی استحصال خاندانی استحصال میں۔ خاندانی استحصال قبیلہ واری استحصال میں اور قبیلہ واری استحصال قومی استحصال میں تبدیل ہو چکا ہے۔ موجودہ جنگ محض استحصال کی جنگ ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کرنا چاہتی ہے لیکن دوسری قوم دفاعی تدابیر اختیار کرتی ہے نتیجہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری عام نظر آتی ہے استحصال کے یہ تمام مواقع معاشرتی زندگی کی پیچ در پیچ صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ بالخصوص مخفی استحصال کو موجودہ نظام معاشرت سے بہت تقویت پہنچی ہے۔

(۱۰) استحصال کو کلیتہً مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت تخریبی جذبہ ہے اور اس کی بدولت بحیثیت مجموعی عام خوش حالی متاثر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر قسیمی معنی میں اس کی کچھ کنی کرنا چاہیں تو بہ حالات حاضرہ یہ چیز ناممکن ہے کیونکہ جب تک انسان میں ذاتی مفاد و خود غرضی جالب منفعت اور مشغولیت کے جذبات موجود ہیں یا جس وقت تک بڑائی اور چھوٹائی، امیری اور غربی، قومی اور کمزوری، زبردست اور زیر دست، فاتح اور مفتوح اور حاکم و مملوک کے مدارج اور مراتب موجود ہیں اس وقت تک استحصال بھی باقی رہے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف تدابیر کے ذریعہ ہم استحصال کے مدد کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔

قوتوں کا توازن استحصال کا بہترین سدباب ہے۔ اگر ہم استحصال کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم معاشی معاشرتی اور سیاسی قوتوں کو متوازن کرنے کی کوشش کریں اور یہی استحصال کا مورد ترین حل ہے۔ یہ سوال کہ مختلف قوتوں میں کیونکر توازن قائم کیا جاسکتا اور اس کے بعد کس طرح استحصال میں کمی ہو سکتی ہے نہایت وسیع ہے لہذا ہم استحصال کی مابیت، اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

محمد ناصر علی ایم۔ اے (عثمانیہ)

رہط کے نصب العین کا ارتقا

تعلیم اخلاق نشوونما کے ساتھ ساتھ ایک خاص سماجی عمل بھی ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر نئی تعلیم کا سب سے پہلا پیغمبر بھی وہی شخص ہو جو ایک گمراہ سماج اور ہلکی ہوئی سیاست کو راستہ دکھانے اور سنوارنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں زمانے کے رخساروں سے کچھ حجاب اٹھا تا ہوں۔ لیجئے میں آپ کو آج سے ایک سو تیس سال پہلے کے جیوا میں لے آیا ہوں ایک گمراہی ساز رہتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام ترائن تراک روسو ہے۔ دونوں باپ بیٹے رات بھر کتابیں پڑھنے میں گزار دیتے ہیں۔ روسو آوارہ فطرت واقع ہوا ہے۔ اسے جنگل کی تفریح اور پاپیادہ سفر کرنے کا عشق ہے۔ روسو بیٹ پانے کے لئے ایک سرکاری وکیل کا غور بن گیا ہے۔ پیرس میں موسیقی کی تحریر کیا بیچتا ہے۔ بیس کے فرانسیسی سفیر کا سکریٹری بنتا ہے اور پھر ادیب بن جاتا ہے اور ایسا ادیب جس نے ایک پوری قوم اور اس کے ذریعے ایک پورے نظام تمدن و سیاست کا نریشہ عمل بدل دیا۔ روسو خود چوری کر کے ایک بے تصور لڑکی کو مجرم ثابت کر سکتا ہے وہ اپنا مذہب بدل کر ایک والدہ عورت سے صرف ضرورتاً علق بھی کر سکتا ہے اور خود اپنے بچوں کو اپنی زندگی میں یتیم خانہ بھیج سکتا ہے لیکن یہی شخص اور یہی روسو ایک وقت سماج اور سیاست کو دھڑکنے والا قلب دینے کے لئے ایک ہاتھ میں معاہدہ عمرانی کے نام سے ایک نئی توریث اور دوسرے ہاتھ میں "ایمیل" کے عنوان سے ایک نئی تعلیمی انجیل لے ہوئے زمانے کے سامنے آتا ہے۔ اس کی توریث کا پہلا جملہ ہے "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے" اور اس کی انجیل کی پہلی آیت کچھ یوں ہے "ہر چیز جو صانع قدرت کے ہاتھ سے آتی ہے اچھی ہوتی ہے لیکن ہر وہ چیز جو انسان کے ہاتھ میں پڑتی ہے خراب ہو جاتی ہے"

اب تک کوئی پیغمبر اپنے ساتھ بیک وقت دو الہامی کتابیں لے کر نہیں آیا تھا کچھ یونہی سمجھ لیجئے کہ لوگ روسو کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کی ایمیل کو آگ میں جھونکا اور اسے خود گرفتاری سے بچنے کیلئے

فرانس سے سوستان بھاگنا پڑا لیکن ایٹل سوستان میں بھی معاہدہ عمرانی کے ساتھ ساتھ ممنوع قرار دیدی گئی لیکن روح کی بکار نہ قانون و اسکا ہے اور نہ اس کا محمد آگ میں جل کر فنا ہو سکتا ہے۔ ایٹل کو نذر تاش کر دیا گیا تھا لیکن ایٹل آج ہمارے پاس ہے۔ بالکل وہی جو روسوں نے کھٹی تھی۔

ایٹل ایک بچہ ہے روسوں نے اسی عنوان سے بچپن سے لے کر بیس سال کی عمر تک اس کی تعلیم تربیت کا حال ایک کمائی کی فصل میں لکھا ہے فی الحقیقت ایٹل بچوں کا قرآن ہے روس سے پہلے بچے کو ایک چھوٹا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس پر مردہ بات جبر کی جاتی تھی جو بڑوں کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی تھی۔ روسوں نے سب سے پہلے بچہ کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کی زندگی، اس کی دلچسپیوں اور اس کے رجحانات پر زور دیا بالفاظ دیگر تعلیم کا خارجی اور مصنوعی عمل روس کے ہاتھوں زندگی کا فاضل اور فطرت کا عمل بنا۔ روسوں نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم فطری قوتوں کی ترقی کا نام ہے نہ کہ علم و فن کے حصول کا۔ روسوں نے (۱) انسان (۲) اشیاء (۳) فطرت۔ ان تین چیزوں کو تعلیم کا مرتبہ مانا ہے فطرت سے پیشتر انسانی قومی کا اندرونی نشوونما، جبلتیں، صلاحیتیں اور رجحانات مراد ہیں۔ اشیاء جو اس کے ذریعہ اس نشوونما میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور انسان، انسان کو زندگی کے تجربے سکھانے کا آلہ ہے۔

روسو تعلیم میں تسبیح کا کس حد تک مخالف ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ بچوں کے ہاتھ میں چاندی سونے کے جھنجھے دیکھنے کے بجائے وہ کسی بزرگ کی ایسی شاخ دیکھنا چاہتا ہے جس میں گلگڑوں کے بجائے سوکھے ہوئے بیج بکھتے ہوں۔ روسو کے قول کے مطابق پانچ سے بارہ سال تک کی عمر کا زمانہ زندگی کا سب سے نازک زمانہ ہے اس زمانہ میں جو اس کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے، جو کچھ انسان کے ذہن میں داخل ہوتا ہے وہ جو اس کے ذریعہ داخل ہوتا ہے عقل و خرد کا پہلا روپ جو اس کا روپا ہے یہیں سب سے پہلے جن استادوں سے فلسفہ کا سبق ملتا ہے وہ ہمارے پاؤں ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہیں اور ہماری آنکھیں ہیں۔ اس سے آگے کی منزل میں روسو ایک حرفے کی تعلیم بھی تجویز کرتا ہے۔

کما جا سکتا ہے کہ روسو کا مام اصول بذریعہ تجربہ ہے کوئی بات بچے کو اس لئے نہ جاننے دو کہ تم نے اسے بتائی ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے اسے خود سمجھا ہے۔ اسے سائنس کی کتابیں نہیں ہے۔ اسے

سائنس تحقیق کرنا ہے..... میں کتابوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ ہیں ایسی چیزوں کے متعلق بات چیت کرنا سکھادیتی ہیں جن سے فی الحقیقت ہم واقف نہیں ہیں۔

دوسو ذہن وحواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسم سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی کمزوری تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ”کچھ جتنا کمزور ہوگا اسی قدر دوسروں پر حکومت کا خواہشمند ہوگا اور جتنا مضبوط ہوگا اسی قدر فرائز بردار ہوگا۔ تمام نفسانی خواہشات کمزور جسم کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور تمام خوابیاں کمزوری کے باعث وجود میں آتی ہیں“ دوسو نے جسمانی تربیت کے لئے ورزشیں تجویز کی ہیں۔ لیکن یہ ورزشیں عموماً وہی ہیں جو کبھی اہل اسپارٹا نے وضع کی تھیں اور جنہیں فلاطون نے بھی اپنی ریاست کے تالیفوں کے لئے قابل قبول سمجھا تھا۔

ایہل سے جو مختصر اور ضروری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو جانا چاہئے کہ دوسو بچوں اور لڑکوں کو اور الفاظ پر عمل کو قابل ترجیح سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ذہن کے ساتھ ساتھ حواس اور جسم کی تربیت بھی اتنی ہی اہم تھی۔ یہ ضرور ہے کہ دوسو نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا جس سے ایک ہی چیز ذہن، حواس اور جسم تینوں کی ہم آہنگ تربیت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ اس نے حورنہ کی تعلیم بھی تجویز کی ہے لیکن حورنہ سے کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا اس کا مقصد نہیں تھا۔ اس نے ایہل کو حورنہ اس لئے سکھایا تھا کہ وہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھے لیکن باوجود اس کے اس کی پیغمبرانہ اور مجتہدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس نے فضا میں ایک آواز پیدا تو کی اور اس کی بدولت ہم نے۔

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اور دیکھا تو ہوا

ابھی میں نے عرض کیا کہ دوسو کا سب سے بڑا کام یہی تھا کہ اس نے فضا میں ایک آواز تو پیدا کی۔ اب اگر آواز میں خلوص و صداقت ہے تو اس آواز کو نئی قوتیں دے کر اسے پھیلانے والے بھی پیدا ہو ہی جاتے ہیں چنانچہ گو غور و سو کے وطن میں روسو کی آواز نہ سنے جانے کے برابر سنی گئی اور انگلستان میں بھی عقیدہ مندوں کی کثرت کے باوجود کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو سکا لیکن جرمنی میں روسو کے نئے تعلیمی اصولوں کو جامہ پہنانے کی کوشش ضرور کی گئی۔ بیڈو نے (۱۷۷۳ء تا ۱۷۹۷ء) جہاں روسو سے متاثر ہو کر صحیح مذہب اور

صح اخلاق کے لئے جہاد کیا وہاں اس نے تعلیمی اصلاح کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ میٹر و نے نہ صرف تعلیمی معاملات میں اختیار رکھنے والے لوگوں اور ماہرین کے لئے بچوں کی تعلیم سے متعلق پوری چار جلدیں لکھ والیں، بلکہ اس نے تعلیم بذریعہ عمل کے اصول پر بچوں کو مادری زبان اور لاطینی پڑھا کر تجربہ بھی کیا اور پہلی مرتبہ ثابت کیا کہ اس طریقہ سے بچے کم دقت میں اور بغیر گرانی محسوس کئے ضروری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ میٹر و نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بچوں کا ادب پیدا کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر روسو نے اصول کی بنیاد ڈالی تھی تو میٹر و نے اسی اصول کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ میٹر و کی کوشش کمان نک کامیاب تھی اس کا اندازہ اس سے لگایے کہ **سائنس** میں جرمنی میں ایک مدرسہ **نٹن** تھروپی نم کے نام سے کھلا اور اس کی مثال میں اور بہت سے مدرسے بھی کھلے۔ ان تمام مدرسوں کا نصب العین اصلاحی تھا۔ ان مدرسوں میں بچوں کو کچھ ہی سمجھا جاتا تھا۔ زبان کی تعلیم تو مادے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ بول چال کے طور پر دی جاتی تھی ساتھ ہی ساتھ جسمانی تربیت کی اہمیت بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم میں جسمانی فعالی کے ساتھ تال ٹکر کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ حرفہ بھی تعلیمی اور سماجی اغراض کی بنا پر فریک تعلیم تھا۔ تصویروں اور چیزوں کے ذریعے اسباق پر زور دیا جاتا تھا اور مدرسہ اور مدرسہ کی چار دیواری سے باہر کی زندگی میں ربط اور تطبیق کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک بڑی تصویر کا پہلا خاکہ ہی تھا۔ ابھی رنگ کاری سے پہلے اصلی خطوط ہی کو زیادہ نمایاں اور روشن کرنے کی ضرورت تھی یہ کام سوئٹزرلینڈ کے ایک مصلح پرست **ایڈوارڈ سائمن** نے کیا۔ ہاتھوں ہونا تھا پتا لوزی کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اور اپنی ساری قوتیں تعلیم کے تجربے پر صرف کیں۔ اس نے بننا تو چاہا تھا پادری، کیل، کسان اور نہ جانے کیا کیا لیکن قدرت کو اسے درس بنانا مقصود تھا۔ اس نے خود اپنے بچے کا مطالعہ کیا اور اس پر تعلیمی تجربے کئے۔ اس کے بعد غریبوں اور غفلوں کے بچوں کے لئے ایک صنعتی مدرسہ چلایا۔ اس مدرسہ میں زراعت اور کاشت و فصل کی قسم کے کام سکھائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رہتا تھا لیکن اس مدرسے میں دستکاری ذریعہ تعلیم نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو ہمارا مقصد پتا لوزی کے ہاتھوں ہی پورا ہو جاتا۔ اس کی کو چھوڑ کر پتا لوزی ہمارے لئے

نصیب اللہین سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ آتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس نے تسلیم کو ساج کی اصلاح کا آلہ سمجھا ہوا اور مدرسہ کو بچے کے لئے دوسرا گھر بنانے کی کوشش کی ہو بلکہ اس نے مشاہدہ کو تدریس کی بنیاد بنا دیا اور اشیا کے ذریعہ تعلیم عام کر دی اس طرح اس نے ذہن اور حواس کی ہم آہنگ تربیت کا پورا پورا التزام کر دیا۔

حواں اور ذہن کی نشوونما میں جسم برابر کا حصہ دار فرد بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں بنا فرد بل نے سب سے پہلے ذہن اور حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی زندگی عضلاتی یا جہانی فعالی کو بھی جگہ دی اور اسی چیز کو حواس کی نشوونما اور ذہنی تعلیم دونوں کا ذریعہ بنایا۔ فرد بل نے نجی طور پر بچوں کو پڑھنا تو ۲۳ سال کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا اور اس ابتدائی تجربے کی کامیابی سے متاثر ہو کر اس نے ۳۴ سال کی عمر سے اپنا مدد تعلیمی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک کسان کی جمونپڑی میں پانچ بچوں کے ساتھ سے ایک مدرسہ کھولا۔ اس مدرسے کا نام سنیں گے آپ؟۔ بہت شاندار نام ہے۔ ”یونیورسل جبرسن ایجوکیشنل ٹیوشن“۔ کسان کی اس جمونپڑی۔ نہیں میں نے غلط کہا اسی ”یونیورسل جبرسن ایجوکیشنل ٹیوشن“ میں فرد بل نے اس طریقہ تعلیم کی بنیاد ڈالی جو ”بالک گھر“ کے نام سے مشہور ہے۔ فرد بل کے نزدیک تعلیم کا پورا عمل بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی شخصیت کے آزادانہ اظہار کا عمل ہے۔ وہ ہر بچہ کو ایک دیوتا کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اپنی دنیا بنائے اور دیکھے کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ ہر بچہ کو صحیح معنی میں ایک خالق کا درجہ دینا چاہتا ہے اور اس کی قسمت کو اسی کے افعال و اعمال سے معنون کرنا چاہتا ہے۔ اس مدعا کو ذہن میں لئے ہوئے فرد بل نے ان کی رنگین گیندوں، لکڑی کے استواؤں، کمبلوں، گولوں اور دوسری ٹٹلوں کے ٹکڑوں سے بچوں کے لئے کچھ خشے تجویز کئے ہیں۔ یہ خشے بتدریج آسان سے مشکل ہوتے جاتے ہیں اور بچے اپنی خود فعالی ہی میں اپنے ذہن کے نشوونما کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں اور انہیں وہ ذریعے مل بھی جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کا اصول جمونپڑی حرکت ہے۔ بچہ کو اگر آپ کچھ سکھانا چاہتے ہیں تو اسے خوش رکھنا ضروری ہے اور خوش رکھنا کیا معنی رکھتا ہے یہ سطر ہے اے جیکین کے الفاظ میں سمجھئے۔ ان کے الفاظ اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں ترجمہ کر کے آپ کو ان کے صحیح لطف سے محروم

کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پہلے خود پوچھتے ہیں :-

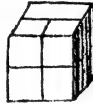
What is happiness for the child ?

اور پھر خود جواب دیتے ہیں :-

It is the free functioning of all faculties. It is action.

It is expression. It is finding one's self. It is coming into one's own. It is the flight of the arrow winging its way to the mark.

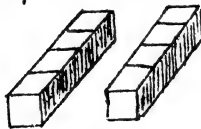
ذہن کے بچے کو وہ خوشی پوری طرح حاصل ہے جن کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے۔ وہ کسی وقت لکڑی کے یہ آٹھ ٹکڑے



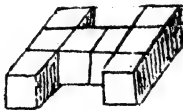
سے کر بیٹھا ہے اور ایک مصوم فرشتہ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے کہ ان سے کچھ بن بھی سکتا ہے یا نہیں۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں کو مختلف صورتوں میں لگا کر رکھتا ہے۔ اس نے آٹھوں ٹکڑے پہلے ایک قطار میں لگائے۔



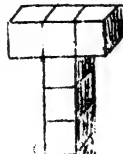
لیکن یہ چیز کچھ اسے بھی نہیں۔ اس نے پھر ترتیب بدلی۔ اس نے چار چار ٹکڑوں کی دو قطاریں بنائیں۔



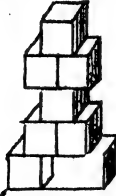
یہ کچھ بہتر صورت معلوم ہوئی۔ اس نے اور سوچا۔ اس مرتبہ اس نے تین تین ٹکڑوں کی دو قطاریں بنا کر باقی کے دو ٹکڑے ان کے بیچ میں رکھ دیے



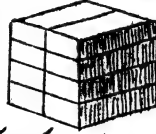
ذہن ہنوز مصروف ہے۔ لگا میں ہنوز نئے خاکے کی منشا ملی ہے اور ہاتھ ہنوز مضطرب ہیں۔ اس نے اس دفعہ تین ٹکڑے ایک قطار میں رکھے اور چار اس کے نیچے لگا دیے۔



لیکن اس مرتبہ ایک ٹکڑا بچ رہا یہ اس کا کیا کرے؟ تو تخیل نے پھر ایک نئی شکل اختیار کی۔

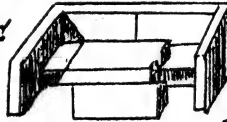


یہ شکل نئی تو ہے اور اس کے بنانے والے کو پسند بھی آئی لیکن یہ چیز آخر ہوئی کیا؟ اس انجن سے وہ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے فوراً لکڑی کے



یہ ٹکڑے لے

اور ذہن کو وہ اتنا دوا یک پیچ ذرا زور کے دے ڈالے۔ ایک خاکر بنایا بگاڑ دیا، دوسرا بنایا اور بگاڑ دیا۔ بالآخر ایک اور نئی چیز بنی گئی۔ اور ہمیں اس کی جنت کھل ہو گئی۔



یہ ایک بادشاہ کے بیٹے کا تخت ہے۔ اب یا تو وہ اس بادشاہ کی کمائی اپنے ذہن سے نکالے گا، یا کسی سے سنے گا وہ خود بادشاہ بنے گا، خود تلوار ہاتھ میں لیکر جنگ کرے گا۔ خود مشکت کا خون اور فتح کا غرور محسوس کرے گا۔ امیری اور غریبی، ظلم اور انصاف، بھلائی اور برائی کے سارے خاکے اسے اسی تصویر میں نظر آئیں گے۔ پھر کسی فرصت میں وہ کاغذ سے اس بادشاہ کے کپڑے بنائے گا اور مٹی سے اس کے کمانے پینے کے برتن بنائے گا۔ الغرض جب تک وہ اس بادشاہ کی زندگی اپنی زندگی نہیں بنائے گا اس وقت اسے چین نہیں آسکتا۔

بعض لوگ کہیں گے کہ وہ صاحبِ اہل بچوں کو انھیں چونچلوں میں بھلائے رکھے اور پٹھنا کھنا خاک بھی نہیں لیکن ذرا غور کیجئے۔ کیا اس کے آٹھ لکڑی کے ٹکڑوں کا حساب چار اور چار آٹھ، تین اور تین چھ اور دو آٹھ اس کے لئے حساب کا پہلا سبق نہیں ہے؟ وہ بادشاہ کی کمائی سن کر اسے اپنے دوستوں کو بتانے کی کوشش کرتا ہے کیا یہ کمائی اس کے لئے زبان کا پہلا سبق نہیں ہو سکتی؟ وہ مٹی کے برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اور کیا ہے اگر سائنس کی بنیاد نہیں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ بچہ یہاں اپنی اچھ کا بادشاہ ہے وہ آپ کے احکام کا غلام نہیں۔ وہ ابھی سے اپنا ذہن اور اپنے ہاتھ پاؤں کا استعمال کرنا سیکھتا

ہے اور جس وقت وہ معروف ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا وجدان — جسم، حواس اور ذہن سب ہی مصروف ہوتے ہیں اور مکمل انسان اسی طرح پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح پیدا کیا جاتا ہے۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے کہ یہاں بچے کے مثال اور مصروفیتیں صرف اشارتی (Symbolic) حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یہ کہہ کر سمجھ لیں کہ جو بچہ اون کی گیندوں پر شیشم کے فیتوں اور پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے انچی دنیا بنا سکتا ہے وہ اینٹ پتھر اور غیر صاف کی ہوئی لکڑی سے بھی کوئی عالم پیدا کر سکے گا۔ ہم یہ کہہ کر سمجھ لیں کہ جو بچہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ابلے کپڑے پہنے لکڑی کے بھین مثلثوں کو ترتیب دے کر کوئی ڈیزائن بنا سکتا ہے وہ دنیا میں — گردوغبار اور مصیبتوں کی دنیا میں بھی — اپنا اور دوسروں کا مقام پہچان سکے گا یہ خواہاں کی دنیا ہے، یہ تصورات کا عالم ہے اور اس لئے کہیں نہ ہم بچوں کے مثلثوں اور ان کی مصروفیتوں کو دنیا، سماج اور زندگی سے براہ راست وابستہ کر دیں بچے کے لکائے پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے ایک فرضی مکان کیوں بنائیں۔ وہ جی جی ایٹ، ہٹی اور لکڑی سے چھوٹا ہی ساسی لیکن اصلی مکان کیوں نہ بنائیں۔ زندگی میں بے شمار خدا کے بندوں کو انٹیں اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے ہمارے بچے بھی انٹیں اٹھانے میں کیوں بھگت محسوس کریں۔ دنیا میں لاتعداد انسانوں کو ہنسی میں ہاتھ پاؤں ڈالنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کیا ہوا اگر ہمارے بچوں کے ہاتھ پاؤں بھی گاہے میں بھر جائیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ لکڑی کاٹ کر اسے صاف کرتے ہیں اس لئے کوئی حرج نہیں اگر ہمارے بچے بھی یہ کام کریں انھیں در سے نکل کر ہر حال دنیا میں جانا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس بزم کبر و ناز میں کس کو کہاں جگہ ملے گی۔ اس لئے بچوں کے کردار کی ایسی داغ بیل کیوں نہ ڈالیں جو انھیں ہر مرکز پر کامیاب انسان بنا سکے۔

بالک گھر پر کچھ بھی عقیدہ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ماہر تعلیم جان ڈیوی کی بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو شکر و جہی ہوئی کو نین کی گولی کھلانے سے بہتر یہ ہے کہ اسے کو نین کی سادہ گولی دیجائے تاکہ کھانے والے کو معلوم ہو کہ کو نین کا ذائقہ بالآخر ہوتا کیا ہے۔ اسی لئے تعلیم کے سلسلے میں ڈیوی ان مثلثوں کو ترجیح دیتے ہیں جو تمدنی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ تمدن کی بنیادیں اس وقت سے بڑی ہیں جس وقت ہے انسان نے آگ جلانا، گھر بنانا، کاشت کرنا، لکڑی بنانا وغیرہ شروع کیا

ہے اس لئے مدرسہ میں اسی قسم کے مشغلوں کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ اس طرح ہر اس بچے کے لئے جو اس راہ پر کام کرے گا۔ جگہ جی آپ بیتی بن جائے گی پھر تاریخ بتائی ہے کہ علم ان نتائج ہی کی منظم صورت ہے جو انسان کو عمل کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں زراعت کو ایک مرتبہ مددوں علم کی صورت اختیار کئے تھوڑا ہی زمانہ گزر رہا ہے لیکن بحیثیت ایک اہم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے۔ اس لئے ہمارے طلبہ بھی وہ ہی راستہ کیوں نہ اختیار کریں جس پرنسپل انسانی جبل چکی ہے۔

اس اصول کے ماتحت جو طریقہ تعلیم وضع کیا گیا ہے وہ منصوبے کا طریقہ تعلیم ہے بچے اپنی پسند سے کوئی منصوبہ منتخب کر لیتے ہیں وہ مدرسہ میں میلا کرنا چاہیں یا دوکان کھولنا چاہیں یا میلہ کرنا چاہیں۔ انہیں اپنی راہ میں لکھنے پڑھنے، حساب لگانے، تاریکی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی جہاں جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے وہ بڑے شوق سے اپنے کام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور کسی ضرورت کا سامنے آنا اور شوق کے ساتھ اس کا حل سوچنا ہی ذہنی تربیت اور باقی رہنے والی تعلیم کی بنیاد ہے۔ علم فی الحقیقت بچوں کے لئے کبھی شعوری مقصد نہیں بن سکتا ہے۔ ان کے لئے علم کو انہیں کے مرغوب مشغلوں کا نتیجہ ہونا چاہئے۔

لیکن منصوبے کے طریقہ میں تین باتیں ذرا کھٹکنے والی ہیں۔ اول یہ کہ سال بھر ایک منصوبہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے ایک دشواری تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ نصاب بعض وقت صفائی کے ساتھ منصوبی مشاغل سے مربوط نہیں ہو جاتا۔ یہ دشواری ہندوستانی مدرسوں کے لئے خاص دشواری ہے کیونکہ یہاں منصوبہ نصاب کے لئے ہے نصاب منصوبے کے لئے نہیں بلکہ ایک منصوبے کے بعد دوسرا منصوبہ اور دوسرے منصوبے کے بعد تیسرا منصوبہ منتخب کرنا ممکن ہے بچوں کی توجہ کے انتشار کا باعث ہو اور اس دوسری شکل سے ایک اور تیسری غامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ بچہ متعدد قسم کے کام کرتے رہنے کے باوجود کسی ایک کام میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔

منصوبے میں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی ماہرین تعلیم نے منصوبے کی حدود کو اتنا وسیع کیا کہ ایک طرف تو وہ پورے سات سال کا منصوبہ بن جائے اور دوسری طرف اس کے ذریعہ دیا ہوا

نصاب بھی زیادہ سے زیادہ پڑھایا جائے اور سب سے زیادہ یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے تک کسی ایک ایسی دستکاری میں اتنی مہارت حاصل کرے جو اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو ذریعہ معاش بھی بن سکے اور یہ بات حاصل کی گئی ہے مختلف مشغلوں کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے حرفے کو تعلیم کا ذریعہ یا مرکز بنا کر لیکن دیکھنا ہے کہ کیا کوئی ایک حرفہ مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بن سکتا ہے اور کیا ہمیں خود کسی ایک حرفے کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہئے۔

حرفوں کی اضافی اہمیت اور ان سے ربط کا مسئلہ - حرفوں کو سب سے پہلے نصاب میں داخل کرنے کا سہرا فن لینڈ کے سر ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی سوئڈن، جرمنی، امریکہ وغیرہ ممالک نے بھی حرفے کی تعلیم کو بچوں کے مدرسوں اور استادوں کے مدرسوں دونوں میں شامل کیا لیکن حرفے سے بچوں کے جمعی رجحانات کی تسکین کے علاوہ اسے اقتصادی اور خالص تعلیمی غرض سے اختیار کرنا بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم بنانے والوں کا امتیاز ہے۔ بنیادی قومی تعلیم نے یوں تو ہر اس حرفے کی اجازت دی ہے جو تعلیمی صلاحیت رکھتا ہو اور زندگی کے زیادہ سے زیادہ دائروں کو چھو کر گزرتا ہو لیکن تین حرفے بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے خود بھی تجویز کئے ہیں۔ وہ تین حرفے ہیں۔ باغبانی و زراعت، کاتنے بننے کا کام اور لکڑی گتے کا کام۔ ان حرفوں کو تجویز کرتے وقت یقیناً اس کمیٹی کے سامنے کل ہندوستان کا ماحول اور سماجی نظام تھا باغبانی پہلی پانچ جامتوں کے لئے لازمی حرفے کے طور پر نصاب میں داخل ہے اور اسے عام سائنس کے نصاب میں بھی پوری پوری جگہ دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی برہا کو چھوڑ کر چوتیس کروڑ کی آبادی کا ۴۳ فیصدی دیہات میں رہتا ہے اور اس حصہ کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ ہندوستان کی کل قابل کاشت زمین ۲۲۷،۸۶۹،۹۷۲ ایکڑ ہے یعنی ایک فرد کے لئے ایک ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان کو بمبھوکوں مرنے سے بچنا ہے تو اسے اپنی زمین کو زیادہ سے زیادہ اختیار اور بہتر سے بہتر طریقہ پر جوتنے ہونے کی کس قدر ضرورت ہے۔

کاتنے بننے کی اہمیت ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ہے کہ ہم اندازاً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کپڑے کی خرید کے سلسلے میں باہر بھیجتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا نیل ہے اور دوسری طرف یہ بھیانک

حقیقت ہے کہ ہماری آمدنی کا اوسط پینتالیس روپیہ سالانہ یعنی ایک آنہ گیارہ پائی یومیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کل ہندوستانیوں کی آمدنی ہم سب پر یکساں بانٹ دی جائے تو محل سے چنے اور صرف چنے کمانے کو مل سکتے ہیں۔ انہیں بھی جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور موٹروں میں چڑھتے ہیں اور انہیں بھی جو پنہروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور پاپا دو پلٹے ہیں۔ وہ تو یوں کہنے کہ دولت کی تقسیم کے غلط ہنگاموں میں نہ ہیں غلطی نظر آتی ہے نہ اس کی صحیح پکار سنائی دیتی ہے۔ یہ قومی افلاس کسی حد تک دور ہو سکتا ہے اگر ہم کم از کم وہ ساٹھ کروڑ روپیہ ہی اپنے اس مزدور اور اپنے اس غریب کے لئے روک لیں جو کام کرنا چاہتا ہے اور جسے کام نہیں ملتا یہی نہیں بلکہ ہمارا دو کسان بھی جس کا خون ہمارے تمدن کے خاکے میں رنگ و نور پیدا کرتا ہے۔ وہ کسان بھی فاقوں سے بچنے کے لئے لٹکلی کا سہارا لے سکتا ہے۔ اس لئے کاتنے بننے کا کام ہماری دیہی زندگی کو بھی زیادہ خوشگوار بنا سکتا ہے اور فی الحقیقت اسی میں ہماری نجات ہے۔ نیگور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ”دیہات عورتوں کی انند ہیں جن کی بدولت قوم کی گود آباد رہتی ہے“

باغبانی و زراعت اور کتائی بنائی کے حرفوں کی قومی ضرورت مسلم لیکن لکڑی گتے کے کام کی کوئی اتنی وسیع اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی ہاں ان لوگوں کے بچے جنہیں باغبانی اور زراعت سے کوئی واسطہ نہ پڑ سکے اور جنہیں کاتنے بننے کے کام میں کوئی سیاسی یا اقتصادی تکلف محسوس ہوتا ہو وہ ضرور اس حرفے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اقتصادی اور قومی حیثیت سے نہ سہی لیکن اس حرفے میں کاتنے بننے کے کام کے متبادل میں ایک بڑی برکت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے تنوع پسند طبیعتوں کے لئے اس حرفے میں تسکین کا بہت سامان موجود ہے۔ کاتنے بننے کے کام کی بکرنگی شاید بعض وقت تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے بچوں کو روز دہتی کھلی۔ وہ ہی روئی۔ وہ ہی دھاگا۔ وہ ہی انداز نشست وہ ہی ہاتھ کا ایک مخصوص سمت میں پی ہوئی اور پنچائی تک اٹھنا اور کھلی کی گھوں گھوں کی آواز گراں اور بہت گراں گزرے مکن ہے آپ یہ سوچیں کہ بچے اس کام کا مقصد سمجھ لیں گے اور اس لئے اگر کبھی غمی محسوس ہوئی بھی تو وہ اسے دوا کے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیں گے لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ بچہ جب تک کم از کم نو سال کا نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے کسی مقصد کے سمجھنے یا کسی مقصد کو حاصل کرنے کے شوق کی امید

نہیں کی جاسکتی۔ یہ اندیشہ گاؤں کے بچوں کی زندگی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گاؤں میں بچے سادہ زندگی اور تنوع سے ایک حد تک بے نیاز ماحول کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے عملی کام کی کمرنگی کو بھی اسی طرح برداشت کر لیتے ہیں جس طرح کوئی شخص گردش روز و شب کا عادی ہو جائے۔ شہر کے بچے البتہ تنوع کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں۔ ان کے ماحول میں نئے نئے خاکے ذرا جلدی جلدی بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس حرفے کو بھی پسند نہ کریں جو ان میں بس ایک ڈگر پر لے جائے۔ ہر روز ہر مہینے اور ہر سال۔ اسی لئے کاتنے بننے کے حرفے میں بچوں کو اپنی شخصیت کے انظار کا بھی زیادہ موقع نہیں مل سکتا ہے۔ باغبانی کرنے والا بچہ ہر مرتبہ نئی قسم کی کاریاں بناتا ہے۔ لکڑی، گتے کا کام کرنے والا ہر مرتبہ نئی چیز پیدا کرتا ہے اور نئے ڈھنگ سے لیکن کاتنے میں سوائے اس کے کہ کوئی بچہ اپنے سوت کا نمبر گننا، بڑھالے اور تو کچھ نہیں کر سکتا۔ قسمتی سے سوت کا نمبر گننا بڑھانا بھی اکثر بچوں کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے تنوع اور انظار شخصیت کے موقعوں کے اعتبار سے کاتنے دھتے کا حرفہ ذرا گھٹیا درجے کا حرفہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بننے کے کام میں خود نمائی، انظار شخصیت اور عالی تکنیکی قوتوں کے استعمال اور نشوونما کا بدرجہ اتم موقع موجود ہے لیکن بننے کے کام کے لئے ایک بچے کو صرف دو سال اور وہ بھی مدرسے کی زندگی کے آخری دو سال ملتے ہیں۔ ایک اور بات جو باغبانی اور گتے لکڑی کے کام کی حایت میں اور کاتنے کے خلاف کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر حرفوں کے مقابلے میں آخر الذکر حرفہ جو اس کی تربیت اور جسمانی اعضا کی نشوونما کے اتنے زیادہ امکانات نہیں رکھتا۔ باغبانی میں جو اس کی تربیت کے لئے صرف ہر وقت رنگ و نور اور نغمہ و ترنم کی ایک جنت موجود ہے بلکہ اس میں مضائقہ اور جسمانی غالی کا ہر مناسب و متوازن موقع ہے کیاری کے کنارے بیٹھے بیٹھے سوکھی پتیاں پٹنے سے لے کر چاؤڑے سے زمین کو کھودنے کا سخت کام تک کیا جاسکتا ہے گتے لکڑی کے کام میں بھی یہ تمام برکتیں موجود ہیں لیکن وہ اس جالیاتی لٹا سے محروم ہیں جو باغبانی کو ہر اعتبار اور ہر پہلو سے ممتاز بناتی ہے۔ ہانکلی ذہن کو گلیان و حیان کا مادی بنا سکتی ہے۔ جہاں خیال چوکا اور دھاگا لٹا اور کائنات ہاتھوں سے گئی۔ ایس نے ایک مرتبہ ڈاکٹر عبد المجید (مصنف پستاندازی) سے یونہی پوچھا۔ ”آپ کا کھلی کے متعلق کیا خیال ہے؟“ فرمائیے گئے۔ ”مڑے مڑے

کی چیز ہے۔ دماغ کو کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو لیکن جہاں تکلی نے دو ایک جکر کھائے اور معلوم ہوا کہ کمالات
نظر کے سامنے گھوم رہی ہے! لیکن یہ ایک بالغ ذہن ہی کی صلاحیت ہو سکتی ہے اور اگر مان بھی لیا جائے
کہ تکلی کمالات اور دہاگا زرازل کی ایک کرن بن سکتا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں مستقبل کے ہندستان
کے لئے ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو برگد کے پیر کے نیچے بیٹھے جلدوں کا انتظار کیا کریں یا ایسے شہریوں
کی ضرورت ہے جو کارگرہ حیات میں پھاوڑے سنبھالے اپنے حصے کی ایک ایک زمیں جوتنے بونے پر مستعد
نظر آتے ہوں؟

یہی نہیں بلکہ جہاں تک خالص تعلیم کا معاملہ ہے۔ یعنی حرفے کے ذریعہ نصاب کے مضامین پڑھانا
وہاں بھی کا تا بنانا باغبانی کے معیار کو نہیں پہنچتا لکڑی گتے کے کام میں بھی ربط کے امکانات محدود ہیں
اس حرفے کے ذریعہ حساب آسانی پڑھایا جاسکتا ہے لیکن اس سے اونچی جماعتوں میں حساب کے ربط
کے زیادہ موقعے نکلتے ہیں۔ حالانکہ گتے کے کام سے ہمیں پہلی دو جماعتوں کا نصاب پڑھانا ہے۔ براہ راست
گتے سے حساب میں، وزن پیمانے، سکے، رقبہ، جیومیٹری کی شکلیں وغیرہ۔ سماجی علم اور عام سائنس میں آمد
رفت کے ذرائع جینیوں کا تمدن رنگوں کی بناوٹ، پانی، زہر وغیرہ قسم کے موضوع پڑھانے کا اچھا موقع
ہے لیکن کا تنے بننے کے کام میں ابتدائی جماعتوں کے حساب پڑھانے کا زیادہ بہتر موقع ملت ہے مگر
آگے چل کر کیچنگ تان کو زیادہ دخل دینا پڑے گا۔ عام سائنس آسانی پڑھائی جاسکتی ہے اگر کپاس بونے
کا کام بھی شامل ہو لیکن شہر کے مدرسوں میں یہ انتظام ناممکن ہو گا۔ سماجی علم کا ربط کا تنے بننے کے اصلی کلام
سے زیادہ کپڑے کی تجارت کی ترقی اور اس کی تاریخ سے ہو گا اور یہی اس حرفے کا سب سے بڑا عیب
ہے۔ باغبانی بے شک ان کوتاہیوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہے۔ اس کی افضلیت اس میں
ہے کہ عمل اور حد درجے متنوع قسم کے عمل کا موقع ہے چنانچہ یہاں بیشتر مضامینوں کا ربط باغبانی کی تاریخ
سے نہیں بلکہ باغبانی کے کام سے ہوتا ہے اور یہی ربط کی بہترین صورت ہے۔ باغبانی نباتاتی دنیا
حیوانی دنیا، تمدنی دنیا اور قدرتی مظاہرات۔ سب پر بیک وقت ہمارے لئے دروازے کھولتی ہے
لیکن باغبانی کے حق میں یہ سب کچھ کہنے کے باوجود ایک سی اور حرفے کے حق میں اس سے بھی

زیادہ کہہ سکنے کے باوجود ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک حرفہ ربط کے تمام مقاصد پورے کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ذکر حسین کمپنی نے خود ربط کے، وادہ کے، یعنی بچے کا ماہی احوال اور طبی احوال بھی تجویز کئے ہیں اور بیچ تو یہ ہے کہ حرفے کے ساتھ ساتھ ان دو مرکوزوں کے اٹھانے سے ربط کی گنجائشیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔ اور سمجھو جو رکھنے والے استاد کو ربط کا صحیح موقع بکھانے میں کبھی اور کہیں ناکامی نہیں ہو سکتی۔ بالآخر ہم نصاب میں بچوں کو پڑاتے ہی کیا ہیں؛ یقیناً وہی چیزیں جو ساج اور قدرت ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہے اور اس لئے نصاب کا کوئی موضوع ان دو مرکوزوں سے الگ کوئی چیز ہو نہیں سکتا لیکن انہوں نے یہ ہے کہ جہاں عمل کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں بعض استاد یہ بات بھول جاتے ہیں اور وہ نہ صرف نصاب کے تمام مضمونوں کو ایک اور صرف ایک حرفے سے مربوط کر کے پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم بنیادی قومی تعلیم کا تمام نصاب کا تنہا دھننے کے کام سے یا انگریز گتے کے کام سے مربوط کر کے پڑھا سکتے ہیں۔ میں ایک کے متعلق نہیں متعدد مدرسوں کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش پر نازاں ہیں۔ یہ کوشش تو بری نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش سے کوئی اچھا تعلیمی نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ کو بھی جواب نفی میں دینا ہوگا جہاں تک حساب کا تعلق ہے یہ چیز تو بالکل مفید تعلیمی اور تفریحی شغل سے مربوط ہو سکتی ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں زبان کے سبق بھی چاہے جس حرفے اور چاہے جس شغل سے مربوط ہو سکتے ہیں لیکن عام سائنس اور سماجی عمل کے مضمونوں کے لئے ربط کا ایک اور صرف ایک مرکز خود نہایت نادر و اکوشش ہے۔ ٹوئینگ کے دوران میں ہماری جماعت ایک مدرسے میں نمونے کے کچھ سبق دیکھنے گئی یہاں ایک سبق دیکھا۔ استاد کو زبان کے سبق میں ایک چینی بچے کی لکائی پڑھائی تھی استاد نے بچوں سے سوال کیا کہ سب سے پہلے کس ملک میں کاغذ بنا؟ چینی میں بچوں کا جواب تھا اس کے بعد اسناد نے اہل چین کے رہن سہن کے طریقوں پر ان کے لباس پر ان کے تفریحی مشاغل، ان کے قانون و جداری، ان کے مذہب پر ادا ان کے زبان و ادب پر گفتگو کرنے کے بعد وہ سبق شروع کیا سبق زبان کا تھا زبان کے سبق کا مقصد وہ معلوم۔ لیکن یہ استاد زبان کے سبق کے مقصد کو کس حد تک جاہل کہہ سکے ہوں گے اس کا اندازہ اس سے لگایے

کہ انھوں نے ۴۵ منٹ ربط کے شوق میں تمہیدی گفتگو پر صرف کئے اور صرف ۵۵ منٹ اس سبق پر ایسا ہوا کیوں اس کی وجہ صاف ہے استاد کو مدرسہ کے نگراں کی جانب سے اس سبق کو گنتے کے کام سے مربوط کر کے پڑھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہدایت اب آپ کو تعجب ہوگا یہ سبق خود اپنی جگہ سماجی ماحول سے مربوط تھا اس سبق کے ابتدائی حصے میں ذکر تھا کہ کس طرح ان بچوں ہی کے شہر میں ایک عینی ڈاکٹر ہیں اور ان کا ایک کچہ ہے وغیرہ وغیرہ اگر اہل سبق میں یہ تمہید موجود نہ ہوتی تو بھی اس سبق کا ربط سماجی ماحول سے ہو سکتا تھا لیکچر میں پھر یہی چاروں پڑھنی دہار رکھنے والوں کا منظر عینی بچوں کا تماشا کرتے ہوئے کبھی کبھی نظر نہ آنا چینیوں کا بڑی سی گٹھری میں ریٹیم لادے لادے پیچھے پھر نا اسی باتیں نہیں جنہیں شہر کے بچوں اور بالخصوص اس شہر کے بچوں نے جہاں یہ سبق پڑھایا جا رہا تھا نہ دیکھا ہو۔ ایک اور مدرسے میں استاد کو دیکھا کہ اس نے بچوں کو رونی دکھا کر پوچھا "رونی کا رنگ کیا ہے؟" سوال کی صحت اور عدم صحت کو چھوڑیے دیکھنا یہ ہے کہ جب بچوں نے جواب دیا "سفید" تو پھر استاد نے پوچھا "برف کا رنگ کیا ہوتا ہے؟" بچوں کا جواب پھر وہی تھا یعنی "سفید" اب کیا تھا استاد جس نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے وہ انہیں مل گئی بس تو آج ہمیں برف سے دھکے ہوئے پھاڑوں کا حال پڑھائیں گے۔ اور بچوں نے کتاب سے وہ سبق پڑھا شروع کر دیا جہاں تک میری معلومات اور ذاتی تجربے کا دخل ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط فہمی لوگوں میں اور عام قوم کے استادوں میں تین مرکزوں سے پھیلتی ہے۔ وہ مرکز ہیں ٹریننگ اسکول، جہاں ناگاہی کی ذات اور ربط کی وہ مثال جو ڈاکٹر حسین کٹنی کی رپورٹ میں شامل ہے ٹریننگ اسکولوں میں حرفوں سے ربط کے متعلق طلباء کو کوئی صحیح راستے قائم نہیں کر سکے کیونکہ جو استاد انہیں ربط پڑھاتا ہے وہ حرفے کا عمل نہیں جانتا اور جو استاد حرف نہ سکھاتا ہے، وہ نہ ربط کے نظری پہلو سے واقف ہوتا ہے نہ نصاب اس کے سامنے ہوتا ہے اور نہ اس حرفے کی نشوونما اور اس کی تاریخ اس کے ذہن میں ہوتی ہے نظری اور عملی کام کے اس فرق کو صاف طور پر اس حقیقتی مثال سے سمجھ لیجئے کہ ایک ٹریننگ اسکول میں طریقہ تعلیم پڑانے والا استاد مڈل پاس ہے ربط پڑھانے والا استاد ایک ایم اے ہے حرفہ سکھانے والا استاد ایک نئی پاس ہے اور مشقی سبقوں کی جانچ کرنے والوں میں ایک چوتھا درجہ پاس پی ٹی سی ہے پھر طالب علم کے سامنے

بعض وقت یہ مہجوری ہوتی ہے کہ اس کو اپنے سبق کی مخصوص حرفے سے مربوط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس ٹریننگ اسکول کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے اس میں باقاعدہ سبق سبقوں کے پروگرام میں ربط کا کام مروج کر دیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے کسی حصے کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ورنہ پیش کر دیتا۔ ایک اور گراہکن چیز یہ ہے کہ بعض ٹریننگ اسکولوں میں حرفہ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیمی اہمیت کچھ خود بخود دب جاتی ہے میری ایک عزیزہ پانچ کے شروع میں ایک بیک ٹریننگ سنٹر دیکھنے گئیں اور اس کے بعد انھوں نے مجھے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ترجمہ یہ ہے:-

”ہم پچھلے ہفتہ بیک ٹریننگ کالج دیکھنے گئے ہم نے وہاں دیکھا کہ یہ کام کس طرح ہوتا ہے
حسب نے وہاں ابری بنا لیا میں اپنی بانی ہوئی ابری کے دو نمونے بھیجی ہوں
لکھیں یہ ٹھیک ہیں نا؟ یہ میری پہلی کوشش ہے۔۔۔۔۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال
بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے۔“

یہ آخری ٹکڑا اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال کو دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے ”نا آپ نے؟
پھر ماما کا مذہبی نے اکثر و بیشتر جب بھی اس تعلیم کا ذکر کیا تو انھوں نے وہی حرفوں کے کسی اور
تعلیمی شغل کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ انھوں نے بار بار (ہر کجی) کے متعدد مضامین میں، ذاکر حسین کیٹی کی رپورٹ
پیش لفظ میں، پونہ کانفرنس کے موقع پر اپنے پیغام میں، یہی کہتا ہے کہ تعلیم وہی دستکاریوں کے ذریعہ
ہونی چاہئے عقیقت چونکہ ہندوستان کے ذہن پر اب بھی غلبہ کئے ہوئے ہے اس لئے کوئی تعجب نہیں
اگر بعض لوگ ماما کا مذہبی کے الفاظ سے متاثر ہو کر تعلیمی مسائل کو بھی جسے حد درجہ سائنٹفک ہونا چاہئے
محض اعتقادی معاملہ بنالیں چنانچہ ایک صاحب نے پونہ کانفرنس میں فرمایا تھا کہ میں بنیادی تعلیم کا
سند یافتہ استاد نہیں ہوں میرے پاس ایک ہی سند ہے اور وہ اعتقاد کی ہے آگے چل کر ان صاحب
نے فرمایا کہ کس طرح دستکاری اور تخلیقی مشاغل کے ذریعہ تعلیم کا اصول سمجھئے۔ بعد انھوں نے کاتنا
سیکھا اور پھر تعلیم دینا شروع کر دیا۔ اعتقاد کا سوال تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے تو یہ چیز آپ کو اصولاً
غلط اور حتمی معلوم ہوگی بنیادی قومی تعلیم ہمارا استزادہ قیمتی تحریک ہے اس لئے ابھی اسے زیادہ تر

زیادہ محتاط ہاتھوں میں رہنے کی ضرورت ہے۔

ذاکر حسین کیٹی نے حرفے کے ساتھ ساتھ سماجی اور طبی ماحول کو بھی ربط کے مرکز قرار دے کر اپنا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ لیکن جب عام استاد ہی رپورٹ میں کاتنے بننے کے کام سے پورے سات سال کے نصاب کے ربط کے امکانات دیکھتے ہیں تو وہ یا تو سماجی ماحول کو بالکل بھول جاتے ہیں یا انہیں اتنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ذاکر حسین کیٹی نے ربط کے یہ امکانات محض اس لئے تجویز کئے تھے کہ ہمدردی اپنی جگہ سمجھ بوجھ سے کام لے کر آزادانہ حیثیت سے مگر صحیح کام کرے گا۔ ہوا قسمی سے یہ کہ عقیدت نے سمجھ بوجھ کو یہاں بھی تھسکیاں دے کر سلا دیا۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی حیثیت سے اس تجویز کے ہوئے ربط میں کہیں کہیں بھول نظر آئے گا چند مثالیں آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔

جماعت اول :- افریقہ میں اہرام بنانے والے غلام کمال۔ ربط مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کا لباس۔

جماعت دوم :- حضرت موسیٰ کی کمانی۔ ربط :- قدیم زمانے کا لباس۔
جماعت سوم :- تھراپلی کی جنگ۔ سقراط وغیرہ۔ ربط :- قدیم زمانے کے لباس کی سادگی اور خوبصورتی
جماعت چہارم :- ہمندر گیت، کالیڈاس، آریہ بحث ربط :- زمانہ قدیم میں کپڑے کی تجارت۔
جماعت پنجم :- پیغمبر اسلام کی سوانح حیات۔ ربط :- آنحضرت کا سادہ لباس۔ وغیرہ وغیرہ

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو جانا چاہیے کہ ربط اور کھینچ تان میں کیا فرق ہے۔ اہرام بنانے والے غلاموں کی زندگی میں ان کا لباس کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا عنوان غلامی اور مشقت ہو سکتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ اور پیغمبر اسلام پر ہر گفتگو میں ان کے پیغام کی اہمیت باقی تمام دوسری چیزوں پر حاوی رہے گی۔ تھراپلی کی جنگ میں اس لباس کی کیا حقیقت ہو سکتا ہے اور ایران کے سپاہی پہنتے تھے۔ ان ایک طرف ملک گیری کی ہوس اور دوسری طرف حب وطن کا جوش۔ یہ اس جنگ سے متعلق زیادہ تر حقائق ہیں۔ ہمندر گیت کے لئے مکرانی کالیڈاس کے لئے شعروادب اور آریہ بحث کے لئے علم و تحقیق طرہ امتیاز رہے ہیں۔ انہیں اپنے زمانے میں کپڑے کی تجارت سے کیا واسطہ ؟

اہرام اور اہرام بنانے والوں کا ذکر کیا ان شاہی عمارتوں کے ذکر سے مربوط نہیں ہو سکتا، جو بچوں کے ماحول میں ہوں یا جنہیں بچے جانتے ہوں، ایک طرف اہرام بنانے والوں کو پناہ کھانے کو ملتی تھی، دوسری طرف تاج محل بنانے والے کاریگروں کو زندگی کی ہر سہولت میسر تھی، اہل بیود اور اہل اسلام کے بانیان مذہب کا رشتہ بڑی آسانی سے جوڑا جاسکتا ہے۔ ان بے شمار مذہبی تہواروں سے جو سال میں ایک نہیں کئی واقعے ہوتے ہیں۔ تھراپلی کی جنگ موجودہ جنگ سے کس قدر ملی ہوئی چیز ہے۔ اسی طرح سمندر گہٹ کا لیداس اور آدیہ بحث ہم سے کچھ دور نہیں ہیں۔ حکمرانی، شعر و ادب اور علم و تحقیق زندگی میں روز کا شغل ہیں۔

کچھ غلطی اور اصل یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے ربط کو عام تعلیمی طریقوں سے الگ کوئی چیز سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ربط کا مسئلہ صاف صاف سبق کو پیش کرنے کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے ربط کا طریقہ چند خطوں سے محدود و محدود طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کی معین دائرہ دروازہ اور اس کے امکانات گنجائش اور گنجائش ہیں ربط فی الحقیقت کوئی خارجی اصول نہیں ہے، وہ فی الحقیقت سبق کی بنیاد ہے اور سبق کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ جماعت کے سامنے کس طرح پیش کیا جاتا ہے سبق سبق ہوگا اگر بچوں میں اس کے لئے صحیح شوق پیدا کر دیا گیا ہو اور بچوں میں شوق اسی وقت پیدا ہوگا جبکہ انہیں اپنے پچھلے تجربوں سے منسلک اپنی زندگی سے ہر شے اور اپنے مشاغل سے متصل سبق میں ایسی معلومات کی امید ہو جو انہیں کسی نہ کسی اعتبار سے آگے بڑھا سکے۔

ایک استاد اپنی جماعت میں جاتا ہے اور کہتا ہے: ”نکالو سورج کی روشنی والا سبق“ استاد یہ سبق اس لئے پڑھائے کہ غنما ہے اور بچے یہ سبق اس لئے پڑھیں کہ وہ مجبور ہیں تو بات دوسری ہے۔ لیکن اگر کوئی بچہ کھڑا ہو کر استاد سے پوچھ بیٹھے کہ ہم یہ سبق اس وقت کیوں پڑھیں؟ تو استاد کے سامنے جو نازک صورت ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگائیے۔ ایک استاد کے بچے صبح مدرسے کے پھولوں کی کاریاں اور گلے وغیرہ صاف کرنے کے لئے جاتے ہیں بچے دیکھتے ہیں کہ ایک کونے میں جو گلارکھا ہوا ہے اس کی پتیوں اور پھولوں کے رنگ میں وہ تیزی اور خوبصورتی نہیں جو باہر کیا ریوں میں لگے ہوئے پھولوں میں ہیں یاں استاد کے لئے سورج کی روشنی کیوں کو معلومات دینے کا کتنا اچھا موقع ہے

فرض کیجئے کہ ایک مدرسے کا استاد خواجہ معین الدین خشتی کے عرس میں اجمیر جاتا ہے جب وہ لوٹ کر آتا ہے تو ایک جماعت کے بچے اسے دہے میں بلا کر عرس کے حالات سنتے ہیں وہ استاد اسی موقع پر انہیں خواجہ معین الدین خشتی کا وہ سبق بھی پڑھا دیتا ہے جہاں کے نصاب میں داخل ہے۔

ایک استاد اپنے بچوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا کمروہ کچھ دیران دیران سا ہے۔ بچے کمروہ کو جاننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ استاد بچوں کے سامنے کاغذ کی پٹی پر ابروی کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے کئی ڈیزائن پیش کر لے گا۔ ایک ڈیزائن مربوں سے بنا ہوا ہے ایک دائروں سے اور ایک مثلثوں سے۔ بچے آخری ڈیزائن پسند کر لیتے ہیں۔ اب بچوں کو یہ مثلث خود کاٹنے ہیں۔ بچے خود ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ مثلث ایسا ہے جس کا ہر ایک ضلع برابر ہے۔ وہ استاد اسے آسانی سے بنانے کا طریقہ پوچھتے ہیں۔ استاد انہیں مساوی الاضلاع بنانا سکھا دیتا ہے بچوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کمروہ جاننے کے لئے حاشیہ بنا رہے ہیں یا مثلث مساوی الاضلاع بنانا سیکھ رہے ہیں۔

یہ مثالیں میرے خیال میں ربط کی اچھی اور صحیح مثالیں ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین استاد بچوں کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے کہ بچوں کو یہ بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ان پر کوئی چیز جبر کی جا رہی ہے۔ بلکہ بچے اس نئی چیز کو اپنی ذاتی کوشش اور کھوج کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وہی خوشی ہوتی ہے جو کہ لبس کو امر کیہ دریافت کر کے کہے ہوئی ہوگی۔ مربوں سے بچوں کے شوق کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں چمک اور ہنسیوں پر مسکراہٹ چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔

ربط کی کچھ اور صورتیں | تعلیم میں ربط کا مسئلہ تخلیقی مشاغل کے ذریعہ یا بچوں کے سماجی اور طبی ماحول کے ذریعہ تعلیم دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ربط کا مسئلہ ہر جہتی مسئلہ ہے۔ چنانچہ یہاں سبق کار ربط سبق سے نکل سکتا ہے روزمرہ کی زندگی میں جب بھی کسی مدرسہ کا مائٹم ٹیبل ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم ہی سمجھتے ہیں کہ مختلف مضموپ میں اوپر سے نیچے تو کوئی رشتہ ہے مثلاً تیسرے گھنٹے میں روزانہ گریزی یاد دوسرے میں روز حساب لیکن ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ مائٹم ٹیبل میں مضموپوں کا رشتہ دائیں بائیں سے بھی ہے یعنی اگر تیسرے گھنٹے میں انگریزی ہے۔ چوتھے میں تاریخ، پانچویں میں جغرافیہ، چھٹے میں ڈرائنگ اور ساتویں میں اردو ہے تو اس کے باوجود کہ یہ گھنٹے

نام ٹہل میں الگ الگ ہیں۔ نہ تیسرے کا کام چوتھے سے الگ ہے نہ چوتھے کا پانچویں سے، نہ پانچویں کا چھٹے سے جن دروسوں میں ہر مضمون کے استاد الگ الگ ہوتے ہیں وہاں تو اُلٹیہ ہر مضمون ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جاتا ہے لیکن جہاں جماعت کے استاد موجود ہوں وہاں تو پہلے گھنٹے سے لے آخری گھنٹے تک کام میں کوئی مصنوعی تقسیم ہوتی ہی نہیں چاہئے مضمون خود اپنی جگہ الگ الگ ہونے کے باوجود مجموعی حیثیت سے ایک وحدت ہیں اور ہم زندگی میں خود ان مضمونوں کو وحدت کی حیثیت سے استعمال بھی کرتے ہیں جس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اس وقت مجھے تاریخ تعلیم، نفسیات تعلیم، اصول تعلیم، طریقہ حصول تعلیم، اقتصادیات زبان، ڈرائنگ اور حساب سب سے یکساںی طور پر کام لینا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ مختلف مضمونوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی۔ ادب کی تعلیم کے ساتھ مصوری، موسیقی، تاریخ جغرافیہ اور سائنس وغیرہ وہ کوئی چیز ہے جو وابستہ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس خیال کے بھی گھرے ہیں کہ مختلف مضمونوں میں سے کسی ایک مضمون کو مرکز بنا کر بقیہ تمام مضمونوں کو اس ایک مضمون سے مربوط کر کے پڑھایا جائے۔ بہرہوت جو تعلیم کا مقصد و ماسیرت کی تعمیر سمجھتے تھے اور ان میں ان سے اختلافات کرنے کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے تاریخ کو مرکزی حیثیت دے کر ادب، ریاضی، جغرافیہ، ڈرائنگ اور سائنس سب ہی کچھ اس کے ذریعہ پڑھا دینا چاہتے تھے چنانچہ اگر کسی جماعت میں اکبر کی شخصیت کو مرکز بنایا گیا ہے تو اکبر سے متعلق زبان کے نظم و نثر میں سبق، ہندوستان کے ان حصوں کا جغرافیہ جن پر اکبر نے حکمرانی کی، گجرات پر فوج کشی کے سلسلے میں احمد اور اس کے ساتھ سائنس کے مسائل اور اکبر کے زمانے کے لازموں کی تنخیاہوں اور تعداد سے مربوط سوالات اکبر کے زمانے کے لباس عمارتوں اور ہتھیاروں وغیرہ کی تصویریں۔ سب ہی کچھ پڑھایا جائیگا ہمارے ایک اور بزرگ کرنل پارکر مطالعہ قدرت کو مرکزی حیثیت دے کر ربط کی کچھ ہی صورت تجویز کرتے ہیں اور اس میں کوئی شکائیں کہ بچوں کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا طریقہ ہے۔

ربط کی اس صورت کو نفسیاتی حمایت بھی حاصل ہے۔ بچہ دنیا کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا جن آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے لئے انسان اور فطرت، دنیا اور دنیا کی مختلف چیزیں الگ الگ کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ انہاں بانہ ہو کر وہ چیزوں میں امتیاز کر سکتا ہے اور ان کی اضافی اہمیت سمجھ سکتا ہے۔ وہ کرسی کو نیز

سے اور ان دونوں کو ٹیل لیمپ سے اپنے شعور کی ابتدائی زندگی میں الگ الگ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جس کمرہ میں رہتا ہے اس کی کتابیں، اس کی تصویریں، اس کی کرسی، اس کی میز اس کا لیمپ سب ایک دوسرے سے ہم بشتہ ہیں اور پورا کمرہ اس تمام سامان کے ساتھ ایک وحدت کا درجہ رکھتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ ضرور میز کو میز اور کرسی کو کرسی سمجھنے لگتا ہے گویا یہاں ربط کا مسئلہ امتیاز کا مسئلہ ہے اور تجزیے میں تحلیل کا رشتہ نکلتا ہے۔

ہر پارٹ اور پارٹ نے ربط کی جو صورت تجویز کی ہے اس کو سامنے رکھ کر ہم جماعت میں ربط کی یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں کہ ہم کسی مضمون کے کسی سبق کو کسی مضمون کے کسی موضوع سے مربوط کر لیں۔ ایک استاد ایک جماعت کو دوسرے گھنٹے میں شہد کی مکھڑوں پر بچوں کو سبق پڑھانے جاتا ہے۔ استاد کو معلوم ہے کہ یہ بچے گھر کی کھجی کا حال پڑھ چکے ہیں۔ استاد اپنا سبق اس طرح پیش کرتا ہے۔

گھر کی کھجی کہاں پیدا ہوتی ہے؟

گندگی میں

گھر کی کھجی کس چیز پر زندگی بسر کرتی ہے؟

گندگی پر

گھر کی کھجی ہماری دوست ہے یا دشمن؟

دشمن

لیکن آج ہم ایک ایسی کھجی کا حال پڑھیں گے جو گندگی میں پیدا ہونے کے بجائے صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوتی ہے جو گندگی پر پردش پانے کے بجائے رنگ و نور کی دنیا میں ملتی ہے اور انسان کو تکلیف پہنچانے کے بجائے اس کے لئے دنیا کی سب سے اچھی نعمتوں میں سے ایک نعمت مہیا کرتی ہے۔ بچے ایک دم پکار اٹھے "شہد کی مکھڑ" ماٹ صاحب! ربط کا حق اسی منزل پر پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر سبق میں ہی التزام تھا کہ نئی معلومات کی ساری عمارت منزل بہ منزل انہیں بنیادوں پر بنی تھی جو بچوں کی کھجی معلومات نے تیار کی تھی

ایک استاد نے دوسرے گھنٹے میں ایک جماعت کو دارائے اعظم کی کمائی پڑھائی اور اسے بغیر بچوں کے شوق کو کھلیت پہنچائے گھنٹے کے ساتھ ختم کر دیا۔ تیسرے گھنٹے میں استاد کو شہد کی مکھیوں کی لانی کا حال پڑھانا تھا۔ استاد نے بچوں سے کہا کہ اب تک تو ہم نے انسانوں کی دنیا میں راج کرنے والے ایک راجہ کا حال پڑھا۔ اب جانوروں کی دنیا میں حکومت کرنے والی ایک رانی کا حال پڑھیں گے۔ استاد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے تھے کہ بچوں کے شوق میں تازہ جان بگڑ گئی۔

بعض اسباق میں خود بخود دوسرے اسباق سے ربط کے عناصر موجود ہوتے ہیں ایک جماعت کے بچوں نے حاکمی کی نظم پڑھی (مجھے پوری نظم یاد نہیں۔ یادداشت سے نقل کرتا ہوں)،

جھپٹنے کے وقت سر شام ایک مٹی کا دیا	ایک بڑھیا نے سر در لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پر پرسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں	راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اس فانوس اور اس لمبے	روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جنگی سدا

سر خود آفاق میں وہ رہنا سہنا راہیں

روشنی سے جن کی ملاح کے پیرے پار ہیں

اس نظم کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ”روشنی کا مینار“ سبق بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور اس کے ساتھ ”مہفت مہانتا عالم“ تھران کے مجرنے وغیرہ دوسرے زبان، معلومات اور سماجی علم کے سبق۔

بیلیم کے مدرسہ جدید کے بانی واسکوئٹلو کی نظر میں ایک ہی دن میں ریاضی، لکھنا، پڑھنا، تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے ایک جماعت آزماسی کسی جا سکے لیکن اس کا تعلیمی نتیجہ صفر ہو گا کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں۔ واسکوئٹلو نے مشوروں کی تہنیم کچھ اس طرح کی تھی کہ ایک مضمون سے متعلق کل سبق ایک جگہ مربوط سلسلے میں لکھے ہو جائیں اور اس طرح کہ انھیں سچی ماحول و حالات سے بھی ہم رشتہ کیا جاسکے۔ چنانچہ وہ اپنے طلبہ کے لئے گزری کے موسم میں حیوانات اور نباتات وغیرہ کا مطالعہ تجویز کرتے ہیں اور سردی کے موسم میں طبیعیات و کیمیا کا مطالعہ۔ ان کے طلبہ جس موضوع

کو لیتے ہیں اس پر مبرا اور استقلال سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہیں بھی نصاب میں اکثر ایسے مضامین ملیں گے جن کی ترتیب کو نظر انداز کر کے ہم انہیں باسانی ایک سلسلے میں اور بہتر طریقے سے پڑھا سکتے ہیں بعض مصنفین بھی مدرسین کا کام آسان کرنے کے لئے اب ایک موضوع سے متعلق مضمونوں کو کتابوں میں ایک ساتھ درج کرنے لگے ہیں۔

بنیادی قومی تعلیم کو سنگ زنبڑ سے دیکھنے والے استاد ممکن ہے ربط کی ان صورتوں کو قابل قبول نہ سمجھیں لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکٹر حسین کملٹی کی رپورٹ خود میں ربط کی ان صورتوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے اس میں سماجی علم کے بعض عنوانوں کو زبان کے سبقوں کے لئے بھی تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ افریقہ کے بوزوں، آسٹریلیا کے وحشیوں، عہد قدیم کے عبرانیوں، رومیوں اور ہندوستانیوں کی زندگی سماجی زندگی سماجی علم کے ساتھ ساتھ زبان کے نصاب میں بھی شامل ہے (صفحہ ۱۵۸) اور وہ بات جس کی تحریک واسکونسلو نے کی ہے پورے نصاب کی جان ہے۔ عہد قدیم کا مصر، عہد قدیم کا چین عہد قدیم کا ہندوستان ایک دوسرے سے ہم تعلق موضوع ہیں۔ چنانچہ یہ تمام موضوع نصاب میں اجتماعی حیثیت سے ایک ہی جگہ موجود ہیں اور ان میں باہمی ربط کا جو موقع ہے۔ وہ بھی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں۔

فضل الدین اثر

(صفحہ ۱۵۸)

لے حوالہ مندرجہ نصاب بنیادی قومی تعلیم انگریزی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۷ء

نئی تعلیم کے پڑھانے والے کیسے ہوں؟

اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو گاندھی جی نے کانفرنس میں لوگوں کو دیا تھا کہ پڑھانے والے وہ لوگ ہوں جو میٹرک فیل ہوں۔ اس میں ملک کے مختلف پڑھے لکھے لوگوں کے سیارے کے مطابق ایک بات کہہ دی جو اس سے اسکیم کے پڑھنے والوں اور چلانے والوں کو معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے جو مڈل پاس، میٹرک پاس اور ایف۔ اے۔ بی۔ اے پاس کے معیار کو سمجھتے ہیں انہیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معیار کے پڑھے لکھے لوگ اس اسکیم کو چلا سکتے ہیں اگر ان کی خاطر خواہ تربیت ہو جائے۔ اس وقت نئی تعلیم کی ابتدا نئی گاندھی جی کا یہ جواب کافی تھا لیکن اب جبکہ کام کرنے اور کرانے والوں نے نئی تعلیم کے کام کو شروع کر کے کچھ تجربہ کیا ہے تو استاد کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا جا رہا ہے کام کرنے اور کرانے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ استاد کو موجودہ تعلیمی معیار کے علاوہ کیا کیا باتیں آنی چاہئیں۔ اس میں کیا کیا اصطلاحیں ہونی چاہئیں اور کن کن امور میں اس کی تربیت ہونی چاہئے نئی تعلیم کے بسیط نصاب کے لئے جس میں دنیا کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ زمانے کے حالات اور واقعات کو معائنہ کے اسباب کے ترتیب دیا گیا ہے۔ صرف میٹرک فیل پاس استاد کافی نہیں ہو سکتا اس نصاب کو پڑھانے کے لئے بی۔ اے پاس استاد بھی وقت محسوس کرتے ہیں نئی تعلیم کا نصاب پرانی تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اس کے انداز اور اٹھان کی بنیاد ہی بالکل الگ ہے وہ موجودہ تعلیمی حالت میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے وہ استادوں شاگردوں اور سرپرستوں میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس نصاب میں نفس مضمون سے واقفیت ہی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں بہت سی باتیں نئی ہیں۔ میٹرک تک ان میں سے کئی باتیں نہیں بتلائی جاتی ہیں پہلی اور دوسری ہی جماعت میں کئی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھانے والے نہیں جانتے پھر اس میں تو سبھی کو وقت ہوتا ہے کہ ان باتوں کو چھوٹے چھوٹے پھول کے سائے کس طرح پیش کیا جائے اور ان کا سلسلہ کس طرح شروع کیا جائے؟ دوسری طرف اس تمام نصاب کے پڑھانے میں ان تمام بنیادی

باتوں کا خیال رکھنا ہے جس پر نصاب میں زور دیا گیا ہے اگر چہ جانے کے دوران میں نصاب کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا گیا تو محض واقعات اور حالات کا پتہ لگانا بالکل بے سود ہوگا۔ نصاب میں جو باتیں رکھی گئی ہیں وہ چند مقاصد کے ماتحت رکھی گئی ہیں۔ اگر نفس مضمون کے پیش کرنے کے دوران میں یا اس کے بعد وہ مقاصد نہیں حاصل ہوئے تو محض مجوزہ باتوں کا پیش کر دینا بالکل بے سود ہوگا۔ لہذا پڑھانے والے ان مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

مرتبہ پڑھائی کا خیال تو ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بالکل نیا ہے پہلی دونوں صورتوں میں تو کچھ نہ کچھ کامیابی ہو جاتی ہے لیکن ربط کے تصور ہی سے بڑی پریشانی ہوتی ہے بعض لوگ تو اس کو بالکل مہل سی بات سمجھتے ہیں اور نہ جاننے والوں کے لئے واقعی بالکل مہل بات ہے جن لوگوں نے بالکل سیدھے سادے طریقے سے تعلیم حاصل کی ہے ان کے لئے یہ بات بالکل نئی ہے۔ تمام نصاب کو حرفہ، سماجی ماحول اور قدرتی ماحول میں سمجھ دیا جائے بالکل نیا خیال ہے (صرف ہندوستان میں) ہم جو دوسروں کے کئے ہوئے تجربہ پر انحصار کرتے ہیں اور اپنا کوئی تجربہ نہیں کرتے محض عقلی دلائل کی طاقت پر ہر نئی بات کو مہل ہی خیال کرتے ہیں۔ یا مان لیتے ہیں لیکن بغیر سمجھے ہوئے کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کے کام کرنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو قدرتی ماحول اور سماجی ماحول کو نہیں سمجھتے اور سمجھیں کیسے جبکہ ہمارے ذہن تاریخ، جغرافیہ، مدنیات، مطالعہ قدرت، مطالعہ اشیاء اور حفظان صحت کے عنوانات میں الجھ کر رو گئے ہیں یہی نام نامیوں سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان سے ربط دے کر کسی مضمون کو پڑھانا بالکل عجیب بات معلوم ہوتی ہے حالانکہ اخبارات، رسالوں، جلسوں اور ٹریننگ اسکولوں میں بار بار اس کی وضاحت کی جا چکی ہے پھر بھی اس بات میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے کوئی دو استاد اس کو ایک طریقہ پر نہیں سمجھتے اور نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت بالکل مختلف ہے اور اس طریقہ کے سمجھنے کے لئے کمزور ہے اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں تعلیمی تحریک میں کم و بیش ایک قسم کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے اور کام کرنے والے اس طریقہ کے تمام اصولوں کی ایک حد تک پابندی کرتے ہیں اور تجربہ کے بعد اختلاف پیش کرتے ہیں اور پہلے اصولوں کو تجربہ کی روشنی میں بدلتے ہیں لیکن ہم اصولوں کو بذلک بدل کر

تجربہ کرتے ہیں کسی ایک اصول کو پیش نظر رکھ کر تجربہ نہیں کرتے ہم پہلے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اصول صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تجربہ کرتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو سارا الزام اسکیم کو دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں پڑھانے والوں میں چند خاص خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ ہمارا کام ہر بچہ پر موجود مدارس کے طریقہ کار کی طرح ہو کر رہ جائے گا سب سے ضروری بات یہ ہونا چاہیے کہ جو ثانوی تعلیم کا کام کر رہے ہوں وہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک قومی کام کر رہے ہیں جس میں ذاتی مفاد کو بڑی حد تک قربان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خیال سے وہ قومی تعلیم کا کام نہیں کر رہے تو ان کے کام میں وہ خوبی اور وہ زور نہیں ہوگا جو ہونا چاہئے نئی تعلیم کی روح کو قائم رکھنے کے لئے بھی اس بات کا ہونا بہت ضروری ہے یہی وہ بنیادی خوبی ہے جس سے طلباء میں وہ ذہنیت نہیں پیدا ہوگی جو آج کل کی مروجہ تعلیم سے پیدا ہو رہی ہے اور جس سے قوم کا ہر طرح نقصان ہو رہا ہے۔ جو استاد اس خیال سے کام کریں گے ان کے کام میں بیداری نہیں پائی جائے گی اور خاص امنگ کے ساتھ کام ہوگا اور اگر کام کرتے کرتے کبھی ناکامیابی ہوگی تو اتنا کبھی ہمت نہیں ہارے گا۔ اکثر کام کرنے والوں کو میں خواہ کی کمی کی شکایت کرتے سنا ہوں۔ قومی کام کرنے والوں کو یہ شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ ہندوستان میں جب تک تعلیم کے لئے حکومت کافی روپیہ خرچ نہیں کرتی اور قومی مدارس میں اس کے لئے کافی روپیہ فراہم نہیں ہوتا استادوں کا خواہ کی کمی کی شکایت کرنا فضول ہے اس سے کام بھی خواہ ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ بھی نہیں بھگتا یعنی خواہ کے معیار بڑھنے کی کوئی سہیل نہیں نکلتی اور کام برائے نام ہوتا ہے ہیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ہمارے ملک میں اب سے پچاس ساٹھ سال پیشتر جو لوگ مکتبوں مسجدوں اور پانٹالوں میں درس اور تدریس کا کام کرتے تھے ان کو صرف دو گولہ دقت کا کمانا محلہ کے لوگوں سے ملتا تھا۔ اور سال میں محلہ کے لوگ ہی کچھ پزیرے بنوا دیا کرتے تھے۔ انعام و اکرام عیدی، تہناری سے ان کے پاس تھوڑی سی رقم جمع ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے جس میں استاد کے گندارے کی یہ صورت رہی ہو۔ وہاں خواہ کا میاں بڑستے بڑستے بڑے گا۔ ابھی تو استاد کی خواہدہ کی طرف لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور بعض بعض صوبوں میں پرائمری اسکول کے پڑھانے

دالوں کو صرف تین روپے ماہوار ملتے ہیں جو موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی کام کو تنخواہ کی کمی بیشی سے ناپا کچھ بچا سا ہے اور ایسی حالت کی شکایت کرنا ہے جو اپنے بس میں نہیں ہے۔ اگر نئی تعلیم کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا خیال ہے اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی کچھ تعلیمی تجربے ہوں اور دوسروں کی تقلید ہی تقلید نہ ہو تو قومی اسپرٹ سے کام کئے جائیے اور اس اسکیم کو کامیابی کی طرف بڑھانے میں نمایاں حیثیت حاصل کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جن مدارس میں استاد تنخواہوں کا خیال کئے بغیر نئی تعلیم کے کام کو کر رہے ہیں ان میں اس اسکیم کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ناکامیوں پر قابو پانے کے لئے نئی نئی ترکیبیں سوچی گئی ہیں اور اس طرح نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ان کے کام میں زندگی پائی جاتی ہے یہی نہیں ان مدرسوں کے استادوں نے اس اسکیم کو بھی طرح چلانے کے کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ گویا ایسے مدرسے ملک میں ابھی کم ہی ہیں لیکن ایسے مدرسوں ہی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نئی اسکیم کی ہر غریب اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اور ہر بات کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کا صحیح ثبوت پیش کر سکیں گے جس خیال کو میں نے پیش کیا ہے۔ اس خیال کے استاد ملک میں بہت تھوڑے ملیں گے اور ان کی خاطر خواہ ہمت افزائی بھی نہیں ہو رہی ہوگی جو خواہ کا بدل ہو سکتی تھی لیکن نئی اسکیم کو کامیابی سے چلانے کے لئے ایسے ہی استادوں کی ضرورت ہے جو تمام حادثات کو برداشت کر سکیں اور کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دیں۔ نئی اسکیم کے استادوں کے لئے یہ ایک بنیادی خوبی ہے۔

اس کے علاوہ استادوں میں تعلیمی سوچ بوجھ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ تعلیمی کام سے پڑھانے والے کی طبیعت کو قدرتی لگاؤ ہو۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں بھی تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہوں اور ان کے حل کے متعلق سوچتے ہوں تعلیمی سوچ بوجھ کا ہونا بعض استادوں میں بالکل قدرتی ہوتا ہے اور ٹریننگ سے اس میں خاص جلا ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کو تعلیمی کام کاج سے قدرتی لگاؤ نہیں ہوتا ٹریننگ سے ایک حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جن لوگوں کی طبیعتوں کو تعلیمی کام کاج سے بالکل مناسبت نہیں ہے ان کا اس اسکیم کے چلانے کی ذمہ داری لیا محض اس خیال سے کہ اس بیکاری کے زمانہ میں کوئی اور کام نہیں ملتا تو تعلیمی کام کرنے لگیں۔ مفید نہ ہوگا ٹریننگ لیکر بھی کوئی خاص

بات پیدا نہیں ہوگی خواہ ایسے استاد یا روبرو قربانی کے مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں ان کے ایثار اور قربانی سے اس اسکیم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے ایسے استادوں کو اپنے کام میں کوئی لطف نہیں آئے گا بلکہ بیدلی ہی بیدلی نظر آئے گی بالکل بے نتیجہ کام ہو رہا ہوگا۔

تیسری اہم بات استادوں کے لئے یہ ہے کہ وہ نئی اسکیم کے نصاب سے پوری طرح واقف ہوں خواہ وہ نصاب پہلی جماعت کا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف نصاب سے واقف ہوں بلکہ نصاب کے پڑھانے اور پیش کرنے کے دوران میں جن ضروری مسائل کے پیدا ہونے کا امکان ہو ان سے بھی واقف ہوں پڑھاتے پڑھاتے کہیں سیکرپر وگرام آجاتا ہے یا شاہد کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو نصاب میں نہیں دیے جاتے ہیں لیکن استاد کی معلومات اس قدر وسیع ہو کہ وہ طلباء کے سوالات سے گھبرانے والے، لاچار اور مجبور نہ ہو جائے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کرے انھیں صحیح طریقہ پر شاہدہ اور سیر کرے اور پوری طرح فائدہ اٹھانے دے۔ استاد نہ صرف واقف ہوں بلکہ اسے پڑھانے کے گریہی اچھی طرح جانتے ہوں بعض ایسے استاد دیکھنے میں آئے ہیں جو نصاب کے متعلق بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں لیکن وہ طلباء کو بتلانے اور سمجھانے سے واقف نہیں ہوتے کبھی وہ سہل خراب ہو سکتے ہیں کبھی اس قدر وسیع معلومات دیتے ہیں کہ طلباء سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کبھی معلومات اس قدر خشک طریقہ سے پیش کی جاتی ہے کہ طلباء بد دل ہو جاتے ہیں اور استاد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں کبھی وہ اپنے وسیع معلومات سے ایسے نپے نوٹ ترتیب دے کہ طلباء کو لکھاتے ہیں کہ طلباء کھٹے لکھتے اور انھیں دوبارہ نقل کرتے کرتے اکتا جاتے ہیں اور امتحان کے موقع پر انھیں ایک معصیت سمجھ کر یاد کرتے ہیں لیکن پھر بھی یاد نہیں ہوتے۔ یہ سب طریقہ تعلیم کے نہ جاننے کے نتائج ہیں۔ ایسے استاد بھی ہیں جو نصاب سے تو تھوڑی واقفیت رکھتے ہیں مگر پڑھانے کے گروے ایسے واقف ہوتے ہیں کہ طلباء میں سمجھ پیدا کر دیتے ہیں انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتے ہیں طلباء سے مشورہ کر کے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں کہ طلباء تمام پڑھائی میں جان محسوس کرتے ہیں۔ وہ مضمون زیر بحث کے متعلق مسائل فراہم کرنے کا شوق پیدا کر دیتے وہ اپنے طریقہ سے پڑھائی کو بامقصد بنا دیتے ہیں۔

بہر حال نفسِ مضمون سے واقفیت کے ساتھ ساتھ طریقہ تعلیم سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہئے کیونکہ تعلیمی میدان میں یہ بات زیادہ ضروری ہے۔ اس سے نصاب کی دشواریاں بھی حل کی جاسکتی ہیں اور طلباء کو صحیح رہنمائی بھی دی جاسکتی ہے۔ نئی تعلیم میں تعلیم کے گروں کا جاننا اور استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پرانے طریقوں میں اس کا نہ جاننا اور نہ استعمال کرنا پرانے طریقہ تعلیم میں امتحان، مارواٹ، سرپرستوں کے خوف و تہیہ سے کچھ نہیں تو چالیس فی صدی نتیجے تو کھل ہی آتے ہیں لیکن نئی تعلیم میں اس قسم کی سرزنش اور لگاؤ کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں تو سرپرست اس کی شکایت کریں تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہوگی کہ وہ تعلیمی معاملات میں ماریٹٹ کر دے اور نہ رکھیں اس سے بچنے کی ساری اوج ختم ہو جاتی ہے۔ نئی تعلیم میں تو طریقہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں تعلیم کے نئے نئے گروں کو استعمال کر کے اور پرانے تمام طریقوں سے قطع نظر کر کے سو فی صدی نتائج کی توقع کی جائے گی اس لئے یہ کام پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگا۔

تعلیم کے اچھے طریقے اور گزٹرننگ اسکولوں میں ہی نہیں سیکھے جاتے۔ یہ طریقے طلباء میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرنے ان کے مسائل سمجھنے تعلیم کو ان کی طبیعتوں کے مطابق بنانے، ان کی دقتوں کو رفع کرنے اور طلباء کے پورے پن میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے کبھی کسی ٹرننگ اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے خود طلباء کے لئے مدارس کھولے۔ ان میں تعلیم دی تجربے حاصل کئے اور ان تجربوں کا ریکارڈ رکھا۔ اس طرح تعلیمی اصول ترتیب دیئے جن سے ہم آج نامور اٹھارہ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں استادوں کی تربیت کا مخالف ہوں لیکن اس کی اہمیت اس تجربہ کے آگے کچھ بھی نہیں ہے جو پڑھانے والے مدرسہ میں اپنی گھٹا تار محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ استاد کی ٹرننگ تو صرف اس بات کی سند ہے کہ آپ کو تعلیمی تجربے کرنے کے گز ایک حادثہ بتلا دئے گئے ہیں۔ ہارٹنڈ مدرسین اگر اپنے کام کا ریکارڈ نہیں رکھتے، اپنے تجربوں کو قلم بند نہیں کرتے، اپنے سوچے ہوئے طریقہ تعلیم کو لکھتے نہیں تو وہ نئی تعلیم کے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کام کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلم ہے۔ ہندوستان میں تعلیمی تحریک کا آغاز ہی چند سال ہوئے ہوئے ہیں۔ اس لئے پہلے

پہلے ہمارا تقلیدی دور تھا۔ دوسروں کا سہرہ پر بلند آتما تھا اور اپنی ہر بات بے اصول معلوم ہوتی تھی۔ لہذا اگر ہمیں دوسرے مالک کے مدارس کے برابر کوئی اہمیت حاصل کرنی ہے تو اپنا کوئی سرمایہ جمع کرنا چاہئے خواہ وہ کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بچوں کی طبیعتوں اور ان کی عادتوں سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے اور حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی سہم ہے۔ حرفوں کے کرانے کے دوران میں جو بوجھ اور کیسوی پیدا ہو جاتی ہے اس سے بہتر طریقہ پر فائدہ اٹھانے کے لئے استاد کو بچوں کی طبیعت میں کافی دخل ہونا چاہئے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہو ورنہ وقت برباد سے فائدہ نہ اٹھانے سے تمام بوجھ اور کدو پسی کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بات کے سمجھنے اور استعمال کرنے سے نہ صرف تعلیم بہتر طریقہ پر دی جاسکتی ہے بلکہ بچوں کی انفرادی نشوونما صحیح اور بہتر طریقہ پر ہو سکتی ہے۔ جو استاد بچوں کے کام کا ریکارڈ برابر رکھتے ہیں۔ بچوں کے رجحانات کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور اپنے طریقوں کو ان کی طبیعتوں کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ بچوں کی طبیعتوں سے واقف ہو جاتے ہیں ٹریننگ اسکولوں میں اس بات پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ وہاں اس کو مرکزی جگہ ملنی چاہئے۔ اس کے لئے کتابیں اور اعلیٰ طور پر شاہدہ کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے بیشتر استادوں میں اس فن کی کمی ہے۔ جانتے ہیں لیکن استعمال نہیں کر سکتے۔ طریقہ تعلیم کے موثر طریقہ پر استعمال ہونے کی صورت جب ہی ہو سکتی ہے جب استاد بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقف ہو ورنہ ہو سکتا ہے کہ استاد اپنے طریقہ سے اس بات کو بہتر طریقہ پر ترتیب دیں۔ مواد جمع کریں (Teaching Aids) بنائیں لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بچے اس بات کے کیسے کی طرف مائل نہ ہوں اور اس طرح استاد کی تمام کوششیں بیکار رہیں لہذا استاد کو بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہئے۔

میں نے چند نہایت ضروری باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ان خوبیوں کو بیان کیا ہے جو تعلیم کے پڑھانے والوں میں ہونی چاہئیں میں نے عدا ان غایوں کو نہیں بیان کیا ہے جو اس قسم کی تہم خویوں کے ہوتے ہوئے استادوں میں ہوتی ہیں۔ تاخوی غوی حزن ہے۔ جو استاد غی تعلیم کا کام کر رہے

ہیں وہ کئی حرفے جانتے ہوں۔ حرفوں کو اس طرح جانتے ہوں کہ بچوں کو اچھی طرح سکھلا سکتے ہوں۔ اکثر استاد
 کئی حرفے جانتے ہیں لیکن ایک جامعیت کے تیس مہینے لڑکوں کو سکھلانے میں انھیں بڑی دقت ہوتی ہے
 اور اس سیکڑم میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ اتنے بچوں کو یک وقت کوئی دستکاری کس طرح سکھائی جائے
 اس کے متعلق تجربہ کے بعد ہی کوئی صورت تجویز کی جاسکتی ہے لیکن جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے ہیں انھیں اس
 پر غور کرنا چاہیے کہ بچوں کو حرفہ کس طرح سکھانا چاہیے اس لئے کہ بڑے طلباء کو کوئی دستکاری سکھانے کے
 مقابلہ میں بچوں کو سکھانا بہت دشوار کام ہے اور اس صورت میں جبکہ اس سے تعلیمی فائدہ بھی حاصل کرنا ہو
 اگر تعداد کا مسئلہ نہ بھی ہو پھر بھی بچوں کو سکھلانے کا مسئلہ اپنی جگہ پر خود بھی بہت اہم ہے۔ دستکاری جاننے اور
 بچوں کو سکھانے کے ساتھ ساتھ استاد حرفوں سے جہاں تک ممکن ہو تمام مضامین کے پڑھانے میں مدد بھی
 لے سکتا ہو۔ حرفوں کے کرانے میں جتنا تعلیمی کام ہو سکتا ہو اسے کرا سکتا ہو۔ حرفوں کے ذریعہ تعلیم باہمی اور
 با مقصد بنا سکتا ہو طلباء کو تہی نشتی، جتنا حوصلہ اور جتنا جوش حرفہ کرنے میں ہوتا ہے وہی خوشی وہی حوصلہ اور
 وہی جوش تعلیم کے حصول میں بھی پیدا کر سکتا ہو۔ حرفہ علیحدہ اور تعلیم علیحدہ کی صورت نہ پیدا ہونے دے بلکہ حرفوں
 کو تعلیم کا ذریعہ بنا سکتا ہو۔ وہ محض تصورات کی دنیا میں نہ ہو کہ تمام تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہو رہی ہے حالانکہ
 دراصل ایسا نہ ہو۔

سید احمد علی

جامِ صہبائی

- جب ظلمتِ غم سے روشنی ملتی ہے (۱) جب دردِ عالم سے بے خودی ملتی ہے
 اک یہ بھی مقامِ عشق ہے اسے ہدم! جب موت سے صبحِ زندگی ملتی ہے
 یہ گردشِ صبح و شام ہے میرے لئے (۲) یہ محفلِ خوش نظام ہے میرے لئے
 گھلے ہمارا مہر و ماہِ داغِ جسم! اے دوست یہ اہتمام ہے میرے لئے
 دشتِ دو جہاں ہے میرے بڑھنے کیلئے (۳) بے عرش کا بامِ میرے چڑھنے کیلئے
 فطرت کا صحیفہ مقدس اے دوست! ہر وقت کھلا ہے میرے پڑھنے کیلئے
 حق کو شہن ہوں حق کی راہ پر جاتا ہوں (۴) دشوار گزار ہے، مگر جاتا ہوں
 ہر گام پہ روکتا ہے باطل مجھ کو ٹھکرا کے اسے آخر گزار جاتا ہوں
 ہر گام پہ سنگ رہ پاتا ہوں اسے (۵) ٹھکرا کے مگر پرے ہٹاتا ہوں اسے
 کر دیتا ہوں پاش پاش باطل کی چٹان یا ہو کے لبّہ پھانڈ جاتا ہوں اسے
 اغیار سے بے نیاز کر دے یارب! (۶) کاسہ مرا تو آپ ہی بھر دے یارب!
 بارِ غم دو جہاں اٹھائوں؟ نہ کر وہ عزم وہ ہمت جگر دے یارب!
 بے تیزی راہِ رو کو منزل کی تلاش (۷) بے تاب ی موج کو ہے ساحل کی تلاش!
 ہر نقش کو کیوں مٹا رہی ہے؟ شاید فطرت کو ابھی ہے نقشِ کامل کی تلاش
 مستی میں یم و جو دہرا تا ہے! (۸) تنکے کو گاماں ہے اس سے ٹکراتا ہے!
 فطرتِ مائتہ کیل ہے، مگر اناں کو نکر و غم بہت دبو دکھا جاتا ہے!

اثرِ صہبائی

پیام زندگی

اٹھ کہ پھر تاریکی شب سے سحر پیدا کریں
 تلخوں میں لذت شہد و شکر پیدا کریں
 پھر خن و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں
 دل تو ہے یک قطرہ خوں گرم دل کی اہل کیا
 جس کی صوفے جگلا گئے شب تار حیات
 جو نہ ہو منزل پہ قائم جو نہ ہو سمتوں سے قید
 نرم اور سنگین راہوں سے گزرنے کے لئے
 کوہ ٹکرا دیں جو سائل ہوں کنوؤں کا میں
 لوج میں موج نسیم اور کاٹ میں تیغ امیل
 دے سکے انسان کو ہر قید و غلامی سے نجات
 زندگانی کی سلسل چلچلاتی دھوپ ہیں
 دم میں یہ سار اطمینان حاضر ٹوٹ جائے
 موت کے سینہ سے ہمتی کے شرر پیدا کریں
 زہر میں پھر آب حیا کا اثر پیدا کریں
 خاک بے ایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں
 رنگ خارا میں در آئے وہ نظر پیدا کریں
 توڑ کر دم ستارے وہ قمر پیدا کریں
 کار داں میں وہ نئی روح سفر پیدا کریں
 آنکھ شبنم کی توہیرے کا جگر پیدا کریں
 اس طلسمی گنبد بے در میں در پیدا کریں
 مکتب نو سے وطن صل با خبر پیدا کریں
 ذمہ کی کچی ایسی اک نوع بشر پیدا کریں
 نزہت و ریختنی موج گہر پیدا کریں
 پنجسہ فولاد و ضرب کار گر پیدا کریں

ست بنیادوں کو ڈھا کر اس جہان خام کو
 اک جہان دیگر دپائندہ تر پیدا کریں

سروش مسکری طباطبائی بی۔ اے لکھنؤی

خواہستی

وہ زمانے اور تھے جب تیرا غم سہتا تھا میں

جب ترے ہونٹوں کی رنگینی سے کچھ لگتا تھا میں

جب ترے بالوں سے گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا میں

ایک بیکہ بکلی سی چکی اوشب میں لٹ گیا

تو نے برسوں میں کو سینچا تھا وہ گلشن لٹ گیا

تو نے موتی جس میں مانگے تھے وہ داہن لٹ گیا

تجک جو جس دل سے محبت تھی وہ اب دل ہی نہیں

قصہ جس کا تج کو جانا تھا وہ بسمل ہی نہیں

رنگ محفل تجھ سے کیا کیسے و محفل ہی نہیں

اب نہ وہ شوق تصور اب نہ وہ ذوق فناں

مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہد رفتہ کے نشان

دہندلی دہندلی سی نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں

یہ جوانی، یہ پریشانی، یہ پیسہ اضطراب

بار بار اکھن میں دوڑا ہوں سوئے جام شراب

بار بار گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب

رنگ صبا اور ہے صبا کی سستی اور ہے

ذکر پستی اور ہے، احساس پستی اور ہے

خواہستی اور ہے تمہاری سستی اور ہے

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

معین حسن جذبی

غزل

آنکھوں میں بسکے دل میں سا کر چلے گئے
حسن ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
دے کر خود اپنے ہاتھ سے اک درد لا دو
سمجھا کے پتیاں میرے اوج کمال کی
اپنے فروغِ حق کی دکھا کے وسعتیں
شکرِ کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
لئے تھے دل کی پیاس بجھائے کیوسٹے
لئے تھے چشمِ شوق کی حسرت نکالنے
اب کا رو با عشق سے فرصت مجھے کہا
میری حیات عشق کو دے کر جنوں شوق

لب تھر تھرا کے رہ گئے لیکن وہ لے جگر
جاتے ہوئے نگاہ لا کر چلے گئے

جگر مراد آبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ساز و آہنگ :- از مولنا سیاب اکبر آبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ نصر الادب آگرہ۔ سائز ۱۶×۱۰ صفحات ۲۰۴ قیمت مجلد سے ۷ روپے کا نقد کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مولنا سیاب کی نظموں کا مجموعہ ہے کل نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں (۱) قومیت سیاست وطنیت (۲) مذہب اخلاق معاشرت (۳) شعر و حکم (۴) معتقدات (۵) بچوں کے لئے۔

اب تک ہم مولنا سیاب کو محض غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں اور وہ بھی پرانے اسکول کے یعنی جہاں الفاظ ہمیشہ معانی پر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ سیاب صاحب کے یہاں ان کی غزلیات میں یہ چیز بہت ملتی ہے۔ ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر پرانے اسکول کا کوئی شاعر نظم گو ہو جائے تو اس کا کیا رنگ ہوگا۔ جہاں تک قادر الکلامی الفاظ کی نشست و قوئی کی درستگی و انصافی کا تعلق ہو مولنا سیاب اپنی مشق سخن کے باعث کافی اونچے درجوں پر پہنچ چکے ہیں نظمیں انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھ کر کتنا شروع کیں۔ اس میں انھوں نے پیامات بھی دیئے ہیں اپنے احساسات کی تیزی بھی دکھائی ہے۔ ہنرمندی اور ہر رنگ کی نظمیں لکھی ہیں لیکن ابھی معانی پر سے وہ الفاظ کی چادر نہیں اٹھی ہے اقبال کی نقل ہے لیکن تقابلیت نہیں پیدا ہوئی ہے پھر بھی ہم مولنا سیاب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا نظمیں ان کی غزلوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ آئندہ بھی اگر آپ نظمیں لکھتے رہے تو امید ہے سوز و گداز بھی پیدا ہو جائے گا کچھ کام کی باتیں بھی کہہ سکیں گے اور ان کا وہ غزلوں والا تصنع اور خالی لفظی سجاوٹ بھلے کو دور ہو جائے گی۔ پیش نظر نظموں میں بعض بعض بہت اچھی ہیں امید ہے شائقین اس مجموعہ سے لطف اٹھائیں گے۔

حیات و غزلیات غالب (دو زبان انگریزی) از عبد اللہ انور بیگ ایم اے ایل بی مطبوعہ اردو اکاڈمی لاہور سائز ۱۵×۲۲ صفحات ۱۸۱ قیمت ۱۰ روپے کا نقد و طباعت بہت عمدہ دوسرے تصاویر جو غالب

کے اشعار سے متعلق ہیں،

اور دو اکاڈمی لاہور نے غالب کی زندگی اور کلام کو انگریزی داں طبقے میں اس کتاب کے ذریعہ روشناس کرنے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ ہمارے شاعری کے بہترین غزلگو شاعر سے غیر زبان واسلے بھی لطف لے سکیں۔ شروع میں جان کلا یورڈے کا دہچاچہ ہے موصوف غالب کے کلام سے متاثر یا واقف نہیں معلوم ہوتے اکاڈمی مذکور کے خلوس نیت سے تو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا لیکن افسوس ہے کہ انور بیگ صاحب اس کا عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جہاں تک حیات غالب کے حصے کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ غالب نامہ کی بدولت انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور غالب کی زندگی اور ان کا زمانہ خاصی اچھی طرح پیش نظر ہو جاتا ہے کلام کے انتخاب اور ترجمے میں البتہ غامیاں ہیں۔ اول تو انتخاب میں صرف ان اشعار کو لینا چاہئے متعجب میں مطالب کی خوبی ہے اور جن میں الفاظ کی صنایع ہے یا لفظی دروہیت کی خوبی ہے یا وہ اشعار جو انھوں نے فارسی نا اردو میں لکھے ہیں انھیں ہاتھ نہ لگانا چاہئے تھا اور اگر ایسا کیا بھی تھا تو بالکل لفظی ترجمہ نہ ہوتا جس سے نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غالب کی طرف سے سونپنی پیدا ہونے لگتی ہے۔ انتخاب میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ہم ترجمہ جن لوگوں کے لئے کر رہے ہیں ان کا مذاق شعری کیا ہے اور کس رنگ میں وہ چیزیں دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر غالب کے تخیل کو انھیں کے رنگ میں پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ وہ غالب سے لطف اندوز ہو سکیں مثال کے طور پر اس قسم کے اشعار نہ ہونا چاہئے

دھوتا ہوں جب میں پیسے کو اس سین کے پاؤں رکھتا ہے ہند سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
زخم نے داؤد می تنگی دل کی یارب تیر بھی سیئہ بسیل سے پریشان نکلا

دوسری خرابی لفظی ترجمہ کی ہے۔ اول تو اس سے لطف آتا تو درکنار غالب کے معانی کا اندازہ ہی نہیں ہوتا شرمض ایک جیتان معلوم ہوتا ہے اور بجائے حظ کے در دوسر حال ہوتا ہے۔ ترجمہ اگر ایسا ہوتا کہ اچھی انگریزی کے ساتھ معانی کا لطف بھی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والے پر کھل سکتا تو غالب کی صنایع اور سنوی خوبیاں انگریزی داں طبقہ پر خوبی روشن ہو سکتی تھیں اور غالب کی قدر و قیمت بھی بڑھ سکتی تھی۔ بالکل لفظی ترجمہ کر دینے سے نہ تو غالب کے معانی کی خوبی ظاہر ہو سکتی ہے نہ اس کی فن کاری۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے معانی جو کچھ

انگریزی ترجمہ سے ظاہر ہوئے وہ محض صفر ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
آگہی دام شنیدن جس قدر چلے چھپتے
مدعا عذاب اپنے عالم تقریر کا
سبزہ خط سے ترا کا کل مشکین نہ دبا
یہ زمرہ بھی حریف دم انہی نہوا

تیسری بات یہ کہ صرف یہی نہیں کہ ترجمہ اور انگریزی اچھی اور شاعرانہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ ترجمہ صحیح نہیں ہوکا ہے۔ کیں الفاظ کا اور کیں پورے مصرعہ یا شعر کا مثلاً درج ذیل مصرعے اور اشار کا ترجمہ سہم اور غلط ہے۔

۵۵ کتے ہونہ دیں گے ہم دل اگر پڑ پایا

۵۶ سادگی و پرکاری، بخودی و بشاری

۵۷ دل نہیں در نہ دکھاتا بھکودا غوں کی بہار

۵۸ تیری فرصت کے مقابل اے عمر

۵۹ گرم تماشا

۶۰ دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو وغیرہ

غرض کہ غلط بہت کافی ہیں اور بالکل لفظی ترجمہ نے غالب کی اسپرٹ پر پانی پھیر دیا ہے۔ امیدوار دو اکاڈمی آئندہ اڈیشن میں اس ظاہری خوبی کے ساتھ صحت اور ترجمہ کی خوبی کی طرف بھی بہت احتیاط بریگی تاکہ غیروں کے ہاتھ میں ہماری جو چیز جائے وہ بہتر سے بہتر صورت میں ہو۔

متاع حرم :- از زیب عثمانیہ ملنے کا پتہ کرمی دواخانہ بازار شوپورہ لودیانہ (پنجاب) سال ۱۳۰۲ء
۳۰۴ صفحات ۱۴۳ قیمت ایک روپیہ کاغذ کتابت اور لمباغت اچھی۔

زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی کی نظمیں عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ کی نظمیں اپنی سادہ بیانی اور پاکیزگی خیال کے باعث خاص اثر رکھتی ہیں۔ پوری کتاب باعتبار متنوع تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (۱) چمن گل (۲) نیستان نالہ (۳) غمناہ ہے۔ پہلے حصے میں چھٹی چھوٹی ادبی نظمیں ہیں مثلاً پروانہ، سروالہ، قنچہ وغیرہ دوسرے حصے میں اصلاعی نظمیں ہیں جو قوم کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ تیسرے حصے میں

عام تعزل کے رنگ کا کلام ہے۔ مختصر یہ کہ ان کا شعر کوئی نہ کوئی نکتہ اپنے اندر ضرور لئے ہوئے ہوتا ہے کوئی نہ کوئی پیغام وہ ضرور دینا چاہتی ہیں۔ اقبال کا اثر و تقلید ہر جگہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کلام تفریح یا دلچسپی کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے ہمیشہ اصلاح پیش نظر رکھتی ہیں۔ ان کا آرٹ ہمیشہ مقصد کے زیرِ محنت رہتا ہے اسی لئے زیادہ تر ان کا اسلوب ناصحانہ رہتا ہے۔ یہ چیز ایک شاعر کے لئے ناقص اور ایک مصلح کے لئے قابلِ تعریف ہے۔ اقبال کے آخری دور کے کلام کا اثر زیب صاحبہ نے زیادہ لیا ہے بہ نسبت ان کے ابتدائی کلام کے۔ اسی لئے شعریت ان کے یہاں کم ہے نصیحت زیادہ ہے پھر بھی بچنگی اور روانی کلام کو بلندی پر رکھتی ہے۔ جو قابلِ ستائش چیز ہے

کمالا :- مترجمہ راجہ ممدی علی خاں۔ طے کا پتہ نرائن دت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔
سائز ۱۰×۷ صفحہ ۲۳۱، قیمت مجلد عہد کا غذا کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول ”بارواری“ کا اردو ترجمہ ہے۔ بارواری کی تیاری میں بارہ مختلف مصنفوں نے حصہ لیا تھا۔ ترجمہ آزاد صاف اور شگفتہ ہے۔ ناول کا پلاٹ ذرا پیچیدہ ہے اور کوئی ندرت نہیں لیکن جب زیادہ لکھنے والے ہوں تو عموماً ایسا ہو جاتا ہے پھر بھی بنگالی ہندو سماج کے بعض بعض اچھے مرقعے ملتے ہیں۔

ضیغم ایران رضا شاہ ہیلوی :- مرتبہ انعام اللہ خاں ناھر۔ طے کا پتہ کابل بکڈپو لاہور سائز ۱۰×۷ صفحہ ۱۰۳، قیمت مجلد عہد کا غذا کتابت اور طباعت معمولی۔

افسوس ہے کہ رضا شاہی دور ایران میں ختم ہو گیا اور حکومت کی بے بسی اور بے چارگی تمام دنیا نے دیکھ لی۔ کہاں تک یہ بے چارگی بد انتظامی کا نتیجہ تھی یہ ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ مسلم ہے کہ رضا شاہ نے موجودہ ہوا کا رخ نہ بھجوانا جس کی بدولت ملک کو غیروں کے بہرہ کے گوشہ نشین ہونا پڑا حالانکہ موجودہ واقعات اس کتاب میں نہیں آسکے ہیں پھر بھی ناصر الدین شاہ قاجار کے زمانے سے لے کر سلطان محمد علی کے حالات مختصر دیدئے گئے ہیں۔ ترتیب خاصی ہے عام معلومات کے لئے اچھی کتاب ہے۔
دوسری جنگ عظیم :- مرتبہ محمد مرزا دہلوی۔ طے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی، سائز ۱۰×۷

صفحات ۳۰۴، قیمت مجلد غیر کاغذ کتابت اچھی، طباعت معمولی۔

محمد مرزا صاحب نے اس کتاب میں صرف موجودہ جنگ عظیم کے حالات ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ پہلی جنگ عظیم کے اسباب اور اس کے بعد کے اثرات کی بدولت یورپ کی سیاست کی جو حالت ہو گئی اور جن کے باعث موجودہ جنگ وقوع میں آئی، ان سب کا محاکمہ بڑی لیاقت سے کیا ہے جنگ اور اس کا پس منظر کھنسنے سے حالیہ حقیقتیں تمام روشن ہو جاتی ہیں۔ زبان و بیان کی پختگی اس کے علاوہ ہے **خطوط غالب :-** مرتبہ ہمیش پر شاہد صاحب، ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈمی آباد سائرس ۲۲۵ صفحات ۴۸ قیمت للہم مجلد صر کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔

اب تک غالب کے خطوط محض دو جلدوں یعنی عود ہندی اور اردو سے ملنے کے نام سے چھپے تھے لیکن ان میں بہت سے غلطیاں تھیں نیز ان میں تاریخیں موجود نہیں تھیں منشی ہمیش پر شاہد صاحب نے تمام وہ خطوط نیز نواب رامپور کے خطوط اس کے علاوہ جو مستند رسالوں میں نکل چکے ہیں اور جو کچھ اب تک شائع نہیں ہو سکے ان سب کو بڑی سعی اور کاوش سے تلاش کر کے مرتب کیا ہے۔ ہندوستانی اکاڈمی انھیں دو جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اس پر نظر ثانی عبد الستار صدیقی صاحب نے کی ہے اور انہوں نے بہت سے مفید حواشی اس پر اضافہ کئے ہیں۔ غالب کے خطوط اور نفاذ کی عکسی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں بکاتب غالب عرشی کے بعد غالب کے خطوط پر یہ دوسری مستند کتاب شائع ہوئی ہے جس پر مصنف اور ناشرین دونوں لائق مبارکباد ہیں۔

آزادی ہند :- ازمانا کا مذہبی ملنے کا پتہ شری گاندھی سید آشرم بکڈ پوسٹ کورٹ اسٹریٹ لاہور سائرس ۲۲۵ صفحات ۱۲۴ قیمت ۶ روپے کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ کتاب دراصل انڈین ہوم رول کا ترجمہ ہے یعنی وہ مضامین ہیں جو گاندھی جی نے افریقہ میں لکھے تھے اور جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک میں مصروف تھے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے حالانکہ اسے لکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی سیاسیات ہند کے مطالعہ کرنے والوں کو اس میں آنکے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں گی اور بہت اچھی چیزیں ملیں گی

دکھی دنیا :- ازرا جگوپال صاحب اچاریہ۔ ملے کا پتہ شری گاندھی سید آشرم بکڑ پور، نمبر ۴ کو رٹ اسٹریٹ لاہور صفحات ۲۴ قیمت ۶ روکا غذ کتابت اور طباعت اچھی۔ سائز ۲۰x۳۰

گاندھی سید آشرم کی یہ دوسری اشاعت ہے را جگوپال صاحب اچاریہ صرف سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تصنیف سے بھی شوق ہے۔ دکھی دنیا دراصل سات چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے جو کانگریس کے تعمیری پروگرام کی اہمیت اور ان کا اثر دکھانے اور پھیلانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ حالانکہ مصنف کا اسلوب تو ان میں نہیں آسکا پھر بھی اثر اور دور سے یہ ہماری زندگی کی کمائیاں خالی نہیں۔

کیا خوب آدمی تھا :- ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی سائز ۲۰x۳۰ صفحات ۱۲۰ قیمت ۸ روکا غذ نمبر ۱ کتابت و طباعت اچھی۔

آل انڈیا رینڈیو دہلی نے "یاد رفتگان" کے سلسلے میں متعدد تقریریں مختلف لوگوں سے کرائی تھیں۔ یہ سلسلہ کی گیارہ تقریروں کو حالی پبلشنگ ہاؤس نے زیر طبع سے آراستہ کیا ہے۔ جن مرحومین پر تقریریں کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا راشد انجیری، حالی، نذیر احمد، چکبست، داغ، پریم چند، میکیم اہل خاں ڈاکٹر انصاری، اقبال، سردار اسعد، مولانا محمد علی جن لوگوں نے تقریریں کیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ ملاوادی، خواجہ عبد الحمید دہلوی، مولوی عبد الرحمن، پنڈت کیفی، یخود دہلوی جے نند کمار حکیم کی محمد محمد غالب دہلوی، ممتاز حسین، خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبد الماجد۔

یہ تمام تقریریں باوجودیکہ مختصر ہیں لیکن مرحومین کی زندگی اور سیرت پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہیں ناشرین کتاب گھرانہ تحفین ہیں کہ انھوں نے یہ مفید و دلچسپ چیز طبع کر دی۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں ان ہی حضرات سے ان ہی مرحومین پر ذرا تفصیل سے یادگاریں لکھوانے کا التزام کیا جاسکے تو وہ اور بھی دلچسپ ہوگا کیونکہ ریڈیو پر وقت کا اختصار سب کھول کر کہنے نہیں دیتا۔ دنیا فانی ہے کون کس وقت میں ہے کچھ اعتبار نہیں جیتک یہ بزرگ حیات میں ان کی یادداشت سے استفادہ کرنا چاہئے۔

یاد رفتگان :- از خواجہ عبد الحمید دہلوی۔ ملے کا پتہ مٹیا محل دہلی سائز ۲۰x۳۰ صفحات ۱۲۰ قیمت ۷ رو

نہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

خواجہ عبد المجید صاحب دلی کے پرانے مشہور اور مستند صاحب قلم ہیں۔ آپ کی زبان خصوصاً لکھنؤ کی زبان ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں انشا پر دازی اور دہلی کے محاورہ اور سلاست سے ایک عجیب رنگ دیدیتے ہیں آپ کی عمر چھ تک مختلف زمانوں سے گزر چکی ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں اس لئے آپ نے اپنی یادداشت سے یہ مختلف لوگوں کے حالات کا مجموعہ لکھا ہے یہ نہ صرف اپنی جگہ پر بہت دلچسپ اور مفید ہے بلکہ گزرے ہوئے لوگوں اور زمانہ کو ہم سے قریب کر دیتا ہے خواجہ صاحب کا انداز بیان طرفہ لذت دیتا ہے۔

فرست نہیں دی گئی ہے لیکن عنوانات حسب ذیل ہیں میرے محبوب علی پاشا شاہ دکن سرالاجنگ اول۔ مرالاجنگ ثانی۔ سرسید شہل۔ داع۔ ہندو رتن ناتھ سرشار۔ حالی۔ شہر۔ عزیز حکیم محمود خاں حکیم دہل خاں محسن الملک۔ وقار الملک وغیرہ۔
شرح دروہ خواجہ محمد شیع صاحب دہلوی۔ لئے کا پتہ میا محل دہلی ساؤنڈ ۲۲x۲۹ صفحہ ۲۱۳ قیمت ۲۰/-
کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

سکلیات دروہ کی صحیح طباعت کی شد ضرورت تھی خواجہ محمد شیع صاحب نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ دروہ کے شکل اشعار کی شرح بھی لکھ دی ہے کیونکہ دروہ کا کلام زیادہ تر تصوف سے بھرا ہوا ہے اور اب تصوف کے سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ کم ہیں امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف طالب علموں کے لئے مفید ہوگی بلکہ اردو ادب سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے ایک تحفہ ہوگی خواجہ محمد شیع صاحب کی زبان نے بھی شرح کو بہت شگفتہ بنا دیا ہے قابل مطالعہ چیز ہے۔

مالک اسلامیہ کی سیاست :- از عبد السلام خورشید صاحب بی۔ اے ناشر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ساؤنڈ — صفحہ ۲۹۳ قیمت ۲۰/- کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

عبد السلام صاحب نے مالک اسلامیہ کی سیاست پر یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے لیکن موجودہ حالات اس میں نہیں آسکے ہیں اس کے علاوہ واقعات کا بعض حصہ کر دیا گیا ہے۔ ان سے کوئی

نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے نہ کسی قسم کا محکمہ ہو سکا ہے۔ ویسے عام معلومات کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔
دنیا کے آرزو: از میرزا ادیب بی۔ اے (آرزو ناشر نرائن دت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب دہلوی
دروازہ لاہور، سائز ۲۴x۳۲، صفحات ۲۲۸ قیمت ہر کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ تین افسانوں کا مجموعہ تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں سے متعلق ہے جس میں ان کے درد بھری زندگی
کے حالات ڈائری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ میرزا صاحب کے قلم میں زور ہے اس لئے ان
کے یہ افسانے بغیر اثر کئے نہیں چھوڑتے۔ سرمایہ داری کی لغتوں کے خلاف آج کل اردو کے جتنے ادیب قلمی
لغات کر رہے ہیں ان میں میرزا صاحب کا بھی نام لیا جائے گا۔ باوجود میرزا کی ادبیانہ شگفتگی کے حقائق
کی تلخی پوری طرح نمایاں رہتی ہے اور بعض بعض جگہ نفسیاتی مطالعے اچھے نظر آتے ہیں۔

سر سید احمد پاشا یاقات کی پری: از علی عباس حسینی طے کا پتہ بھارگو اکبر پور۔ امین آباد لکھنؤ
سائز ۲۴x۳۲، صفحات ۱۸۸، قیمت عمر دوسرا ڈلٹن کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

حسینی صاحب کا ایک تخیلی اور درملنی ناول ہے جو ۱۹۱۱ء میں پہلی دفعہ نکلا تھا۔ گذارش میں خود
حسینی صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اس میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ۱۹۱۱ء میں میرے سن کے اقتضا
سے ہونا چاہئیں یعنی اس کا ہیرو پرانے قسم کا ہیرو ہے جو ہر جگہ اپنی جان دیدینے اور دوسروں کو بچانے
کے لئے تیار رہتا ہے۔ خود خوبیوں کا پیلا ہے۔ شجاعت اس کی کمزوری ہے۔ ایک حسینی یاقات کی پری
کے عشق میں قربان کی طرح ناممکن سے ناممکن کام کے لئے تیار رہتا ہے آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔

زبان، جملوں کی ساخت اور طرز بیان حسینی صاحب کا محتاج تعارف نہیں۔

رسید کتب

غریبوں کی گائے (نجارتی بکری خانہ) مرتبہ محمود مرزا صاحب قیمت ۳۴ صفحات ۱۲۰ ادارہ تجدید علم حیدر آباد دکن
ہندو مسلم اتحاد: از ستیہ بھگت۔ ستیہ آشرم وردھا، صفحات ۲۲، قیمت ۲۲
دلش کی لیلیا (وطن کے متعلق اچھے گیت) از میاں عبدالحیید بھٹی، بونہار بک ڈپو ریلوے روڈ لاہور صفحات ۸۸ قیمت ۲۲

ربط کا طریقہ تعلیم

انفسیاتی بنیاد | ہر تعلیمی نظام کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں۔ اول نصاب۔ دوم طریقہ نصاب کا تعلق ماضی کی روایات، حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے تقاضوں سے ہوتا ہے اور طریقہ تعلیم کا انحصار نصاب کی نوعیت کے ساتھ نفسیاتی تحقیق و انکشاف پر چنانچہ جب بھی زمانہ کے ہاتھوں زندگی کا خاکہ بدلتا تو سیدار قوموں نے نصاب میں بھی ترمیم و ترمیم لازمی تھی اور اسی طرح جیسے جیسے انسانی ذہن کے تعلق ہماری معلومات حقیقت سے ترقی پھرتی گئیں ہاں طریقہ تعلیم بھی بدلتا گیا۔ نصاب چونکہ ایک قوم کی تاریخ سے وابستہ ہوتا ہے اس لیے اس میں حدود کو بعض اوقات کافی تنگ رکھنا پڑتا ہے لیکن طریقہ تعلیم کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور انسانی فطرت ہر جگہ ایک واقع ہوئی ہے اس لیے تعلیمی طریقہ بنیادی طور پر زمان و مکان کی قید سے بے نیاز عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا کہ انسان کے جسم اور ذہن میں وہی رشتہ تصور کیا جاتا تھا جیسا انسان کے لباس اور جسم میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ لباس جسم کی حالت پر دلالت کر سکتا ہے اور نہ جسمانی حالت لباس کا تعین کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تپ دق کے ایک مریض کو ریشم کے کپڑے میسر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی صحت رکھنے والے جسم کو ڈھانکنے کے لیے چیتھرے بھی نہ مل سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جسم اور ذہن دونوں کی تربیت کے لیے الگ الگ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اور ان تدابیر کی نوعیت خواہ وہ جسم کے لیے ہوں یا ذہن کے لیے ورزشی نوعیت ہوتی تھی۔ ذہنی تعلیم کے لیے جو نصاب تھا وہ زندگی کی کسی غرض کو پورا نہیں کرتا تھا اس کا مقصد ذہنی تربیت تھا۔ شعر و ادب کی تعلیم کا مقصد تخیل و مبالغہ کو اجاگر کرنا تھا اور ریاضی کا مقصد قوت استدلال کی نشوونما کرنا تھا۔ علم ان معنوں میں کہ اسی طرح اختیار کرتا تھا جس طرح آپ اپنے جبروں کو مضبوط کرنے کے لیے ربر بڑبڑانا اختیار کر لیں۔

جسمانی تعلیم کا مقصد و مبالغہات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ ہر بھی ہمارے وقت سے پہلے اسے

ذہنی نشوونما میں مدد دینے کے خیال سے کبھی انقباض نہیں کیا گیا۔ چینیوں کے یہاں تو ساری تعلیم ذہنی تربیت کے لیے تھی اور وہ بھی یہ ادا لیے ہوئے کہ بچے بغیر کچھ بوجے عبادتیں اذہر کر لیتے تھے اور ہر کتاب بند کر کے استاد کے سامنے تیزی کے ساتھ دہرا دینا ہی اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے تھے گویا قوتِ حافظہ ان کے یہاں ذہانت و فراست کا بیان تھی۔ یونانیوں کے یہاں البتہ نہ صرف ذہنی اور جسمانی تعلیم پر کسی قدر مساوی زور دیا جاتا تھا بلکہ ذہن اور جسم کے درمیان جو تعلق تھی اسے بھی بعض وقت پر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ ترقی کی ساری اہمیت یہ تھی کہ اس میں ظاہری حرکات کو اندرونی احساسات اور کیفیات کا ترجمان بنانے کا امکان تھا لیکن ذرا آگے چل کر انہیں یونانیوں نے جسمانی تربیت کو ایک خالص جمالیاتی رُخ دیدیا۔ یونانی فوجانہ جسمانی تربیت سے اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے کے بجائے یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کے جسم ظاہری حسن و تناسب میں بس سانچے میں ڈھلی ہوئی چیزیں بن جائیں۔ ازہر و بطی میں تعلیم کی غرض و غایت "روحانی تربیت تھی اور گو اس کے ساتھ سینٹ بینیڈکٹ کے احکام کے مطابق سات گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام کا التزام تھا لیکن اس ہاتھ کے کام سے جسمانی نشوونما کے بجائے ذہن کو برائیوں سے محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ نشاۃ ثانیہ میں جسمانی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ پوپ ثانی کا فرمان تھا "تھو ساری تعلیم کا یہ لازمی جزو ہو گا کہ تم کمان اور نیزے کا استعمال سیکھو گھر سے کی سواری، کو دنا اور تیرنا جانو یہ چیزیں نہایت باغزت ہیں اور علم کے دائرہ عمل سے باہر نہیں چھوئے۔ بچوں کو کھیل بھی سکھائے جائیں اور یہ ان کے روزمرہ کے کام کا جزو ہونا چاہیے۔ ہمارے زمانے سے قریب ترجمان لاک یہ عقیدہ لے کر پیدا ہوئے تھے کہ "ایک صحیح ذہن ایک سالم جسم کے اندر ہی دنیا میں سب سے بہتر زندگی بسر کرنے کا مختصر گرجا ماحول ہے" لاک کا یہ عقیدہ یقیناً مستحسن تھا اگر وہ جسم اور ذہن کو ایک دوسرے سے اتنا بے تعلق نہ سمجھتا جتنا انہوں نے خود سمجھا اور دوسروں کو بھیایا۔ ان کے پاس دونوں چیزوں کے لیے الگ الگ نسخے تھے۔ لاک کا خیال تھا کہ جسمانی طاقت سختیاں برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن کی تربیت کا انحصار قوتِ استدلال پر ہے اور قوتِ استدلال کی تربیت کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ریاضی خود لاک کے الفاظ ہیں "میں نے ریاضی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس سے ذہن میں قوتِ استدلال پیدا ہوتی ہے نہ اس سبب کہ ہر ایک کو ریاضی داں بنانی

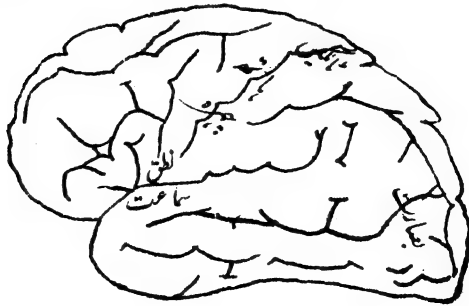
ہو۔ اس طرح اپنی قوت استدلال کو بڑھا کر جو اس معنوں سے پیدا ہوتی ہو وہ (طلبہ) دوسرے علوم میں بھی جب جب اس کا موقع آئے اُسے منتقل کر سکتے ہیں۔ لاک کو آج ہم سے رخصت ہوئے دو سو تین سال گذر چکے۔ اس وقت سے اب تک زمانہ نہ جانے کتنی کر دیں لے چکا۔ علم کی نہ جانے کتنی نئی شاہراہیں ہم پر کھل چکیں لیکن یہ لاک کی غرض قسمی کہتے باقی قسمی کہ اس کے متعین نہ صرف آج تک زندہ ہیں بلکہ بعض جگہ با اثر حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک ٹریننگ اسکول میں انچارج طریقہ تعلیم اب بھی پڑھاتا ہے کہ حساب کا متعدد قوت بدر کہ متغیر داند لایہ کی نشو و نما جو یہ ضرور ہو کہ یہ ٹریننگ اسکول ایک ریاست میں واقع ہو اور وہاں کا انچارج طریقہ تعلیم آج سے پچیس تیس سال پہلے کا نارل پاس ہو۔

ہاں تو میں کہتا یہ چاہتا تھا کہ ابھی ابھی جو حوالے دیئے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدمائے نزدیک جسم اور ذہن الگ الگ چیزیں تھیں چنانچہ تعلیم میں ایسے طریقوں کا فقدان نظر آتا ہے جو بیک وقت جسم اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے ضامن ثابت ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ذہن کو مختلف قوتوں کا مجموعہ مانا گیا تھا جس کی رو سے نصاب کے مضامین کی تعلیم و تھخیص پیدا ہوئی اور سب سے زیادہ خطرناک وہم جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ایک درجہ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ تعلیم بہر اعتبار اور بہر پہلو ایک خارجی اور مصنوعی عمل تھا۔ سادہ بات یہ تھی کہ انسان کی ذہنی تربیت اور اس کی معقول پسندی کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کسی شخص کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا۔ شریعت النفس انسان پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو ریاضی کی مشق کے بعد قوت استدلال بڑھا بیستا معقول پسند اور شریعت النفس بن جایا کرتا ہے۔ اس لیے کہ جس میں آپ کو ستا تا نہ آپ کو شکوہ ہوتا، نہ فرشتے میرا معاملہ نہ سیاہ کرتے، نہ حشر ہوتا، نہ آپ داد خواہی کرتے نہ جھگڑنا دست ہوتی!

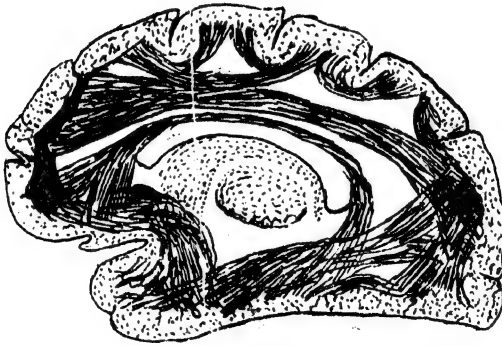
انسانی ذہن سے متعلق اس نفعیات کے مقابلے میں جدید نفسیاتی تحقیق بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا موجودہ ماہر نفعیات بتاتا ہے کہ انسانی ذہن بنی بنائی قوتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سالم قوت ہے جو جسم کے ہر رگ و ریشے سے ظاہر ہو کر کام کرتی ہے۔ ہمارے جسم کی بالائی منزل اس قوت کا مرکز ضرور ہے لیکن اس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔ اس لیے جسم اور ذہن کا رشتہ اس قدر قریبی سمجھا گیا ہے کہ ایک

کی صحت دوسرے کی صحت اور ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی مانی جاتی ہے۔ وہ چیز جو ہمارے سر میں قریب بہن پاؤنڈ کا وزن رکھ کر قائم ہے اور جو دماغ کلماتی ہو وہ چیز ذہن کی مشین ہے اور ذہن اسی مشین کے ذریعہ اپنا کام کرنا چاہیگی کہ آپ دیکھ نہیں سکتے لیکن اس کی بلوہ گری ہر جگہ بے حجاب ہے۔ اسی طرح ذہن دیکھا نہیں جاسکتا لیکن اس کا عمل ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ بجلی کے نظام کے لئے مشین ضروری ہے۔ خواب مشین سے بجلی کی پیداوار اور اس کے نظام میں رکاوٹ اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی کمزوری ذہن کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درشتی اثرات سے ماوراء دماغ کی بہتر نشوونما کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں سب سے پہلی چیز جو دماغ کی نشوونما کے لیے ضروری ہے وہ ہے جو تمام جسم کے لیے ضروری ہے۔ یعنی اچھی غذا جس طرح لاکے مارے ہوئے درخت سے اچھے پھل حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس جسم میں اچھے ذہن کی تلاش بھی فضول ہے جس پر غذا کی کمی کے صدمے گزریں چکے ہوں اگر رتے رہتے ہوں ایسے ذہن کی تربیت کے لیے خواہ کتنے ہی اچھے مواقع فراہم کیوں نہ کیے جائیں لیکن وہ کسی مسیح میاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوا اور چیزیں جو ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہیں وہ بھی سامنے کی باتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہیں کیلئے والوں کا دایاں ہاتھ ان کے بائیں ہاتھ سے کچھ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اچھا اس معنی میں کہ اس میں طاقت تو زیادہ ہوتی ہی ہو لیکن بناوٹ کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ الفاظ دیگر نشوونما کے لیے استعمال لازمی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح دماغ بھی اپنی نشوونما کے لیے استعمال کا محتاج ہے۔ دماغ کے مختلف مرکز مختلف حواس اور جسم کے مختلف حصوں کی فانی کا نظام قائم رکھتے ہیں۔



اس لیے مکمل طور پر نشوونما پایا ہوا دماغ وہ ہی ہو سکتا ہے جس پر حواس نے بے ردک ٹوک کام کیا ہو اور جس نے جہانی اعضاء سے بغیر تکلف کام لیا ہو اور ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں نے زمین کے پامال ذروں سے لے کر آسمان پر چکنے والے ستاروں تک ہر اس چیز کا جائزہ لیا ہو جو نگاہ کو دعوت رنگ و نور دے سکتی ہو ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کے کان فطرت کے سایے میں مدغم سے مدغم نرم پیدا کرنے والے آبشاروں سے لے کر سمندر پر ہیبت ناک انداز میں کڑوٹیں لینے والی موجوں کے سماعت پاش شور سے آشنا ہوں ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی حق شامہ زیادہ سے زیادہ مختلف القسم خوشبوؤں اور بدبوؤں سے دوچار ہوتی رہی ہو ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کی زبان نے بے شمار چیزوں کا ذائقہ لیا ہو اور دماغ کے یہ مختلف مرکز ہی بل کر اچھا ذہن پیدا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شکل میں دماغ کے مختلف مرکزدں کا تعلق دیکھا جاسکتا ہے۔



مادی دنیا اور انسانی دماغ کے درمیان حواس ایک کڑی کلاک کرتے ہیں جس قدر مادی دنیا کے اثرات حواس کے ذریعہ دماغ پر پڑتے رہیں گے اسی قدر دماغ کی نشوونما کے امکانات زیادہ ہوں گے دماغ کی مکمل نشوونما میں اسی قدر اہمیت آزاد جہانی فعال کی بھی ہے۔

انسانی دماغ کا وہ حصہ جو تمام شعور کا مرکز ہے کہ کورٹیکس (Cortex) کہلاتا ہے یہ دماغ کا سب سے

ادبوری حصہ ہے اور رنگ میں راکھ کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ بالائی سے بالائی تک دبیز موتی جیڑا ایک مکمل اور اچھے دماغ میں یہ تہہ پوری لمبائی چوڑائی میں یکساں دبیز موتی جیڑا لیکن اگر ہم کسی ایسے شخص کے دماغ کا معائنہ کریں جو زندگی میں کسی ایک جس یا جہانی نقالی کے کسی ایک مرکز کو استعمال نہ کر سکا ہو تو ہمیں اس کی کوٹیکس کا وہ حصہ جس کا تعلق اس جس یا جہانی نقالی سے متا باقی کوٹیکس کے مقابلہ میں کم دبیز ملے گا یہ دماغ نامکمل اور ناقص دماغ ہے اور اس کے ذریعے کام کرنے والا ذہن بھی ناقص ذہن ہے۔ پروفیسر ٹروٹنگٹن نے ٹورنٹو میں ایک خاتون کے دماغ کا معائنہ کیا تھا۔ ٹورنٹو عام بچوں کی طرح پیدا ہوئی تھی اور قریب تین سال کی عمر تک اس نے عام بچوں کی طرح زندگی بسر کی۔ اس کے بعد وہ ایک خطرناک بیماری کے باعث سماعت سے بالکل محروم ہو گئی اور اس کی بائیں آنکھ بھی جاتی رہی۔ بیماری کا اثر دائیں آنکھ پر بھی پڑا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اس کی یہ آنکھ بھی بے نور ہو گئی۔ ٹورنٹو نے اس حالت میں زندگی کے ساٹھ سال گزارے۔ اس کی وفات کے بعد ڈونڈس نے اس کے دماغ کا معائنہ کیا تو اول تو اسے ٹورنٹو کی پوری کوٹیکس عام دماغوں کی کوٹیکس کے مقابلے میں بہت پتلی ملی اور اس میں بائیں آنکھ سے متعلق کوٹیکس کا حصہ اس حصے سے اور بھی زیادہ پتلا ملا جس کا تعلق دائیں آنکھ سے تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آدمی دنیا اور جو اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بچے کو ان حرکات و سکنات کی آزادی موجود ہو جو اس کے سلسلے میں بطور جوابی عمل کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کی زندگی میں قسم قسم کے رنگین کھلونوں کی سیر و تفریح کی سیلون تماشوں کی اذیتوں کو دیکھنا کی اہمیت صحت دماغی کی پہلی لیکن سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ دماغ کے مختلف حصے ریڈیوسٹ کے (valves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کے ریڈیوسٹ کے سب ڈیولوز میک ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام کر سکتے ہیں تو آپ کا ریڈیوسٹ آپ کی بے شک بہت عمدہ خدمت کرے گا۔ لیکن اگر اس میں ایک ویلوز بھی خراب ہے تو وہ پورے ریڈیوسٹ کی حمدگی پر دماغ لگا دیتا ہے۔ فطرت ہمیشہ انسان پر اقتدار کرنے سے زیادہ اپنے انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک حواس اور جہانی نقالی کے ذریعہ دماغ کی نشرونا کا تعلق ہے فطرت نے خود بچے میں چھل پن کیبل کو دادر چنیدوں کو بنانے بگاڑنے کا رجحان اور جبلت پیدا کی ہے۔ بچہ خود بخود اپنی نشرونا کے لیے

غیر شعوری اور جلی طور پر کہ مشش کرتا رہتا ہے لیکن انوس اس بات کا جو کہ بعض ماں باپ یا استاد بچوں کو ان کے اس بنیادی کام میں مدد دینے کے بجائے اٹلی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ داغ بہت باریک باریک ریشوں سے بنا ہوا ہے یہ ریشے نشوونما کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیچے کی شکل میں نشوونما پائے ہوئے اور نشوونما نہ پائے ہوئے ریشوں میں فرق دیکھا جاسکتا ہے۔



یہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا ہو گا کہ انسان کی صحیح نشوونما میں کیا عناصر بنیاد کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ عناصر ایک مرتبہ پھر عملاً عرض کر دوں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ اچھی غذا

۲۔ حواس کے استعمال کا موقع اور

۳۔ جسمانی فعالیت کی آزادی۔

تعلیم کی آخری غرض دعایت چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح اور مکمل قسم کا انسان پیدا کرنا ہی ہو سکتی ہے اس لیے بہترین نظام تعلیم بھی وہی ہے جو جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کا ذریعہ بن سکے اور حقیقتاً ہماری تعلیم کا نیا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے نسب العین پر خیال و عمل کی توقعیں صرف ہونے لگی ہیں۔ جہاں پہنچ کر ہمیں یہ بات مائل ہو جاتی ہے وہیں ہماری منزل ہو یہاں نصاب کے معنایں ایک دوسرے سے الگ الگ شمار ہونے کے بجائے ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان معنایں کو پڑھانے کا کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں

جہانی خالی حواس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہو۔ جو طریقہ تعلیم ہمیں یہ چیز دہیا کر دے۔ وہی ربط کا طریقہ تعلیم ہو۔ آج سلاسل میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سہولتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہو کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا۔ جیسا بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم کسی صبح اٹھے ہوں اور یہ بات الامام کے ذریعہ ہم میں سے کسی پر وحی کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین اثر ایم۔ لے

ہماری آبادی

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۲۵۲۸۳۷۷۸۰ تھی۔ نفیس مٹی اور خیال ہے کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرائع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک میاں کر کے ڈھونڈنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

کیا اضافہ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے یا بلائے بے دریاں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہے؟۔ ان سب سوالات کے مختلف الجھنوں کی جانب سے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے اور ہمارا افلاس، قرض، خرابی صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر جس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی، محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی بالخصوص حکومت اس خیال کی طرف توجہ دے رہی اور اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دھکیل رہی ہے۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈر اور ان کے دوسرے ہمخواہ ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بڑی حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہیں۔ اینڈت جو اہل لال نہرو اپنی کمائی میں

جہاں فیضی جو اس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہے۔ جو طریقہ تعلیم ہیں یہ چیز مہیا کر دے۔ وہی ربط کا طریقہ تعلیم ہے۔ آج سالہ ۱۹۷۱ء میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سولیتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہے کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا۔ اے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کسی صحیح آٹھے ہوں اور یہ بات امام کے ذریعہ ہم سے کسی پردہ کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین اثر ایم۔ لے

ہماری آبادی

انرا زہ لگا یا گیا جو کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا جو گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۷۷۹,۳۶,۲۵۲ نفوس تھی اور خیال ہو کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی، ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرائع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک مہیا کر سکے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہو۔

کیا اضافہ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہے؟ برصغیر ہوی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے یا بلائے بے درماں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہے؟۔ ان سب سوالات کے مختلف خیال گوگوں کی جانب سے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے اور ہمارا افلاس، قرض، خرابی صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر ہے اس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی، محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی بالخصوص حکومت اس خیال کی طرف توجہ دے کر اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دسیل بنا رہی ہے۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈروں کے دوسرے ہمنوا ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بڑی حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہو۔ اینڈت جو اہل لال نہرو اپنی کافی ہیں

لکھتے ہیں:-

”ہندوستان میں ہماری خوراک کی کمی نہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن خوراک کی رسد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے اور آبادی کے اضافہ سے بڑھ کر اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ دس سال کے سوا یہ اضافہ اکثر مغربی ممالک کی کے اضافہ سے کہیں کم ہے۔“

سال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو گروہوں میں کون بچا ہے؟ دراصل غلطی دونوں کی ہے۔ موزن لڈر گروہ کا یہ خیال کہ ہندوستان کی آبادی زائد از ضرورت نہیں، دلائل اور اعداد و شمار سے ابھی غلط ثابت کیا جائیگا یاں یہ ضرور ہے کہ ہماری زیادہ آبادی نے معاشی پستی پیدا انہیں کی بلکہ یہ پستی نتیجہ ہے حکومت برطانیہ کی غیر بہرہ ورانہ روش کا۔ حکومت کی روش کی تفصیل اس مقام پر غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیوں، حکومت برطانیہ کے مضرت رساں طرز عمل اور حکومت ہند کی لاپرواہی اور سر دھری کی طویل داستان بیان کرنی پڑے گی۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح اضافہ آبادی سے معاشی پستی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خوش حالی سے منطقی کی جانب معاشی حالت کا زوال بھی خود بخود زائد از ضرورت آبادی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ معاشی حالت کے گرنے اور وسائل معاش کے مفقود ہونے سے آپ ہی آپ آبادی کا ایک کثیر حصہ بیکار ہو گیا۔

لیکن اتنا کہہ دینے سے آبادی کے مسئلے کا صحیح اوقطعی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستانی آبادی کے رجحانات کی تحقیق کرنی ہوگی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان رجحانات میں زائد از ضرورت آبادی کی کون سی علامات پائی جاتی ہیں کثرت آبادی سے مراد آبادی کا متوازن حد سے بڑھ جانا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے زرعی ملک میں فی مربع میل زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک سو پچاس آدمی فی مربع میل بتے ہیں کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آبادی گنجائش سے کم ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اگر ہندوستان کی زراعت کی حالت ابھی ہوتی ہو تو بسٹر آلیٹ کا خیال ہے کہ ایک شخص کے گوارے کیلئے کم از کم ۱۲ ایکڑ زمین ہونی چاہیے۔ پوری کے متعلق ڈاکٹر اسٹیل نے اندازہ لگایا ہے کہ اعلیٰ

سیار رہائش برقرار رکھنے کے لیے ہزر رعی گھرانے کے پاس تیس ایکڑ رقبہ ضرور ہونا چاہیے ان اعداد کا جب ہم ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے کسان کے پاس ضروریات سے بہت کم رقبہ ہو چکا، بہار و اڑیسہ یو۔ پی۔ اور مدراس میں فی کس رقبہ کاشت ایک ایکڑ سے بھی کم ہو سی پی اور بمبئی اور پنجاب میں یہ رقبہ ایک اور دو ایکڑ کے بین ہیں ہران اعداد و شمار سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں زمین پر آبادی کا ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے۔ یو پی کی جنگل انکوارٹری کمیٹی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اچھی بارش کے موسم میں بھی صرف ۵۲ فی صد کسان اپنی تمام ضروریات میا کر سکتے ہیں کیا یہ نامداز ضرورت آبادی کی ملامت نہیں؟

اضافہ آبادی کا اندازہ شرح پیدائش اور اموات کے مقابلے سے کیا جاسکتا ہے اگر کسی ملک کی شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں بڑھی ہوئی ہوں تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف شرح اضافہ سے کثرت آبادی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ اگر شرح پیدائش اور شرح اموات میں برابر کی کمی یا زیادتی ہو تو شرح اضافہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر یہ کہ کسی دو ملکوں کی شرح اضافہ تو یکساں ہو لیکن شرح پیدائش اور شرح اموات ایک میں زیادہ ہوں تو دوسرے میں کم۔ اس لیے اضافہ آبادی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے یکساں شرح اضافہ سے ہرگز دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔

ہندوستان کی شرح پیدائش و نیز شرح اموات بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور عرصہ سے اس میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی شرح پیدائش ۳۵.۴ اور شرح اموات ۲۶.۴ تھی اور ۱۹۳۱ء میں یہ شرحیں ملل ترتیب ۳۴.۳ اور ۲۳.۸ ہو گئیں ہیں پنڈت جواہر لال صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انیسویں صدی میں یورپی ممالک کی شرح اضافہ ہندوستان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور بیسویں صدی تک وہ برابر بڑھتی چلی گئی لیکن بیسویں صدی سے اس میں نمایاں کمی ہونے لگی لیکن ہندوستان کی حالت بالکل برعکس ہے اور بیسویں صدی میں ہماری شرح اضافہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔

در اصل انیسویں صدی میں چند غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا

جاتا جو درہ ہندوستان میں اضافہ آبادی کا رجحان جب بھی پایا جاتا تھا۔ یورپ میں اس زمانے میں سائنس کی ترقیات روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نئے نئے ذرائع معاش پیدا ہو رہے تھے۔ نوآبادیوں میں جا رہی تھیں۔ غرض یہ کہ آبادی کے بڑھنے کے بے انتہا مواقع مل رہے تھے لیکن بیسویں صدی میں حالات اتنے موافق نہ رہے۔ نوآبادیوں میں گنجائش بہت کم رہ گئی یورپ کے ستائے ہوئے ممالک کو بھی ہوش آنے لگا اور انھوں نے معاشی ترقی کے لئے جان تو لجد و جدوجہد شروع کر دی۔ یورپ میں خود کفالتی کے چوہے مہرے لگے اور لوگوں میں آبادی گھٹانے کا رجحان پیدا ہو گیا اور محض سب کچھ ہوا اور ہندوستان میں انیسویں صدی میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی غلامی بھی پھیلی۔ ملک کی زراعت اور صنعت، سب تباہ ہو گئی، قحط پڑا، بیماریاں پھیلیں۔ وہاں آئیں۔ غرض یہ کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ آبادی میں نمایاں اضافہ نہ ہو سکا لیکن جب بیسویں صدی میں بالخصوص گزشتہ دس پندرہ سال میں چین نصیب ہوا تو شرح اضافہ پھر بلند ہو گئی اور آج یورپ کے اکثر ممالک سے بلند ہے خیال ہے کہ سالہ ۱۹۸۰ء کے بعد سے ہماری آبادی پچاس لاکھ سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بیسویں صدی کے ختم ہونے تک ہندوستان کی آبادی ستر کروڑ ہو جائے گی کیا یہ حالت خطرناک اور اندیشہ انگیز نہیں ہے؟ اور وہ بھی جب کہ ہمارے پاس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی ذرائع معاش نہیں ہیں اور تخفیف آبادی کے رجحانات مختفا ہیں۔

اخلاقی ضبط ہمارے یہاں نہیں کم سنی میں شادیاں ہو جاتی ہیں، مذہبی رسم و رواج ہیں کہ شادی کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہو گیا یہ سب چیزیں اضافہ آبادی کے رجحانات کو ظاہر نہیں کرتیں، مگر تھاکہ افلاس اور بیماری آبادی کو محدود کر دیتے لیکن مذہبی رسوم ضبط تولید کی غیر مقبولیت اور بہت درجے کے میاں و بہنیش کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہماری نوے فی صد آبادی فاقہ کشی کی درد انگیز مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔

ہندوستان کے اضافہ آبادی کو خوش آمدید کہنے والے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعت اور زراعت دونوں میں محنت کی قلت کا محسوس ہونا آبادی کی کمی کا ثبوت ہے لیکن حاقہ

اس کے برخلاف ہر بے شک فصل کاٹنے کے زمانے میں محنت کی طلب بڑھ جاتی ہے لیکن اس کے بعد مزدور بیکار رہتا ہے بہت سے دیہاتی شہروں میں جا بے ہیں اس لیے بھی فصل کے وقت محنت کی قلت ہوتی ہے جو علاقے شہروں سے دور ہیں وہاں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ بنابرین یہ کمنا غلطی ہے کہ ہر مقام پر اور ہر وقت ہندوستان میں محنت کی قلت رہتی ہے صنعت میں جو محنت کی قلت پڑ جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور کو گاؤں سے شہر میں نقل مکان کرنا دشوار ہوتا ہے علاوہ ازیں صنعت میں جو قلت پیدا ہوتی ہے وہ بامارت محنت کی ہے۔ اس لئے صنعت میں محنت کی قلت کو دور کرنے کا طریقہ اضافہ آبادی نہیں بلکہ بامارت مزدوروں کی تربیت ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ ہمارے سامنے خوراک اور آبادی کے تناسب کا ہے۔ ضروری ہے کہ ملک میں آبادی کی ضروریات کے لائق اچھی خوراک موجود ہو۔ ^{۱۹۱۱ء} میں پروفیسر شاہ اور کھیتانے اس بارے میں تحقیقات کی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت سے چالیس فی صدی کم غذا نصیب ہوتی ہے اور اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ عظیم ^{۱۹۱۴ء} کے بعد سے ^{۱۹۳۰ء} تک کے عرصہ میں آبادی میں آکیں فی صدی اور اجناس خوردنی کے رقبہ زیر کاشت میں صرف ۱۲۴ فی صدی اضافہ ہوا ہے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے بیرونی مالک سے ہندوستان میں اجناس خوردنی کی درآمد بڑھ رہی ہے۔ پروفیسر رادھا کمل کرجی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف اٹھاسی فی صد آبادی کی ضرورت کے لائق غذا پیدا ہوتی ہے بہر حال یہ ظاہر ہے کہ غذا کی رسد ضرورت سے کم ہے جو کثرت آبادی کی اہم نشانی ہے اور جب تک اس صورت حال کی اصلاح نہ کی جائے ملک پنپ نہیں سکتا۔

مسئلہ آبادی کا حل | خوراک کی کمی کیونکر دور کی جائے اس مسئلہ کے حل پر وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر پیش کی جاتی رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیونکر آبادی اور ذرائع معاش میں توازن قائم کیا جائے؟ اس کا حل تین طریقوں سے ہو سکتا ہے؛ یا تو ذرائع معاش کو موجودہ آبادی کی ضروریات کے مطابق بڑھا لیا جائے اور ان میں اتنی بچک بھی رکھی جائے کہ وہ اضافہ آبادی کے تناسب سے بڑھے رہیں۔ یا پھر آبادی کو اتنا گھٹا دیا جائے کہ وہ خود بخود ذرائع معاش سے مناسب ہو جائے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں طریقوں پر

ایک ساتھ عمل کیا جائے۔ ذیل میں ہم ان کی مختصر کیفیت درج کرتے ہیں۔

ذرائع معاش کو وسیع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ملک میں خوردنی اجناس کی رسد بڑھادی جائے۔ اس وقت ملک میں خوردنی اور غیر خوردنی اجناس کا تناسب ۸۲ اور ۱۸ فی صدی ہے۔ غیر خوردنی اجناس چونکہ زیادہ منافع کی امید دلاتی ہیں اس لیے عموماً اچھی زمین پر کاشت کی جاتی ہیں۔ اگر غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دی جائے تو خوراک کی رسد میں ۱۸ فی صدی اضافہ کا امکان ہو لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دینے کے بعد کسان لازمی طور پر خوردنی اجناس کی کاشت کرنے لگے؟ دراصل غیر خوردنی اجناس کی کاشت کی ضرورت اسے اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی کاشت کی بدولت وہ زمیندار اور سرکار کے مطالبات ادا کرتا ہے۔ اگر وہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دے تو زمیندار اور حکومت کے مطالبات کہاں سے ادا کرے۔

ایک دوسری تدبیر غذا کی رسد کو بڑھانے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غذا کی برآمد بند کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں خوردنی اجناس کا کوئی بہت زیادہ حصہ برآمد نہیں کیا جاتا اور آج کل تو خوردنی اجناس کی برآمد دروزد کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ نیز اس تدبیر میں برآمد کو روکنے سے جو خوردنی خالص اثرات پڑیں گے ان کے برداشت کرنے کے لیے ہمیں تیار ہونا چاہیے۔ خوردنی اجناس کی برآمد بند کر دینے سے یہ خطرہ ہے کہ کسان ان کی جگہ مزید تجارتی غیر خوردنی اجناس کی کاشت شروع کر دے اور خوردنی اجناس کی رسد میں معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بیرون ملک سے خوردنی اجناس حاصل کریں۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے غذا کی درآمد برابر بڑھ رہی ہے لیکن اس طریقہ میں نہ تو زیادہ توسیع کی گنجائش ہے اور نہ خود کفالتی کے نقطہ نظر سے یہ طریقہ اطمینان بخش ہی ہو سکتا ہے۔ ہماری قوت خرید کم ہے۔ درآمد شدہ غذا کے بدلے میں اور ملکوں کی طرح ہندوستان کے پاس پیسہ بھی نہیں۔ ہندوستان انگلستان کا قرضدار ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے خام پیداوار اور اجناس خوردنی برآمد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ طریقہ زیادہ دسٹ کا حامل نظر نہیں آتا۔ اگر دوسری اصلاحی تدبیر سے ہماری خریدنے کی قوت بڑھ بھی جائے تو بھی اس طریقہ

کی سفارش نہیں کی جاسکتی کیونکہ جنگ کے تجربوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ غذا کے لیے دوسروں کا دست نگر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

نایدب سے کامیاب تدبیر غذا کی رسد بڑھانے کی "اصلاح زراعت" ہے۔ اس مہتمم باستان کام کے لیے ہمیں زراعت کے تمام مسائل جیسے آب پاشی، تقیم اور انتشار، راہی، طریق زراعت اور آلات زراعت کی اصلاح اور زرعی قرضے وغیرہ کی کل مشکلوں کو حل کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے روپیہ اور ہمت و نیز فلوں اور ہمدردی کی ضرورت ہے لیکن اسے سرانجام دیا جاسکتا ہے اور اس کی تکمیل سے ہماری آبادی کی بہت سی توقعات دابستہ ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑی مایوسی اور نفوس ہوتا ہے کہ ہمارے کسانوں کو جدید ترقیات سے روشناس کرائے کی رفتار بہت سست ہے اور جہاں کسں بھی جدید ترقیات کا پرچار کیا جاتا ہے وہاں انھیں کسان کی دسترس میں لانے کی سعی پوری طرح نہیں کی جاتی تعلیم یافتہ طبقے کو سرکاری دفاتروں کی خاک چھاننے کی ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ باوجود ناکامی کے دوزراعت یا صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ غضب تو یہ ہے کہ کسان کا لڑکا بھی پڑھ لکھ کر زراعت سے متنفر ہو جاتا ہے زراعت اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری کثیر زرعی آبادی اسی لیے مصیبتیں جھیل رہی ہے۔

آبادی کا پیشوں میں ٹھیک تناسب سے تقیم نہ ہونا بھی بہت سی مشکلات کا باعث ہے۔ مسلمانوں کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۶۷ فی صد آبادی زراعت میں مشغول ہے اور بنگلہ ۱۱ یا ۱۱ فی صد صنعت و حرفت میں اور ان میں سے بھی نصف ایک فی صد اعلیٰ پیمانے کی جدید صنعتوں میں مشغول ہے۔ زراعت پر آبادی کا غیر ضروری دباؤ ہے اگر اس زائد بار کو ہٹا دیا جائے اور آبادی پیشوں میں صحیح تناسب سے تقیم ہو سکے تو یقیناً آبادی کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کی صنعتی کیش نے سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے ملک میں قدرتی عطیات کی کمی نہیں اگر سرمایہ اور مہارت کی ضروریات پوری طرح مہیا ہو جائیں تو صنعتوں کی ترقی کے لیے وسیع میدان موجود ہے لیکن اس کے ساتھ یہ لکھا بھی لکھا ہوا ہے کہ کسں ہم کو بھی یورپ اور امریکہ کی طرح

صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مشکلات کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ باوجود اس کے کہ انگلستان اور امریکہ میں صنعتی ترقی اتنا کہ پہنچ گئی ہو وہاں کی کثیر آبادی کا گزرا رہا نہ کبیر کی صنعتوں پر نہیں اور بیکاری کی لعنت وہاں بھی پائی جاتی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید سائنسی صنعتی نظام میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ روزگار میں اس مناسبت سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سرمایہ داروں کا نظام چند خوش نصیبوں کی مدد کرتا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیاں اور کمپنیاں سیکڑوں آدمیوں کا کام انجام دیتی ہیں۔ اعلیٰ پیمانے کے انتظام کی بدولت مزدوروں کی اور بھی بچت ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہندوستان اپنی تمام مصنوعات کو خود صرفت میں لاسکے کیونکہ جنگ عظیم کے بعد جو اندازہ لگایا گیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف نوے فی صد آبادی مصنوعات خریدنے کی استعداد رکھتی ہے۔ ملک کی آبادی میں ہر سال ایک فی صد اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کا لحاظ کرتے ہوئے صنعتی پیداوار کی مقدار دوگنی بھی کر دی جائے تو بھی صرف اسی اضافہ شدہ آبادی کے لئے روزگار فراہم ہو سکے گا۔ پھر ہر سال صنعتی پیداوار کو دوگنا کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ بالفرض اگر ہندوستان اس میدان میں اتنی ترقی بھی کر لے کہ تمام آبادی جدید صنعتوں میں مصروف ہو جائے تو پیداوار اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کھپت ناممکن ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں بیرونی مصنوعات کی درآمد بالکل بند کر دیں اور ہندوستان کو محض ایک برآمد کرنے والا ملک بنادیں ورنہ رہے کہ آج کل تجارت مبادلہ اشیاء کے اصول پر چلتی ہے اگر آپ کے ملک میں بیرونی اشیاء کی درآمد نہ ہوگی تو آپ بھی اپنی اشیاء برآمد نہ کر سکیں گے۔ پھر آج کل خود اکتفا کے جو چرچے ہو رہے ہیں اور غیر ملکی اشیاء کے ہر ملک میں نئے نئے بدل تلاش ہو رہے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے اس قسم کی توقع کرنا عبث ہے۔

چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی ترقی کے یہ معنی نہ لیے جائیں کہ ہم بڑے پیمانے کی صنعتوں کو بالکل ہی بند کر دیں گے البتہ ان کو ناگزیر محدود تک محدود کر دینا ہوگا۔ وہ جاری رہیں گی مگر ان کو یہ ہمت نہ دیا جائے گا کہ چھوٹی اور متوسط پیمانے کی صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مفاد کو کسی قسم کا گزند پہنچائیں، برطانیہ کے عمل دخل سے پہلے ہندوستان اپنی بیشتر ضروریات کے لئے خود کفایتی رہا ہے جس کا سبب چھوٹی اور متوسط

صنعتوں کا رواج تھا۔ آج بھی اگر چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی طرف پوری توجہ دی گئی تو اس پست مالی کا خاتمہ مشکل نہیں۔ ضرورت ہے کہ ان صنعتوں کے لیے منظم اور باقاعدہ بازار فراہم کیے جائیں اور ان کی فروخت منظم طریقے پر ہو۔ جاپان میں موزہ بنانے کا کام نے منظم پیدائش اور فروخت کی بدولت اتنی شاندار کامیابی حاصل کر لی کہ گلدھیانے میں غیر منظم پیدائش اور بے قاعدہ فروخت کی وجہ سے اس کے کام کو جاپان کی ہی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

کسی ملک کی آبادی کو اثر انداز کرنے والی ایک چیز نقل و وطن بھی ہے۔ نقل و وطن سے آبادی کم ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں نوآبادیات میں توطن کی بدولت یورپ میں آبادی کے لیے بہت کافی گنجائش مکمل آئی تھی۔ ہندوستان والوں کے لیے نقل و وطن کے امکانات زیادہ وسیع نہیں۔ کچھ تو ذات پات کے طریقے کی وجہ سے ہندوستانی کو غیر ذات والوں کے ساتھ رہنے سے آرام نہیں ملتا۔ کچھ رسم و رواج اور مذہبی خیالات بھی نقل و وطن کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر ہمارے ملک کا عام پیشہ زراعت بھی اس قسم کا ہے کہ دھڑا دھڑا ہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آج کل صرف ۲۵ لاکھ ہندوستانی بیرونی ممالک میں بستے ہیں۔ اکثر ممالک میں ہندوستانیوں کے کے داخلہ پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ خود حکومت نے مسئلہ ٹیلیک بل پاس کیا جس سے ملایا میں ہندوستانیوں کا نقل مقام تقریباً ناممکن ہو گیا۔ ملک کے باہر نقل مقام روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے لیکن اب بھی کچھ عرصہ تک برا اور سیلون میں ۱۴۰۰۰ آدمیوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ علاوہ ازیں برٹش گیانا میں بھی کافی آبادی کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہاں کی موجودہ آبادی ۳۰۴۰۰۰ نفوس ہے۔ اور اس سے کمی گنی زیادہ آبادی سماسکتی ہے۔ مسئلہ ۹۲ امر کے قانون نقل و وطن میں یہاں ہندوستانیوں کو بسالے کی ایکم بھی بنائی جا چکی ہے مگر ابھی تک اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

ادھر اندرون ملک بھی آبادی کا مختلف علاقہ جات میں توازن قائم کیا جا سکتا ہے۔ آسام اور سی۔ پی میں دوسرے صوبوں کی زائد از ضرورت آبادی کی بھی خاصی تعداد کھپ سکتی ہے۔

اگر ذرائع معاش کے ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھتی رہے اور آبادی کا یہ اضافہ ذرائع معاش کے اضافے سے زیادہ یا مناسب ہو تب بھی ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی ضروری ہے کہ

آبادی سواضاندہ کے رجحانات کو کم کر دیا جائے اور موانعات اجتماعی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے سماجی رواج اور مذہبی عقاید جلد شادی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ہماری آبادی کا میاں و رہائش اس قدر پست ہے کہ بہت جلد اسے حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد فطری طور پر اسے شادی کی ترغیب ہوتی ہے۔ دیر سے شادیان ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہیں۔

بہی عوامان ملک کا پہلا فرض ہے کہ اس خراب حالت کی اصلاح کا بیڑا بنائیں۔ رسم و رواج اور مذہبی خوش اعتقادیوں کے اس ظلم کو توڑ دیں۔ ملک کی دولت میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اعلیٰ میاں و رہائش حاصل ہو، نشر و تبلیغ کی مدد سے اخلاقی ضبط پیدا کیا جائے۔ لوگوں میں صحیح قسم کی تعلیم پھیلائی جائے تاکہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے

وہ زمانہ اب گزر چکا جب ضبط تولید کی حمایت میں پمفلٹ شائع کرنا جرم خیال کیا جاتا تھا۔ تاریخ رچرڈ کارلائل کی ممنون ہے کہ اس نے ضبط تولید پر اظہار خیال کی پابندیاں اٹھا دیں۔ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ضبط تولید کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ ضبط تولید کی تحریک کا یہ پہلو بھی کچھ کم قابل فور نہیں کہ اس کا رواج امر میں زیادہ ہے جن کی قوت تولید پہلے ہی گھٹی ہوئی ہے۔ عوام کی معاشی حالت انہیں اجازت نہیں دیتی کہ ضبط تولید کے قیمتی آلات استعمال کریں۔ لیکن سائنس کی ترقی کی بدولت ابھی اور بے ضرر طریقے ضبط تولید کے رائج ہو چکے ہیں اور وہ عوام کی دسترس سے باہر بھی نہیں۔

مذہبی نقطہ نظر سے ضبط تولید کو برا بتایا جاتا ہے اس کا جواب ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ ”الحکیم“ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم رقمطراز ہیں۔

”اگر حفظ نفس مقصود نہ ہو حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم راہ نمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں“

اسی رسالہ میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :-

”بلاشبہ ضبط نفس اصل آئیدل ہے لیکن معلوم ہے کہ وہ عملاً پل نہیں سکتا۔ کم از کم اس وقت

تک کا ان فی تجربہ ہی جو ایسی حالت میں جو لوگ طبی، منزلی، خانہ دانی، اجتماعی اور اقتصادی مقتضیات پر زور دیتے ہیں یقیناً ان کے دلائل کی قوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔
 کہا جاتا ہے کہ ضبط تولید سے لوگوں کو اپنے اخلاقی جرائم کے چھپانے کا موقع مل جائے گا اور ان میں بد اخلاقی پھیلے گی لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سوسائٹی ان تمام مفید کاموں کو ترک کر دے جن کا بعض لوگ غلط طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ضبط تولید بذریعہ ضبط نفیس کیا جائے اور اس صورت میں کوئی اخلاقی جرم عائد نہ ہوگا۔

جب علامہ اقبال مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ٹیگور، پنجمانی (دخط بنام اگر گریٹ سینگر) اور کتاب ”ضبط تولید کے لیے میری جدوجہد“ اور مسٹر سر جینی ٹائیڈ (تقریر مستورات کا فرنس گراچی منعقدہ ۱۹۳۵ء) جیسی معتد بہشتیاں ضبط تولید کی موافقت میں رائے دے چکی ہوں اور ملک کے حالات کا تقاضا بھی یہی ہو تو ضبط تولید کو ملک میں مقبول کرانے کی سر توڑ کوشش کرنی چاہیے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعہ عوام میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہ کیا جائے۔ ہماری تعلیم بھی اس قسم کی ہونی چاہیے جو ذہنی قوتوں کے ساتھ عمل کی طاقت کو بیدار کر سکے تاکہ پڑھ لکھ کر ہم روزگار سے لگ سکیں نہ کہ ملک کی آبادی میں بڑے لکھے بیروزگاروں کا اضافہ کریں۔

دقت کی پہلی ضرورت ہے کہ حکومت اور ملک کے بھی خواہ مخواہ سے آبادی کے نازک مسئلے کو حل کریں جب تک ان تمام تدابیر پر یک دقت پوری قوت کے ساتھ عمل نہ کیا جائے گا کیٹھن مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ آبادی کے مسئلے کے حل میں ہمارے مستقبل کی تمام تباہیاں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ سبکی آبداری کبھی سر نہ آدر و نہیں ہو سکتی۔

آیتہ اللہ بیگ عارف

اسٹیلن کا روس

رسالہ جامعہ کی اشاعت ماہ ستمبر میں مشرقی ممبر میرٹھی کا ایک مضمون بعنوان "جرمنی اور سوویت جنگ" شائع ہوا ہے یہ لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ ہے جو ٹروٹسکی کی کتاب (The Revolution Betrayed) کو بنیاد قرار دے کر لکھا گیا ہے اس مضمون میں جوہر صاحب نے اسٹیلن اور ٹروٹسکی کے مشہور اختلافات سے متعلق ٹروٹسکی کی تائید کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسٹیلن اور اس کی پارٹی نے روس کو تباہ کر دیا ہے اور اشتراکی نظام کو بھلا دیا ہے۔

مضمون نگار نے اس واقعہ کو حقیقت تسلیم کر کے بحث اٹھائی ہے کہ ٹروٹسکی لینن کے اشتراکی نظریوں کا صحیح پیرو تھا اور اسٹیلن نے لینن کی اشتراکیت سے غداری کی ہے حالانکہ اس بحث میں بنیادی طور پر اسی مسئلہ پر پہلے بحث کرنا چاہیے تھی لیکن جوہر صاحب نے اس کو ضروری خیال نہیں کیا۔

آپ نے آج کے روس پر یہ اعتراضات کیے ہیں۔

۱۔ روس کی اقتصادی حالت انوس ناک ہے۔

اس ضمن میں روس کے ذمہ دار افسروں کے اقوال سے استناد کیا گیا ہے اور آخر میں روس کے ساتھ جو غمناک امر کہ اور انگلستان کی معاشی اور صنعتی حالت کے اعداد و شمار دیے ہیں اور دونوں کے توازن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روس کی حالت مذکورہ مالک کے بالمقابل بہت اتر ہے۔ جرمنی کی بڑھی ہوئی صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لینن کے یہ خیالی جملے آپ نے لکھے ہیں۔

"ستائیس سال پہلے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا"

۲۔ اسٹیلن نے بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کو بھلا دیا جو لینن کا واحد مقصد تھا اور اس

راہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ موجودہ جرمنی روسی جنگ کے شروع ہونے پر سوویت احرار نے حسب ذیل نعرے لگائے۔

”مادر وطن کو بچاؤ سودیٹ کی ایک انج زمین کے لیے خون بہا دو سودیٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو“

کنا یہ ہجہ کہ روسی رہنماؤں نے بین الاقوامیت کے بجائے قومی تصور کو اپنا لیا ہے۔

۳۔ روس نے بین الاقوامی انقلاب کا خیال چھوڑ کر محض عظیم پروتاری امداد سے خود کو محروم کر لیا ہجو روس کی تائید میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

۴۔ چونکہ روسی ساج میں ذاتیں بن گئی ہیں اس لئے فوج میں بھی ذاتیں بنی ہوئی ہیں اس ذات

سازی کا نتیجہ یہ ہجہ کہ روسی سپاہ بالکل باکارہ ہجو اور صرف ۱۶ دن میں جو من فوج اتنی بڑھی کہ آسکو کو خطرہ پیدا ہو گیا — سودیٹ کی فوجیں کہیں سپاہ ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔

جوہر صاحب کے یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں یہ وہی آوازیں ہیں جو امریکہ اور برطانیہ کے

سرمایہ دار پرپس سے رہ رہ کر بلند ہوتی رہتی ہیں اور ذہین و چالاک بورژوا اہل قلم مختلف اسالیب میں انھیں پیش کرتے رہتے ہیں ذیل میں سرسری طور پر میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ مضمون نگار

نے کس طرح واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہجو اور یہ کہ اصل حقیقت بیان کردہ واقعات سے کتنی مختلف ہجو

لینن اور ٹروٹسکی | مسٹر جوہر کے مضمون کا یہ بنیادی نظریہ ہی سرتا پا غلط ہجہ کہ ٹروٹسکی کی رائے لینن کے

فلسفے کی تائید میں تھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے مسئلہ ہی سے شروع ہو گیا تھا

جب لندن کانفرنس میں باشوئیک اور ٹشوئیک الگ الگ ہوئے تھے لینن باشوئیک پارٹی کا لیڈر تھا مگر

ٹروٹسکی اس اختلاف میں لینن کی تائید میں نہیں تھا وہ بالکل غیر جانبدار رہا اسی طرح مسئلہ اور مسئلہ

کے انقلابوں میں بھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے رہا لیکن اس تمام مدت میں اسٹیلن

براہر لینن کی پارٹی کا روح رواں رہا اور ان دونوں انقلابوں میں لینن کا نقطہ نظر ہی صحیح ثابت ہوا۔

یہ کتنا طوطہ بازی حقیقتوں سے انکار کرنا ہجہ کہ روس کی فوجی سیاسی اور معاشی حالت مکمل کیے

بغیر بین الاقوامی انقلاب لانے کا تصور لینن کا نقطہ نظر تھا اس لیے کہ لینن نے خود کہا تھا۔

”ہمیں روس کو اتنا مضبوط کر دینا چاہیے کہ وہ تنہا سرمایہ دار ملکوں کا مقابلہ کر سکے“

جو ہر صاحب ٹروسکی کی اس تجویز پر کہ
 ”روس میں ایک بڑا ریڈیو اسٹیشن طیار کیا جانا چاہئے“
 اسٹیلین کے اس جواب کا مذاق اڑاتے ہیں کہ۔
 بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لیے ایسا ہر جیسے کسی سان کا بجائے
 لگائے کے گراموفون خریدنا۔

حالانکہ عملی سیاست کو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اسٹیلین کے اس جواب کی کیا اہمیت ہے۔ اسٹیلین کے سامنے
 روس کی ۲۰ کروڑ آبادی اور اس کی ابتدائی ضروریات تھیں۔ بڑے ریڈیو اسٹیشن کا قیام کیا قوم کی ابتدائی
 ضروریات میں ہیں؟ اسی پالیسی کا یہ نتیجہ کہ آج روس میں خواہ ریڈیو اسٹیشن ہوں یا نہ ہوں لیکن بھوک فاقہ
 اور تباہ حالی کا وہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔

روس کی معاشی حالت | روس کا مقابلہ جرمنی، امریکہ اور انگلستان سے کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ممالک مدتوں
 سے ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی صنعتی حالت صدیوں سے ارتقاء کی مرہون منت ہے اور روس اقبل جنگ
 سے ایک زراعتی ملک تھا لیکن امریکہ، انگلستان اور جرمنی انیسویں صدی ہی میں صنعتی میدان میں کافی
 ترقی کر چکے تھے۔

یقیناً پرآوازا، آسٹیا، موٹوٹوں اور ریشیوٹوں کا یہ کننا صحیح ہے کہ

”ہماری صنعت ردی حالت میں ہے۔“

لیکن ان بیانات کا وہ مفہوم نہیں ہے جو کسی سرمایہ دار ملک کی صنعتی تباہ حالی کے ضمن میں دیا جاتا ہے اس لیے
 کہ جس وقت پرآوازا یہ لکھتا ہو کہ

”پیرسے کی صنعت بہت ردی حالت میں ہے۔“

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روس کے ۲۰ کروڑ انسانوں کی ضروریات کے پیش نظر وہاں کی صنعتی حالت ناقابل

اطمینان ہے لیکن جب لندن ٹائمز یا نیویارک ٹائمز یہ اعلان کرتے ہیں کہ

”ہماری صنعتی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔“

قواس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے کارخانے جو محض تجارتی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اپنے مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں اس لیے جوہر صاحب کا روس کے ذمہ داروں کے اولیٰ کا اس طرح نقل کرنا کہ پڑھنے والا وہ مفہوم سمجھے جو عام طور پر سراسر یہ دارمالک کی بات سمجھنے کا وہ عادی رہا ہو بالکل گمراہ کن ہے۔ روس کی صنعتی حالت اس کی ضروریات کے مطابق ناکافی ہے لیکن زاری روس کے متقابل کئی گنا ترقی یافتہ ہے۔

جوہر صاحب کا یہ کہنا کہ غلط ہے کہ فرانس میں تقریباً سوا تین لاکھ موٹریں ہیں اور روس میں صرف تقریباً سوا لاکھ لہذا روس کی حالت میں اشتراکیت نے کوئی انقلاب نہیں کیا۔ حالانکہ وہ یہ اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ یہ سوا لاکھ موٹریں اس روس کے پاس ہیں جہاں مسلمانوں سے پہلے چند گنتی کی موٹریں تھیں اور اس سوا تین لاکھ موٹریں رکھنے والے فرانس کے پاس مسلمانوں سے پہلے بھی ہزار موٹریں موجود تھیں۔ اشتراکیت کوئی منتر نہیں ہے کہ اسے پھونکتے ہی صنعتی مجسمہ زمین سے اٹھ کھڑا ہو گا معاشی حیثیت سے وہ عبارت جو اس سماجی طریقے سے جو عوام کی قوت پیداوار کی صحیح مقصد میں رہنمائی کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی خود قوت پیداوار میں بھی شدت پیدا کر دیتا ہے چنانچہ روس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے پنج سالہ پروگرام کے اعداد و شمار اس واقعہ کی پوری تائید کرتے ہیں۔ روس کے ان پروگراموں کو اتنی کامیابی ہوئی کہ سرمایہ داروں کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کے صدر انٹرمسٹر روز ویلٹ نے بھی ایک پنج سالہ اسکیم کا اعلان کر دیا۔

روس اور جرمنی [جوہر صاحب نے اشتراکی روس اور نازی جرمنی کا قوازن کرتے ہوئے لینن کا خیال قول لکھا ہے کہ

”سننا ہوں ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دیا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا“

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ دعویٰ کن اسباب کی بنا پر کیا ہے کیا اس لیے کہ اس کے نزدیک جرمنی کی جارحانہ طاقت روس سے زیادہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ موصوف روس اور جرمنی کے اندرونی حالات سے قطعی نا بلد ہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۹ء تک روس میں کیا ترقیات

ہوئیں اور جرمنی میں اس سلسلہ میں کیا نئے اسلامی اور اختراعی قدم اٹھائے گئے اور ان دونوں میں کیا نسبت ہو۔

جہاں تک جرمنی کی اس ۲۱ سالہ ترقی کا تعلق ہو میں مضمون نگار کو یہ یاد دلاؤں گا کہ جرمنی میں نئی بھاری صنعتوں کا احیا امریکی اور یورپی سرمایہ داروں کی امداد کا مہم بن منت ہوا اگر وہ انگلینڈ اور لندن کے بینک برلن کی مدد نہ کرتے تو کسی طرح بھی ہٹلر کا جرمنی آج وہ طاقت حاصل نہ کر سکتا جو وہ حاصل کر چکا ہو۔ تاہم جرمنی کی طاقت کسی طرح سوڈیٹ روس کی ترقیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی آج کل جرمنی اور ہٹلر کی بڑی طاقت اس کی فوجی کامیابیاں بتائی جاتی ہیں لیکن اگر اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو جرمنی کی فوجی قوت روس کی طاقت کے مقابلہ میں نہیں لائی جاسکتی جیسا کہ گذشتہ لمبائی مادہ کی روسی جرمن جنگ سے ظاہر ہو کہ اس مدت میں جرمنی — جس کے ساتھ فن لینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، اطالیہ جیسے نیم آزاد یورپی ممالک اور آسٹریا، پولینڈ، چیکو سلوواکیہ، ناروے، یونان اور دوسرے مقبوضہ یورپی ممالک کی فوجی طاقت ہو — روس کو کوئی خاص اور قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکا۔

یاد رہے کہ اگر اس جنگ میں جاپان شامل ہو جاتا تو بھی روس کا یہ محوری بال بیکانیں کر سکتے۔ اس لیے کہ روس کی سائبیریا کی فوج بالکل خود مختار ہو۔

روس کی اہم فوجی قوت کا قرار خود جرمن ماہرین نے بھی کیا ہے چنانچہ جرمنی کے مشہور فوجی جنرل ہان نے ۱۶ فروری ۱۹۴۷ء کے مشہور جرمن اخبار دیوئیچے دہر میں مختلف ممالک کی مسلح فوج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

”روس کی فوجی طاقت آج تمام دنیا کے لیے چیلنج ہے۔ وہ ہر طرح جدید ترین ہتھیار سے آراستہ ہے۔ اس کی تربیت نئے اور ترقی یافتہ اصول کے ماتحت کی گئی ہے۔“

ابھی اس جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اطالیہ کے مشہور اخبار ریپوبلیکائیٹلین کے فوجی تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ

”روس کے ساتھ جنگ میں محوریوں کو لابی مدت کے لیے اپنی فتح کے خیالات کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ روسیوں نے جدید ذرائع سے اپنی فوجوں کو آراستہ کر رکھے سوڈیٹ یونین کو

اقبالِ تعمیر بنا لیا ہے۔ محوریوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری مضبوط اور زبردست قوت
 کو احتیاط کے ساتھ لکراتے رہیں۔
 ان حالات میں جوہر صاحب کا یہ لکھنا کہ
 ”سوڈیت کی فوجیں کہیں پیاہور ہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں“
 ایک غیر ذمہ دارانہ اظہارِ رائے کے علاوہ اور کیا ہے۔

بین الاقوامی پروڈلٹاریہ کی مدد جوہر صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب کے تعبیر کو چھوڑ کر اسٹیلن نے
 اس عظیم پروڈلٹاریہ مدد کو کھو دیا جو ایسے نازک وقت میں اسے بہت امداد دیتی۔
 معلوم نہیں موصوف نے کن اسباب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے جبکہ معلوم ہے کہ روس پر جرمن حملہ کے ساتھ ہی تمام
 یورپی ممالک کے پروڈلٹاریہ اور انقلابی گروہوں میں بے صبری کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے جرمن سامراج کے خلاف
 علیٰ جدوجہد شروع کر دی۔ فرانس، ناروے، اطالیہ اور یوگوسلیویہ اور بلغاریہ کے نئے حالات اس واقعہ کے
 ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

بلاشبہ صحیح ہے کہ اگر بین الاقوامیت کی طرف کمیونسٹ انٹرنیشنل مزید توجہ دے سکتی تو یورپ کی بیچنی
 زیادہ شدید ہوتی لیکن اس خیال کے پیش نظر اس وقت جبکہ دو منظم اور تربیت یافتہ فوجیں سائنس کے فوائد
 ہتھیاروں سے مسلح ہو کر گنتی ہوئی ہیں یہ کہنا کہ روس کی طاقت محض پروڈلٹاریہ میں محض ایک طرح کی روایت
 ہو۔ پروڈلٹاریہ ضرور روس کی طاقت ہیں لیکن یہ طاقت مخصوص اور متعین حالات میں ایک طاقت ہی اس وقت
 اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے جب تقریباً دو ہزار میل کے میدان جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجیں گنت
 سامان جنگ کے ساتھ لگرا رہی ہوں اگر روس سرمایہ دار جرمنی سے مقابلہ کرنے کے معاملہ میں فقط بدیسی پروڈلٹاریہ
 کے انقلابی اقدامات پر اطمینان کر کے چپ بیٹھ جاتا تو جرمن افواج دلاؤ و داسک بھی پہنچ جاتیں اور پروڈلٹاریہ
 تک اطلاع بھی نہ پہنچتی۔

جوہر صاحب کو روس پر اعتراضات کرنے میں نسبتاً سنجیدگی اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے اعتراضات
 کی نوعیت سرمایہ داروں کی مجاہدانہ ذہنیت کی جھلک عکاسی ہے۔

محمد تقی اودھوی

علامہ اقبال کا فلسفہ

گزشتہ مہینے کے جامعہ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے ”علامہ اقبال کا فلسفہ“ مدیر صاحب نے دعوت دی کہ اس پر کچھ اظہار خیال کیا جائے۔ اس لیے میں نے مضمون بغور دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عنوان تو بہت وسیع ہے مگر بحث اتنی وسیع نہیں۔ اصل بحث کے اعتبار سے صحیح عنوان ”اقبال کا فلسفہ عقل و دل“ ہو سکتا تھا۔

مدیر صاحب نے اپنے نوٹ میں فاضل مصنف کے اصل خیال کی وضاحت کر دی ہے مگر مضمون کے پڑھنے سے مجھے علم نہ ہو سکا کہ کن اصولی طریقوں سے عقل و دل کے فلسفہ پر فکر کی گئی اور جو نتائج نکالے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ ہم اس انتظار و عجیب گی کو دور کر دیں جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے یا شکل موضوع پر سوچتے وقت خود فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادب عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں جو صاف سوچتا نہیں وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کیے گئے ہیں اور ان لفظی گوروں کے دھندوں سے دور ہو کر جو اعتراضات و پیچیدگیوں کی لنگو میں پائے جاتے ہیں مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفہ عقل و دل کیا ہے؟ جب غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مصنف شاعر کے کلام کی جراحی اور شعری تحریر کے کلام کا منظر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب کی تنقید سے یہ خام طریقہ دور نہ ہو سکا۔ اقبال کے مفکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دہشک ایک مہندر میں

کو پڑتے ہیں جس میں کو دنے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انہیں سوائے ادھر ادھر ہر گز پیرانے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی سیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہو حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہو جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بحیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہو اور تجربہ زیادہ نغیات، ادبی تنقید کے اعلیٰ اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجربے یا تقابل پر رکھی جاتی ہو۔ حالانکہ تجربہ سے زیادہ ربط (Synthesis) کی ضرورت ہو۔

اس انداز کی بخنوں کا نتیجہ ہوتا ہو کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہر گز بحث کرنے والوں کی ذاتی طلیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہو دوسرے..... اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہو جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہو قرآن مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو آیات بیانات کی حدود سے نکال کر فقہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا اسی طرح اندیشہ ہو کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں نگم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشین کر لیا جائیے۔

۱۔ شاعر اقبال فلسفی نہیں ہو، فلسفی کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہو جو ابتدا سے مسائل پر ایک خاص نقطہ خیال، اہمناک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات رد و قدح کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہو۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہوتا ہو۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفہ سے متصادم نہیں کیا جاسکتا میری رائے میں فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان، یا سبب ان مقل کا محسوم

منطق اور معقولیت کا شکار ہوتا ہے اور اس کے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان شور و منطق اور ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کے تجل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو ”حکیمانہ شاعری“ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی مستقل نظام نکتہ یا معقول اور منطقی محاذ قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

۲۔ جس طرح شکر کی دنیا فلسفہ نہیں ہوتی اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام عمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کا گریں یا سلم بلک کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راستہ اور بالارادہ لائحہ عمل بنا سکیں شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشویشنا یا قائل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو دلچسپ بنانے کے لیے جذبات اور احساسات سے کیلتا ہے، لیکن اس طریقے سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳۔ اقبال خوش قسمتی سے کیئے یا تہمتی سے غمزوں میں بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے اور تقریریں کیں، ہم اُن سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شاعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قائم رکھتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور اُن میں کیا وسعت اور اثر پیدا کرتی ہے؟ وہ خود شاعر نہیں جانتا اس لیے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقاید کو معلوم کرنے کے لیے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعے سمجھنے کے لیے دنیا کے شکر کی جاوگری کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ۲۵ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پہلی نظم ”کوہ ہالہ“ کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور فنی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ شاعر اقبال میں انسان اقبال کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے پر غور کرتا ہوں تو ان کے الفاظ

تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے نفس شعور اور احاس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں
جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے۔ اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طو کرتا ہوا شعر کے قالب میں
اپنی نمود حاصل کرتا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

بنیم از گمازد دل، در دجلہ آتشی جویل غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر بن بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا مہیا بنایا یہ اصول رہا جو کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکس خیال ہوتے ہیں) خیال
نہیں ہوتے، غور کرنے کے بجائے "گمازد دل" کو محسوس کروں اور وہ بہ ضمیر حاصل کروں۔ اس طرح میں شاعر
کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پر ناز کرتا ہوں۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقہ فکر و استدلال ہے اس سے مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد
قوتیں موجود تھیں ایک عقل کے راستے سے غور و فکر دوسرے دل کے راستے سے مشاہدہ باطن۔ اقبال
کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تو اس نے کہا۔

خود افرو در مدرس ملکمان فرنگ سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظران

ان دو قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درس ملکمان فرنگ" یعنی فلسفہ
دوسری طرف "صحبت صاحب نظران" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے لیکن
یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگ درا
سے لے کر ارخان مجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور
خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کتنی طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی
تصادم کا مال کیا ہوا؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے
ایک بانگ درا، دوسرے پیام مشرق، تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے
درمیان فی فلک پر چڑھنے والی ہیں۔ یاد رکھیں کہ ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے
سے ملاتی ہیں۔

ہنگ در میں اقبال ایک نوجوان شاعر جو ذوقِ جتو کا شکار ہو لیکن اسکے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیامِ مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکرِ اقبال کے مکمل شباب اور کھٹنگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پر داز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی منزلت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزل عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جو جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں ابراہیم سے اور دروازے گلے ہوئے ہیں۔

پیامِ مشرق کی منزل پر اقبال ایک قسم کی کشش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے اور بعض کا نہیں لیکن اس کشش میں وہ جن مستقل تجویز پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لیے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل، قلب اور باطن کی قوت سے دور ہو گیا۔ مشرق ہنوز اس روحانیت کا محافظ و علمبردار ہے لیکن یہ آگِ سینہ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بڑھکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفہ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام ہی ہے۔ پیامِ مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ”درس حکیمانِ فرنگ“ پر ”صاحبِ نظراں کی خاموش تعلیمات ہر طرح مادی آفتی رہیں چنانچہ جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے اور ایک منکر درویش کی طرح نعرہٴ اللہ پڑگانے لگے۔

کلامِ اقبال میں عقل و دل کی کشش بڑی دلچسپ ہے جب ذوقِ جتو بڑھ گیا اور شاعر درویشِ فلک سے گزر کر درویشِ حق بن گیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل نظریہ

جو قائم کر لیا ہو وہ حسب ذیل ہو۔

حقیقت ایک کل ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری و دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے اور جو چیز جو توجہ کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس کو چسپ منے پرانا اللہ بشرط فرست میں کچھ اور لکھوں گا ہم نے غصہ نہ کیا کہ اقبال کا ارتقاء ذہنی کس ماحول میں ہوا؟ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ برجستہ تجربی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔ (۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی۔ میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ مورخ علم، اور کچھ فنکارانہ زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو تضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دونوں کو ملانے کی بھی کوشش کی چونکہ ان کا خیال مجاہد طرح کا بھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کش مکش میں انھوں نے دو اہم سوالات کیے۔

۱۔ انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؟

خود مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابت کیا گیا؟ کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں میری اتہا کیا ہو؟
۲۔ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکنا نہیں ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا فلسفہ عشق یا امن کی دینا۔ قدیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے ماحول کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔

عشق کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے تین راستے متعین کیے۔ (۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل۔

عمل ایک جامع لفظ ہے جو دنیاوی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد سوئی ہوئی اور کاہل قوم کو جگانا، ترقی پر آمادہ کرنا اور اسے کام کی قوت دکھانا ہے خواہ وہ

سیاست ہو یا ریاضت، اس پیغام کو انہوں نے طرح طرح سے اگسایا دو ایک مثالیں خود جو ہر صاحب کے دہے ہوئے اشارے معلوم کیجئے۔

(۱) لاکھ کلیم سر مجیب، ایک کلیم سر رکعت

(۲) زندہ قوت تھی جاں میں ہی توحید کبھی آج کیا ہی فقط ایک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہوجس کی رگ دپے میں نقطہ مستی کو دار

یقین اور شری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کچھ تو زیرِ پ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر ان متناقض حیات پر اپنا یقین کھڑی ٹیھی ہے جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جتنا جس بات پر یقین ہوگا اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہوگا عمل میں جوش پیدا کرنے کے لیے حقایق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرات اور حکمت کے ساتھ کی گئی۔ ایسے دور میں جبکہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے اور علوم کے نظریات کے باہمی تضاد کی وجہ سے اسے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے ذوق یقین کو اگسا نا کمال تھا۔

خودی یقین اور عمل کے ساتھ ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انہوں نے اپنا فلسفہ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے خاص انداز سے پیش کیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا اقبال اس بے خودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کابل بنا دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی اپنے مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ نہیں بلکہ مثبت طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیے۔ خودی ہو یا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچا جاتے ہیں لیکن حالات زمانہ کا اتنا تضاد ہے کہ منزل کبریا کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے جس طرح مصنف نے سمجھا۔ اس مقام پر خودی اور عشق عقل و دل، یاقوت کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ وہ خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "میزداں بکند" اور "کاغذ بے پیدا کرے۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے اور اس مقام کا

حصول اور یہاں تک رسائی کے لئے پہلے حوصلے کی ضرورت ہو۔ حوصلہ خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو پانے دیکھنے کے لئے لازمی ہو کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جمع کرے اور بلند مقام پر آ کر خدا کو دیکھے۔ یہ عمل اس کی ثایان شان ہو اس طرح خودی نہ صرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے، تو کہیں نفس، ریاضت، ذکر، تپیل، مراقبہ سب جائز لیکن اقبال کے فلسفہ کے مطابق یہ خود انکھاری (Self Denial) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خود شعوری (Self Consciousness) اور خود ثباتی (Self Assertion) کی روح اور رابطے کے ساتھ۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا ارادہ عام انسانوں کے فائدے کی چیز نہ کہ خودی اعتبار سے بھی مفید ہو گا اگر یہ آئندہ پل کرے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے ثایان شان ہوگی۔ اس خودی کے دو روپ یہ ہیں۔۔۔

(۱) خودی کو کم بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پرچھے بتا تیری رضا کیا ہو۔

یہ سخن کلمہ مافی السموات و مافی الارض کی نہایت ذی شعور، حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی جا سکتی ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح کا ہی میں انھیں پختہ ترک دو طریق فنا کا ہی میں انھیں۔

جو ہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عہدگی سے واضح ہوتا ہے۔ طریق فنا کا ہی، گو فرسودہ ہو چکا ہو لیکن عشق کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں پختہ تر ہونا چاہیے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے اور فکر کا تعلق عقل سے ہو جیسے اقبال کی اور جگہ کہتے ہیں۔

گفت مرگ عقل، گفت مرگ فکر گفت مرگ قلب، گفت مرگ ذکر

ان مختصر توضیحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے جہاں خدا اٹھ آتا ہے اس تک پہنچنے کے تین راستے ایک خودی (۲) عمل (۳) یقین۔ انھیں پروردگار دینے کے لئے اس نے طرح طرح کی تشبیہیں، استعارے، حکمت اور دوزخی کے حکمت اور مثالیں پیدا کیں۔ انہوں نے کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر جہسب نہ نہیں ہیں اور نہ ان کا مفہوم صحیح پیش کیا گیا ہے مثلاً انھوں نے ایک شعر پیش کیا ہے۔

معجزہ اہل فکرمفسدہ بیچ بیچ معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہو دوسرے مصرعہ میں اقبال نے عمل یقین اور عشق کے متفقہ پیغام پر زور دیا جس کے منظر حضرت موسیٰؑ ہیں اور ان کا تعلق فرعون اور طور سے ہے پیغمبر اقبال کے نزدیک خودی عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے فاضل مصنف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا اسی طرح اقبال نے عمل اور خودی کی قوت کو اکاٹے کے لیے فلسفہ شاہین کی دلچسپ تشبیہ پیدا کی عقل کو غلام عشق کو امام علم کو پوست عشق کو مغز جنوں کو جو عشق کی ایک دالماہ کینیت ہے علم سے زیادہ تیز رو بتایا بہر حال جس موقع پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حق کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا۔ مثلاً عقل ہے بے زہام ابھی عشق ہے بے مقام ہاں نقش گرازل ترانقش ہر نام ابھی اس شعر میں عقل اور عشق کی نامی اور بے راہ رومی پر انوس کیا ہے۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراتبے یہ سرور تری خودی کے گنجباں نہیں تو کچھ بھی نہیں مصنف کے پیش کردہ اس شعر میں جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے جانے کے بخشد دیگر نہ گیرند آدم بہ میر دا زبے یقینی اس شعر میں یقین کی قوت دکھائی گئی ہے۔

ننان راہ عقل ہزار حیلہ مہر بس بیا کہ عشق کمالے زیک نمنے دارو اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے اس طرح مطالعہ کرنے سے معایم ہو گا کہ ہزار طریقوں سے اقبال نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کلامم ہو جاتا اگر ان عناصر میں توافقی باہمی کے بجائے تضاد باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ان کے مدایح اور فوقیت کا ہر منزل پر خیال رکھا ہے۔ اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے جو ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ فاضل مصنف اس مقام پر غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر میں یہ بتانا مناسب ہو گا کہ

- ۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی۔ ایک تو ”العلم حجاب الابرار“ دوسرے اس کے خیالات میں اس کے مطالعہ اور شاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر پرچائیاں آئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گزشتہ بڑی شخصیت میں خواہ وہ غزالی ہیں یا برگسان تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا جو یہ نظریہ برگسان کا جو اس لیے ناموزوں ہو کہ اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح نظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا انہیں غماض کیا جائے۔
- ۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقایق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہو کہ حقایق نئے نہیں ہوتے شاعر جن حقایق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھٹلے لے ہوتے ہیں بہت ممکن ہیں تو ”نہ اسائن با آئین دنیا“ سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اقبال کی ”سن کی دنیا کو نئی چیز نہیں، خود کو نئی بات نہیں ہوا اور ہوبھی کیسے سکتی ہو۔ اس لیے اس مفروضہ یا تصور راقبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھائی چیزیں پیش کرتا تھا۔ انتہائی ادبکل شاعر تھا۔ علم تھا۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ غیر ضروری صفات کا افسانہ کر کے اس کے کلام کو شکل تر بنا دینا ہے۔

جہاں تک اس کے پیامات شاعرانہ کا تعلق ہو میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہً اقبال نے اپنی شاعری کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لیے انہیں شعر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اگر اس نے اپنی تقریروں میں شور و ارادے سے سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے بیان کیے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہو کہ وہ خیالات اور نظریات میں ”عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح شعر میں یہ شاعری کی ایمائیت (suggestiveness) اثر اور وجدان کو روکنا جس کے ذریعہ اہل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور ذہنی تاثیر پیدا کر لیتا ہے۔ خود شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالوں میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں؟

محمد عبد القیوم خاں باقی

عاشقی

انسانی زندگی میں سیکڑوں گوناگوں واقعات پیدا ہوتے ہیں اور پورے ہوتے ہیں عموماً ہلکے منسوب کے قول میں بے آہنگی کے عنصر کا کیا ذکر ایسی ہم آہنگی اور مطابقت ہوتی ہے جیسی تصویر کے ساتھ پس منظر یا مطرب کے ساتھ باجے کی آواز واقعات ہماری پیش بندیوں کے مطابق اس طرح پورے ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ہنسی و حال کی خوشگوار تاریخ سے اپنے مستقبل کے بھی اتنے ہی روشن اور خوش آئند ہونے کی امید کیا کرتے ہیں لیکن خواہش کے مطابق کاموں کی تکمیل اور حصول مقصد کے باوجود ہماری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آتا ہے جو ہمیں مہبوت اور ہمارے مستحکم و دیرینہ نظریوں کو ستر لال کر دیتا ہے۔

عشق اتنا اہم موضوع ہے کہ اس کی حقیقت عاشقوں کی حالت کے شاہرے یا غم عشق میں مبتلا ہو جانے کی آرزو سے سمجھ میں نہیں آ سکتی اس کے لیے نہ تو وجدان و کشف کافی ہیں اور نہ معقولات و منقولات بلکہ عشق سے روشناس کرانے والی چیز ہمارے لیے محض ذاتی تجربہ ہی مشہور ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر معقولات اپنے دوستوں کے حلقہ میں موضوع عشق پر بحث کر رہا تھا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ کوئی قطعی رائے اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ خود اس کی کٹھن واقع نہ ہو۔ فرانسیسی کو بہت برا معلوم ہوا وہ جلسہ سے باہر نکلا اور ارادہ کیا کہ بغیر تجربہ کیے ہوئے منہ نہ دکھائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کہ میں پھر اسی موضوع پر گفتگو کر دں گا اس لیے کہ اب میں عشق کی لذت و درد کا خوگر ہو چکا ہوں۔ اگرچہ اس قلیل مدت میں وہ کیفیات اور مداح عشق سے کیا واقف ہو سکا ہو گا تاہم اس واقعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ عشق کو کتابوں اور اقوال سے کوئی نہیں سمجھ سکتا اس کے لیے صرف ذاتی اقدام اور انفرادی تجربہ ہی ضرورت ہے۔

عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہم میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے ہماری آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ہمیں گزشتہ تمام تمنائیں گرد معلوم ہونے لگتی ہیں عشق سے پہلے ہمارے باغ آرزو کی بوہمہ متدل

Stevenson's "On Falling in Love"

لے یہ ترجمہ ہے۔

تھی، ہمارے جذبات میں اشتعال نہیں تھا لیکن اب ان کی جگہ ایک ایسے زبردست جذبہ نے لے لی جو ان تمام چیزوں کو محو کر کے ہم پر پورا پورا غلبہ حاصل کر لیتا ہوا دس وقت ہم درد و رنج کی ان لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں جن سے ہمیشہ ناہلہ تھے۔ صرف عشق ہی اس مقول پسند دنیا میں ایک نامقول اقدام ہے جو عقل و فکر کا پابند نہیں۔ اس کے اثرات بھی بالکل غفلت اور غیر متناسب ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب اور کس کے عشق میں مبتلا ہو جائے گا۔ روز کی بات ہو کہ خود غیر مانوس انسان جن سیرت و صورت سے ماری ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں جیسوں دفعہ ایسا ہو کر تا ہوا اور ان کو کوئی خیال بھی نہیں ہوتا کہ دفعتاً ایک دفعہ انھیں احساس ہوتا ہو کہ وہ عشق کے دیوتا کا شکار ہو گئے جس نے دونوں میں محبت کا وہ ربط قائم کر دیا ہو کہ مشوق غرض تخلیق عالم اور عطر کشیدہ آفرینش معلوم ہونے لگتا ہو۔ مانتے کے خیالات اس پرستہ باطنی میں اتنی مضبوطی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے فعل کو مشوق کی پرستش اور خوشی کا سبب سمجھنے لگتا ہو یاں تک کہ اس کے اپنے وجود کا مقصد بھی محض محبوب کے ساتھ ہم نشینی اور ہم نوائی ہو جاتا ہو۔ لوگوں کو اس قدر پرہیز گار ہوتی ہو کہ ان دونوں میں کون ایسی چیز باہر الاقتیاد تھی جو ایک دوسرے سے محبت کا پیش خیمہ ہوئی؟ ان کے نزدیک اگر مرد اپولو بلو بیڈر (APOLLO BELVEDERE) کا اتنا حسین ہوتا اور عورت اُس پر فریفتہ ہو جاتی تو چنداں محل تعجب نہ تھا لیکن دشواری تو یہ کہ یہاں مرد میں وجہ سیرت و صورت بھی نہیں کہ وہ عورت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے پھر عشق کا آخر کیا سبب ہوا؟ غالباً اس سلسلہ کا مکمل

”سیار شیوہ ہاست تباں را کذا نام نہیت“

میں مل سکے۔ ورنہ جہاں تک حسن صورت کا تعلق جرمیری دانست میں صرف دو مرد یعنی لیانا رڈوڈا ونسی (LEONARDO DA VINCI) اور گوٹے (GOETHE) ایسے ضرور گذرے ہیں جو جوانی میں

لے اپوزیٹا نہیں کے خیال میں سورج اور مریخی کا دیوتا مانا گیا ہو۔ اس کی شبیہ بے مثل سنگ مرمر کی بنائی گئی تھی اور جوانی و جن کی کوئی دلخاشائی بھی باقی تھی۔

۱۷۰۰ء پندرہویں صدی کا معروف اطالوی مصویر جو غیر معمولی جوانی و جوانی رکھتا تھا۔

۱۷۰۰ء اٹھارہویں صدی کا جرمن فلسفی و شاعر نہایت حسین شکل تھا جو اس سے ملتا تھا کہ وہ دیدہ ہو جاتا تھا۔

عورتوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے تھے۔ ان کے علاوہ مردوں کا بڑا حصہ کسی طرح اپنی جسمانی خوبصورتی سے اس قابل نہیں کہ وہ اپنی لنگاہوں سے عورتوں کے سنیہ کو چھلنی کر دے۔ عورت کے لیے اس کے برکس جاذب لنگاہ ہونا بالکل ممکن ہو لیکن برہمنی سے میں مردہوں اس لیے غیر جنس کے نفیات پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔

دنیا میں سیکڑوں کام ایسے ہیں جن کے سبب خود ہم ہوتے ہیں ہم چاہے اسے کریں یا نہ کریں تقدیر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہماری تمام روحانی فضیلتیں، شہقت، بلند خیالی، نیک اعمالی اور تمام وہ کام جو ہماری روحانیت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ہمارے ہی بس میں ہیں، ہم انھیں چاہے بگاڑیں چاہے بنائیں، تقدیر کا ان سے کوئی تعلق نہیں لیکن دینائے عشق میں تو بس مقدر ہی کی مگرانی ہے۔ عاشق ہونا یا نہ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ عشق اختیاری داکٹرابی نہیں بلکہ اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شکیسپیر بھی اس میدان میں سپر ناماختہ رہا اور جب ملکہ ایڈیٹھ نے اس سے فالسٹاف کو عاشق کی حیثیت سے پیش کرنے کی فرمائش کی تو اسے بڑی وقفوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت ناکامیابی ہوئی اس لیے کہ عشق کا مظاہرہ سب کے امکان میں نہیں اور فالسٹاف جیسا موٹا مکڑوہ، ہنرور اور اہل زمانہ کبھی بھی اس کا مناسب موضوع نہیں بن سکتا تھا شکیسپیر کی طرح ہنری فیلڈنگ بھی عشق کی چاشنی سے بے خبر تھا۔ سوائے راب رائے نامی ناول کے ایک آدھ باب کے اسکاٹ کے متعلق بھی میری یہی رائے ہے جب یہ تین تاریخی شخصیتیں یعنی شکیسپیر، فیلڈنگ اور اسکاٹ جن میں سب کے سب تخیل کے اعتبار سے بلند پرواز صحت کے اعتبار سے تندرست، احساس کے اعتبار سے ذہنی اور لمبا بلع کے اعتبار سے غیر انسان تھے اور جن سے ہم عشق کی صحیح ترجمانی کے متوقع ہو سکتے تھے اس وادی سے ناکام واپس آئے تو ان زرد روہے جس اور خود پسند انسانوں سے جن کا زیادہ وقت

لے شکیسپیر کے ڈرامہ ہنسری چارم میں پرنس ہال کا ندیم ولیس ہے۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد ملکہ ایڈیٹھ نے شکیسپیر سے فرمائش کی کہ فالسٹاف جیسے یوقوت آدمی کا عاشق کی حیثیت سے دکھائے چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ایک دوسرے ڈرامہ میں فالسٹاف کو ایک خدا دسہ کا عاشق دکھا یا اگر ناکامیاب

لباس کی سچ دنج میں صرف ہوتا جو درجن کی تعداد شاید دنیا میں سب سے زیادہ کبھی عشق جیسے بلند جذبہ کی امید کرنا حاققت نہیں تو اور کیا ہو۔ بن کی تو بس یہ مثال ہے کہ جس طرح بیگہ ہوا کپڑا لنگ سے یا نا بیٹا مناظر قدرت سے متاثر نہیں ہو سکتا اسی طرح مادہ جذبہ و انجذاب کا فقدان ان کے دل کی بستی میں عشق کو کبھی خیمہ زن نہ ہو سکے۔ دے گا اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو مادہ انجذاب رکھنے کے باوجود محبوب کا عشق حاصل نہیں کر سکتے اور یوں تخلیق عشق مکمل ہو جاتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس ناکامیابی کے بھی اسباب وجوہ ہیں:-

مشتوق سے اظہار عشق ایک نہایت نازک اور اہم بات ہے۔ اکثر اوقات مناسب موقع کا نہ ملنا یا جھپک کی وجہ سے عشق ظاہر نہ کرنا بھی محبت کو ختم کر دیتا ہے۔ بعض عشق کی ڈینگ مارتے ہیں مگر وہ اس سے باہر قدم نہیں رکھتے لیکن ایک عقلمند انسان مقدمات عشق سے واقفیت کی وجہ سے پہلے ہی سے زمین ہموار کرتا رہتا ہے اور مناسب موقع پر اظہار محبت کر کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے مرد بھی ملیں گے جو حد سے "ارنی" اور جواب "لن ترانی" کے بعد بھی اپنی بات پراٹے رہتے ہیں اور آخر کار عشق حاصل ہی کر لیتے ہیں لیکن اس ضد میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ عورت فطرتاً عشق کا دم بھرنے سے ادب کبھی چپڑی باتوں کو خوش ہوتی ہے تاہم معاملہ کی تکرار سے پریشان ہو جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ عاشق اپنے فعل سے محبوب کی نظر میں بیک ہو جائے۔ اگر بغرض محال ایسا نہ ہو تو بھی زبردستی کے عشق کے بعد شاید زیادہ خوش گوار اور دیرپا نہیں ہو سکتی۔ عشق جہر یہ کامیاب نہیں بنایا جاسکتا۔ عشق تو دراصل وہ ہے جو غصے سے پیدا ہو، مداح کمال طو کرنا ہوا دونوں طرف آگ لگا دے اور محبت کی آغوش کھول کر ایک دوسرے کا استقبال کر لے۔ یاد دوسرے الفاظ میں عشق کی ابتدائی حالت یوں سمجھو کہ دو مشت کے متوالے کمال احتیاط اور مشعل جذبات کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں جس طرح کہ دو نادان بچے ایک انجان اور تاریک کمرے میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تکتے اور ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلتے ہوں جب عشق کی یہ کیفیت ہوگی تب ہی نظروں یا پیتانی سے ایک دوسرے کے خیالات اور کھیلوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح عشق کی آواز بارگشت دونوں دلوں کو باخبر کرے ایک دوسرے سے اس طرح واقف کر دیتی ہے کہ انہیں اظہار عشق کی ضرورت

بھی نہیں ہوتی۔ وہ آپس میں اس طرح یک جان ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ روحانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ عاشق کے دل میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ یہی بات محبوب کے دل میں بھی پیدا ہوتی ہوگی عاشق ہونا جتنا تحیرنازک اور متناہی مفید بھی ہے۔ یہ زمانہ کے انحطاطی اثرات کو زائل کر کے طبیعت کو حقیقت اور دماغ کو قوی رکھتا ہے۔ یہ بددماغی اور بد مزاجی کو جس کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے دور کر کے انسانی احساسات میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اس کے خفہ اور نیم خفہ جذبات کو سیدار کر دیتا ہے عشق سے قبل تک انسان ان تمام لذائذ کا جو اس کی پہنچ سے باہر تھے منکر رہا کرتا۔ چیزوں کے تاریک پہلو پر نظر رکھتا اور روشن پہلو سے قطع نظر کر کے زندگی کی بیکار و بد مزہ چیزوں سے دل بستگی حاصل کیا کرتا تھا۔ اس طرح گویا اس نے زندگی کے تمام عمدہ جذبات، جوانی کی لذت، ظرافت اور جن کہ جس کا اس کے پاس ذخیرہ تھا عدم استعمال کی وجہ سے زنگ آلود کر دیا تھا۔ وہ محبت کے باغیوں کا ایک رکن بن گیا تھا۔ خود داری کا غلط مطلب اور خود غرضی کی آزاد کو دوجہ ناز سمجھتا تھا۔ وہ اپنے محدود حلقہ مشاغل سے قدم باہر نکالنا گناہ اور شادی کو ڈراؤنا خواہ جانتا تھا لیکن ان تمام قبولیت اور کمنہ پرستیوں کے باوجود عاشق ہونے کے بعد اس میں سینٹ پال کی طرح ایک اچانک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے قلب کی حرکت جو ابھی تک تدریجی تھی ایک بارگی تلام و جزر و مد کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے ازلی دلا ہوتی نظر میں غرق دکھائی دیتی ہے۔ اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج تک نہ کچھ دیکھا تھا نہ سنا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی اسے خواب معلوم ہونے لگتی ہے عشق کے تیز احساسات اسے مضطرب اور بے کیف رکھتے ہیں کبھی تنہائیوں میں خوب ہنستا ہے اور کبھی راتوں کو ٹٹٹکی باندھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ تعلیم میں کہاں وہ قوت کہ اس دماغی کیفیت کی تصویر کشی کر سکے۔ اسے ہم محض فلاسفہ اور شعرا کے چند زبردست شاہکاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ایڈیلٹ ڈامی نظم میں مینیسن کی

لے ابتدا میں یہ بھی تھا اور عیایوں کا جانی دشمن لیکن دشمن اس کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور وہ مذہب عیسائیت کا زبردست حامی اور مؤید ہو گیا۔

علامہ جوین شاعر فریدک متقی سن ۱۸۳۱ء تا ۱۸۳۳ء کی تعلیم جو موضوع عشق پر ہے نظر نگاہ ہے۔

ماڈ) میں پہلا ^۱ (کی غزلوں میں اشکیہ پیر کے نپٹنی اینڈ مکلر پٹرا
اور رومو اینڈ جولیت) (وغیرہ میں اس کیفیت کی حیرت خیز ترجمانی کی گئی ہے
اسی طرح لارمز بیل میں پلارڈیس کی حالت بھی اس کیفیت کی پوری پوری
آئینہ دار ہے۔ جارج سینڈ (اور جارج میریڈتھ)

کے کرداروں میں یہ دائمی کشش خوب موجود ہے۔ ہم کہاں تک نام گنائیں ادب میں عشق کے اردوں کی
داستان بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہے۔ ہم ادبیات کے دروازہ ہی سے شہر بیتولا میں داخل ہو سکتے
ہیں جو بہشت سے متصل اور شہر عشق کے بالمقابل ہے۔ یہاں بیچہ کر عاشق خوش بختی اور نہ پوری ہونے والی
امیدوں کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عاشق ہونے کے بعد انسان اپنے وجود اور اپنے نعل کو دنیا کے لیے کیوں
منفرد اور متمم سمجھنے لگتا ہے؟ غالباً یہ فطرت ہے کہ انسان اپنے معمولی سے معمولی کام کو بھی مالگیری اور دنیا پر جھیا ہوا
سمجھے جس اسی طرح عاشق بھی خیال کرتا ہے کہ اس کے عشق کے تاثرات اور سرگرمیاں دوسروں کو بھی ضرور
متاثر کر دیں گے۔ عاشق و مشوق کی تنگدلیوں میں اپنا وجود اس قدر دلکش اور روح افزا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ
دنیا کے لیے مکانات میں سے بہترین چیز ہے۔ وہ اس جذبہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ آسمان کا نیگلوں ہونا
آفتاب کا روشن ہونا اور موسم کا خوشگوار ہونا بھی اپنے ہی وجود کا منت کش سمجھنے لگتے ہیں اور اس مبالغہ آمیز
میار عشق کی وجہ سے وہ روز بروز خود کو خدا و خدا پسند ہوتے جاتے ہیں انسانیت کا میار عاشق کی نظروں
میں اس قدر قبیح ہو جاتا ہے کہ وہ ہر عورت کو جان آن آرک (خیال کرتے ہیں گو فوسر
چارلس گریڈیلٹ) کی طرح لان و گزات اور خود نمائی سے آگے نہیں بڑھتے

۱۰ یہ بھی انیسویں صدی کا ہر شاعر بہت سی خرابیوں میں گرفتار رہا جس رشتہ دار میں اپنی ہائے
کے عشق کی وجہ سے نہایت کامیاب ہیں۔

۱۱ (۱) کے ناول بے لعیب میں ایک کردار جو عشق میں بہوت ہے
۱۲ (۲) اپنی کتاب بلو سڈ و گرس (۳) میں بولا (۴) کو ایک
مقام بتاتا ہے جو کہ تمام فرحت و لذت کا نمونہ ہے۔

۱۳ (۵) کے ناول کا ہیرو جو بولنے میں بڑے بڑے جملے استعمال کرتا ہے اور لان و گزات کا مادی ہرچیز
کی وجہ سے نہایت منہک ہو گیا ہے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ آیا عشاق کی اس قسم کی نفسانوی سے عورتیں بھی خوش ہوتی ہیں؛ لیکن اب جانج ایلینٹ (G. Eliot) کے ناول ڈینیئل ڈیرڈنڈا (Daniel Deronda) کے پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ بے شک وہ خوشامد سے خوش ہوتی ہیں اس لیے کہ اس ناول کی ہیروئن اپنے عاشق کی ڈینگوں اور گہنی چڑبی باتوں سے انتہائی خوش ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی جھجلا بھی جاتی ہے۔

گوکہ عشق کا یہ بلند معیار کہ عاشق و معشوق کا عشق دنیا کی خوش بختی کا سبب ہو اپنے میں کوئی افادہ پہونیں دیکھتا تاہم اس میں ایک خوبی ضرور ہو اور وہ یہ کہ اس خیال سے عاشق بخیر اور کشتہ دل ہو جاتا ہے اور جس وقت وہ دوسروں کو بھی محبت میں مبتلا دیکھتا ہے تو ان پر ترحم اور خوشی کی نظر ڈالتا ہے ترحم اس وجہ سے کہ وہ اپنے عشق کی تکمیل کو یاد کر لیتا ہے اور خوشی اس وجہ سے کہ لوگ عشق میں اس کی تقلید کرتے ہیں جس طرح کسی کیتھی میں ہیرو ہیروئن اپنے عملا وہ کسی معمولی کردار کے معشوق پر بھی ترس و شفقت کرتے ہیں اسی طرح اصل زندگی میں بھی باوجودیکہ عاشق اپنے عشق کے مقابلہ میں دوسروں کے عشق کو بیچ سمجھتے ہیں پھر بھی خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کی محبت بھی پچھلے پھولے اور بار آور ہو بہر حال عاشقوں سے ہمدردی فطری چیز ہے یہ روکی نہیں جا سکتی جس طرح کوئی انتہائی کاروباری انسان بھی مناظر قدرت کی دلکشی کی وجہ سے چند منٹ صابح کر کے اسے ضرور دیکھ لیتا ہے اسی طرح انتہائی بے جس اور ٹھوس انسان بھی جذبہ ہمدردی سے پر ہو جاتا ہے جبکہ وہ دوردند دلوں کی داستان پڑھتا ہے یا ان کو شہر کی کسی گلی میں دیکھ لیتا ہے اگر کوئی مدت العزنا کھتا تو کسی ناول میں ہیرو ہیروئن کے عاشق سے دلچسپی نہیں لیتی تو وہ اس کی نصیحت طبیعت کی وجہ سے اس لیے کہ جو شخص عشاق پر کم از کم ہمدردانہ نظر نہ ڈالے وہ بہت ہی لپٹ اور ضلالت فطرت ہو گا۔

عاشق و معشوق کا عشق چاہے دوسروں کے لیے مفید ہو یا نہ ہو لیکن اس سے خود عاشقوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے بھلائی کرنا اور اسے لوگوں تک پہنچانا ان کا مطمح نظر ہو جاتا ہے عاشق کی ذاتی خود نمائی اور خود پسندی ختم ہو جاتی ہے اور اسے محض معشوق کی خوشی اور نظر التفات میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے معشوق کی خوشی سے عاشق کے دل میں غمزا نکسا، ترحم اور محبت کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے فہل میں لباس میں گفتار میں

کردار میں محض مشوق کی خوشی کا خیال رکھتا ہو وہ دنیا کے لیے مازب نظر نہیں بننا چاہتا بلکہ صرف مشوق کے لیے تاکہ اس کی بارگاہ میں ہر یہ نیاز پیش کرتا ہے۔ عاشق اپنی تمام کمزوریوں سے بھی مشوق کو آگاہ کر دیتا ہو اور قبول و غور کا متمنی رہتا ہو۔ اب اس کی محض یہ خواہش رہتی ہو کہ وہ اپنے کسی ذاتی محاسن کی وجہ سے نہ چاہا جائے بلکہ اہلی حالت میں اس سے محبت کی جائے۔ اپنی حالت کو مشوق کے سامنے صحیح پیش کرنا دنیا میں سب سے مشکل کام ہے اس وجہ سے کہ انسان محض الفاظ کے ذریعہ سے اپنے خدو خال کو صحیح دکھا سکتا ہو اور اس میں اس بات کی ہرقت گنجائش ہو کہ وہ اپنے مسنون کو بخوبی ادا نہ کر سکے یا مشوق الفاظ کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑ جائے۔ پس اس سبب سے اپنے کردار کے صحیح پیش کرنے میں انسان کو عموماً ناکامیابی ہوتی ہو۔ عاشق اس کی پروا نہیں کرتا کہ آیا وہ اپنے کردار کے سامنے صحیح دکھا سکا یا نہیں، اس کی دلی تمنا یہ ہوتی ہو کہ وہ اپنے کو مشوق کے سامنے اہلی رنگ میں دکھا سکے۔ اس کی بس یہ خواہش رہتی ہو کہ مشوق اسے اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی طرف سے کسی غلط فہمی یا نادانیت میں مبتلا نہ ہو۔ جب اس کو کشش اور محبت کے باوجود اسے کسی وقت یہ علم ہو جائے کہ مشوق نے اسے پوری پوری طرح نہیں سمجھا ہو یا مزاج شناس نہیں ہوا ہو تو عاشق میں جذبہ بغاوت و نفرت پیدا ہو جاتا ہو۔

عاشق گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنا اپنے لیے کوفت و مصیبت سمجھتا ہو۔ اسے اس بات سے اذیت ہوتی ہو کہ زمانہ ماضی بغیر اس مشوق کی ہر اہی کے کیوں صرف ہوا اور اس نے اتنے عرصہ تک دوسری عورتوں سے کیوں عشق بازی کی۔ کیوں نہ اپنے اسی محبوب کے ساتھ رہا؟ یہ خیال اس کے جذبہ خود داری کو ٹھیس لگاتا ہو۔ اپنے ان خیالات پر تو اسے رنج ہوتا ہی ہو لیکن جو چیز اس کے دل میں ناسور پیدا کر دیتی ہو اور اس کے زخم کو مندمل نہیں ہونے دیتی وہ یہ ہو کہ خود مشوق نے ماضی میں کیوں اس کے علاوہ دوسرے مردوں سے تعلق رکھا اور کیوں خدا سے رحیم اتنے عرصہ تک عورت کے دوسرے مردوں کے عشق پر راضی رہا؟ یہ مرد کی خود غرضی ہو در نہ جس فعل کو خود اس نے روا رکھا تھا اسے عورت کے لیے کیوں میوہ سمجھتا ہو؟

مرد اپنے عشق کی مطلق العنانی کو جائز رکھتا ہو لیکن عورت کے اس رویہ کو غیر فطری اور مطلق زندگی کے خلاف سمجھتا ہو۔ جہاں جہاں مطلق عشق نہیں اس لیے کہ دونوں کو بوجہ کائناتی ہو اگر مرد کو عورت کے پچھلے واقعات

عشق کی وجہ سے اس سے حب پیدا ہو گیا تو وہ عشق پاک و بے آلائش کب رہے گا؟ وہ تو انسانی خواہشوں کا گواہ نکار رہا اور گویا ہوس رانی ہی اس کا اہل مقصد تھا۔ غالباً خدا انسان کے غمیر میں نہیں رہا جو اس کے لیے محض یہ ثبوت کافی ہو کہ جب قدیم ترین انسانی سلسلے عشق کی تھوڑی پرجی کے ساتھ دنیا میں آئیں تو ان میں یہ مادہ تھا ہی نہیں یہ تو تہذیب و تمدن کی برکت ہو کہ حب پیدا ہوا ہم میں مبنی تہذیب ہوگی اتنا ہی بلند ہمارا عشق ہوگا اور اتنا ہی زیادہ حب و ثبوت کے لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دوسرے مالک والے جو ہم سے کم تمدن ہیں عشق کا پست معیار رکھتے ہیں اور ان میں کتنا کم حب ہوتا ہو اس جگہ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم عشق کی کوئی تاریخی ریسرچ کریں اور یہ بتائیں کہ آیا وہ قدیم قوموں مثلاً یونانیوں وغیرہ میں بھی عطا یا نہیں اس وجہ سے کہ یہ تفتیش ہیں معاملہ میں ڈال دے گی یہیں بس یہ ماننا پڑے گا کہ عشق تخیل و تہذیب تمدن کی برکت ہوا اور حب و عشق دوستی، وطنیت اور مناظر قدرت سے دلچسپی لینے کے سلسلہ میں پیدا ہوا اگر ہم عشق کو اس وجہ سے دلیل نہیں سمجھتے کہ یہ ہماری موجودہ تہذیب کا کرشمہ ہو جو وہ تہذیب کا طرہ امتیاز ہو تو ہمیں حب و رقابت کو بھی بری نظر سے دیکھنے کا مجاز نہیں اس لیے کہ یہ تو محض اسی عشق کا ہی جزو الاینفک جزو ہے اسے کوئی مانے یا نہ مانے واقعہ یہی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مثنوی کی گزشتہ زندگی اور معاشرہ کی داستان پر جس جذبہ نفرت کہ ہم حب سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الاصل حب نہیں کہا جاسکتا اگر کوئی مرد شادی کے بعد اپنی بیوی کے پاس ان خطوط کا مجموعہ پائے جو اس نے شادی سے قبل دوسرے عاشقوں کو لکھے تھے تو کیا مرد اپنی بیوی سے حب کرنے لگے گا؟ نہیں! مرد کو محض دکھ ہوگا اور شدید دکھ۔ اسے تکلیف ہوگی کہ جو رونے شادی سے قبل کیوں دوسروں سے محبت کی۔ وہ اس بات پر انوس کرے گا کہ زن دشوار ایک ہی احساسات و جذبات کے ساتھ کیوں نہ تمام پیدا ہوئے تاکہ دونوں میں کوئی راز نہ رہتا۔ وقت بھی نہ ضائع ہوتا۔ کہیں اور ایک دوسرے کا تعلق بھی پیدا نہ ہوتا ان کا عشق آپس میں کامل اور بے غل و غش رہتا اور ابتدا ہی سے ساتھ رہنے کی وجہ سے تفسیح اوقات نہ ہو سکتا اور وہ اس غم و غصہ سے بھی نجات پا جاتے کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ہی کیوں نہ باہر دے گئے اور کیوں شادی سے قبل تک ہر وقت ضائع ہوا پس ان خیالات کے علاوہ

اسے بوجی سے نہ کوئی حبس ہوگا اور نہ وہ اس کی طرف کوئی ناجائز شک کرے گا۔

عشق انسان کو اس کے غیر فانی ہونے کا یقین کرا دیتا ہے۔ عاشق یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ عشق کی وسعت کے لیے زندگی کوتاہ ہے۔ اس کے لئے زندگیوں کا ایک مجموعہ کفایت کر سکتا ہے۔ زندگیوں کا ایک نسل ہونا چاہیے تاکہ عشق ایک بڑی مدت تک نشو و نما حاصل کرے اور پھر پھولے اور بار آور ہو۔ ان خیالات کے علاوہ عاشق کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی کیوں نہ عشق میں بسر کی۔ اسے لطف اندوز ہونے کے لئے کیوں اس قدر قلیل مدت ملی؛ مگر انہیں کہ عاشق اسی تھریل میں رہتے ہیں اور کوس تھریل بچ جاتا ہے اس لئے کہ زندگی عاشقوں کے خیال کی پابند تو نہیں وہ اپنا دورہ پورا کرتی رہتی ہے اور ایک سکند کے لیے بھی اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ ان کی دلچسپی ختم ہو جائے تب موت آئے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق ہونے کے بعد ہی موت آجاتی ہے۔ بعض کیو پڈ کا نشانہ بننے سے قبل ہی دنیا کو وداع کر دیتے ہیں اور جب عشاق موت کی گہری نیند سو جاتے ہیں تب کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ جب تیس برس کے عشق کا ڈرامہ دنیا کے اسٹیج سے ناپید ہو جاتا ہے تو یہ پاک جذبہ جس کو وہ اتنا بزرگ، اتنا عظیم سمجھتے تھے کیا نشانیاں چھوڑتا ہے؟ کچھ نہیں، سوائے دو ایک گیتوں کے جو کہ انہوں نے لکھے ہوں دو ایک عمدہ کاموں کے جو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہوں اور دو ایک بچوں کے جو ان کی نشانی اور گفتار و کردار میں والدین کی شبہیہ ہوں۔ یہ ہے اس غیر فانی جذبہ کی مختصر کہانی۔

مترجمہ اقبال انصاری ایم اے

سراغ رسانی کے قصے

سراغ رسانی کے قصے فی الحقیقت مصرعہ حاضر کی پیداوار ہیں لیکن زمانہ قدیم میں بھی ان کے غیر ترقی یافتہ گرد و بچسب نمونے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں سراغ رسانی کا شوق ابتداء ہی سے موجود ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ نہایت مشہور ہے کہ دو مور تیں ان کے پاس فریاد لے کر آئیں۔ ان میں ایک بچے پر جھگڑا ہوا۔ ہر ایک یہ کہتی تھی کہ بچہ میرا ہے اور مجھے ملنا چاہئے۔ حضرت سلیمان نے حکم دیا کہ بچہ کو تلوار سے کاٹ کر آدھا آدھا بانٹ دیا جائے۔ اہل مان کی مانتا بھلا اس تقیم کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ وہ چیخ اٹھی کہ یہ بینہ غیر عظیم! میں بچے سے درگزر ہی مجھے تو میں اس کی جان پیاری ہے اس طرح حضرت سلیمان کو معلوم ہو گیا کہ بچہ کی حقیقی مالک کون ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلے نفسیاتی سراغ رساں تھے جن کا حال ہمیں زمانہ قدیم کے حالات میں ملتا ہے۔

دانیال کے زمانہ میں بل دیوتا کا ایک مشہور مندر تھا۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ گوشت یا شراب جو چیزیں ہر رات دیوتا کو نذر کی جاتی تھیں وہ اُن کو کھا لیتا تھا۔ دانیال بڑے صائب المراسے تھے انھوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور اگر تمہیں یقین نہ ہو تو مندر کے صحن میں راکھ بکھیر دو اگلے روز اس کا امتحان ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صبح کو بادشاہ نے لوگوں کو بجاریوں کے پیروں کے نشانات دکھائے جو راکھ پر بن گئے تھے اور بتلایا کہ یہی لوگ گوشت اور شراب کے مزے اڑا رہے ہیں دیوتا غریب کو اس کی خبر بھی نہیں۔ دانیال کا یہ کارنامہ تجزیہ کی عمدہ مثال ہے جس کو سراغ رسانی کا پہلا اصول سمجھنا چاہیئے۔

دوسرے ہرقل کے قصہ میں لکھا ہے کہ کاکس نے اس کے چار بیل چرائے اور ان کی دم کڑکڑا کر اپنے غامد میں لے گیا تاکہ کوئی ان کا سراغ نہ پاسکے کہ وہ کہاں چھپے ہیں لیکن ان کے ڈھکالنے نے سارا راز افشاں کر دیا۔ اب کاکس غریب کی کم بختی آگئی اس لیے ہمارے ہمدردی اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ کلاسیکل تصویروں

کا یہ نقص ہو کہ اس میں ہماری ہمدردی مجرم کے ساتھ ہو جاتی ہے جو موجودہ زمانہ میں اس نقص کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔

علم الاصنام کے قصوں اور قدیم روایات میں بھی کیس کیس سرانغ رسانی کی جھلک مل جاتی ہے۔ ایک آقا کا قصہ مشہور ہے کہ اس کے چور کا پتہ لگانے کے لیے اپنے تمام نوکروں سے کہا کہ وہ ایک بادو کی پٹی کو ہاتھ لگائیں جو چور ہوگا اس کے ہاتھ لگاتے ہی بی میاؤں کرنے لگے گی۔ آقا نے بی کے رد میں پر کوئی چیز مل دی تھی جب سب کے ہاتھ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کے ہاتھ بالکل صاف اور بے داغ تھے وہی چور تھا اس لئے کہ اس نے میاؤں کے ڈر سے بی کو دور ہی سے برائے نام چھو لیا تھا!

ایک شیر کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی دعوت کی تو مڑی نہ دیکھا کہ بہت سے ہرنوں کے بھٹ تک جانے کے تو ثنائیات ہیں لیکن واپسی کے نہیں ہیں اس لیے اس نے شیر کی دعوت نا منظور کر دی۔ یہ تمام قصے تجزیہ اور نفسیات کی واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن ان قصوں میں اور موجودہ سرانغ رسانی کے قصوں میں بڑا فرق ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی گئی ہے لیکن موجودہ حالات، سائنس اور نفسیات کی واقفیت نے اس کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی ہے۔ اور اسی لیے اس کا صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے وسط سے قبل آغاز بھی نہیں ہوا۔ کائنات میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۵۹ء پہلا شخص ہے جس نے سرانغ رسانی کے قصوں کی مقبولیت بڑھائی اور ۱۹۷۷ء کی لڑائی کے بعد ان کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ روز بازار ان سے بھرتے تھے اور روز خالی ہوتے تھے۔ سرانغ رسانی کے قصے نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہوئے یوں تو ہر زمانہ کے نوجوانوں میں شوق تلاش و تجسس رہا ہے لیکن اس زمانہ کے نوجوان اس معاملہ میں اور بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ یہ عہد ہی تحقیق و دریافت کا ہے۔

موجودہ صدی نتیجہ و اصحاب سے عبارت ہے اس میں ہر طرف ہوش و گوش کی فراوانی اور عقل فراست کی ارزانی نظر آتی ہے۔ دکتوریہ کے عہد میں جو غیر استدلالی ایمان دہین پیدا ہو گیا تھا اس کے خلاف بغاوت کی گئی اور ایسی شدید کہ تمام پرانے اصنام خیالی کو مٹا کر دیا گیا۔ اب ہر چیز کو جاننا، پرکھنا اور

تو جاتا، اور کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کیا جاتا جو انسانی ذہن و دماغ کو گمراہ نہیں ہوتی۔ یہ شک اور شبہ کا دور ہو۔ اب فرض کر لیتے اور کسی بات کو ملحوظ شدہ سمجھ لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے ہر مسئلہ کو چاہے وہ آرٹ کا ہو یا ادبیات کا، اخلاقیات سے متعلق ہو یا مذہبیات سے اسے غیر معتقدانہ اور خشک کانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور بڑی جانچ پڑتال، شدید غور و فکر اور مکرر رسد و تجربوں کے بعد ہی کوئی فیصلہ دینے کی ہمت کی جاتی ہے۔

یہ سو صدی والوں نے عقل کی پاسبانی اور رہنمائی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اعتدال کا دھن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور معتقدات کی تمام بنیادیں ہل گئیں لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہر شخص میں تلاش و دریافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور اس جذبہ بے اختیار کی تسکین کے لیے نئے نئے سامان پیدا ہو گئے جو نیا اور مسخ حل کرنے کا بیہوش اس زمانہ میں پیدا ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ادب اور خصوصاً نعتیہ اور انسانی زمانے کے اس رنگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے چنانچہ سراغ رسانی کے افسانوں میں بیسویں صدی کے تمام میلانات آکر مجتمع ہو گئے ہیں اور وہ ہائے جذبہ تحقیق و تجسس کی آسودگی میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

بھلی جنگ عظیم کے بعد قیام امن و سکون کی جو کوششیں کی گئیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید ”رومانی“ ادب کو بہت نقصان پہنچے گا اور اب سوائے تجربہ خانوں کے انسان کو کہیں بھی کارناماں دکھانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس کے ثبوت میں ایچ جی، ویس کے سائنٹفک ناول پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں دارالہجرت ہے ”رومان زار کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں لیکن انسان ہمیشہ جوش آفریں محرکات کی جستجو میں رہا ہے اس کی کو سراغ رسانی کے افسانوں نے پورا کیا۔ اس لیے کہ ان میں اسرار و رموز، جادو، جانی اور حوصلہ مندی، خوف و ہراس، جوش و اشتعال سب ہی کچھ موجود تھا۔ اور ان سب باتوں کی منطقی تشریح بھی موجود تھی جس سے سائنٹفک دماغ کو فرحت حاصل ہو سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں مادی اور ہنسی کے عہد کے غلام زبردست رومانی رد عمل ہوا۔ اس زمانے میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں فوق الفطرۃ عناصر شامل تھے اور اس دنیا کی تلخیوں سے گریز کر کے تخیل کے دامن میں پناہ لی گئی تھی جیسا کہ خیز تھے درہل انہیں فوق الفطرۃ

انسانوں کی دوسری کردی یا ان کا منطقی تجربہ ہیں لیکن اس قسم کے قصوں کی ادبی ترقی اور آراستگی کا آغاز دیگر کہانین پر مشتمل داستانیں سے قبل ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بوسٹن (امریکہ) میں پیدا ہوا اور انری نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ ایک لڑتے اور شاید اسی اثر کی وجہ سے وہ ڈرامائی یا ہنگامہ خیز قصے کامیابی کے ساتھ لکھ سکا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت اور ذہنیت کا حامل تھا۔ اس میں شاعر کی موضوعیت، ریاضی دان کی درست پسندی، فن کار کا تخیل اور سائنس دان کا ادراک اس عمر کی کے ساتھ سرگیا تھا کہ وہ اس کام کو محسن و خوبی انجام دے سکا۔ پچھلے قصے جھلسمی اور خیالی کہانیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ جدید جاسوسی انسانوں کے لیے مشکل راہ ثابت ہوئے لیکن ان کا ایک بڑا نقص نصیحت آمیزی جو بعض اوقات صفحے کے صفحے ماہر خیالات کا کچھ معلوم ہوتے ہیں اور ان کو اصل قصے سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ کانن ڈائل نے پچھلے درسی اور خشک منطقی ڈھنگ کو بدلا اور سراغ رسانی قصوں کے دامن کو گل ہانے لگا۔ رنگ سے بھر دیا۔ انداز بیان کی شگفتگی اور روزمرہ کے ماحول کی دلکشی نے کانن ڈائل کی مقبولیت بڑھا دی اور اس کے ”ہومز“ نے گھر گھر پڑے جانے لگے۔ اس سے قبل صد و کئیوں کے دو مشہور ناول ”لیون سنز“ تھی وڈ اور ”ولی کائنات“ نے ایسے قصے لکھے کہ جذبہ بات اور ذہن و دماغ کو متاثر کرتے تھے کانن ڈائل کے لیے راہ ہمارا کردی تھی۔

سراغ رسانی کے انسانوں کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ اس میں پڑھنے والے کی ہمدردی سراغ رسانی کی طرف ہو جانا چاہیے ورنہ اسے ایسے قصوں میں کوئی لطف نہیں آئے گا جن میں مجرم کو برابر رک اور شکست ہوتی ہو۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس قسم کے قصے اپنی نوعیت کے لحاظ سے عقلیت کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند گتھیوں کو پیش کیا جاتا ہے اور اگر کشائی کے لیے محض ناخن ہی نہیں بلکہ نغمہ و فراست بھی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے سراغ رسانی کے قصے تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں مقبول ہو سکتے ہیں۔ اگر قصہ ذہن و عقل کو متاثر نہیں کرتا بلکہ صرف جوش و خروش پیدا کرتا ہو تو وہ (THRILLER) ہیجان انگیز چیز ہے اور اس کی مانگ صرف معمولی پڑے کلمے لوگوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ انگلستان میں انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کا شوق نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا اور ہر شخص کو

تعلیم سے بہرہ ور کئے جانے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں تعلیمی قوانین پاس ہوئے اور قبل کے قوانین تعزیری کی اصلاح کی۔ پولیس کا باقاعدہ انتظام بھی اسی عہد میں ہوا جس کے ذریعہ انکشاف جرم میں پہلے سے زیادہ ضابطہ اور قاعدہ برتنا جانے لگا۔ یہ تمام باتیں سراغ رسانی کے انسانوں کی مقبولیت بڑھانے میں معاون ہوئیں اور ان محرکات نے جو کی بنیادوں پر فلک بوس قصر تعمیر کر دیا۔

کافن ڈائل کے شرک جو مرزے قصے بہت مقبول ہوئے اور باتوں باتہ بکے بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک شخص آر تھرمارین کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو بھی کافن ڈائل کا مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ڈائل نے لوگوں کو ایسا سو کر دیا تھا کہ ایک مدت تک کسی اور کو وہ قبول خاطر حاصل ہی نہیں ہوا۔ سلسلہ میں جا کر جی کے چپٹرٹن (۱۸۶۴-۱۹۳۷) شرف قبولیت اور خراج عقیدتیں حاصل کر سکا۔ اس کے سراغ رسانی کے انسانوں نے تمام ادبی طبقوں میں دھوم مچا دی۔ سلسلہ میں یہ وزن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہو گیا اور اس تعلق نے اس کا مقصد پچھلے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف کر دیا اس نے اپنے افسانے قانون کی محبت میں یا تفریح طبع کے لئے نہیں لکھے بلکہ بہ حیثیت ایک مذہبی آدمی کے وہ یہ چاہتا تھا کہ مجرم کو اقبال گناہ کا موقع ملنا چاہیے اور یہی اس کے نزدیک جرمیات کے مسائل کا سب سے بڑا حل تھا۔ چپٹرٹن کے ”خادر براؤن“ افسانے لطیف اصلاح پسندی سے قطع نظر اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دنیا کو بتلایا کہ اس قسم کے قصے ادبیات میں بھی بڑا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

سلسلہ میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کی تباہ کاری اور خون ریزی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انسان باوصف دعویٰ شائستگی، اب بھی اتنا ہی بڑا درندہ ہو جتنا پہلے تھا۔ وحشت و بربریت کا عہد پھر تازہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ کی باگ پیچھے کی طرف موڑ دی گئی ہو اس وقت ہر طرف خطرہ شور اور ہنگامہ ہی نظر آتا تھا۔ اس لیے ادبیات کے ذریعہ اس ضد بنانا زری و خطر پسندی کی تسکین غیر ضروری تھی اس لیے اسی زمانہ میں جاسوسی افسانے لکھے گئے جو غیر محاربین کے لیے بہت کچھ دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔

جنگ کے بعد یعنی مسئلہ میں رومانی جذبات بہت ابھرتے اور امن قائم ہو جانے کے بعد ان کی تسکین کا مسئلہ پیش ہوا اب اہل فکر دلوں کو ٹٹولنے اور اسباب کی چٹان میں مصروف تھے۔ اسی وجہ سے نئیاتی ناول کا عروج ہوا لیکن یہ چیز عام پسند نہیں تھی۔ فوج کے خستہ اور در ماندہ سپاہی، بے روزگاروں کے جتنے اور ہنگامہ پسند عوام، برگشتہ فکر اور مراقبوں کی غلیظانہ تحریروں پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے ان کی تسکین کا سامان صرف ہیجان انگیز انانے اور سراغ رسانی کے قصے ہی ہم پہنچا سکتے تھے۔

مسئلہ کی جنگ عظیم کے بعد سراغ رسانی کے انانوں میں کافی تبدیلی اور وسعت پیدا ہو گئی اب انانہ میں محض اسرار اور بھید ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ اب سچ سچ کا ایک سماپیش کیا جاتا تھا جس کے حل کرنے میں پڑھنے والے کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں آسٹن فری مین نے ایسے دلچسپ قصے لکھے جن کے ایک حصہ میں مجرم کے کاسوں کی تفصیل ہوتی تھی اور دوسرے میں بڑی خوبی اور دلآویزی سے رفتہ رفتہ جرم کا انکشاف کیا جاتا تھا۔ کہ چیتاں کا لطف آخر وقت تک قائم رہے۔

بعض لوگوں نے اپنے سراغ رسانی کی قابلیت دکھانے کے لیے بڑا مبالغہ کیا جو اور عجیب عجیب مجرموں کی داستانیں لکھی ہیں۔ اس قسم کا مبالغہ ہیجان انگیز انانوں میں تو کچھ نہ جاتا ہو لیکن سراغ رسانی کے قصہ میں مجرم اور سراغ رساں دونوں کو اسی عالم آب و گل کا انسان ہونا چاہیے کامیاب قصہ وہ جس کو پورے قاری یہ نہ کہے کہ سراغ رساں کتنا ہوشیار ہی بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو کہ میں کتاب بے خبر تھا کہ میں نے ان باتوں اور علامتوں پر غور نہ کیا :

اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سراغ رسانی کے قصوں میں نہایت معمولی قسم کے جرائم کی داستان ہونا چاہئے۔ اس کے انکشاف میں کچھ لطف نہیں ہے۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی جیسے رنگیں آنکھوں میں سرمہ ہر صنف ادب میں ضروری ہے جو اس لیے کامیاب انانہ نگار کو یہ چاہیے کہ وہ عام اور عجیب کے درمیان کا راستہ اختیار کرے اور اس کے اشخاص انانہ ایسے ذہین لوگ ہوں جو اسی دنیا کے آدمی معلوم ہوں لیکن جو کسی کام میں مہارت خصوصی سے زیادہ اپنی فہم و فراست پر بھروسہ رکھتے ہوں انانہ نگار کو پڑھنے والے کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ضروری آجاتا بتلا دے تاکہ قاری کی داعی تسکین بھی ہو سکے۔

سراغِ رسانی کے قصوں پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ مہتر مفسر کے نزدیک جرم کی داستان بیان کرنا ہی جرم کی ترغیب دینا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ اسکو وائلڈ نے اپنے مضمون ”در ویش بانی کے زوال“ میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا، بالین ہی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کتاب اچھی لکھی گئی ہے یا بری۔ والٹر پیٹر کے نزدیک بھی کسی صنفِ ادب کو جانچنے کا معیار صرف حسن و دلکشی ہے۔ اس کے علاوہ ان قصوں کا کنٹری ہی مجرم کا سراغ لگانا ہے۔ ایک ایسے اور کامیاب افسانہ میں ہماری ہمدردی کبھی بھی مجرم کی جانب نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو اس کی سزا کے وقت ہمارے اوپر ہمدردی کا جذبہ طاری ہو جائے اس لیے اخلاقی اور فنی بہتری اس میں ہے کہ افسانہ کو انکشاف و راز پر حراست مجرم کے بعد ختم کر دیا جائے۔ اس کے آگے کہہ کر بڑھانا یا افسانہ نگار کا بیج کے فرائض انجام دینا خوش مذاقی اور فن دونوں کا خون کرنا ہے۔

سراغِ رسانی کے اہل اور کامیاب قصے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں اس لیے ان کا اثر آرٹ کے زمرہ میں نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آرٹ غیر متغیر جذبات و کیفیات پر اثر ڈالتا ہے۔ اسی لیے حقیقی آرٹ ہمیشہ مستقل اور پائیدار ہوتا ہے۔ شکیلیہ حقیقی آرٹسٹ تھا اور اسی لیے آج تک زندہ ہے۔ اس کے علاوہ سراغِ رسانی کے قصے زیادہ تر زندگی کے ایک رخ کو نمایاں کرتے ہیں اور اس میں اصلی زندگی کے تمام خط و خال نظر نہیں آتے۔ اسی لیے ان کا مقصد ہنگامہ خیزی، ترقی اور ذہنی تفریح سے زیادہ نہیں ہو لیکن موجودہ زمانہ میں اسی قسم کے قصے مقبول اور محبوب ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہماری بے لطف اور بندھی ہوئی زندگی میں دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اسی مصنوعی تہذیب اور میکانیکی دور میں جبکہ انسان کو لمبی لمبی کھوپڑی کی طرح کام کرنا پڑتا ہے یہ قصے ذرا ہنگامہ لطف اور شور و غلاباط کا باعث ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہو اور انسان ہمیشہ سے سرور و شہر اور جوش و خروش کا متلاشی اور تحقیق و دریافت کا جو بار بار ہر سراغِ رسانی کے قصے ہماری اس تشنگی کو رفع کرتے ہیں لیکن جس طرح شہید گری میں کہیں سے اگر بہت سا پانی پی لینا نقصان دہ ہے اسی طرح ان قصوں کا مطالعہ بھی اعتدال سے نہ بڑھنا چاہیے۔ اگر یہ دماغی تفریح محض۔ یعنی کام و ذہن، رخ کرنے کے لیے حاصل کی جائے تو باعثِ لطف و مسرت ہوگی۔

اردو میں سراغِ رسانی کے قصے بہت کم لکھے گئے ہیں ہمارے یہاں قصہ کا شوق کافی پرانا ہے۔
 لکھنؤیوں اور بنارس کے قصوں، اقبال جرم کی پرانی کہانیوں اور علم الاساطیر کے افسانوں میں کہیں کہیں
 سراغِ رسانی کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ اردو میں داستانی فنوبیاں شروع ہی سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض اپنے
 مافوقی موضوع کے اعتبار سے ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ مافوقیت بہت اسرار اور سراغِ رسانی
 کے قصوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ انگلستان میں کالمرج اور جوریس واپول کی تحریروں نے جن میں
 مافوقی عناصر زیادہ نمایاں تھے اولین نظم ریزی کی۔ وکٹوریہ کے صد میں دلی کائناتس وغیرہ نے اس زمین کی
 آبیاری کی اور پچھلے ذریعہ نظم کی نشوونما کے آثار شروع ہوئے اور اس درخت کی پہلی کوئیل کا فن ڈائل کی صفت
 میں نمودار ہوئی۔ اردو کی شندویوں میں مافوقی عناصر کی کمی نہیں ہے۔ بدرنیر اور گلزار نسیم کی بنیاد ہی مافوقی نقطہ
 ماحول پر قائم ہے۔ پرانے قصوں میں بھی مثلاً طلسم ہونٹرا، طلسم نوخیز، جیشیدی اور بوستان خیال وغیرہ میں بھی
 خدقِ عادت، سحر طلسم اور معیاری اور مخبری کے متعدد قصے مل جاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو دراصل موجودہ
 زمانے کے جاسوسی افسانوں سے جن کے درمیان کئی جموری منزلیں حاصل ہیں، کوئی راست علاقہ نہیں ہے
 اور یہ شمعِ خوشابان ملک کی مجلسِ برخواست ہو جانے کے بعد بجڑ کر خاموش ہو گئی اب اس کو کوئی دوسری
 مثل ہی روشن کر سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے مستقل قیام، پولیس کے باقاعدہ انتظام، اخباروں کی روزانہ فزوں ترقی، انگریزی
 تعلیم کے فروغ اور مغربی اثر نے نئے خیالات پیدا کیے۔ وہ چراغ بھرنے نیل سے روشن کیا گیا اور لوگ پورا اور
 کائنات کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ مورخ الذکر کے بہت سے ترجمے ہوئے اسی سلسلہ میں پروفیسر
 فیروز الدین مراد اور محمد یعقوب کلام (مترجمین حکایات ہومز) پروفیسر نصیر الدین عثمانی (مترجم وادی خوف)
 اور محمد نصیر احمد (مترجم طبقہ ہومز) اور خانمانی آسیب قابل ذکر ہیں۔ ڈائل کے علاوہ اور جاسوسی مصنفین
 کے بھی ترجمے ہوئے۔ کچھ جنگلہ خیز قصے سلطانہ ڈاکو، قتل بے گناہ، پراسرار انسان، ٹوپی کا سراغ وغیرہ
 نہایت سستے چھپے تاکہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں کچھ معمولی انگریزی قصوں کے خاکے ہیں جن کو مقامی زبان
 میں صدف داغ کے بعد پیش کر دیا گیا ہے۔ بعض طبع زاد ہیں جن کا مقصد ذہنی تفریح سے زیادہ جنگلہ خیزی

ہو۔ ہمارے یہاں اول تو تعلیم کی کمی اور طبیعتوں کی انفرادی کی وجہ سے جاسوسی لٹریچر بہت کم ہو اور جو ہر وہ بالکل گھٹیا اور ابتدائی صورت میں اس میں نہ منطقی استدلال ہو اور نہ دماغی فرحت کا سامان۔ اس کی ساری عمارت اتفاقات اور حادثات پر قائم ہو۔ غور و فکر اور مشاہدہ اس میں نام کو نہیں فنی خوبیاں بھی اس میں مفقود ہیں۔ ایک نقص جو عام طور پر ان معمولی قصوں میں ملتا ہر وہ یہ کہ مجرم کو جب تک پھانسی نہیں ہو جاتی کتاب ختم ہی نہیں ہوتی۔ بعض قصوں میں بے حد مبالغہ ہو اور اشخاص افسانہ معمولی گوشت پوست کے انسان نہیں معلوم ہوتے۔ اور وہ انسانی کمزوریوں اور خوبیوں سے بالکل معری نظر آتے ہیں۔ ان قصوں کا انداز بیان بھی اصول فن کے اعتبار سے ناقص ہو مختصر یہ کہ ان میں بجز ہیجان انگیزی اور عوام نوازی کے اور کوئی دھن نہیں ہو۔

مولوی ظفر عمر اس بے آب و گیاہ سرزمین میں ایک نخلستان کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ سراسر فنی میں انھیں کافی درخور حاصل ہو کیونکہ ان کی عمر ہی پولیس کے کام میں صرف ہوئی ہو لیکن ان کے یہاں بعض اوقات مجرم کو فنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جاتی ہو۔ ایک گتھی کو پیش کرنا اور پھر ایک ایک ڈور سے کو سائنٹفک قابلیت سے سلجھانا جو آگاہی کراہی کا دھن ہو۔ مولوی ظفر عمر کے یہاں بھی ہو لیکن معمولی حقیقت یہ کہ ابھی اردو میں ایک شریک ہو مرزا کٹر تھارن ڈائل اور فادر براؤن کی بڑی کمی ہو۔

کیا عجب ہو کہ موجودہ جنگ کے محرکات ہمارے افسانہ نویسوں کے ذوق کو ہمیز کریں اور وہ مولوی ظفر عمر کی بنیادوں پر ایک بلند عمارت تعمیر کر کے اردو کے دامن کو دھچپ قصوں سے بھر دیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ لے

اندرون مصر

یورپ میں صرف ایک جگہ ہے انگلستان پر حملہ کر کے اسے بڑی طرح نقصان پہنچایا جاسکتا
ہو اور وہ مصر ہے۔
(ڈاکٹر پال روربرگ جرمن ماہر جنگ)

جہازوں کا ہر سو نہ پر غور ہوا اور مصر بھی یورپ میں اور امریکہ کے اخبارات کی سرخیوں میں نمایاں نظر
آنے لگا۔ اس سے پہلے بیشتر امریکی اسے ایک رنگین سرزمین خیال کرتے تھے جہاں سیاحت کرنا راحت فرا
ہو۔ ابوالہول اور اہرام مصری، رقبیلی زمین، اونٹ سیاح، بحیرہ روم کے مسافر جہاز اور فرعونوں کے مقبرے
اس سے متعلق ہیں اور پھر ایسی سرزمین میں جہاں مطلع ہمیشہ صاف اور دھوپ تیز رہتی ہو۔ ریگستان کا رون
اور مشرقی اچھلتا دل جل کر عجیب فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

لیکن آج کل کا مصر عجیب متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ سیاح اب بھی گھومتے پھرتے ہیں اور آثار
قدیمہ کے باہر جہتو کرتے ہیں مگر اس کی ایک اور حیثیت بلند تر ہے۔ یہ بہت اہم فوجی مرکز ہوا اور یہیں سے
رومی پیل اور غلہ دستیاب ہوتے ہیں یہ بحیرہ روم کا دروازہ ہوا اور یہاں سے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان
کے راستے کی نگہداشت کی جاتی ہے اگر انگریز مصر سے باہر نکال دیے جائیں تو جہازوں کی طاقت
بحر ثانی سے لے کر ہالیوڈ تک ناقابل شکست ہو جائے گی نیز دونوں ڈکیتیزوں کو تیل کا اس قدر کافی ذخیرہ
مل جائے گا کہ وہ دس یا بیس سال تک جنگ جاری رکھ سکیں گے۔

تمام عملی مقاصد کے لیے مصر سے مراد نیل کی وادی لی جاتی ہے اس کا رقبہ ۳۳۵۰۰۰ مربع میل ہے۔
جس میں ۳۲۶۰۰۰ مربع میل ریگستان ہے۔ دریائے نیل باقی بارہ سو میل کے باشندوں کے لئے غن
زندگی کا کام کرتا ہے۔

نیل میں پشتوں کا بہت وسیع سلسلہ ہوا اور انہیں سے اس پر قابو رکھا جاتا ہے۔ ۵۵۰۰۰۰ ایکڑ زرخیز
زمین متیل کھیتوں میں منقسم ہے جن کے ارد گرد نہریں ہیں۔ یہ دریا سے سیراب ہوتے ہیں ان جہازوں میں اگست

میں (جو دریا کی طغیانی کا زمانہ ہی) چالیس دن کے لیے تین فیٹ اونچا پانی چھوڑا جاتا ہے اس کے بعد پانی کمال دیتے ہیں اور زمین پر جو بے حد زرخیز عریض بوہے جاتے ہیں۔ اسی طرح گتے، روئی، غلہ پھل اور رکاوٹوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ بیشتر فصلیں اور اکثر تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔

نیل مصری تجارت کی بھی جان ہے اس کے ذریعہ سے ملک کی بیشتر پیداوار ساحل سمندر پر برباد یا ملکی ضروریات کے لیے پہنچائی جاتی ہے۔ وسیع باٹ پینڈے والی کشتیوں میں سامان لے جایا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں پانی کے ساتھ بہہ کر نیچے پہنچتی ہیں اور پھر کسان انہیں رسیوں سے باندھ کر اوپر کھینچ لاتے ہیں بہت سی دفانی کشتیاں بھی نیل میں چلتی ہیں مگر آدمیوں اور بادبازوں کے کئی رانی ارزاں ہے۔

جاں مشرق در مغرب ملتے ہیں ایل کا ڈیلٹا مشرق کا آستانہ اور مغرب کی منزل راہ ہے۔ یہاں مشرق اور مغرب قدیم اور جدید مل جل جاتے ہیں اور نسل زبان، آداب اور روایات کے اس مہون مرکب میں جو دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتا ان کا امتیاز رفتہ رفتہ فراموش ہو جاتا ہے۔

مصر میں دو تمدن نشو و نما پاتے ہیں گھوڑا اور خچر گاڑی، جاپ سے چلنے والے اور پٹرول انجنوں کے باوجود باقی ہیں۔ وہ ہے اور کنکریٹ نے کچے گھروں اور لکڑی کے یک منزلہ مکانوں کی جگہ لے لی ہے۔ مگر وہ بالکل محدود نہیں ہوئے۔ مصریوں کا اعلیٰ طبقہ، انڈسٹریٹ لندن کے کپڑوں میں ملبوس گھومتا ہے۔ ادنیٰ لوگ اب بھی سوئی گلابیہ جو برسے کی طرح تلی ہوئی ہے پہنے ہوئے ننگے پیر شہر اکھیتوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

دارالسلطنت قاہرہ میں ہزار سالہ قدیم جامعہ ازہر ہے جو ساری اسلامی دنیا کا علمی مرکز ہے۔ اسکندریہ میں مختلف اقوام کے لوگ بسنے ہیں اس کی بنیاد دو ہزار سال ہوئے سکندراعظم نے ڈالی تھی اور

اس وقت سے یہ دنیا کا سبز شہر ہے قاہرہ اور اسکندریہ میں وسیع اور عالیشان موسمِ اختیاری ^{Corporations}

دفاتر بنے ہوئے ہیں جن کے درمیان جدید طرز کی سڑکوں پر لنکن، روس رائس اور کینڈیلاک موٹر فٹن اور خچر گاڑیوں کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں کناروں کی سڑکوں پر خاکی دروی پوش انگریز فوجی، افسر اسٹریلیا کے سپاہی اور یونانی تاجرانہ و منکر شامی سوداگر بیار اور کوڑھی فقیروں سے کندھے سے لگاتے ہیں جو گندے چمچے ہوئے ہیں نیم برہنہ گھوما کرتے ہیں۔

۴. ۱۸۵۸ء میں مصر کے سلاطین نے مصر کے حاکم کے ساتھ قرضہ لیا۔ اس کے تحت کچھ عسکر سے راجہ کے
ہستان پر۔ دیگر زمین پر سلاطین کے قرضہ ۳۰ لاکھ روپے۔

کیا گیا کہ وہ اپنے سے زیادہ مجددار بجائے تو قین کے حق میں متعفی ہو جائے ٹیکس کے طریقے کی اصلاح ہوئی
قومی قرضہ کم کیا گیا۔ برطانوی اور فرانسیسی افسروں کو مصری نظام میں عمدہ جگہیں دی گئیں اور مغربی طور طریقے
راج کیے گئے۔

اوپری پاشا
ان اصلاحوں کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک جابنا مصری افسر عربی پاشا نے مسلح بغاوت کی ۱۸۸۲ء
میں عربی پاشا کو شکست ہوئی اور برطانیہ نے مصر پر تسلط جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۸۲ء میں سخت عیدگیوں کا سامنا تھا۔ فرانس مصر میں پھر سے کچھ پسپے لے رہا تھا۔ اور کرنل کرڈ
سوڈان میں فنوڈا پر لگ لے کر وارد ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور انتہا پسند شخصیت مہدی نے جو خود کو
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے بتلاتے تھے بڑی جرات سے آزادی پھیلانے کی کوشش کی مگر
ان کو جنگ عہد ران میں انوس ہو کر شکست ہوئی۔ یہ جنگ ۲۱ لاکھ روپے خرچ کی وجہ سے مشہور ہے۔
جن میں لفٹیننٹ ڈسٹن چرچل نے حصہ لیا تھا۔ یہ لارڈ کرڈمر کا زمانہ عروج تھا۔ جب جنگ کے پھر لگے تو برطانیہ نے
مصر کے ماتحت حکومت زیر حمایت ہونے کا اعلان کر دیا۔

مصر نامہ میں پریسڈنٹ ڈسٹن نے قومی خود مختاری کا اصول مد نظر رکھا اس نے مصر میں سخت ہنگامہ
بپا کر دیا۔ ایک قومی تحریک پیدا ہوئی جس کا نعرہ ”مصر مصریوں کے لیے“ تھا۔ اس نے بلوے اور طلباء کے
مظاہرے کرائے اور دہشت انگیز تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ آخر میں برطانوی سردار (کمانڈر انچیف) مصری ملک
کے صدر زا غزل پاشا کے رفقاء نے قتل کر دیا تب برطانیہ نے مداخلت میں آفتیا کر لی۔ دبا بے اسکندریہ کی
سڑکوں پر گھومتے رہے اور تھوڑی اور دھاڑی ہوئی اور نظام از سر نو قائم ہو گیا۔ زانغلوں پاشا اور بیس اور
نمایاں مصری لیڈر ملادین کر دیے گئے۔

۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ قوم پرستوں کے مطالبات حق بجانب تھے
چند شہنشاہ کے علاوہ مصر کے آزاد اور خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور شاہ فواد اول اس کے
پہلے حکمران ہوئے۔

اس وقت تک برطانیہ نے تجارتی اور مالی اعتبار سے مصر میں پوری طور سے قدم جما لیے تھے۔

اس نے..... اڈا الملک میں قومی قرض ہیشینل بینک مصر کپینوں کا نوں، ردی کے کارخانوں اور
 میامی اکیٹیو میں پھیلا رکھے تھے ۱۹۲۲ء کے صلح نامہ میں بہت سے مستثنیات تھے جن کی رو سے
 انگلستان کا مصر کی ایلیات پر قابو باقی رہتا تھا۔ اسی سے اس کا سرمایہ محفوظ تھا اور غیر ملکی ٹیکس اور مصری قانون
 کی رو سے باہر تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ حق بھی مسلم تھا کہ وہ سمرزمین مصر پر تھوڑی سی صلح فوج بھی رکھے۔
 ۱۹۳۶ء کے درمیانی مہینوں میں برطانیہ کو ڈیکٹرٹوں کے عروج اور خاص طور سے اٹلی کی بحیرہ روم
 میں روز افزوں طاقت کو دیکھ کر تشویش پیدا ہوئی اور اس وقت پھر مصر میں یہ تحریک ہوئی کہ فیرملکیوں کا اتحاد
 باطل بنادیا جائے۔ خاص قومی انجمنوں کے ساتھ دوفاشتی خیالات رکھنے والی جماعتیں بھی پیدا ہوئیں۔
 نوجوان مصری پارٹی یا سبز قمیص والے جن کی مالی امداد اطالوی حکومت کرتی تھی۔ اور سفیدی قمیص والے چنگامی
 سپاہی جو جرمن طوفانی سپاہیوں کے نمونے پر تھے جنہیں جنگ عظیم میں خاص اور اہم خدمات کے لیے
 رکھا گیا تھا۔ اس کے لیڈر ابراہیم العزم مدبر بناس پاشا تھے۔ ڈیکٹرٹوں کے یہ اثرات بہت جلد زائل کر دیئے
 گئے مگر مصری وطن پرستوں نے برطانیہ کے غلامان احتجاج جاری رکھا۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی دوبارہ تسلیم کی اور دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد اور
 امداد کے معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اگلے سال ۱۹۳۷ء کے مستثنیات کو بھی رد کر دیا گیا اور مصر جمعیۃ الاقوام میں
 بھی داخل کر دیا گیا۔ اس کے معاہدہ میں برطانیہ کو مصر نے اس بات کا حق دیدیا کہ وہ نہرو سڑک کے علاقے میں
 دس ہزار فوج اور چار سو خیارے اور ہوا باز رکھے تاکہ ان سے رو دبار کی حفاظت کی جاسکے۔

۱۹۳۷ء کے معاہدے کے مطابق مصر نے اٹلی اور جرمنی سے سیاسی رستے منقطع کر لیے ہیں۔
 جرمن اور اطالیوں کا مال جس کا اندازہ..... ڈالر کیا جاتا ہے حکومت نے ضبط کر لیا ہے اس سلسلے میں
 یہ ذکر دیکھ چکے ہو گا کہ مصر کا سالانہ بجٹ..... ۲۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ ۶۰ ہزار
 جرمن اور اطالوی جو مصر میں رہتے تھے اور جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اپنی اپنی حکومتوں کی امداد کرتے
 ہیں ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ گزشتہ جن سے مصر میں فوجی قانون نافذ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاقہ جنگ
 ہونے کا اعلان کر دیا گیا ہے اسکندریہ اور قاہرہ کی بیس فیصدی آبادی سلامتی کی جگہوں میں لے جای

گئی اور فضائی حملوں سے بچنے کی تدابیر کی گئی ہیں لیکن اس امر کے باوجود کہ مصر افریقہ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کی منزل مقصود مصری حکومت نے اپنی غیر ملکی پالیسی برقرار رکھی ہے۔

اس حکمت عملی کے وجوہات کچھ تو فوجی اور بیشتر سیاسی ہیں۔ اہم جنگی مسئلہ یہ ہے کہ مصر ایسا ملک نہیں کہ پروردہ ہوائی حملوں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر قدیم مصریوں پر فضائی حملہ ہوا تو ان میں دہشت پھیل جائے گی۔ اور جانوں کا بھی بہت نقصان ہوگا کیونکہ وہ نہ تو ذہنی اور مادی طور پر اس طریقہ جنگ کا مقابلہ کر سکتے ہیں سارے قاهرہ میں جہاں ۳۰۰۰۰۰ کی آبادی ہے صرف تیس چالیس تہ خانے ہیں اور وہ بھی محض گلیے کھود کر ان پر لکڑی کے تختے ڈال دیے گئے ہیں اور اوپر سے ریت بچھا دی گئی ہے۔ اس میں صرف کھڑے رہنے کی جگہ ہے۔ جو اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں اور فضا اس قدر گندی ہے کہ اب تک تہ خانوں میں اتنے حادثے ہوئے ہیں جتنے باہر نہیں ہوئے۔

جامعیت اور سیاسیات | جنگ ہی کے مسئلہ پر مصری جامعوں اور سیاست دانوں میں اختلاف ہے۔ عدم مداخلت پسندوں کے لیڈر شاہ فاروق میں گو شاہ فاروق محض برائے نام حکمران ہیں مگر درحقیقت وہ بہت سے اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ شاہ موصوف اپنے باورچی، موٹر ڈرائیوروں اور موٹر سائیکل سواروں کا نظروں سے لے کر عمل کے خاص انجینئراں کو گریو کی تک بہت با اثر اطالوی جامعیت سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے والد شاہ فاروق نے اٹلی میں تعلیم پائی اور اطالوی فوج میں تربیت حاصل کی۔ ان کے منیر خاص عرصے سے نرم و علیٰ حق پنا شاہی جامعیت کے لیڈر رہے ہیں۔ حال ہی میں برطانوی سفیر مرالس لیمپن نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اٹلی اور جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور اسی مسئلہ پر انھوں نے گزشتہ جن میں شہنشاہی دے دیا۔

مصر میں بہت سے سیاست دان بھی ہیں جو جرمنوں کے تو خلاف ہیں مگر برطانیہ کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ سابق وزیر اعظم سائیری پاشا بھی ان ہی میں سے تھے۔ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں وہ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ موجودہ وزیر اعظم حسین سری پاشا بھی اسی جامعیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مصر کی موجودہ سیاست میں محال ممکن یہ ہے کہ سعدی یا قومی جماعت برمنوں اور اطالیوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیے چلا رہی ہو اور یہی جمعیت برطانیہ کے سخت خلاف رہی ہو۔ سعدی کہتے ہیں کہ مصر کا آزاد قوم کی حیثیت سے وقار اور اس کا قومی مفاد اس بات کی ضرورت پیش کرتے ہیں کہ جلد از جلد مداخلت کی جائے۔

مصر میں گوام رائے دہندگی پر گروہاں کے لوگ درحقیقت بالکل گونگے ہیں۔ اور حکومت کے لائحہ عمل بنانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ اہرام مصری بنانے والے غلاموں کی اولاد سے فلاطین ہیں اور یہ آبادی کا بیشتر حصہ یعنی ۱۶۰۰۰۰۰۰ میں۔ ان میں سے نوے فی صدی جاہل ہیں اور صرف دو فی صدی سیاسی احساس رکھتے ہیں۔

فلاطین کی حالت بھی بہت فرسودہ ہے۔ وہ مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں اپنے زمینداروں کا کام دس سنٹ روزانہ پر کرتے ہیں اور نظیری روٹیاں سیم، کھجور اور اکثر گوشت کھا کر زندگی کے دن گاتے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ آشوب چشم میں مبتلا رہتے ہیں۔

چونکہ وہ جاہل ہیں اس لیے ان کی خبریں کا وسیلہ صرف ریڈیو ہے۔ شام کو وہ گاؤں کے قہوہ خانے میں بیٹھے نازیل پیتے ہوئے چیخے چلاتے جو مصر کی بازی پر بازی کیلئے رہتے ہیں۔

خبروں کے وقت عقیدت مندانہ خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور تمام حرکات بند ہو جاتی ہیں۔ تبہتی سے جو خبریں اس وقت سنی جاتی ہیں وہ اطالوی نشر گاہ باری سے نشر ہوتی ہیں۔ ایک عربی مقرر وہاں سے برطانیہ کے خلاف پرجوش پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے اور برطانیہ کی زبردست شکستیں سنا کر جذبات کو اور بھڑکاتا ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء سے B.B.C. نے عربی میں خبریں اور تقریریں نشر کر کے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور نشر گاہ باری سے برسہا برسہا عربی مصر کی نشریات کو مقبول بنانے کے لیے اس نے ایک مشہور مصری گوئیے کو نوکر رکھ لیا ہے جو خبروں کے درمیان رسیلے عشقیہ گانے سناتا ہے۔ یہ تدبیر بہت عجیب ثابت ہوئی ہے۔ مگر برطانیہ اور اٹلی کے متضاد دعوے فلاطین کو سرگروہاں کو دیتے ہیں۔ دریاں مایکہ وہ جو کچھ ریڈیو پر سنتے ہیں اسی کو یقین کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عرب اپنے بھائی کو ایسے نازک سلسلہ

پر کیے دھوکا دے سکتا ہے۔ اور بآرمی اور لندن کے مقرر چاہے قیاد کیے رکھتے ہوں لیکن سچے مسلمان تو ضرور ہیں۔ [۱۶۷۱ء کا ساہکلہ در سے عو کہ ماضیہ کن در دریں برائی، بری اس میں دو چھٹیوں کا ذکر ہے]

بحیثیت مجموعی مصر کے خیالات جو مبنی اور اٹلی کے شدت سے خلاف ہیں اور یہ بھی طو شدہ امر ہے کہ وہ برطانیہ کے بھی مخالف ہیں۔ مگر مصری اور خاص طور سے وہاں کے سجدار لوگ، ممبران پارلیمنٹ اور تعلیم یافتہ طبقہ جو آبادی کا دس فی صدی جو سمجھتے ہیں کہ صرف برطانیہ کی فتح سے مستقبل امید افزا ہو سکتا ہے اور وہ خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ جرمنوں نے جو مالک فتح کیے ہیں ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ حکومت کی اس پالیسی کو کہ عربوں میں یہ فیاضانہ جذبہ قائم رکھا جائے کہ وہ برطانیہ کے ساتھ غیر جانبدار رہیں قدر کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی عزت کرتے ہیں لیکن اتنی محبت نہیں کہ وہ ان کے ساتھ لڑ کر جان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

بہر حال مصر کی مداخلت افریقہ میں حکومتوں کے توازن قوت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کرے گی۔ (ترجمہ)

شفقت اللہ کرمانی بی۔ اے (آنرز)

Books for further reading

Egypt Since Cromer :	Lord Lloyd
The problem of Egypt :	V. Chirak
The Transit of Egypt :	Elgood
Independent Egypt :	Emin Jonssef
Mahmud & Ali :	Dawson
Suez Canal :	Wilson
Egypt :	Elgood
King Faud :	Isaiah Ali Shalh

آخر کیوں؟

شہر کے روشن بازاروں میں کھوئے کھوئے چلنے والے
 ادب کے ادبے ایوانوں کے مرجھائے گلگائے ہاں
 بڑی بڑی تخیلات ہوں والے سچے اطمینان و عاری
 سینٹھ ہوں یاد فر کے باوجود فرزانے ہوں یاد دوانے
 شہروں کی اسیلی پریاں یا گاؤں کی دوشیزائیں
 لمبے ناموں والے لیڈر ملک کی ناؤ کھینے والے
 کالج کی دیوار کے پیچھے ذبح ہوئی غیرت کی دیوی
 چمٹا ہوا ہر دھرتی سے آکاش سے باتیں کرنے والا
 گرا کی دوپہر میں جیسے دھندلے سائے ڈھلنے والے
 لب لباب کے انگلیں اندھیری چھپے فی جاہوں میں ادا
 اُن کے جسم امراض کے مخزن گولہ بوس ہیں بجاری بجاری
 سب کی رگوں میں چکیٹ پیٹھڑے جیسے پھٹے پڑنے
 سب کے من میں کوٹ بھرا ہوا پر سے چاہے محکائیں
 سب کے سب ہیں زر کے بندے یا آزادی دینے والے
 رقصاں ہر تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی
 راہ کے تنکے چٹا ہوا آزادی کا دم بھرنے والا

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ اے بندوں کی سننے والے!

فرش پر کیوں غمگین و مریں ہیں عرش سے تائے چٹنے والے؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

یوں پریش مال وہ فرا کے رہ گئے شکوے مری زبان تک آ کے رہ گئے
 پہلے تو عرض غم پہ وہ جھجلا کے رہ گئے پھر کچھ سمجھ کے سوج کے شرما کے رہ گئے
 وہ کون ہے جو تا سر منزل پہنچ سکا دہندے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے
 بار عیادت اٹھ نہ سکا اُن سے ناز کی تکلیف چند گام وہ فرما کے رہ گئے
 اب دل سے کیا نکلتے ہیں تیر نگاہ ناز جو دل میں آ کے رہ گئے بس آ کے رہ گئے
 نفیوں پر میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے
 آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار دیکھا جو یک بیک مجھے گھبرا کے رہ گئے

ہر شکر انتقام محبت ہو اے جگر

شکوہ نہیں ہو اُن سے جوڑ پا کے رہ گئے

جگر مراد آبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نقش اول :- از صاحب ماجہدین۔ طے کا پتہ عالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحات ۳۳۲، قیمت عسائر ۲۲۳/۲۰
کاغذ کتابت اور طباعت اچھی

یہ بیگم ماجہدین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو ایک نئے بھی ہیں۔ ان قصوں میں زیادہ تر ہماری گھریلو زندگی کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں ہیں۔ ہماری تہذیب ہماری معاشرت ہمارے معتقدات ہمارے رسوم و رواج اور ہمارے قہمات غرض کہ ہر چیز اس میں موجود ہے۔ مصنفہ نے عورتوں کی سیرت اور ان کے رہن بہن کے طریقوں کو بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اصلاً غلطی بھی زیادہ تر بے منظر میں رہی ہے۔ مصنفہ کے قصے ہلکی چمکی تحریر میں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دراصل ان کے بیان کی سادگی اور سستہ پن ہے۔

ہماری رائے میں صاحبہ اگر ناول نگاری اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ ان کے قصوں سے تشنگی پوری نہیں ہوتی اور ذہن گھریلو زندگی کو تھمتہ دیکھنے کا متلاشی رہ جاتا ہے۔ یوں بھی لذیذ حکایت دراز ہونی چاہیے۔ ذرا افسانہ نویس کے گردن کے برتنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ انسانی فیت ذرا اور اثر انگیز ہو جائے۔

گل و گل :- از سید علی عباس صاحب عباس۔ ناشر انجمن ترقی ادب دہلی۔ سائر ۲۲۳/۲۰ صفحات ۳۸۰
قیمت عسائر کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ عباس صاحب سہارنپوری کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اردو کلام ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فارسی کلام ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حدیث محسنی صاحب ایم۔ اے کا ۶۲ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں عباس صاحب کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت عباس سہارنپوری کے ایک کہنہ نشین اردو و فارسی کے شاعر ہیں۔ کلام میں پاکیزگی خیال اور

ذائق اور اعلیٰ ادبیت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہ تمام فیض غالب مرحوم کا ہے عباس صاحب غالب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ تمام کلام پر رنگ ان ہی کا چڑھنا ہوا ہے حالانکہ تخیل کی وہ نزاکت اور جدت طرازی نہیں پیدا ہو سکی ہے بھر بھی خیالات کی شائستگی اور کلام کی بگنگی میں تمام دہوی رنگ موجود ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تعمیر کائنات بود القات دوست عالم بکام ہاست کہ او شد بکام ما
جن کی دنیا مستزف تھی وہ مری خود داریاں خوب کام آئیں کہ نذر پائے درباں ہو گئیں
عقل کی حامی کا اے دل گردا دیکھیے پختہ کا دان جنوں سے ربط پیدا کیجیے
کیجیے تعمیر ہرزوہ پر سو عرش خیال دیدہ دل وقف تعلیم تاشا کیجیے
ترتیب کلام میں ردیف کے بجائے اگر تالیف کا خیال مد نظر رکھا جاتا تو بہتر تھا۔

جامِ طلسم ۱۔ از خواجہ جلد بسج پال اثر صبا ئی۔ ناشر تاج کینی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ لاہور صفحات ۱۷۱
سائز ۱۱۔ قیمت درج نہیں۔ کاغذ معمولی کتابت و لمباحت عمدہ۔

یہ مجموعہ اثر صبا ئی کی رباعیوں اور قطعات کا ہے شروع ۲۰ صفحوں میں اپنی شاعری کے متعلق مختلف اشارات دیے گئے ہیں جس سے ان کی شاعری کا پس منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں خیاں، شریک حیات کی موت، گاندھی، ناسائی، اقبال اور دیگر سے تاثر پذیر ہوتے رہے۔ بہتر یہ ہوتا اگر رباعیات کی ترتیب بھی ان ہی ادوار کے تحت کی جاتی اثر صاحب کی شاعری ایک پاک خیال، صوفی منش اور حق پسند انسان کی شاعری ہے۔ اہرمن و یزدان، خیر و شر، تزکین نفس، موت و حیات، فنا و بقا، عدم اور وجود، جبر و قدر وغیرہ فلسفیانہ مضامین اثر صاحب کے کلام کے خاص جزو ہیں۔ وہ ان مابعد الطبیعیاتی بلندیوں سے بہت کم نیچے اترتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ اہم بھی اپنی جگہ مسلم ہیں کہ ان فلسفیانہ مضامین کو وہ ایسی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شریعت میں سموتے ہیں کہ قاری کا ذہن بغیر کسی قسم کا بار محسوس کیے ایک خاص لذت حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ لطیف، پاک اور منفرہ ہوتی ہے۔ چند مختلف حالتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

حورانِ بشت کی تمنا بے سود ہنگامِ شباب زہد و تقویٰ بے سود

لبریز نشا طہر چنستاں بہار یاد غم دوش و فکر فردا بے سود

نیرنگ طلسم زندگی کو پایا آلودہ غم ہر اک خوشی کو پایا

تکلیں جو تو ذکر یزداں میں آئے سرچشمہ بے خودی اسی کو پایا

گل چوم کے داء واہ کی ہو میں نے کانا چھینے پر آہ کی ہو میں نے

رویا ہنس ہنس کے اور ہنسا رو رو کر یوں چشم شب سیاہ کی ہو میں نے

ہنگامہ روح و جاں ہو حق کی ہستی سیلِ یم بیکیاں ہو حق کی ہستی

گو تلخ ترین ہو حق کی عواہم خوش باش کہ جاوداں ہو حق کی ہستی

اے حاصل دہر! تجھ کو حاصل کی تلاش! اے بر لبِ ساحل! تجھے ساحل کی تلاش!

تو خضر بھی، منزل بھی، رہہ منزل بھی رہبر کی تلاش کر کہ منزل کی تلاش!

ہنگامہ فصل گل ہو ہنگامہ رنگ ہو ربط رنگ سے رواں نغمہ رنگ

مے خانہ رنگ ہو گلستان جہاں گل ساغر رنگ ہو صبا بادہ رنگ

رباعی سے آخر صاحب کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہو خیام کے ترجمہ کا اسی کے رنگ میں
ذوق کر اگر کسی اُردو شاعر کو حق پہنچتا ہو تو آخر صاحب کو۔

خدا کی باتیں :- مرتبہ سبحان اللہ حافظ احمد سعید صاحب، ناشر دینی بک ڈپوہیت السعید کوچہ ناہر خانہ
دہلی سائز ۸×۱۲ صفحات ۲۹۸ قیمت عامر کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

اس کا اصل نام تو المدیۃ السنیہ ہے لیکن عوام کی رعایت سے 'خدا کی باتیں' رکھا گیا ہے کتاب کے
مؤلف یا مترجم یا ناقل حضرت سبحان اللہ حافظ احمد سعید صاحب ہیں جن کی شخصیت اس کتاب کے ذریعہ تعارف
کی محتاج نہیں۔ آپ کی ضروری گزارش پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کو حنن اتفاق سے ایک کتاب 'خطیرۃ التقدیر'
مل گئی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی ہاتھ آ گیا۔ کتاب خطیرہ کس کی ہو؟ گزارش کے (الف) پر بتایا کہ ابو انصر
میر علی حسن خاں صاحب کی تالیف ہے۔

سبحان عربی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جو بات ایک بار بول جاتا دوسری بار ان لفظوں کو نہ دہراتا

حضرت سبحان المندج غیر سے حافظ بھی ہیں۔ گزارش دہا میں علی بن حن خاں کو حسن علی خان بول گئے ہیں اور التالیف کو تصنیف فرما رہے ہیں۔ افادہ خاص و عام کی غرض سے آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہ تھی کہ یہ حسن علی یا علی بن کون بزرگ تھے۔ ورنہ اگر آپ ذاب حسام الدلہ صفی الملک ابو النصر میر علی بن خاں صاحب کو نہ جانتے ہوتے تو بھی کتاب حلیہ و التقدیس کے ٹائٹل کو دیکھ کر آپ پہچان سکتے تھے کہ یہ ذاب سید صدیق حسن مرحوم کے خلف الصدق تھے۔ اگرچہ اس کتاب کے متعلق آپ معترف ہیں کہ محنت سے مرتب کی گئی اور احادیث صحیحہ پر مشتمل ہیں لیکن آپ نے ساری کتاب میں کہیں اپنے اس ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس کے ترجمہ کا۔ اور نہ یہ بتایا کہ آپ نے اور کس قدر اور کون کون محصح احادیث کا اس کتاب پر اضافہ فرمایا۔

خدا کی باتیں صرف "حلیہ و التقدیس ہی سے نہیں لی گئیں بلکہ آپ نے لکھا ہے کہ (علامہ مدنی کی کتاب الانحاف السنیہ اور عللہ ووف سنادی کی اس کی تفصیل زیر مطالعہ رہی) حیرت ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کا حوالہ کسی حدیث کے ترجمہ کے بعد نہیں دیا گیا کہ معلوم ہو جاتا کہ حلیہ پر علامہ مدنی کا یہ اضافہ جو ہو گا جو سکتا تھا کہ کہیں اس سے یہ مطلب تو نہیں کہ اصل کتب حدیث سے احادیث جمع کی گئیں ہیں لیکن مولانا نے خود تصریح کی کہ عظم گدھڑیل میں بحالت قید محض رہتے ہوئے یہ کام ختم کر دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے جمع احادیث کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور تفصیل و ترجمہ حلیہ سے یہ کتاب مرتب فرمادی کاش ہمیں یہ موقع ملتا کہ ابوالشیخ ابن عدی ابن النجار ابن شاہین محمد بن نصر ابوعلی کی کتابوں کا پتا آپ سے پوچھ سکتے احادیث قدسیہ کی تحقیق کے متعلق ہم آئندہ فرصت میں اظہار خیال کریں گے اس وقت زیر نظر کتاب "خدا کی باتیں" کے متعلق یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (۱) جن مؤرخین حدیث (ابو شیخ و غیرہ) کی احادیث لکھی گئیں ان کی تصحیح کیے بغیر ترجمہ مناسب تھا۔ جو بی بات عربی زبان میں ہو تو بھی جھوٹی ہو کر اور ترجمہ ہو کر اردو میں آگئی تو بھی جھوٹی رہے گی۔ (۲) ان احادیث کے ترجمہ میں احتیاط و تشریح کی ضرورت تھی جنہیں سلف نے قضاہات قرار دیا ہے مثلاً احادیث قدم و ساق، کیا جنت کی کبھی اور دوزخ کے کھٹکے کے مصنف ہوتے ہوئے آپ پند فرمائیں گے کہ عوام یہ سمجھیں (جن کو سمجھانے کے لیے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے) کہ جس اللہ کی جنت کی ترغیب دی جاتی ہے اور جس کی دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے وہ خود دوزخ میں قدم رنجہ کرے گا۔

اور قیامت میں واقعی اپنی پنڈلی کھولے گا۔ آپ کی یہ تاویل کہ پانچ کھنے سے مطلب یہ ہے کہ دو بادیا جائیگا کہ سمٹ کر دوزخ چھوٹی ہو جائے اول تو کسی صحیح حدیث سے اخذ نہیں پھر اللہ کے پاؤں کو دوزخ سے نجات کمال لی۔ اسی طرح آپ کی یہ تاویل کہ پنڈلی کھولے جانے سے مراد درمیانی درجہ کی شبلی ہے کسی صحیح حدیث سے اخذ نہیں کشف سابق کی تشریح آپ مفردات راغب میں دیکھ سکتے ہیں (۳۱) غیر مستند کتب حدیث سے روایتیں نہ لینا چاہیے تعین مثلاً ص ۱۸۱ پر پھر ص ۱۸۵ پر اب شیخ سے دو قسم کے مرغول کا حال لکھنا مہم تھا اس حدیث کی سند تو دیکھیے۔ اسی طرح مقل کے متعلق حدیث کا حال ہے کہ ابن جوزی (دیکھئے اعلل المتناہیہ) اور دوسرے علما کی تصریحات کے مطابق اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اسی طرح ص ۱۸۲ پر جو حدیث ہے اس کی صحت کا پتا نہیں (۳۲) بعض طویل احادیث کو مختصر کیا ہے لیکن بہتر یہ تھا کہ انھیں نہ لکھا جاتا کیونکہ طویل احادیث کے متعلق علما نے بہت کم کے حافظ پر پھر دوسرے کاموقع پایا ہے۔ مگر حال اس کتاب کے چھپ جانے سے یہ فائدہ تو ہوا کہ حضرت نواب صفی الملک حسام الدولہ کی کوشش دوبارہ اردو میں آگئی اور ساتھ ہی ساتھ تھیں الاتحاف کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔ ناقدین کے لیے نکر و نظر کا موقع ہے۔ اللہ اس کتاب کے معاونین کو جزائے خیر دے۔

(دی۔ م۔ ر)
بیٹے :- ترجمہ احسان علی شاہ بی۔ لے (آئرن) ناشر نرائن دت سنگھ اینڈ سنز تاجوان کتب لاہور۔
 سائز ۲۰x۳۰ صفحات ۲۹۸ قیمت ۴۰ روپے کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ ناول دراصل امریکہ کی مشہور ناولسٹ پرل ایس بت کی مشہور ناول سنسز کا ترجمہ ہے۔ دراصل موصوف نے چین کی زندگی کے متعلق (جس کا انھوں نے اپنے دوران قیام میں بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا) ایک مشہور ناول لکھی تھی جس کا نام گڈار تھا یا دہرقی اتا ہے اس ناول پر موصوفہ کو نوبل پرائز بھی ملا تھا اور جس کا فلم بھی بن کر بہت مشہور ہو چکا ہے بیٹے، دراصل دہرقی مانا کے لڑکوں کی داستان حیات ہے اس ناول میں چین کی منفس قحط زدہ زندگی کی چلی بھرتی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ایسی پڑاؤم، بھیانک اور مظلوم ساتھ ہی سچی اور حقایق سے لبریز ہیں کہ بڑا تعجب اور انوس ہوتا ہے کہ انسانی مت کب تک اس روح فرسا غربت اور فلاکت میں پھنی رہے گی کاش سرمایہ داری کی لعنت ختم ہوں تو یہ جنگیں قحط اور گرسلی کا خاتمہ ہو۔

احسان صاحب کا ترجمہ بہت سلیس اور بامحاورہ اردو میں ہوا اور وہ وہاں کی زندگی کے خطوط
خالِ قلم رکھنے میں قطعی طور پر کامیاب ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ شائقین اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور
مستفید ہوں گے۔

نعمات نور: از نور صاحب لہریا نوی: ناشر حکیم سید بانٹم علی شاہ جیلانی جعفریہ بک اینجی رجسٹرڈ نمبر ۲۲۲
قیصر باغ لاہور سائیکل پریس صفحہ ۲۲۲ قیمت مجلد ۴ فیہر مجلد ۶ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔

یہ نور صاحب لہریا نوی کی نظموں کا مجموعہ جو زیادہ تر نظمیں مذہب اور اسلامیات پر ہیں۔ اقبال سے
متاثر ہونے کی کوشش ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ آخر میں تہنیت نامے، اودامی نظمیں، نظمیں سلام اور قطعات
اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ اور سب سے آخر میں ۴۰ صفحات میں موصوف کے نثر کے نمونے ادب لطیف
کے عنوان سے درج ہیں۔ نظم و نثر و کلام معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی مشق پختہ ہو چکی ہے۔ الفاظ اور بیان پر قابو
پیدا ہو چلا ہے۔ نظموں کے موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے رکھے ہیں جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ
تعداد میں متاثر ہو سکیں اور اپنی مذہبی باتوں اپنے مذہبی پیشواؤں کے ذکر سے مستفید ہو سکیں۔ بعض گیت
بھی عوام کو بڑے متاثر کرنے والے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (جلد سوم) از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ملنے کا پتہ
دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائیکل پریس صفحہ ۱۶۶ قیمت فیہر مجلد ۶ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔
ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا یہ تیسرا مقالہ ہے جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کے متعلق لکھا گیا ہے۔

اس میں مقصد محض اس قومیت کے نظریہ سے مسلمانوں کو روکنا ہے جو ان میں مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا
ہو گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کے سیاسی و اجتماعی تصورات علمی اور عملی حیثیت سے کیا ہیں اور اس
پر بھی زور دیا گیا ہے کہ بجائے قوم کی مشترک و فاداری کے خدا کی مشترک و فاداری سے مسلمان اپنے
صحیح نصب العین تک پہنچ سکتا ہے۔ خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں: اسلام کی دعوت اور
مسلمانوں کا نصب العین، مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل، اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف
کی راہیں، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے، جماعت اسلامی کی تشکیل وغیرہ

تعلیمی بحث

(اس بحث کا ایوان فرضی۔ اس کے افراد فرضی اور اس کا نفع منعمون بھی فرضی ہے)

آج تعلیمی بحث کا دن تھا اور کل سے آئریبل فیسٹر کو بے حد معروضیت رہی تھی۔ ان کے پاس کئی ایک ٹھکے تھے۔ ان کے سرخاب کے پر تو اور تین تھیں تعلیم تو ان کے گاہ وزارت میں ایک مرعی کے پر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اور مرعی بھی کواک مرعی !

کل شام کو انھوں نے فائلوں کے نیچے سے تعلیم کے کاغذات بکالے تو ان پر اچھی خاصی گرد بھی ہوئی تھی۔ انھیں دفتری پرنا تو بہت آیا مگر پھر سوچ کر رک گئے تھے اور جب انھوں نے فائل کھولی تو ایک جھینگیز قندبھر کوڑن سے ان کی ناک کے پاس سے گزر گیا تھا۔ اس کبخت کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ وہ کسی باوقار ناک کے پاس سے ہو کر گزرا تھا۔ کسی باوقار اور کسی حساس !

ان کے پاس وقت کم تھا بہت کم۔ دھتوں کے سایے ان کے ٹینس میدان پر بسے ہو چلے تھے اور ابھی تک وہ اپنے تعلیمی سکرٹری کو شرف باریابی نہ بخش سکے تھے۔ اتنے میں انھیں نیچے سے چینی کے برتن کھنکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی انھیں یاد آیا کہ انھوں نے آج چند سوشل ٹم کے دوستوں کو چائے پر بلایا جو انھوں نے فوراً سکرٹری کو اندر بلالیا تھا اس دوران میں بھی ان کی نگاہیں بار بار کھڑکی کے پار جا رہی تھیں ابھی تعلیمی بحث کے مباحث پر سرسری سا تبصرہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی نگاہ کھڑکی سے باہر میدان پر گئی اور انھوں نے دیکھا کہ سبز کاہی لان سے پرے کوٹھی کی افنی پر ایک فس قبح کے رنگوں والی ساڑی نمودار ہو چکی تھی اس پر انھوں نے جلد جلد سکرٹری کو خست کر دیا تھا۔

آج تعلیمی بحث کا دن تھا اور آئریبل فیسٹر اس میدان کے پرانے شہ سوار تھے اس موسم کے بحث کی بہت سی ٹشیاں تو وہ صاف پھلانگ چکے تھے اب تو محض اس کی دم باقی رہ گئی تھی بحث کیا تھے اچھے خاصے جنگی ٹم کے بیڑے تھے جنہیں چپو لگانا اور پار کرنا آئریبل فیسٹر کا ہی کام

تھا۔ اور تعلیمی بحث، تعلیمی بحث تو کا مذکر وہ ناؤ تھا جسے اگر وہ ایک بار اپنی گھنی سر نہیں لبوں سے اٹھا کر پھونک ہی دیتے تو آنا نائیں پار کیا ہوا کی لہروں پر ہچکولے لینے لگتی۔

گلاس مرتبہ ان کی خود اعتمادی کچھ ڈالنا ڈول ہی ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ اس بحث پر ہمتہ جی نے کنوئی کی ایک تحریک پیش کر دی تھی!

۱۔ اس کے جواب کی تیاری کے لیے انھوں نے کل شام کو اپنے سکرٹری کو بلایا تھا۔ سکرٹری صاحب نے اس سے پہلے ایک دن اپنے پرنٹ اسٹنٹ کو اور اس نے اپنے نائب کو اور اس نے اپنے کلرک کو بلایا تھا۔ مال گاڑی کے انجن کی طرح انھوں نے ایک ریل جو پیچھے کو دیا تو اس کی دھک گاڑی بے گاڑی، روک بے روک، خرمی ڈبہ تک پہنچی تھی یہ آخری ڈبہ ان کا جو نیر کلرک تھا۔ یہ ڈبہ ان جنادری گاڑیوں اور دیوار کے بیچ میں پس کے رہ گیا تھا۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ ان کے درمیان کیوں آیا کیا اسے پتہ نہ تھا کہ یہ بیچپائی اور پائی تو سب سے کمزور کی قسمت میں ہی لکھی ہو۔

ان کا تیار کیا ہوا جواب محض جواب تھا اس کے ہر جملے اور ہر لفظ کے پس منظر میں ایک کارواں تھا جس میں قطار اندر قطار نشی، اسٹنٹ، سپرنٹنڈنٹ ایک ہی سی اور ایک ہی ٹیکل میں پرے ہوئے تھے۔ اس ٹیکل کا سر از بیل منسٹر کے ہاتھ میں تھا اور اس سی سے اس پورے بے زبان گروہ کی جان انگی ہوئی تھی۔ اگر اس جواب کا کوئی حوت قابل اعتراض قرار دیا گیا تو اس پورے گروہ کی جان ایک پھوڑے کی طرح نہیں لینے لگے گی۔

غرض کہ یہ تقریر کلرک بے کلرک ہوتی ہوئی سینہ بہ سینہ نہیں، قلم بے قلم، آؤخا کلرکوں کے میکائل یعنی ایوان کے کلرک کے پاس پہنچی لیکن جتنی ذمہ داری اسی کمزور اور جھرجھری اینٹ پر جو جس پر اس قصر استماریت کا قوزن جھکا ہوا ہو۔

کہتے ہیں کہ دفتری حکومت کے طلسم کو ایجاد کرتے وقت کسی منچلے نے ستم ظریفی یہ کی تھی کہ اس کی بنیاد اچھے خاصے نٹ گری کے تاشے پر رکھی تھی اور حساب اس طلسم کا یہ تھا کہ اگر سب سے اوپر کانٹ ذمہ داری کے نودبان سے پھسل جائے تو وہ اپنے ماتحت کے عین شالون اور پشت

پر جا کر نکلتا تھا۔ اس سے ایک تو چوٹ کم لگتی تھی اور دوسرے اس تحریک سے وہ ماتحت اپنے نچلے ماتحت پر اسی شان سے نازل ہوتا تھا۔ قس علیٰ ہذا مگر اس سفرے پن میں کم بجتی تو سب سے نچلے ماتحت کی تھی جس کے نیچے سوائے پتھر لی زمین کے اور کچھ نہ تھا اور یہ بے چارہ اکثر چاروں شانے چت جاتا تھا اور چونکہ اوپر کے لوگ مادی لحاظ سے بھی بھاری بھر کم ہوتے تھے اس لئے اکثر اوقات دوبارہ اٹھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی۔

اب اجلاس شروع ہوا۔ اس کا افتتاح مستہ جی کی تقریر سے ہوا تھا۔ آج ان کی زندگی کا ایک سب سے اہم لمحہ تھا اور جب وہ اٹھے ہیں تو انہیں احساس تھا کہ ایک زمانہ کی نگاہیں ان پر اٹھ رہی ہیں اور خاص طور سے وہ نگاہیں جو لیڈرنگ ٹیلری سے ان پر اٹھ رہی تھیں یہ تیز نگاہیں ان کے رخساروں پر چھتی ہوئی آنیاں سی معلوم دے رہی تھیں انہیں نگاہوں کے لیے انھوں نے خون پینہ بہا کے یہ تقریر تیار کرائی تھی۔ اور پھر کل پریس میں ان کے الفاظ علیٰ حروف میں ان کا نام عوام کی زبان پر ان کی آوازاں کے کاؤں میں گونج رہی ہوگی؛ آج دنیا کو پتا لگ جائے گا کہ ان میں کیسا جوہر چھپے ہیں۔

مستہ جی کی تقریر شروع ہوئی:-

”جناب صدر! میں آپ کی وجہ اس خوفناک بے علمی اور جہالت کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے عوام پر مسلط ہو کر جو ہم آج اس ایوان میں ایک روشن خیال گروہ کے مابین ہیں مگر ماحول کی تاریکی کے مقابلے میں یہ گروہ ایک ٹٹاتی ہوئی شمع سے زیادہ نہیں اور جناب صدر! یہ تاریکی کم نہیں ہو رہی۔ کسی جانب سے ہیں امید اور اس کا اجالا ابھرتا نظر نہیں آ رہا یہ تاریکی کم نہیں بلکہ جیسا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے زیادہ ہو رہی ہے۔ اس کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اس کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی ہے اور ہیں ڈر جو کہ یہ تاریکی کہیں مدھم روشنی کے اس دائرے میں تعلیم یافتہ طبقہ اطمینان سے بیٹھا ہو ایک دن نہ آجائے۔ اس محفوظ اور خوبصورت جزیرے پر جس میں اونچے طبقوں نے اپنا ذہنی بہشت بنالیا ہے برابر مد کی لہریں چڑھتی جا رہی ہیں یہاں دیکھا ہے کہ کسی دن مملکت لہر کا وہ تھپہڑ آئے گا جو ایک مرتبہ

پھر اسے سطح آب کے برابر کر دے گا اور بے علمی کا سمندر پھر ایک دفنہ اپنی اس امانت کو واپس لے گا جو ہم نے صدیوں کی محنت اور غلوس سے اس کے سینے سے چھین لی تھی۔

”جناب صدر! ہماری دیہی آبادی کا یکسر بے علم رہ جانا ایک قومی المیہ ہزاروں قوم کے اعصاب میں سے ایک اہم عضو کا مفلوج ہو جانا وہ عضو جس سے کہ نظام ملی میں نئے خون کی تولید ہوتی ہے جو قوموں کی قسمت میں نئے کمالات بیدار کرتا ہے جس سے کہ زندگی کی نئی سوتیں پھوٹتی ہیں جو غیر ملوث سیدھے سادے قزاق کا منہ جو وہ قزاق ایک طوفان کی طرح زوردار اور ایک دریا کی طرح بہاؤ رکھتے ہیں جب روس یا ترکی نے ان خوابیدہ قزاق کو تعلیم کے ذریعہ بیدار کر دیا تو انھوں نے ملک بھر کو ایک نئے برقی صنعت دلوے، ایک نئی زندگی سے بیتاب کر دیا۔

”اگر میں آپ کے سامنے اعداد و شمار پیش کروں تو آپ کو پشیمان چل جائے گا کہ ہم زندگی کی دوڑ میں کس قدر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ دوڑ جو ہر قسم دوڑ رہے ہیں اس میں سب سے کمزور اور سب سے زیادہ قابل رحم ساتھی ہمارا کسان ہے۔ آج اس بحث کے موقع پر میں نے مناسب سمجھا کہ حکومت کی توجہ وقت کے اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرا لی جائے۔“

منہ جی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے اور ان کی تقریر سے ایوان میں سنی سی پھیل گئی تھی ان کی تقریر روایات کے مطابق یہ تھی اس تقریر میں جذباتی عنصر نمایاں تھا اور ان کے الفاظ میں وہ توازن اور پرتقار اعتدال نہ تھی جو ایک رکن کے ثانیان ثانیان ہے۔ یہاں کے کارگر ہتھیار دوہی تھے ایک گرمی گشتار اور دوسری نرمی رفتار گرمی گشتار ہو چکی تو نرمی رفتار کی باری آئی

اب انٹیل فٹرس میدان میں آئے۔ ان کی تقریر میں وہ خود اعتمادی اور مربیانہ انداز موجود تھا جو ایک چھ فیٹ کے قد اور ویٹ اینڈ کے بہترین سٹے ہوئے سوٹ سے اٹھتا ہوا درول و دماغ دونوں پر چھا جاتا ہے اس کے ساتھ ایک دل خوش مزاج کا ترشح بھی ان کی تقریر میں موجود تھا ان کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ عمدہ اور سماجی لحاظ سے بہت اعلیٰ تھے اس لیے وہ ہر ممبر کے ساتھ بعینہ اسی طرح سلوک کر سکتے تھے جیسے چھوٹے بچے جو بصورت پلاؤں کے ساتھ کرتے ہیں پہلے تو چپکارتے ہیں پھر پکارتے ہیں

اور جب وہ خوشی میں خرخرانے اور دم ہلانے لگتے ہیں تو آہستہ سے ایک چپت سر پہ لگا دیتے ہیں مگر چپت بھی مربیانہ انداز میں ہی لگاتے ہیں کچھ ایسا ہی انداز ان کی آج کی تقریر میں بھی پایا جاتا تھا۔

”مجھے آج غزویٰ کے میں مسۃ جی کی تقریر کا جواب دے رہا ہوں مسۃ جی ہمارے پرانے کرم فرما ہیں اور ان سے تو ہماری چھیڑ بڑھلپٹی رہتی ہو اکثر اوقات ان کے سوالات سے جواب دیتے ہوئے مجھے پسینہ چھوٹ چھوٹ گیا ہو اس جملہ پر مسۃ جی نے اپنے پاؤں پر پھیلا کر بجائے اور ان کی نگاہیں غیر شعوری انداز میں لیڈر گیلری کی طرف جھکیں، مسۃ جی کی تقریر خود فصاحت کا ایک بہتا ہوا دریا اور معلومات کا ذخیرہ ہو جملہ مترضہ معاف فرمائیے گا انھوں نے کوئل جعفر سن کے اقتباسات میں سے کچھ پڑھا مجھے اس موقع پر جعفر سن صاحب کو یہ یہ عقیدت پیش کرنا ہو جس دن سے محکمہ تعلیم نے ان کی خدمات شاہی رسالہ سے مستعار لیں اسی دن سے انھوں نے محکمہ کو ایسے شاندار فوجی نظام سے چلایا جو کہ ہمارا محکمہ خوش انتظامی اور ضبط کے لیے ضرب المثل بن گیا ہو (اس قصیدہ خوانی میں پندرہ منٹ صرف ہوئے)

”اب میں موضوع بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں حضرات! قابل مقرر نے فرمایا کہ فلاں ملک میں یہ ہوا فلاں میں وہ ہوا اور اس کے بعد یہ ہندوستان میں کیوں نہیں ہوا؟ جناب صدر! میں پوچھتا ہوں کہ میرے ہاں لوہا کا ہوا فلاں صاحب کے ہاں بچہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا! ایسی جرات تو بیل منسٹری کر سکتے تھے، میرے ہاں آج شرادھ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا یہ کوئی منطقیا نہ دلیل نہیں ہو۔ جناب صدر! اگر نہیں ہوا تو اس نہ ہونے کی ذمہ داری ہم پر نہیں یہ ذمہ داری لوکل باڈیز پر ہے یہ ذمہ داری ڈسٹرکٹ بورڈ پر ہے یہ ذمہ داری مقامی احباب پر ہے حضرات! اگر آپ پچھلے بحث اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ لگ جائے گا کہ ہم لوگ تعلیم پر پہلے سے کتنا زیادہ خرچ کر رہے ہیں ہمارا ابتدائی تعلیم پر ہی خرچ آگے سے ”کتنا ہو گیا ہے“

ایک نمبر کیا میں ”نوبل فٹر“ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ تعداد خواندگان بھی پہلے سے تگنی ہو گئی

ہو یا نہیں؟

”نوبل فٹر“ نمکنت آمیز مکر مہٹ سے ادھر کہا کہ ادھر کہا کہ جناب صدر! میں تعلیم اور کچھ کے معاملہ میں

مادی اقدار اور ناپ تول کا قائل نہیں ہوں تو مومن کی زندگیاں ترازو سے نہیں تولی جاتیں اور نہ ہی ان کی ترقی آنے پاؤں سے عصب ہو سکتی ہے (اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) مگر جناب صدر! ابھی تو مجھے ان اہم مشکلات کا ذکر کرنا ہے جو تعلیم عوام کے راستے میں مائل ہیں اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کے چہرہ پر ہلکے رنج اور فکر کی بدلی سی چٹائی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس گراں بار بوجھ کے احساس سے دبے جا رہے ہیں اس بوجھ کا اثر ان کی آواز پر بھی معلوم ہوتا تھا، ان میں سب سے بڑی اور سب سے اہم مشکل عورتوں کی کمی جو دہیاں ان کی مراد استانیوں سے تھی کیونکہ اگر عورتوں کی کمی ہوتی تو بچوں کی زیادتی کا سد باب ہو جاتا اور تعلیم عوام کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اتنا شکر ہے کہ انریبل منسٹر نے یہ نہیں کمدیا کہ ملک کو آج تک بڑھایا ہی استانیوں نے ہے۔ اس معاملہ میں ان سے کوئی چوک تو ہوئی نہیں تھی۔ انہوں نے پہلے سے اپنے سسٹنٹ کو ایسا تاریخی مواد میا کرنے کو کہا تھا جس سے یہ امر باہر تحقیق کو پہنچ جائے کہ ایک زمانے میں یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں استاد تھیں لیکن ان دنوں اس غریب کو گھر پر اتنے پردہ لگھننے پڑے کہ یہ کام پورا نہ ہو سکا اور پھر جناب صدر! اکثر بچے تعلیم پوری ہونے سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور ہر سو میں سے صرف ۸ بچے چوتھی جماعت تک پہنچ پاتے ہیں۔

ایک ممبر "جناب صدر! کیا استادوں کے لیے ایکٹ اسلٹ نہیں ہے۔ اور کیا ڈنڈا قانون کی زرد میں نہیں آتا؟"

ایک لبرل ممبر (یہ ممبر آزادی کے اصول کی خاطر ایک دفعہ جیل بھی جا چکے تھے) ہرگز نہیں۔ اگر بچہ کو آزاد اصول پر تعلیم کا حق حاصل ہے تو استاد کو آزاد طریق پر تعلیم دینے کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد ایک صاحب پچھلے بچوں سے کھڑے ہوئے کچھ اکڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی ابتدائی زمانے کا انسان انسانی تجربے میں پہلی مرتبہ پچھلے بچوں پر تو ازن قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ ایوان کے ان بے زبان گروہ میں سے تھے جو دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں۔

"جناب صدر! میں کچھ ایسا مقرر تو نہیں ہوں تاہم میرے ذہن میں اس وقت ایک خیال آیا ہے جس کا اظہار ملک و قوم کی بہبودی کے لیے ضروری ہے میرے خیال میں جس نے تعلیم نہیں پائی وہ حیوان ہے

محض حیوان

اتنے میں ایک سیاسیات کے پروفیسر جو بہت کچھ گھوڑا یوان میں پہنچے تھے ذہنی لحاظ سے نہیں بلکہ مالی لحاظ سے گھوڑا، عالمانہ نمکنت سے اوپر کا ہونٹ سکڑتے ہوئے زیر لب بڑبڑاتے۔

آجے گدھے اگر حیوان نہ ہوتے تو تمہارے جیسوں کو انتخاب کر کے یہاں کیوں بھیجتے؟ ہاں بس Hobbes) انسانی ذہنیت کے اس پہلے نباض نے ہی انسان کو سمجھا، انسان کو نہیں بلکہ انسان میں جو حیوان ہوا اس کو سمجھا اور اصل میں سیاست کی بباط کا اصل مہر تو یہی انسانی صورت میں چلتا پھرتا حیوان جو عوام کی تعلیم! یہ لوگ جو عوام کی تعلیم کا ماگ الاپ رہے ہیں انہیں کیا معلوم کہ وہ کس آگ سے مکمل رہے ہیں خود ہی خود اپنے خیالات سے ایک تقض کی طرح جوش میں گر جاتے ہوئے تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ تم کس آگ کے ساتھ مکمل رہے ہو، یاد رکھو یہ تو ایک بمب ہو لگا پڑھا بمب! ان پڑھ بمب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہی ان پڑھ کا سیٹھی والو محض گھونٹا ہوتا ہی اور لکھے پڑھے کا کچھ پتا نہیں کہاں سے لکھ کر پھٹ پڑے (پروفیسر مومفٹ اکثر اس قسم کی تقریریں کرتے رہتے تھے جس میں وہ خود ہی صدر خود ہی مقرر اور خود سامع ہوتے تھے)

اس کے بعد ماراج را جینولا نے تقریر کی یہ ممبر یوان امرا کے درخشاں ستارے تھے ان کی شہرت کا سبب ان کے مشہور گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے جن کی انہوں نے خاص طور پر تربیت کی تھی اس تربیت میں انہوں نے سائنس کی بہترین اور جدید ترین معلومات سے فائدہ اٹھایا تھا پچھلے سالوں سے نظریۂ ارتقاء نے یوان کے ممبروں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی اور یوان میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ انسانی تربیت کی حکیم تیار کرتے وقت ان تمام تحقیقات کو خاص طور پر مد نظر رکھا جائے جو مسلم حیوانیات میں ہوتی رہی ہیں اس رجحان کے سب سے بڑے اور سب سے پر جوش معتقد ہمارے راجہ صاحب تھے۔ جہاں بعض ممبروں کا یہ خیال تھا کہ حیوانی ارتقاء کے تجربات کے مفید پلوں کا تجزیہ کر کے انہیں انسانی تربیت کے عمل کے لیے استعمال کیا جائے وہاں راجہ صاحب کا شریع میں ایمان یہ تھا کہ انسانی تربیت و تعلیم کو من و من اسی لائن پر چلایا جائے جس پر کہ ان کے گھوڑوں کی

ترہیت کی گئی ہوا درحق تو یہ ہو کہ اگر کسی ہندوستانی کسان کے لیے کھانے پینے رہنے سننے، دوا دارو کو وہ تمام سہولتیں میا کر دی جائیں جو کہ راجہ صاحب کے اصطل کے ایک پہاڑی ٹوکو میسر ہیں تو وہ کسان یقیناً راجہ صاحب سے ذہنی اور علمی لحاظ سے دو چار قدم آگے ہوتا لیکن پچھلے دنوں ان کے خیالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھالیا تھا۔

راجہ صاحب اس بحث کے لیے اپنے ساتھ ایک ماہر حیوانیات کو بھی لائے تھے۔ جو کہ خاص طور سے اسی موقعہ کے لیے مدعو کئے گئے تھے۔ وہ مہمان گیر میں موجود تھے۔ اس ماہر فن کا خیال تھا کہ گھوڑے نے اپنی ٹانگوں کی تیزی کش مکش حیات کی جدوجہد میں بڑھ چالی ہوا انھوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس سے ارتقا کی اس رو کو گھوڑے کی چار ٹانگوں میں چل چلی تھی ٹانگوں کی بجائے دماغ کی طرف دھال دیا جائے ان کا خیال تھا کہ اس زبردست اور اہم انگٹان سے راجہ صاحب کے گھوڑے دنیا بھر کی گھوڑوں کو اپنی دماغی ترقی کی وجہ سے جیت لیں گے اور دوڑنے میں ٹانگوں کے علاوہ ذہن سے بھی امداد لیں گے اور اس طریق پر ان کی رفتار بے تحاشا بڑھ جائے گی۔

لیکن انوس یہ ہے کہ سوچ اور فکر کی قوت کے ساتھ ساتھ ان میں کئی ایک اور باتیں بھی پیدا ہو گئیں اول تو ان کا دماغ ان کی ٹانگوں سے پہلے چل نکلا اور سوار کے لیے ان پر توازن رکھنا قریب قریب ناممکن ہو گیا کیونکہ توازن تو جب ہی قائم رہ سکتا تھا کہ سوار کی ران کے نیچے گھوڑا ہوا اور گھوڑے کا ذہن بھی ہو پھر بعض ان گھوڑوں نے جن کے دماغ میں یہ دیکسین کچھ زیادہ چڑھ گئی تھی ذہنی طور پر آڑنا شروع کر دیا اور پہلے بھی کرتے تھے مگر وہ چیز محض شوخی طبع تھی کبھی طبیعت زوروں پر آتی تو پچھلی ٹانگوں کو ہوا میں رقص کا دائرہ کرا دیا۔ یا گردن کو ایک شرمائی ہوئی دامن کی طرح جو نہہڑا یا تو سوار گدے زمین پر۔ اب معلوم بنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کہتے کیسے مزاج ہیں ؟

لیکن اس مرتبہ کا آڑنا خالص ذہنی آڑنا تھا اور اس مرض کے جراثیم جب پہلی دفعہ ماہر حیوانیات کو معلوم ہوئے تو انھیں ایک بالکل کچی سی چڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مرض خطرناک طور پر متعدی تھا ان تیز رفتار پہاڑی نالوں کی طرح جن میں پانی بڑھنے لگتا ہو تو دیکھتے دیکھتے گزرتے ہوئے مسافر کے

کنہنوں سے اوپر ہو جاتا یہ مرض بھی راتوں رات ایک گھوڑے سے دوسرے بلکہ گھوڑوں سے گزر کر کسانوں کو بھی لگ جاتا تھا اور اس کے بعد نہ تو وہ خود محفوظ تھے نہ راجہ صاحب۔

راجہ صاحب کی تقریر میں ان تلخ تجربوں کا رنگ جھلک رہا تھا ان کی آج کی تقریر میں سچے عقیدہ کی جھلک اور ان کی زبان میں صداقت کی فصاحت تھی انہوں نے کنا تیرے خیال میں عوام کو بڑھانا ایک ایسا لگنا کبیرہ ہو گا جن کا خمیازہ ہم کیا ہماری آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا ہو گا۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں چیلنج کرتے ہوئے ان کی آواز نایوان میں گرج رہی تھی اور مارے جذبات کے قطرہ ہار رہی تھی، آپ عوام سے وہ رشتہ پیدا کریں جو میں نے کیا ہے تو آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کتنے سچے دل سے تعلیم کے خلاف ہیں میں نے ایک تجربہ میں غلطی کھائی (ان کا اشارہ گھوڑوں کے تجربے سے تھا، میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی ایسا دھوکا کھا جائیں اگر میں اپنے گھوڑوں سے ایک مرتبہ بھی پوچھ لیتا تو وہ ضرور ہنسا کر کہتے کہ ہم تو بغیر اس ارتقائی عمل کے گھوڑ دوڑیں جیت لیتے ہیں ہیں اس کی کیا ضرورت ہے میں چاہتا ہوں کہ جو سوال میں اپنے گھوڑوں سے کرنا بھول گیا آپ عوام سے کریں وہ ضرور آپ سے کہیں گے کہ سرکار ہم تو بغیر تعلیم کے ہی ساج کی مٹ کر رہے ہیں ہیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے“

راجہ صاحب کے بعد ایک مدرسی ممبر نے تقریر شروع کی۔ نواب صاحب آج شاید پہلی مرتبہ کسی تقریر کے دوران میں بیدار ہوئے تھے اور بڑے آدمی تو بغیر ہی ایک دفعہ نیند اچاٹ ہوئی تو دوبارہ کہاں سے آئے ان کے آرام میں خلل اسی مدرسی ممبر نے ڈالا تھایہ ممبر ایڈلٹ ایجوکیشن (تعلیم بالغان) کے لفظ کو اس طریق پر ادا کرتے تھے گویا ہونٹ رنگن سے گولے چوٹ رہے ہوں چونکہ یہ لفظ ان کی تقریر میں بار بار آتا تھا معلوم یہ ہوتا تھا گویا کوئی قادر گولہ انداز تاک کر نشانے لگا رہا ہو ایک نشانہ ایسا کارگر بیشاک نواب صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں دلت، دلت، دلت ادھار۔ دلت ادھار سے انہیں خاص چڑھتی ان کے علاقے میں اس تحریک کی وجہ سے پھیلی دھولی کے دنوں میں کافی چپقلش رہی انہوں نے ساتھ کے ایک مسلمان ممبر کو ٹھوکا دے کر چوکھا دیا اورے صاحب کیا ابھی سوالات ہی ہو رہے ہیں بہت یہ تھی کہ نواب صاحب کی پہلی نیند سوالوں کے مابین ہی کسی نامعلوم وقت پر شروع ہوتی تھی

اور ان کا خیال تھا کہ ابھی تک سوالات چل رہے ہیں، یا کوئی دلت ادھار کا بل پیش ہو رہا ہو؟
 ان کے ساتھی مسکرائے اور کہنے لگے ”حضرت یہ بحث تعلیم بالغان پر ہو رہی ہے“
 نواب صاحب ”تعلیم بالغان؟ ارے میاں ہمیں تعلیم بالغان سے کیا مطلب؟ میں خوب جانتا ہوں
 اس تجویز میں برادران وطن کا ہاتھ ضرور ہے“

یہ دو ٹوک اور حتمی فیصلہ بادی النظر میں محض جلد بازی کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا لیکن اگر نواب صاحب
 کے جذبات اور ان کے تاثرات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ایک پورے طوفان کی لہروں سے گزر کر اس
 محفوظ چٹان پر پہنچے تھے۔ ان کے غصے نے پہلی بھریری تو اس وقت لی تھی جب ان کی نیند میں غلغلہ انداز
 کی گئی اور جب دلت ادھار کی غلطی بتائی گئی تو ان کی کیفیت اس لہر کی سی ہو گئی جو ایک دفعہ دریا کے
 بندے ٹکرا کر منہ میں جھاگ بھرا لے اور دوسری دفعہ ٹکرائے کو تیار ہوا اور اس کے بعد تعلیم بالغان !
 اب تو پانی سر سے گزر گیا تھا ان کے غصہ کے تلاطم نے سب قید و بند ایک ایک کر کے ٹوڑ ڈالے تعلیم
 بالغان ! حضرت حج کیسے مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی کیا ضرورت ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کو اس کا پورا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی مطلق ضرورت
 نہیں اور یہ فیصلہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی تھا کیونکہ جب سے انھوں نے زمینداری سنبھالی تھی انھوں نے کوئی
 آن پڑھ مسلمان دیکھا ہی نہیں تھا زمینداری سنبھالنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے علاقہ کی
 سکونت چھوڑ دی اور اس کے ساتھ پورا ماحول بھی چھوڑ دیا تھا ان کے خیال میں نئے زمینداری نظام
 کے لیے کچھ اس قسم کے محل کی ضرورت تھی جس سے سانپ اپنی کینچی اتار کر پرانے ماحول اور پرانے بل
 سے رخصت ہو لیتا ہے کینچی بدلنے کے بعد اب وہ شتر کے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے نواب صاحب جدید
 نظام زمینداری کے ابھرتے ہوئے ستارے تھے اس تلی کی طرح جو ابھی ابھی کو یے سے پر پھیلانے
 نکلی ہو جس کا کوئی کسی جاڑی کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گیا اب اس جاڑی کی نیم تاریک دنیا کیسے دوڑ
 پیچھے رہ گئی اور زندگی کی نئی پرداز رنگین پروں پر ایک جگہ گاتی ہوئی دنیا میں چل نکلی تھی یہ دنیا سول لائسنز
 کی دنیا پر پھلکن ڈنڈا اور عمارتوں کی دنیا تھی اس دنیا کے بانے والے نہیں اس کے سجانے والے

ان کے گوانی خاناماں، فزینہ و اوران کا ایک گلو انڈین شو فرم تھے۔ خوبصورت تھیری کا بد صورت نول دیہات میں رہ گیا تھا اور اس نول میں ان کے ابا میاں کے خاندانی شاگرد پیشہ بدھو باورچی شہزادی فرانش اور کلوا عصا بردار کلبلا رہے تھے۔

میرن پور کی زمینداری ان کے ابا جان کے وقت میں ابھی خاصی بیخبرگاری تھی جس میں بدھو شہزادی، ننھو اکلوا اور ان کے ساتھ بڑے نواب سہی سوار تھے کوئی اول درجہ میں تھا تو کوئی تیسرے میں اور تیسرے میں جگہ نہ ملی تو کم پل کر ملازموں کے ڈبے میں ہی چلنے لگے لیکن چھین میاں کے زمانہ میں زمینداری وہ اسپیشل تھی جس کے ٹائم ٹیبل میں میرن پور جیسی جگہ ٹھہرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ میاں شہزادی کی جوتیا اور بدھو کا نرل دھرا کا دھرا رہ گیا اور چھین میاں کی زمینداری نے سیدھا کھنڈ جا کے دم لیا۔

اور بچ تو یہ جو کہ ایک روشن خیال زمیندار کے ہاں ازمنہ و سلی کی ان تنگ و تاریک یادگاروں کی کیا ضرورت تھی ذلیل یادگاروں کو تو انھوں نے اسی دن مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس دن کلکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ آج کل کسی شریف گھرانے میں آن پڑھ ملازم کا ہونا ایک بدنام داغ ہے۔ وہ دن ہوا اور آج کا دن نواب صاحب نے جو قبائے زمینداری کی وصالی کیا گسائی شروع کی جو تو ان بدنام داغوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا بلکہ اب تو اس قبائے کے بھی نیچے سے ریشے ڈھیلے ہو گئے تھے۔

بڑے نواب صاحب کے وقت میں ڈیوڑھی میں ہر روز مکتب لگتا تھا اور شاگرد پیشہ کے بچے چھین میاں کے ہم مکتب تھے۔ اور ان کا خلیفہ ننھو اہشتی کا بڑا بیٹا ننھو تھا۔ لیکن اب تو چھین میاں کے بچے مسوری کے ایک یورپین اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پرانے ملازمین کے بچے باہر سڑک پر خاک دھول میں لٹتے تھے۔ حقیقت تو یہ جو ان کے اس جدید ماحول میں نہ تعلیم کی ضرورت تھی نہ تعلیم بالانان کی اور اگر نواب صاحب اس لفظ پر اس قدر جزبہ ہو رہے تھے تو وہ ایک حد تک حق بجانب تھے۔ وہ پورے تین سو سے کہہ سکتے تھے کہ جہاں تک ان کے تجربے کا تعلق ہو تعلیم بالانان کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کے منہ میں ایک طرف ان اہل رہا تھا اور وہ اس طوفان کی تندہی کو پورے ایوان پر بکھیر دینا چاہتے تھے۔ یہ لپکتا ہوا شعلہ ان کے بہن تک آتا تھا اور پھر واپس ہو جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ

یہ تھی کہ اب تک وہ جناب صدر کی آنکھ اور نہ ہی اس کا اشارہ پاسکے تھے۔ اگرچہ نہ تو ایوان کوئی ہزم ناز تھا اور نہ ہی صدر کی آنکھ چشم یا رے کھیں دور کی بھی مشابہت رکھتی تھی لیکن اس نگاہ کو لاکھ تھانے کی کوشش کریں تھمتی نہ تھی اور ادھر رقیوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی تو بند نہ ہوتی تھی

اس ایوان میں پہنچ کر نواب صاحب کو بعض عادتیں چھوڑ دینا پڑی تھیں اور بعض نے خود بخود ایسی قلابازی کھائی تھی کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر مگھٹی تھیں۔ اب تک انہوں نے باہمی گفتگو میں جوابات دل میں آئی خوب سا کر لی لیکن اب ہر بات کھڑکھڑانا پڑ رہی تھی یعنی سنا کسی کو چاہتے ہیں اور کہہ جناب صدر سے رہے ہیں۔ جمہوریت کے انجمن نے انسانی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ ہر طبعیانی جناب صدر کے واسطے سے ہر کچھ پہنچے اس سے نہ صرف جذبات کا زور دم مچ پڑ جاتا تھا بلکہ یہ عمل اس قوت جادو کا بھی اندازہ لگایا تھا جس کی برکت سے جناب صدر کو کسی صدارت پر چپکے بیٹھے ہیں۔ اس عمل میں جناب صدر کو ان کا وزن اور اہمیت محمود خاص طور پر مدد و معاون ثابت ہوتی تھیں

نواب صاحب لاکھ بن بن کر بیٹھے مگر ان کے لاکھوں ہنڈ پڑ ایک جہا نا لگاہ کا غالب آ گیا۔ وہ جناب صدر کا اشارہ نہ پاسکے اور ان کی تقریر آن سنی رہ گئی۔

اب سیٹھ علیک جلال کی باری تھی اور بیج تو یہ جو کہ آج کسی کی باری کا سوال ہی نہ تھا۔ آج کی بحث عقاید اور اصولوں کے بلند میا پر ہو رہی تھی اور اب تک جو مقررین بول چکے تھے ان کے منہ کے جھاگ اور ان کے پیشانی کے قطروں سے یقین کی بو آ رہی تھی۔ سیٹھ جی بھی انہی لوگوں میں سے تھے عام طور پر وہ اس قدر ٹخنڈے مزاج آدمی واقع ہوئے تھے کہ معمولی مباحثوں کی ہا بھی کان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا ان کے توازن کو برقرار رکھنے میں ان کی تو ندھی امداد دیتی تھی ایک تو اس تو ند پر دونوں ہاتھ رکھنے سے ایک ابدی طمانیت چہرے پر پھیل جاتی تھی اس جادو کے کرتے کی طرح جو اہل سیما اپنے ساتھ رکھتے تھے اس تو ند پر ہاتھ رکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا کامیابی و نصرت کا گولہ ہاتھ میں آ گیا پھر جب کبھی کسی مسئلہ پر طبیعت حاضر ہوئی تو اکثر تو ند حاضر ہونے میں مائل ہو جاتی تھی اور جب تک سیٹھ جی ادھر ذہن کو بیدار نہ دھر تو ند کو ہشیا رکھیں اس وقت تک کوئی اور رکن تقریر شروع کر چکا ہوتا تھا ان کے تو ندیل پیٹ پر سے دسوں

تقریبیں جیسوں اجتماع گرجے برستے گورے کئی طوفان اُٹھے اور ٹھنڈے ہوئے لیلین سیٹھ جی اپنی اس آنسو پناہ گاہ کے پیچھے اکثر چین کی فیند سوتے رہے لیکن آج بائیں جانب سے ایک آواز کان میں پڑی جس میں روپے آنے پانچوں کا ذکر تھا اس پر سیٹھ صاحب ہشیا رہو کر بیٹھ گئے ایک ممبر کہہ رہے تھے۔

”جناب صدر! آپ ہندوستان کے قطعی خرچ کا مقابلہ لندن کا ڈینی کونسل کے خرچ سے کریں یہاں ہم ۲۶ کروڑ کی آبادی پر حکومت کی طرف سے محض ۱۲ کروڑ روپیہ خرچ کر رہے ہیں جو ڈینی کی کس سالانہ سے بھی کم پڑتا ہے لندن کی کونسل چالیس پچاس لاکھ کی آبادی کے لیے ۱۶.۱۶ کروڑ روپیہ خرچ کر رہی ہے جو یعنی ۳۸ روپیہ فی کس سالانہ جناب صدر میں حکومت کی توجہ.....“

مقرر ممبر اسی جملہ ختم نہ کرنے پائے تھے کہ معلوم ہوا ایوان میں زلزلہ آگیا سیٹھ جی اپنی توند سیت یکدم پانچ پر کھڑے ہو گئے تھے، ارے جذبات کے ان کی توند تھر تھرا رہی تھی اور زبان منہ میں پھوٹ پھڑا رہی تھی یہ جذباتی زلزلہ دیکھنے والوں کو اتفاقیہ معلوم ہوتا تھا گردہ ارکان جنھیں اُن آتشیں طاقتوں کا اندازہ تھا جو اس کی تہ میں بھج رہی تھیں ان کے لیے سیٹھ جی کا یوں پھٹ پڑنا کچھ ایسا تعجب انگیز نہ تھا اس ممبر نے نادانستہ طور پر ان کی بہت حساس رگ کو چھیڑا تھا۔ ان کی زندگی کا اصول پہلے دام بعدہ کلام رہا تھا اور کاروباری دنیا کے اس اصول کو وہ پوری دنیا کے کاروبار پر مسلط کر دینا چاہتے تھے۔

یہ درست ہو کہ سیٹھ جی نے اپنی دولت بشیر ٹھیکوں میں اکٹھی کی تھی مگر انھوں نے ہمیشہ پہلے بیج بویا اور پھر فصل کاٹنے کی امید رکھی تھی اور بیج کے بونے اور زمین کے تیار کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ صاحب کو ڈالیاں دیں، بابو کی بیوی کو ساڑی اور جعدار کے بیٹے کو کچھلی دیوالی پر رنگین چنڈول دیا تھا۔ ان کے خیال میں بحث کا سب سے کمزور پہلو بھی تغایج ڈالنا نہیں گیا اور فصل کی امید کی جاری تھی۔

جناب صدر ان سے اس کے ساتھ انھوں نے اپنا ہاتھ تقریر کرنے والے رکن کی جانب ایسے انداز سے بڑھایا جو بالکل غیر پارلیمانی تھا، یہ تو پوچھئے کہ یہ دیتے کیا ہیں جو یہ کہہ ناگئے ہیں، ہمارا کسان حکومت کو کیا دیتا ہے ہاتھ تیسرے درجہ کا سا فریڈلے کو کیا ادا کرتا ہے جناب صدر! ہمارے مالیہ کی ولایت کے مالیہ سے کیا نسبت ہے وہ اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کی بھوس تنی ہوئی تھیں اور ان کا ہاتھ اس تھوڑے کی

مانند پل رہا تھا جو کسی تابوت میں آخری کیلیں ٹھونک رہا ہو، جناب صدر اگر ہم حکومت کو کچھ دے نہیں رہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ حکومت سے سب کچھ مانگیں میں مانتا ہوں کہ تعلیم عوام کا بنیادی حق ہے مگر یہ بتایا جائے کہ عوام اس حق کے لیے کیا مالی قربانی کر رہے ہیں؟

سیٹھ جی کی تقریر کا ایوان پر کچھ ایسا اثر ہوا جیسے کسی تلیا کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو جو ہر دو کی فضا بدل سی گئی اور ایوان کے تاریک گوشوں میں سے بھی بعض ارکان آگے کو جھک آئے تھے۔ ان میں پنڈت جی بھی تھے پنڈت جی کے لیے یہ موضوع خاص دلچسپی کا باعث تھا۔ علم کے شجر ممنوعہ کو اس ملک میں برہمن نے خود تو اپنا یا اور دوسروں کے لیے اسے مسموم قرار دے دیا اور پھر خود اس کے برگ بار حاصل کرنے کے لالچ میں اتنا بلایا اتنا بلایا کہ جڑیں تک دھیلی کر دیں اور اب بالآباد تک کے لیے اسے ایک سو کھانٹھ بنا دیا۔ ہمارے پنڈت جی بھی اسی سوکھے ٹھنڈے کی ایک اداس بلبل تھے۔ اسی ٹھنڈے کی آبیاری کی تجویز نے ان کی برسوں کی مردہ ملاقت لسانی کو بیدار کر دیا۔

”جناب صدر! ہندوستان ہمیشہ سے علم و ہنر کا گہوارہ رہا جو اس سرزمین سے علم و ہنر کی کرنیں پھیلی اور ان سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ علم کا گہوارا بن کر نخل یہاں پھوٹا، پیر و ان چڑھا اور برگ و بار لایا اس کے سایہ میں عوام اور خواص دونوں نے فیضان حاصل کیا۔ اسی سرچشمہ سے ایک طرف مصر و اسکندریہ تو دوسری طرف چین و جاپان سیراب ہوئے۔“

”جناب صدر! اگرچہ آج ہماری تعلیمی حالت اس قدر پس ماندہ ہو لیکن میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید اس ملک میں اس قیامت کی تاریکی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ اشوک کے زمانے کے کتبے اس حقیقت کے سچے اور بے زبان ترجمان ہیں کہ اُس وقت تعلیم کس قدر عام اور ہر دل عزیز تھی۔ اشوک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا زریں زمانہ ہے لیکن زریں کو چھوڑ کر اگر آپ کاٹنی اور پتیلی کے زمانوں میں بھی کچھ برتر ہم تعلیم کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ پر اپنا سرخرو سے ادا کیا رکھ سکتے تھے۔ ابھی پچھلی صدی کے پہلے نصف میں ہی صرف بنگال میں ایک لاکھ مکتب تھے اور آبادی کے چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ جناب صدر! اگر آپ ہمارے صوبوں کے تعلیمی اعداد و شمار کا مقابلہ برما سے کریں تو آپ کو

تعب انگیز کشافات ہوں گے۔ آج بھی برہمیں کلمے پڑھوں کی تعداد فی صدی ہمارے ہاں سے — گناہ اور اس کا سہارا کے پرانے نظام تعلیم اور پنشننگیوں کے سرسبز رگ وید میں لکھا..... پنڈت جی ابھی تقریر کر رہے تھے کہ ایک صاحب اپنی جگہ سے دفعتاً اچل پڑے اور کہنے لگے ”پائنٹ آف آرڈر سنر“ اگر پنڈت جی یہی تقریر اس ایوان کی بجائے آمار قدیمہ کے کسی عجائب گھر میں کرتے تو شاید زیادہ حق بجانب ہوتے (فراموشی قلم) وہاں کے پرانے بت ان کے خیالات کی اصل قدر کر سکے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی زمانے کے بنے ہوئے ہیں جس کی رام کما فی پنڈت جی سنا رہے ہیں کتبوں کی موجود سے تعلیم عامہ کا اندازہ لگالینا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیا پنڈت جی کی مراد یہ ہے کہ ہر کتبے کے نیچے ہزار تلمی مروتے گڑے ہیں۔ (مسلل قلم)

اتنے میں ایک دوسرے رکن نے دوسرے پنڈت جی کو پر نام کیا ”ہے شریمان! بتائیے کس ایدہ بانی کھول بیٹھے یہاں ہر کچن ارکان بھی تو بیٹھے ہیں“ اس آخری وار سے توان کی خود امتدادی کا آلبہ سا پھوٹ نکلا۔

پنڈت کو مارے ندامت کے پسینہ چھوٹ گیا وہیں کے وہیں بیٹھ گئے اور مچٹیا کھول کر آہستہ آہستہ سر ہلانے لگے۔

اس پرہائیں جانب کے ایک ممبر نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انھوں نے کہا کہ تہائے سائنس آج ہندوستان کی فی صدی خواندگی کا مسئلہ ہے یہ فی صدی بہت کم ہے اور کم سے کم ہوتی جا رہی ہے جو خالصتاً! کیا کوئی متمدن ساج روح کی اس دردناک افلاس کو اس دیرانی کو برداشت کر سکتی ہے جو ایک اچھی ابتدائی تعلیم کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ جناب صدر ایک قوم کی علمی اور ذہنی اٹھان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑوں کو ابتدائی تعلیم کے جاں بخش سوتوں سے زندگی بخشی جائے اور ہمارے تغیراتی تسلیم کے نظریے ہمارا ثانوی اور اوچے تعلیم کے لئے شور و غوغا کرنا کیا معنی رکھتے ہیں؟ ہم ملک کی ذہنی زندگی پر ایک ہلکا سا ناہشی رنگ ایک اور پری سی پوت پھیر رہے ہیں مگر اس کے نیچے وہی حیات کی بے بسی، ذہنی کو رذوتی۔ ہمارے ماہرین نے ہمارے لیے تغیراتی تسلیم کا سرمایہ بنایا۔ ان کے خیال میں وقت کی مصلحت یہی تھی کہ اونچے

طبقہ کو تعلیم دی جائے اور جب یہ طبقہ علم کے رس سے لبریز ہو جائے گا تو اس سے رس ٹپک ٹپک کر سب طبقوں کو سیراب کر دے گا۔ مگر جناب صدر اوقات نے بتا دیا کہ اوسنے طبقہ میں کچھ نہ کچھ امر بین کی سی غایت تھی جس نے پورے درخت کا ست کھینچ لیا اور کھوکھلا کر خول چوڑو یا قسط سیر کا منظر فریب خانوس ابتدائی تعلیم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اور پر کی سطح میں کلیاں بھی کھلیں شگونے بھی پھوٹے، مگر زمین کی لاتعداد بھلی تین صحرا کی طرح دیران، پتھر کی طرح بے غریو گئیں، انہی بھلی تئوں کی آبیاری کا کام بعض ریاستوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ شروع کیا جو آج ٹراڈ کور میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد بچاؤ سے فی صدی ہو آپ کو چہین، ٹراڈ کور یا ٹرودہ کی تعداد خزانگان کا مقابلہ

ایک ممبر پانٹ آف آرڈر سر معزز رکن کے یہ الفاظ غیر متعلق ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع ہمارا اپنا ملک ہو ریاستیں خارج از بحث ہیں۔ جناب صدر اب میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو موضوع کی حدود میں رکھنے کی کوشش کریں۔

مقرر نے دوبارہ اسی انداز بے نیازی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ گویا کارواں جا رہا ہو اور اس کے لوازمات بھونکتے چلے جاتے ہیں تاہم اس ہلکے سے اٹکاؤ سے ان کی تقریر کا بہاؤ اور بھی جل نکلا اور اس میں ایک دالمانہ شان خطابت اور گرمی گفتار پیدا ہو گئی۔

”جناب صدر! اب انہوں نے کچلی کر مٹیاں بیچ بیچ کر بولنا شروع کیا گویا کسی چیز کا عرق کھینچنے کے بعد اس کا پلٹن نکالنے کی فکر میں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھالے اور طریقہ کی بلابندہ رکھے سراسر ایک دفتر کی ہلاکی دوسرے افسر کے سر نہ تھوپنے کی کوشش کرے ہماری ابتدائی تعلیم اٹ لیلہ کے اس کبرے کی نش کی طرح ہو جس کے گلے میں بھلی کا کانٹا پھنسا تو درزی کے ہاں تھا لیکن اس کی نش یہودی سوداگر اور کماں کماں ہوتی ہوئی بالآخر شاہی سودی کے ہاں پائی گئی ہم چاہتے ہیں کہ جن کے سراسر ابتدائی تعلیم کی نش کی ذمہ داری ہو انہیں کے کندھوں پر اس کا جائزہ اٹھایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ کوئی رواجی حجام روضی لسان مل کر اس مردے کے حلق سے بھلی کا کانٹا نکال لے اس مردہ پر اس تم کے کامیاب اپریشن غیر مالک میں کئے جائے ہیں روس، ترکی اور جاپان

اس پر ایک ممبر آپ سے باہر ہو کر پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات دوسرے ملکوں کا حالہ !
جناب صدر ! (مارے غصہ کے بیچ کے نیچے ہی نیچے آستینیں چومنے کی کوشش کر رہے ہیں،
جناب صدر ! پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات !

صدر ! آرڈر ! آرڈر !

اب بحث کا وقت ختم ہوئے کو تھا۔ صاحب صدر نے پہلے سے ہی اعلان کر دیا تھا کہ ایسے فردی
مسائل کے لیے غیر محدود وقت نہیں دیا جاسکتا۔

ایران کا یہ دستور اہل اُن شاندار روایات کے خلاف تھا جس کی مثال خانگی ایوانات اکثر پیش کیا کرتے
ہیں۔ ہم نے بھٹیاریوں کی لڑائیاں اکثر دیکھی ہیں جس میں دو پارٹیاں بعینہ اسی طرح دو مستقل محاذوں پر
جھمی جھمی ہیں جیسے ایوان کا دایاں اور بایاں بازو۔ فرق محض اتنا ہے کہ آئینی ایوان میں صدر کا نشان امتیاز
اس کا گزرتا ہے اور نسوانی ایوان میں کالی ہنڈیا۔ نسوانی ایوان میں ہر مقررہ باری باری ایک دوسری کی
جگہ لیتی ہے اور عارضی التوا کی صورت میں ہنڈیا کو الٹ دیا جاتا ہے لیکن اس ایوان کی ایک امتیازی شان ہونی
یہ ایوان زمان و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے یہاں کسی مسئلہ پر کہیں بھی کسی وقت کسی مدت کے لیے بحث جاری
رکھی جاسکتی ہے۔ انوس ہو کہ آئینی ایوان جو اس پرانے جمہوری دماغ رہے کہ جمہوریت سب سے پہلے عورتوں
میں آئی اور سب سے آخر میں جائے گی، ادارے کی ترقی یا منتہ صورت ہو اس کی سب روایات کو اصلی حالت
میں برقرار نہ رکھ سکا۔ اب جبکہ عورتوں کو حق رائے ل رہا ہے یہیں امید ہے کہ آئینی ایوان کے آداب اور دستور اہل
میں خوشگوار تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی

اسطونے ڈراما کے نفسیاتی عمل کو جذباتی تنقیہ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح سیاسی ایوان کے
عمل کو سیاسی تنقیہ کا نام دیا جاسکتا ہے کہ چونکہ آج کی بحث نے ارکان کے دلوں پر سے خبار سادہ صوڈالا
تھا۔ محوک کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی چمک تھی۔ ان کی نگاہوں میں کل کے اخباروں کی سرخیوں
رقص کر رہی تھیں اور ان کے کانوں میں دوستوں کی مبارکبادیاں گونج رہی تھیں وہ اسی بے ساختگی سے
اپنی جگہ بیٹھے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا رنگین کلوٹا دوبارہ مل جانے کے بعد خوش ہوتا ہے۔ اب بحث کے اخیر میں

جودہ جواب دینے اُٹھے ہیں تو ان کا گول پگیا سا چہرہ ایک شگفتہ تبسم بنا ہوا تھا۔

”جناب صدر! میں آپ اور سب معزز اراکین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہایت صبر اور اطمینان سے میری تقریر سنی۔ اس بحث کے بعد میرے دل میں آرزو بل مشترکِ وقعت بہت بڑھ گئی ہے جو جرات آفریں انداز میں انہوں نے مباحثہ میں حصہ لیا اور جن قیمتی خیالات سے ہمیں سرفراز فرمایا وہ تعلیم عوام کے لئے بڑے نیک شگون ہیں۔ ملکِ دہلیت کی بڑی خوش قسمتی ہو کہ اس کی تعلیمی کشتی کا ناخدا ایسا غلصہ اور حوصلہ مند انسان ہے، مبارک ہو وہ قوم جس کی تعلیمی قسمت ایسے محسوط ہاتھوں میں سپرد کر دی گئی ہو۔ میں تعلیم عوام کا سادہ سلی اسی معزم ہستی کو سونپتا ہوں اور اپنی تجویزِ شکریہ کے ساتھ واپس لیتا ہوں۔“

ان کی تقریر کے بعد جو تالیاں بجی ہیں تو انہیں یوں معلوم ہوا گویا ان پر گیندے کی پتیوں کی پھوار پڑ رہی ہے۔ ان کا پورا جسم خوشبو سے لمبی ہوئی رنگین لہروں میں ہلکورے لے رہا ہے۔ آریبل منٹر کی زبان سے تعریف کا ہر لفظ جوان کی شان میں کہا گیا تھا ان کے دل میں یوں بیٹھ گیا جیسے کسی غمگین تہہ پر ہوتی جڑیے گئے ہوں اور جب آخر میں محک نے ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول چومدائے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک پتے شیدائی کا خلوص اور نیا زمندی مٹی وہی اطمینان اور مذہبی عقیدت جو پرانے مصریوں کے چہرے پر ہوتی مٹی جبکہ وہ سال کی حسین ترین دوشیزہ کو دریائے نیل کی نذر کرتے تھے اور اسے لہروں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بہت بڑی بے اصولی نہ تھی۔ کیا ہم اپنے ایمان کو ایک ملا کے ہاتھ اپنی محنت کو ایک نیم حکیم کے پاس گرد دی نہیں رکھ دیتے۔ پھر محک نے اپنی تجویز کو ایسے مبارک ہاتھوں میں سونپ دیا تو کیا برا کیا؟

عبد الغفور ایم اے

لکھنویت کیا ہے؟

(اسلئے کے لیے اہم سلسلہ کا سارا ملاحظہ ہو)

شاعری اور صنعت گری جذبات بھاری اور الفاظ کے کبل کو باہم لا کر لکھنوی شاعر نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا لیکن ہر رنگ میں نمایاں خصوصیت پھر بھی صنعت ہی کو ٹھیرا گیا۔ رعایت لفظی یا صنعت جگت جواد لاندہ کر کی ایک کمرہ کھل جاتی تھی اسی کے باعث ظہور میں آئی تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور بجز ل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ باہر تشبیہوں کے اجزا کی تحلیل ترکیب پر توجہ کی گئی۔ چونکہ غزل کے اشعار میں تنوی کی سی طوالت عموماً ناپسند کی جاتی تھی اس لیے ایک نئے انداز میں دو غزلے سر غزلے چوغزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنوی کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔ یہ خیال آفرینی بھی تو محسوس اشیا کے سلسلہ میں تحلیل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وہی اور شخصی مسائل پر توجہ مرکوز ہوتی تھی۔ آخر الذکر میں گوہ کندن اور گاہ بردن کی مثل بالکل صادق آئی۔ اور شاعری کی کوشش کے سامنے جب ان کے کلمات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی ناامیدی ہوتی ہے۔

صنعت گری کے ہی سلسلہ میں عربی فارسی کی ترکیب کی کثرت جسے ریختہ گو شعرا بالخصوص متقدمین نے بڑی کوشش سے رفتہ رفتہ زبان اردو سے دور کیا تھا دوبارہ رواج پا گئی۔ اشعار کو مرصع کرنے کے لیے فارسی کی قصاں ترکیبیں دل کھول کر استعمال کی جاتی تھیں ان کے استعمال کی ایک اور وجہ بھی تھی اپنی لکھنؤ اور دہلی کی حریفانہ چشمک۔ دہلی کے وہ شعراء جو لکھنوی شاعری کی بزم کے قیام کے وقت سخن گوئی میں مصروف تھے (میر و سودا وغیرہ) ہندی الفاظ ہندی ترکیب، محاورات ضرب الامثال اور ہندی تخیلات کو بھی ریختہ کا ہنر و اہم سمجھتے تھے۔ میر کے کلام میں تو یہ خصوصیت

بہت ہی نمایاں ہوا ان کے ہاں ہندی کے ایسے سبک اور نازک نگینے جڑے ہیں کہ ان کو بحال کر فارسی کی دنیا کاری کی جائے تو سوائے بعد اپن پیدا ہوا جانے کے اور کچھ امکان نہیں جو شعرائے لکھنؤ نے زبان میں تراش خراش کی آڑ سے کو زبان پر جمائی کا وہ عمل کیا کہ ہندی کے عناصر بالکل مٹ گئے جن الفاظ اور ترکیب کو شعرائے لکھنؤ ایسا بجا دکتے ہیں وہ ان کی لاطمی پردہ لیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے لیے نہایت موزوں مترادفات دہلی والوں کی زبان میں موجود ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں کون زیادہ فصیح اور لطیف ہیں تو اس کا انحصار استعمال اور کثرت استعمال پر ہی جس لفظ کو شعرائے لکھنؤ نے کوشش کر کے ترک کرنا چاہا وہ ترک ہو گیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ زمانہ لکھنؤی شاعری کے شباب کا تھا اور شعرائے لکھنؤ کی زبان کو لوگ مستند سمجھتے تھے لکھنؤ میں دربار کی سرپرستی نے اسے اور بھی تقویت پہنچائی۔ دلی والوں کی سلطنت لٹ رہی تھی زبان کو سنبھالنے کا کسے ہوش تھا اور اگر ہوتا بھی تو دلی والوں میں اب وہ کون سی کوشش باقی رہ گئی تھی جو دوسروں کو ان کی زبان، وضع قطع اور تراش کی طرف متوجہ کرتی، اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی شعرائے لکھنؤ کی اس کوشش میں معاون ہوئی عوام ہر جدید کو لذیذ سمجھتے ہیں یہی وجہ ہوئی کہ لکھنؤی شاعری کا میوب ترین رنگ اور اس کی کردہ سر کردہ صورت بھی ابتدا میں بے حد مقبول ہوئی، آخوان ہی لکھنؤی معبوتوں میں آمانت کے ضلع بگت اور ان کے واسوخت کی داد ملتی تھی یہی لوگ رنگین اور جان صاحب کو سرا لکھوں پر بجاتے تھے انہی کے ہاں ہر زیہ گوئی کو مرتبہ گوئی کے پہلو پہ پہلو قابل تحسین دائریں سمجھا گیا۔

سخت گیری میں جس چیز نے زبان کی پگڑی اچھالی وہ معاملہ ہندی ہوا اگرچہ معاملہ ہندی کی ابتدا فارسی شاعری میں ہوئی تھی اور فارسی گو شعرائے اسے بہ حیثیت ایک خاص فن کے بہت کچھ ترقی بخشی تھی تاہم اردو میں جو آت سے پہلے کسی نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ جرات کے اس رنگ میں لکھنؤ کی مذہب موسائٹی کے نقش و نگار ہیں جس کا نمونہ شعرائے لکھنؤ کے علاوہ سوائے حکیم مرہون خان مومن کے اور کسی کے کلام میں نہیں ملتا۔ لیکن مومن کے ہاں بھی یہ رنگ اتنا شوخ اور بے باک نہیں کہ طبع سلیم اور مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ ناسخ کا کلام بیشتر اور آتش کا کثر اور عام

شرائے لکھنؤ کا کلیئہ معاملہ بندی کا ایک ناپاک دفتر ہو۔ جاتی نے خوب کہا ہو کہ سوسائٹی شاعری کے اثر سے اتنی خواب نہیں ہوتی جتنی خواب سوسائٹی شاعری کو خواب کر دیتی ہو۔

سے کہ بدنام کندہاں خود را غلط است بلکہ می شود از صحبت نادان بدنام
یہ لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی زندگی کا عام پسند رنگ تھا جو شاعروں کے کلام میں چمک گیا اور جس کی داد علانیہ مجلسوں میں ان شاعروں کو ملا کرتی تھی، صنعت گری کی ان تمام صورتوں کی چند مثالیں ملاحظہ فرما
رعایت لفظی :-

تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی گئی کا	بادِ دردِ داناں میں مری جان گئی زند
مثل چیتے کے وہ چلتے ہیں۔	جل کی شب پلنگ کے اوپر
کوں آنکھوں کو میں بادام شیریں	کہیں جو بھی نظروں کو وہ دیکھے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا	بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کہیں اس دن سے
ترا چاہہ دُعا اے جان جاں اندھا کنواں بھلا	نہ دکھلایا کسی دن زہد بھر پائی پسینے نے
بے طاقی نے جسم کو مسطر بنا دیا	ساری رگیں ہوئی ہیں تن زار پر نمود
روئی کا جو تو نے کہو تر بنایا	پڑی جان اڑنے لگا میرے عین
جسلوہ حسن چراغِ تہہ داں ہوتا	منہ کو پھل سے چھپانے جو کم اگر شبِ میل
تشبیہ دی کہ ہیں یہ فراںِ صن کے پاؤں	دیکھے قریب جنم جو گیسوے مشکبار
کہ ہر استواں کا رُخ آہو گیا	نہ ہیں اسے گردشِ آسماں
حباب بحر ہر ایک شیشہ گلاب ہوا	معطر اس کے منانے سے بلکہ آدبا
پر چشم سیاہ کا یہ بادام نہیں پستا	دل دیکھ اسے کس کا تاشم نہیں پاتا
قند و نبات میں نہیں ہوتا جو بال کیا	کہ خط سے بوسہ لب شیریں دلا نہ ترک
بعد مرنے کے مری تو قبر آدمی رو گئی	قبر کے اوپر لگایا ہم کا اس نے دخت
رختِ تن کو کاٹے گا جو ہر تماری ناک کا	مرغِ جاں کو توڑے گی بلی تمھے حد وازہ کا

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہر باغبان
لالا کا پھول رکھنا اتانت کی گور پر
معاملہ بندی :-

رات کو چری چھپے پہنچا جو میں
فل مچایا اس نے دوڑ دو چری
دوسپنے کو آگے سے دوہرا ناؤڑ
نمودار چیزیں چبانے سے حاصل
مستی میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے
ہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے بھل گیا
کھیلنا ہر وہ کبڈی میں بھی کھیلوں جان پر
ہاتھ رکھ دوں جی میں ہر قاتل کی نگہی ران پر
پہلے منہ اپنا تو ہوا ایسے آپ
انگڑائیاں جو میں مرے اس تنگ پوش
زبردستی لیا بوسہ جو اس کا وصل کی شب میں
بہت جگڑا بہت بگڑا بہت جھکا بہت پکا
جان جاں یاد ہوے کیلئے وصل کی شب
نتیں کرنا مرا منہ کو چسپا نا تیرا

تشبیہ استعارہ و تشبیہات میں شعرائے کلمتوں نے بینک اچھا مانا نہ کیا ہو۔ راقم السطور کا دعویٰ ہے کہ مرثیہ
حضرت محسن کا کوہی کے پاک نصیۃ کلام میں اس قدر تشبیہات اور تلمیح پر کیف اور رقصاں ہیں کہ اردو شاعری
کے پورے دفتر میں ان کا جواب نہیں۔ انیس کے ہاں بھی تشبیہات کا کمال موجود ہے اور بلاشبہ ان کی تشبیہیں بہت
نصیح اور سلیں ہیں۔ مرزا ذہیر کی تشبیہات میں عالمانہ رنگ ہے لیکن وہ بھی بے مزہ نہیں البتہ لکھنؤ کے بعض اور
شاعروں نے تشبیہات میں بھی کہیں کہیں رکاکت پیدا کر دی ہے لیکن لکھنؤی شاعری کے اماموں نے جن
میں مذکور العصر و حضرات کے علاوہ قسیم صاحب ٹنوی کا نام بھی شامل کرنا چاہیے اس میدان کو بہت وسیع
کر دیا ہے۔ حضرات دہلی کے یہاں اس قدر تشبیہات کا رواج نہیں ہے اور جو ہیں بھی وہ بہت سادہ اور سچرل
میر کے پورے کلام سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کی مثالوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے لکھنؤی
حضرات کی تشبیہات ملاحظہ ہوں :-

محسن کا کوہی :- سبزہ ہو کنار آب جو
باخضر ہو مستعد و مضرب
نوبت ہو صدائے قمریاں کی
تیار ہو باغ میں ازاں کی

موم بجسیر ناخستہ ہو قد قامت سرود لوباہی
 اک شاخ رکوع میں رکی ہو اور دوسری سجدہ میں جھکی ہو
 سوسن کی زبان پر مناجات جاری لب جو سے التیات
 غنچے میں ہو خامشی کا عالم یا صوم سکوت میں ہے مریم
 کیا رمی ہر ایک اعتکاف میں ہو اور آب رواں طواف میں ہو
 سالک جو چین میں نہر موزوں مجذوب ہو شاخ بید مجنوں
 ہو صوفی صاف دل صنوبر تحریک نسیم حالت آدر
 جو گیا بھیس کے چرخ لگائے ہو بہت یا کہ بیراگی ہو پر بت پہ بچائے کمل
 لہریں لیتا ہو جب بکلی کے مقابل سبزہ چرخ پر بادلا پھیلا ہو زمیں پر غمسل
 جس طرف دیکھئے بیٹے کی کھلی ہیں کلیاں لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں زنگی کونسل
 اب انہیں کی بعض تشبہات ملاحظہ ہوں۔

یوں ہر چھپاں تھیں چار طرف اس جناح کے جیسے کرن نکلتی ہو گرد آفتاب کے
 کہتی تھی یہ زہرہ بدن بد خصال میں پکڑا ہو پیل مست کو لوہے کے جال میں
 ۵۔ دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے
 ہر چھپوں کے باہم ٹکرانے کی کیسی نا در تشبیہ ہے
 تلوار کی تعریف۔

جوشن کو کاکٹ جاتی تھی یوں آکے امج سو
 پیراک جس طرح نکل آتا ہو موج سے
 کالی دہ ڈانڈا اور چمکتی ہوئی سناں
 غل تھا کہ اڑ دیا ہو کھالے ہوئے زبان
 کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موم تیرں سے دامن صحرا بھرا ہوا

سہ لہراتی ہو کیا نہرِ مثالِ شکم مار

معنی کے یہاں ایک نہایت نادر تشبیہ ہو

ہو پھر لے منہ کو اس نے بقعا نقاب الٹا ادھر آسان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا
حق ہو کہ شرارے دہلی کبھی ایسی زور دار تشبیہیں پیش نہ کر سکے، ہاتھی کی تعریف میں مرزا داغ فرماتے ہیں
فلک آسادہ تر انیسل کہ جس کے آگے ریزہ نگ و خزن سے ہیں سبک کوہ و دمن
چلتے چلتے جو ٹھٹھ جائے، پڑے بوجھ ایسا ماہی زیر زمین کا بھی تو دھس جائے شکم
ایک اور لکھنوی شاعر کا شعر ہو

غرق آلودہ گردن زیر کا کل یوں دکتی ہو اندھیری رات ہو برسات ہو بجلی چمکتی ہو
خیال کے دو شعر ہیں۔

انٹاں جہیں پہ دوش پہ کاکل پُٹھے ہوئے طرہ جواغ چلتے ہیں کالوں کے سامنے
ساقی کی مست آنکھ پہ دل لوٹ جاتے ہیں شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے
اچھے صاحبِ ذآخ کا ایک شعر ہو۔

مخد پر مہوشوں کے پا کا مجمع تارے ٹٹے پڑتے ہیں زمین پر
مثالیں جس قدر درکار ہوں مل سکتی ہیں طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیجئے۔

یہ چیزیں تو صنعتِ گری سے متعلق ہیں۔ اب لکھنویت کا خاص رنگ یعنی خارجی شاعری ملاحظہ ہو۔ مقتدینِ شرارے نے اپنے کلام کی بنیاد واقعات اور جذبات پر رکھی تھی اور چنانچہ نغمہ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ مضمون کی خوبی کو بھی شرکا جز و ضروری قرار دیا تھا۔ لکھنوی داولوں نے ضد میں بالکل ایک دوسرا رنگ ایجاد کیا یعنی حسن اور اس کی کیفیات سے قطع نظر کر کے محض خارجی تعلقات حسن پر اپنی تمام توجہ صرف کی۔ صرف ناسخ کے کلام سے بعض جستہ جستہ مثالیں پیش ہیں۔ یہ صرف مشتے نمونہ از خود آکر ہیں اور شاعروں کے کلام کا جائزہ لیجیے تو یہ دفتر شاید ہی تام ہو۔

ہارے کے موتی ہیں تارے روئے تاباں آفتاب
اس نے جو پچا پسینہ رئے عالیشان کا
کھسوں کیا حال میں دیوانہ اپنی ناتوانی کا
دکٹا ہر جو کندہ سادہ ہر ایک طے سے
بندے کاؤں میں نہیں تو فیہ بازو میں نہیں

کس قدر صاف ہر تمہارا پیٹ
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی
نقری پٹے کاٹنے نہیں ڈالامہان
رنگبری ہو گلے میں کافر کے

پہنے وہ مسنم جو ہرین زرد
دیکھی جو تیرا تری بستی

ہو جائے سفید یا سین زرد
پھاڑا گیندے نے پیرن زرد

رنگ پاں سے سبز سونا بن گئے کندہ سے گمال
مبتذل تشبیہ ہر سونے پہ میسنا ہو گیا

ہوے لیتی ہر ترے ہارے کی پھل لے صم
چھٹے گی کان کی پھلی نہ زلف جاناں سے

یہ ہر محال کہ جی چھوڑے مار پھلی کا
آتش رنگ حنا سے شمع میں سب انگلیاں

دست جاناں میں مرا مکتوب پر دانہ ہوا
ساق سین کی محبت ہر ہارے دم کیساتھ

اسے پری تار نفس بھی تار سین ہو گیا

اگر اس شاعری کے ساتھ ہزل گوئی اور رنجی کو بھی شامل کر لیں تو لکھنوی شاعری کا چہرہ اپنے
مکمل قد و خال کے ساتھ نظر آنے لگتا ہوں دونوں کی مثالیں بکثرت ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے
بیمار مزاجت و متانت سے اس درجہ گری ہوئی ہیں کہ ان کا اعادہ ناگوار ہر جزآت آفتاز نگین اور ان کے
نامور شاگرد اس حام میں آکر سب کے سب ننگے ہو گئے۔

اس سے یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے علاوہ لکھنؤ کی شاعری نے اور کوئی صاحب فن پیدا نہیں کیا، پیدا ہوئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ایسے چند نخلتانوں کی طرح ہو جو ایک نابینا کسارِ رگستان میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں محسن کا کو ردی اور انیس اس قبیل کی درخشاں مثالیں ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام سے رد عمل کر کے لکھنویت کے اس سیلاب کو روکا اور آج لکھنؤ والے جو خود اپنے بچپن کی اس شبیہ کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں وہ ان ہی بزرگوں کا اثر ہی البتہ اس کا اعتراف کرنا ضرور ہو کر۔ لکھنؤ نے زبان کی حک و اصلاح کے علاوہ بعض اصناف میں ترقی کی، مرثیہ گوئی، مثنوی گوئی اور ڈرامہ نگاری ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کا بیان کسی دوسری صحبت پر منحصر ہے۔

ابواللیث صدیقی ایم۔ اے

علامہ اقبال کا فلسفہ

جوہر۔ آئیے باقی صاحب مزاج عالی، میں ماہ نومبر کے جامعہ میں اپنے مضمون پر آپ کی تنقید دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

باقی۔ فکر یہ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو اس تنقید سے اتفاق ہو یا اختلاف؟

جوہر۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو اختلاف ہو اور اگر ناراض ہوں تو اتفاق۔

باقی۔ آپ نے بھی کمال کیا اختلاف تو اتفاق کی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک زینہ جوہر صاحب آپ کے مضمون سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ علامہ کے کلام کی جراحی کر کے ان کی نثری تحریروں کا کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے پیام کا تعین کر سکیں مجھے انوس ہو کہ اردو شعرو ادب سے یہ خام طریقہ تنقید دور نہ ہو سکا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں نے مضمون میں اقبال کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں ان کی شاعری سے بھی مدد لی ہے اقبال کی شاعری پر کسی تنقید یا تقابل کا خیال میرے دہم و گمان میں بھی نہ تھا اور یہ امر مضمون سے واضح ہے۔

مری نواسے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں عزم راز و دون میخانہ

مرے ہمسفر اسے بھی اثر بہا رہے انھیں کیا خبر کہ کیا ہیو لے عاشقانہ

باقی صاحب! واقعہ یہ ہے کہ اقبال پہلے فلسفی ہیں اور بعد میں شاعر جبکہ ایشیائی طبائع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے اُس نے اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے اقبال کے فلسفہ حیات کی بنیاد قرآن مجید پر ہے اور انھیں احکامات کی روشنی میں علامہ کا پیام علم ہے۔ یہ آپ نے بھی مانا ہے کہ علامہ کا کلام تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہے وہ بانگ درا کے دور میں تلاشِ جہو کا شکار تھے ان کے دل میں سوالات کا ہجوم تھا۔ پیام مشرق میں وہ ان کا حل سوچتے ہیں اور اس کو مغرب کے سامنے

پیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ میں یہ مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں تعجب ہو کہ آپ اس قدر اعتراف کے بعد فرماتے ہیں کہ شاعر اقبال فلسفی نہیں۔ آپ کی یہ بھی رائے ہو کہ فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ اقبال کو صرف شاعر خیال کرتے ہیں تو مندرجہ بالا خیال اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک تو سوال کرنا جو کچھ نامہ مسائل کا حل کرنا اور ان کا اعتدال کرنا شاعر کا کام ہی نہیں اقبال چونکہ بقول آپ کے ایسا کرتا ہے اور صرف جذبات و احساسات سے نہیں کھیلتا تو آپ کے استدلال کے بموجب اس کو شاعر ہی نہیں کہا جاسکتا ہے اور اگر اس کو فلسفی مان لیں تو وہ (آپ کے نظریہ کے بموجب) شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس ارشاد سے آپ کا یہ مطلب ہو کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی دو الگ الگ چیزیں ہیں تو میں آپ کے اخیال سے متفق نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنے مضمون میں اقبال فلسفی کی جرح کی تھی لیکن میری اپنی یہ رائے ہو کہ علامہ کا مقصد فکر شاعری نہیں بلکہ فلسفہ کا درس ہو جو فلسفی شاعر جو اس لیے آپ کے مجوزہ اصول تنقید جو مرتبہ جمالیاتی و جذباتی شاعر کو پرکھنے کے لیے شاید کافی ہو سکتے ہوں اقبال پر تنقید کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

تی۔ کیا آپ کو ان تین اصولوں سے بھی اختلاف ہے جو ہر صاحب وہ تو بدہیات میں سے ہیں۔ ہر۔ باقی صاحب یہ بدہیات ہو سکتے ہیں لیکن علامہ نے ادب کی تنقید کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ آپ کے مجوزہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اس اختلاف کی یہ وجہ ہو کہ آپ کے نزدیک شاعر فلسفی نہیں ہوتا اور اقبال کے نزدیک وہ شاعر فلسفی نہیں یا جس کا کوئی خاص پیام نہیں وہ ایک بے پروا رنگین پھول کی مانند ہے۔ میرا خیال ہو کہ اقبال کے کلام کو اقبال کے مجوزہ اصولوں پر پرکھنا چاہیے۔ اقبال کے معین کو وہ تنقیدی اصول پر غور کرنے سے یہ روشن ہو جائے کہ علامہ اقبال ادب کی تنقید کے لیے اس امر کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ادبیت کی وجدانی دنیا کی تعمیر میں کس قسم کے تجلیات سے کام لیا گیا ہے۔ وہ ادیب کی طرز تحریر اور طرزِ ادب کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے جذباتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے بہت سادگی سے

یہ تحریر کر دیا جو کہ شاعر وہ ہر روز زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صداقتیں کیا ہیں اور یہیں جو فلسفہ کی حد شروع ہو جاتی ہے یعنی ادل تو شاعر کا یہ فرض ہوا کہ وہ صداقت سے روشناس ہو پھر اس کا اظہار شدت احساس سے کرے یعنی پہلے شاعر کو فلسفی ہونا چاہیے پھر شاعر اقبال خود اسلامی تخیل کو شعر کی زبان میں پیش کرتا ہے اور اسلام کے ہر پہلو پر انہماک علی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ اقبال موجودہ زمانہ کے رجحانات سے رد و قہر کر کے اسلامی نظام فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہے۔

باقی۔ دیکھا آپ کی رائے میں ایک جذباتی انسان جو شعور منقطع ادراک اور اعتیاد کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا سے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بالیتا ہے شاعر نہیں جو ہر صاحب شاعر وہ ہر جو بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکے۔

جوہر۔ باقی صاحب! یہ بھی ایک نظریہ ہو سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا علامہ بھی آپ کے جمالیاتی اور جذباتی نظریہ سے متفق تھے حقیقت نگار کو جمالیاتی اور جذباتی نظریہ کے مطابق پرکھنا اس کے کلام کی اہمیت کو گرا نا ہو۔ اب میں آپ کے سامنے اقبال کا کلام پیش کیے دیتا ہوں جس سے یہ صاف ہو جائے گا کہ ادب کو پرکھنے کے لیے علامہ نے آپ کے اصولوں سے مختلف اصول بیان کیے اور شعر و شاعری کے متعلق ان کا اپنا تصور آپ کے تخیل سے بالکل جدا ہے۔

سرد و شعریات کتاب دین و مہر
اگر خودی کی حفاظت کریں تو میں حیات
ہوئی ہر زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب دین مجھے میں بیگانہ

شعر خودی کی حفاظت کرنی چاہیے ورنہ جذباتی گو رکھ دھندہ رہ جاتا ہے جمالیاتی ادب فنون و افسانہ ہر کیونکہ وہ خودی کو کند کرتا ہے لیکن وقت یہ ہے کہ اگر اس تخیل کو مان لیا جائے تو اردو ادب

کا ایک کثیر حصہ حدود ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔ والٹیر کا کرتا تھا "جو باتیں انہی ناپاک ہوتی ہیں کہ ان کو نثر میں بیان کرنا شرمناک معلوم ہوتا ہے" ان کو شعر کی شکل میں لگا کر بیان کیا جاتا ہے" والٹیر کا یہ قول ہماری جذباتی شاعری پر پوری طرح عاید ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لو ان دونوں ہم سے اک رات جانی کماں ہم کماں تم کماں بھر جونی (میر)
 لیتے تھے لب کے بوسے ہم دیتے تھے منہ میں وہ زبا ہائے تھے کامیاب پیش دونوں ہم کہ ناگماں
 صبح و مید شب کوشت ماہ شبینہ خانہ رفت روئے سحر سیاہ کنیم یا ربہ اس بہانہ رفت (مومن)
 یہ سب اشعار شدت احساس سے احساس کو ابھارنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن اقبال کے نزدیک نہ یہ شعر ہیں اور نہ ان لمحات میں جبکہ ان بزرگوں نے یہ شعر کہے ان کو شاعر کہنا مناسب ہے۔ کماں ہمارے پرانے شاعروں یہ عصمت سوز جالیاتی کلام اور کماں اقبال کا یہ نظریہ۔

اسے کہ جو زیر فلک مثل شہر تیری نود کون بھائے تجھے کیا میں مقامات وجود
 گر مہر میں نہیں تمہیں خودی کا جوہر دائے صورت گری و شاعری دئے سرود
 مکتب دے کدہ جز در سر بودن نہ رہند بودن آموز کہ ہم باشی وہم خواہی بود
 جس شاعری سے تمہیں خودی نہ ہو اس پر اقبال آنسو بہاتے ہیں اور باقی صاحب آپ کی جالیاتی شاعری اسی قابل ہے کہ اس پر نوہ کیا جائے۔ ہماری شاعری زوال کے زمانے کی شاعری ہے اور شاید اسی قسم کی جالیاتی اور جذباتی شاعری کو سراہنے کے لیے آپ کے بیان کردہ اصول وجود میں لائے گئے ان شاعروں اور ان کی شاعری کے سراہنے والوں کی بابت ملامت فرماتے ہیں۔

آہ اودہ کا فرجے چارہ کہ ہیں اس کے منہم عصر رفتہ کے وہی ڈٹے ہوئے لات و سنات
 تو جو میت ایہ ہنر تیرے جنازے کا امام نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات
 ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہو لیکن جوئے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دیکھئے باقی صاحب اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہے جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آسکتی اس کی بابت علامہ نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہے۔ اگلے شعر میں علامہ فرماتے ہیں :-

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شر رکھا
شاعر کی فواہ کو کہ معنی کا نفس ہو جس سے جہن افسردہ ہو وہ بادل سحر کیا
بے معبود دنیا میں ابھرتی نہیں تو ہیں جو ضرب کبھی نہیں رکھتا وہ ہنس کر کیا
اگر شاعر کی فواہ کو نہ اُجھائے تو وہ شاعری بیکار ہے۔ ہنر کا مقصد سماجی زندگی کی تشکیل کرنا ہے
جس ہنرمیں ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور جو زلف و کاکل کے جمالیات اور بوس و کنار کے
جذبات سے آگے نہ بڑھے وہ ہنر نہیں بلکہ بے ہنری ہے۔ باقی صاحب آپ کچھ اکتا سے گئے۔

باقی۔ نہیں نہیں آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں مفصل جواب دوں گا۔

جو ہنر۔ باقی صاحب : میں اس مسئلہ کو اس لیے زیادہ وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے چند عزیز دوستوں نے بھی میرا مضمون دیکھ کر یہی فرمایا کہ اقبال تو شاعر ہی اس کی فلسفیانہ نقطہ نظر سے تنقید ہے یعنی ہر اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر یہی خیال ذہن نشین ہو گیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ خود علامہ کے کلام سے نوجوانوں کے اس خیال کی تردید کر دوں۔ اقبال جمالیاتی و جذباتی شاعر نہیں ہے بلکہ فلسفی ہے جو حقیقت کو سمجھتا اور سمجھانا چاہتا ہے شاعر کے عنوان سے ضرب کلیم میں علامہ فرماتے ہیں۔

مشرق کی بنیستاں میں ہے محتاج نفس نے شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم اچھی نہیں اس قوم کے حق میں غمی نے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبھو ہو شمشیر کی مانند ہوتیری میں تری سے
ایسی کوئی دنیا نہیں اخلاک کے نیچے بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم کے
جو قوم غلامی میں جکڑی ہوئی ہو اس کے لیے جمالیاتی شاعری سم قاتل ہے جس طرح اگر گھر میں چوہ

قلا بازیاں کھائیں تو سکین کو نالچ و رنگ و کیٹنا تباہی کو دعوت دیتا ہر اسی طرح غلامی میں جالیات کی طرف جانا بربادی ہے۔ اقبال شاعر کو حقیقت سے معرکہ آرا دیکھنا چاہتا ہے حال سے مہبوت نہیں دیکھنا چاہتا ہماری شاعری کی بابت کہتا ہے۔

ہو شعر عجم گر چہ طرب تک و دلاویز اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ محسوس خیز
اقبال یہ جو خسار تراشی کا زمانہ از ہر چہ بایسنہ نماند بہ پرہیز
شاعر اگر حقیقت آشنا نہیں ہو اور وہ اپنے کلام سے خودی کو نہیں ابھار سکتا تو اس کو خاموش رہنا چاہئے ایک دوسری جگہ ہندوستان کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

عشق و مہی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں زندگی سے ہنران برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند کہتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گرد افسانہ نویس آدھے چاروں کے اعصاب پر عورت ہو سوار

باقی صاحب یہ جو آپ کے جالیاتی ادیبوں کی حقیقت علامہ کی نظر میں جسے آپ اپنی جالیاتی بینک سے دیکھنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ دراصل جذبات و احساسات بھی کسی فلسفہ اور زندگی کے مطابق ہوتے ہیں شاعر پہلے فلسفی ہوتا ہے پھر اس فلسفہ کی روشنی میں خاص قسم کے جذبات و احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال فلسفی شاعر جو اسلام کی دعوت دیتا ہے اسلام ایک خاص قسم کی سماجی زندگی کا موجد ہے اس زندگی کی تشکیل کے لیے ایک خاص لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اقبال اس زندگی اس لائحہ عمل اور اس نصب العین کی طرف برابر دعوت دے رہا ہے جو کچھ علامہ نے نظم میں کہا ہے وہی نثر میں کہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے یہ حق ضرور دیں گے کہ میں علامہ کی نظم کو ان کی تحریر کردہ شریکی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں اور شراکتی طرح اقبال کا مسلک یہ نہیں کہ قافیہ اور ردیف نے جو خیال دل میں پیدا کیا اس کو پر شوکت اور دلگداز الفاظ میں باندھ دیا بلکہ وہ قافیہ و ردیف کو فلسفہ

کے تابع رکھتا ہو تا فیر دین کی خاطر اپنے خاص پیغام سے ایک انجھٹے کے لیے تیار نہیں ہوتا باقی صاحب آپ کے تینوں بدیہیات علامہ کے بدیہیات سے مختلف ہیں علامہ کے کلام پر تنقید آپ کے زاویہ نگاہ کے مطابق نہیں کی جاسکتی اور اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کے پیغام کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جالیاتی اور جذباتی شاعر کی بھی سماجی زندگی میں جگہ ہو لیکن ناچ و رنگ کی طرح شام کو ایک آدھ گھنٹہ ہی اس کو دیا جاسکتا ہو اور بس۔

باقی۔ جوہر صاحب ابڑی دقت یہ آگئی کہ آپ شعر کی جادوگری کو نہیں سمجھتے۔ دراصل جو خیالات نثر میں معمولی طور پر بیان کیے جاتے ہیں وہ جب شعر بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان میں اتنی رنگ آمیزی و حسرت اور اثر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی دوسری شے ہو جاتے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب! شعرا و نثر کے طریقہ بیان میں فرق ہوتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ نثر میں اگر احوال کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو جب اس خیال کو نظم کریں تو وہ خدا کے وجود و وحدانیت کا ذکر معلوم ہو گا۔ ثنوی اسرار و رموز تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی اس میں تاثر علامہ کا وہی فلسفہ ہے جو انہوں نے اپنے مقالوں میں بیان کیا ہے۔ ثنوی کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ در بیان این کہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔

۲۔ در بیان این کہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است۔

۳۔ در بیان اینکه خودی از عشق و محبت استحکام پذیرد۔

۴۔ در حقیقت شعرا و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔

ساری ثنوی میں اسی قسم کے مطالب کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاید آپ یہ فرمادیں کہ یہ ثنوی ہے۔ ضرب کلیم کو لیجئے اس کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

اجتهاد۔ تقدیر۔ توحید۔ جہاد۔ قوت اور دین۔ فلسفہ کلمۃ توحید۔ خودی کی تربیت۔ خودی کی زندگی عقل و دل تسلیم و رضا۔ مرگ خودی۔ آزادی نسواں۔ وجود دین و ہنر۔ اشتراکیت۔ انقلاب و غیر

یہ دہی باتیں ہیں جن کو علامہ نے نہایت جامع طور پر اپنے خطبوں میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ نثر میں خیالات کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لیے علامہ کے کلام کو ان کے خطبوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ شعر میں استعارات، تشبیہات حسن ادا وغیرہ اتنی جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں کہ نفس مضمون کی طرف توجہ منکسر ہو جاتی ہے لیکن نثر میں تمام توجہ نفس مضمون کی طرف رہتی ہے۔ اس لیے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں جو صاحب اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو علامہ کے خطبے پڑھنے چاہئیں اور ان پر پوری طرح عادی ہونے کے بعد اس کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

باقی۔ اچھا ان امور کو چھوڑیے ان کا جواب میں مفصل دوں گا۔ اب یہ فرمائیے کہ علامہ کا فلسفہ کیا تھا۔ جوہر۔ یہ اب دوسری صحبت کے لیے اٹھا رکھے لیکن باقی صاحب! یہ عرض کر دوں کہ آپ نے اقبال کے فلسفہ کی تحلیل جس طرح کی ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔

باقی۔ اچھا تو رخصت کیونکہ کافی رات چلی گئی اور اگر یہ گفتگو چھڑ گئی تو طویل ہوگی۔ اچھا شب بخیر۔ جوہر۔ خدا حافظ!

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

مومن کی غزل گوئی

مومن بہت سی باتوں میں اپنے ماحول سے الگ ہیں کہیں تو اسی پر ترقی کی ہوا دکھیں اپنی انفرادیت الگ قائم کر لی ہو پہلی بات تو ان کا اپنا غزل کا نظریہ جو ان کے نزدیک غزل کو محض لغوی معنوں میں برتنا چاہیے اور اس طرح غزل کو انھیں مضامین پر محدود کر دینا چاہیے جو عشق و عاشقی خصوصاً معاملہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کو جو غالباً ان کی عربی تعلیم کا نتیجہ تھا مومن خاں نے اپنے کلام میں سختی سے برتا اور آخر تک بڑے استقلال سے برقرار و قائم رکھا۔ یہی وجہ ہو کہ ان کے کلام میں ہم کو معدت الوجود، ہمہ اوست یا ہمہ ازوست کے مسئلے نہیں ملتے، تصوف کی خیالی بلندیوں پر چڑھنا نہیں ہوتا اور فلسفہ کی پرتیج وقت سے ہم معاف رکھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں محض عشق و عاشقی جو معاملہ بندی اور مشفق سے باتیں ہیں اور مشفق بھی اسی دنیا کا۔

پیدائش ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں نمبا کے کشمیر سے تھے حکیم نامدار خاں حکیم کا مدار خاں دو بجائی مہد سلطنت مغلیہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول جاگیر عطا ہوئی جو بعد کو ضبط ہو گئی اور نیشن مقرر ہو گئی حکیم مومن خاں ۱۲۵۸ھ میں کوہ چیل میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے نام رکھا عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھیں طب باپ اور چچا سے۔ نجوم اہل فن سے۔ اس کے علاوہ رمل اور ریاضی میں کافی شغف رکھتے تھے شطرنج سے مناسبت تھی موسیقی میں طاق تھے اور عملیات میں بھی ذہل تھا۔ شاعری سے عاشق مزاجی کے سبب لگاؤ ہوا کلام شروع میں شاہ نصیر کو دکھایا۔

تصانیف :- کلیات اردو کلیات فارسی، انٹائے فارسی رسائل طب نایاب،

معاش و حکیم نامدار خاں کے وارثوں کی جو نیشن مقرر تھی اس میں مومن نے بھی اپنا حصہ پایا اس کے علاوہ کچھ سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ شاعری یا طبابت کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ حالانکہ اکثر مختلف ضرورتوں کی خاطر جاگیر آباد۔ باریوں۔ سسوان رامپور اور سمار پور جانا پڑا لیکن کہیں باقاعدہ دیوڑھ گروی نہ کی۔ اور باوجود رائج محدود ہونے کے امیرانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے۔

در اصل توہن کا یہ نظریہ کئی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایک تو عربی میں غزل کی تعریف دوسرے ان کی خود کی سخت عاشقانہ طبیعت اور تیسرے اس وجہ سے ان پر جرات کا اثر عربی میں غزل مشوق سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہو کہ ایسی باتیں عاشقانہ اور ایک دوسرے کی تفریح کی ہوں گی۔ اس لئے توہن طبیعتاً ہی طرف راغب ہوئے اور غزل کو اس لئے اسی مضمون میں برتنے میں زندگی گزار دی۔ چونکہ جوانی جو انہوں میں کئی تھی اس لیے اس کو چہرے سے خوب دانت تھے اور واقعی طبیعت پر ظلم کرتے اگر وہ معاملہ بندی کی طرف نہ آتے لازماً جرات کا رنگ آگیا اور اس کو وہ خود بھی مانتے تھے لیکن جرات میں اور ان میں کافی فرق ہے پہلی بات تو یہ کہ جرات کا ماحول تا مہر رنگ رلیوں کا شیدائی تھا۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر ہر ایک پر سرخوشی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ مرفوعہ عالی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا اور بادشاہ کے اثر سے طبلع اور شاعری دونوں پرستی چھائی ہوئی تھی۔ صلحا اور زباد کی گڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ اسی اسباب کی بنا پر جرات کی شاعری ایک بے دھڑک (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شادی درد کے گھرانے میں ہوئی۔ ساس اور سرسیر درد کی پوتی اور نواسے تھے۔ ایک بیٹا احمد نعیر خاں (ان کے بیٹے محمد نعیر خاں اور بیٹی عزیز بیگم حیات ہیں) ایک بیٹی (علبدغنی سیٹا پوری سے بیاہی گئی) یا دگار جوڑے۔ اسی بیٹی کی تالیخ ولادت کی تھی

نال کھنے کے ساتھ ہاتھ نے کئی تاریخ دستہ مومن

ابتدائی زندگی جو انہوں میں کئی بعد میں سید احمد رائے بریلوی سے ہیئت کی اور صلاح اور تقویٰ میں بسر کردی مذہبی شغف زیادہ تھا مولوی محمد اسماعیل ان کے ہم سبق و ہم جسد تھے۔ اکثر جگہ متاقدین اور شیعہوں پر چوٹیں کی ہیں حلقہ ۱۲ میں کونٹے سے گر کر وہ سینے بعد انتقال کیا جیسا خود حساب لگا یا تھا ۵۳ سال کی عمر پائی۔

گرنے کی تاریخ خود کی رشکست دست و بازو۔ مرنے کی تاریخ ان کے شاگرد آہی نے لکھی۔ تمہوں خاں غالب لکھا

شرطیت کہ روئے دل فراشتم ہمہ عمر خونناہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر ہر مرگ توہن چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

شاگرد: ذاب مسطفی خاں شیعہ مرزا قربان علی ساکب۔ نواب اصغر علی خاں نسیم میر حسین سنگین۔ میر مبلد الرحمن آہی۔

مکرم مند علی آشتیہ ساکب۔ قیمر استاد العالم صاحب یاس و غیرہ

کلام: شیعہ کے نغمہ سے آہی نے صاف کر کے توہن کی علالت میں مجتمع کر دیا تھا۔ غزل دردناک اور دلپذیر موزوں ہے

چو چاٹی نظر آتی تھی تو من کا ماحول اس کے برخلاف منہل اور موبویانہ اور فاضلانہ تھا اس لیے جو بات تو من کو کہنا ہوتی وہ سنجیدگی اور طبیعت کے پردے میں کہنا پڑتی تھی کیونکہ سامعین و نقاد وہی لوگ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ کہ جرات خود کچھ زیادہ پڑے لکھے نہ تھے اس لیے بشیر کمال جاتے تھے مومن برخلاف اس کے علوم متداولہ میں کافی وقوف رکھتے تھے لازماً ان کو اپنے پڑے لکھے کا بھرم رکھنا ہی پڑتا تھا اس لیے پردے پڑے ہی رہتے اور قیں محل کے گرد محض جگر کا ٹاٹا کرتا۔

عوام کی تقلید اور پابندی کے لحاظ سے جس کے مومن خلاف تھے یہ تغزل کا نظریہ ایک جدت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے مومن نے اپنے تغزل میں وہی مسلمات برقرار دو قائم رکھے جو ان کے زمانے میں مروج اور عام تھے اور اسی تقلید نے ان کے تغزل کو بڑی حد تک محدود و بنا دیا ہے۔

حالا کہ مضامین کی اس محدود دنیا میں انہوں نے کافی جبرائلیاں اور نازک خیالیاں برتی اور دکھائی ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک محدود آسان ایک محدود زمین ہے جس میں وہ بجلیاں چمکایا کرتے ہیں اور اس سے سرو متجاوز نہیں کرتے یہ کبھی نہیں کرتے کہ کبھی اس فلک کو توڑ کر باہر نکلیں اور اپنا آشیانہ اس عرش سے پرے بنانے کی کوشش کریں یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھتے وقت مسلمات شعری کا ایک خاص کاغذ سراؤٹھ لینا پڑتا ہے جس میں مضامین و تصورات محدود ہیں اور اگر کوئی نازک خیالی ندرت اسٹو یا شوخی ادا برتی جاتی ہے تو اسی محدود دائرہ کے اندر۔

مومن رعایت لفظی اور ایہام کے عاشق ہیں اور اس حیثیت سے اپنے دور کے باندہ نصیر کے شاگرد

شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے

آئے وہ دست غیر میں دیے ہاتھ

اس پر ہی دس دو لگاتے ہیں مجھے

لے گئی جان یاد رفتن ہائے وصل

کشاد دل پہ باندھی ہو کر آج

منہ کو نہ مسیاناصح کی بنیہ گرمی اتنی

وہ میں بھی ملتی ہیں پردہ درمی اتنی!

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ ہے)

لہ چکے تھے اور ناخ کے ماننے والوں میں سے تھے اس لیے ان پر یہ رنگ چڑھ گیا۔ حالانکہ انہوں نے اس کے اور دیگر خصوصیات قبول نہیں کیے مثلاً مادہ بندی سنگ لاخ زمینیں ان کو چھوڑ کر جو دیوان ساہو کے لیے کی گئیں لیکن رعایت لفظی کو وہ قادر الکلامی کی پہچان سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اس کو اصل غایت نہ سمجھتے

(بقیہ حاشیہ منفرگزشتہ) یاس دیکھو کہ میر سے کدی
 بات اپنی امید واری کی
 اب اور سے لوگائیں گے ہم
 جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
 سردوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے
 جانا کہ نہ سراٹھائیں گے ہم
 دل دے کے اک اور لالہ رو کو
 ہر داغ پہ طع کھائیں گے ہم
 گر خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا
 آنکھیں مڑو کہ دکھائیں گے ہم
 گردیکہ کے ہنس دیا ہیں تو
 منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
 پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو
 جی ہی کہو ابنا میں گے ہم
 اتنا ہر گیلے سے دہیان تیرے
 خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم
 برباد نہ جائے گی کدورت
 کیا کیا نری خاک اڑائیں گے ہم
 بگڑے تو کریں گے اور سے صلح
 تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم
 نب کا ترے دعوے سے سی
 مراد پر آزمائیں گے ہم
 گرتیری طرف کو بے قراری
 کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
 کیا ذکر ہی ہونٹ چاٹنے کا
 کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم
 گرو خواب میں آن کو جگایا
 سوتے مردے جگائیں گے ہم
 بت خانہ میں ہو کر ترا گھر
 مومن میں تو پھر مذا میں گے ہم
 اس غیرت نامہد کی ہر تان ہو دیپک
 شعلہ سا جھک جائے جو آواز تو دیکھو
 اس لب لعل کی ٹپکاپٹپک
 کیونکہ رنگین نہ ہو کلام مرا
 آخر مشکوں کے بھرتے نے ڈوبایا ہے
 چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

تھے لیکن عیار استاد کی کا ایک ضروری جزو ضرور گردانتے تھے اور یہی مومن اور ذوق کی رعایت لفظی کا فرق ہے کہ اول الذکر معانی آفرینی کو پیش نظر رکھتے تھے اور رعایت لفظی کو مقصود شعر نہیں بناتے مگر اول الذکر کا نظریہ بالکل برعکس ہے جو مومن کو یہ شوق دراصل ابتدا میں نصیہ و ناسخ سے حاصل ہوا اور اُس وقت تک اکثر اشعار محض رعایت ہی کی خاطر لکھے ہیں لیکن بعد کو محض ایک ذریعہ و ترکیب اظہار کا رہ گیا نہ کہ مقصود اظہار لیکن چھاپہ عمر بھر نہ چھوڑا۔

لیکن دراصل مومن کا مسلک معنی آفرینی اور نزاکت خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ مومن کی شاعری

دیکھ اپنا حال زار نہ ہم ہوا رتیب	تھا سازگار طالع اس ساز دیکھنا
پامال اک نظریں قرار و ثبات ہے	اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
کرہ خاک ہے گردش میں تیش سے میری	میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد ہا
دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے	فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے
روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا	میرا سوال ہی میرے خوں کا جواب تھا
پس شکستنِ خم زجر محنت معقول	گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق چین	خون فرہاد سرگردن فرہاد رہا
کیوں فتن ہوئے دیکھ آئینہ کو	کہتے تھے تاب لائیں گے ہم۔
جراح کیا سوچا کیا رنگ دیکھا یک ہوا	کیوں کسوں لی پٹی مرے زخم جگر کو دیکھ کر
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں	اتنا رہا ہوں دور کہ ہجر اں کا غم نہیں
دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لیے	سخن بہانہ ہوا مرگ ناگماں کے لیے
میرے تفسیر رنگ کو مت دیکھ	تجہ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
یہ عذر امتحاں اسے جذب دل کیسا نکل آیا	میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
اب تو مرجنا بھی جو مشکل تر ہے بیمار کو	ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے
کیا سنائے ہو کہ ہیجر میں جینا مشکل	تم سے بے رحم پر مرنے سے تو آساں ہوگا

(بشیرہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ذاتی رجحانات اور خارجی سیار و مذاق شری کی کش مکش کا ایک عجیب مرتع ہوا درہمی وجہ ہو کہ ان کی شاعری گنجلک سی نظر آتی جو یہ مرد میدان آخو تک اپنا میدان پانہ سکا کبھی زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایات لفظی و خارجی حسن شعر پر ناں ہو جاتا لیکن اپنی ذاتی اقتاد سے مجبور ہو کر اپنی خدا داد و زور تخیل و نزاکت تخیل کو کام میں لائے بغیر نہ سکتا کبھی طبیعت، دہلوی سنجیدگی اور مناسبت کا نقشہ پیش کرتا جو ماحول کا اثر تھا لیکن اپنی طبیعت کی جوانیوں کو کہاں لے کر جائے کہ اس مصنوعی مناسبت کو چاک کر ڈالنا چاہتی تھیں مختصر یہ کہ پیشہ اور نظام ہر رکھ رکھاؤ اور برتاؤ و اخلاص نہ تھا لیکن طبیعت شاعرانہ اور پختی تھی جو اس کش مکش میں ایک لاکھ میل اپنے لیے بنا چاہتے تھے اور یقیناً ایک خوشگوار رویہ اختیار کر لیتے اگر مرنے پر اس قدر جلد نہ تیار ہو جاتے، یہی وجہ ہو کہ ان کے کلام میں کبھی تو غالب کی طرح حوام کی تقلید سے نفرت جدت سے شوق و نزاکت تحصیل سے رغبت ملتی ہو اور کبھی ذوق کی طرح محض الفاظ کے الت پھیر میں دقت نظری نتیجہ یہ کہ محض گنجلک حاصل ہو جسے ہم ان کا خاص رنگ کہتے ہیں۔ نہ تو کمسنوی خارجی کمالات آئے نہ دہلوی حسن بیان، سلاست سادگی اور روانی میں کنگی اپنے ماحول سے باوجود اپنی صلاحیتوں کے زیادہ ہونے کے زیادہ بلند نہ ہو سکے اس لیے ہم ان کو ذوق اور غالب کے درمیان کی ایک کرہی کہہ سکتے ہیں۔

بعض طبائع دقت پسند ہوتی ہیں اور ان کو گرہیں ڈال کر کھولنا اچھا معلوم ہوتا ہو کیونکہ اس سے ان کی قدرت گروہ کشائی ہموار ہوئے کا ذاتی ہوا اور عوام سے بلندی ظاہر کرتی ہو۔ جو یقینی اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے ان کی نازک خیالی، مضمون آفرینی اور دقت نظری کچھ تو اس سبب سے اور کچھ متاخرین شعراء

بقیہ حاشیہ غزل (۱) نہ پڑے نعل میں آپ کے خوابنازیں	ہم نہیں چاہتے تھی اپنی شب و رازیں
ذرا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر چوک	میاں کی نگاہ سوئے آسمان نہیں
قتل دشمن کا جو ارادہ اسے	یہ نرا اپنی جاں نثاری کی
حیرت حسن سے شکل نبی	کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے
نہ ربط اس سے نہ یاری آج	جناہر عدد و لاؤں کہاں سے
کس طرح مایوس ہوں تاخیر جو	دم رکے ہو لاش بگیرے

فازی کے مطالعہ سے نہ مرث وجود میں آئی بلکہ ان اثرات کے سبب سے مغلق اور دقیق ہو گئی۔ یہ گنگناک یا اخلاق مومن کے یہاں عمر آبا لہ کے دور اذکار ہونے یا ایہام و رعایت منطقی پر شرکے بنی ہونے یا استعارہ و استعارہ کے استعمال یا بڑے خیال کو مختصر کرنے کی خواہش جس کی وجہ سے اکثر الفاظ حذف کر دینا پڑتے ہیں، اسے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے تخیل کو بھی ایک فن بنا لیا تھا اور تعجب یہ کہ اپنے جزئی شعرا میں بھی یہ التزام قائم رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے اشارے مضامینی سے ہو کر رہ گئے جن کو حل کر لینے پر بھی کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا تعلق لغیات بشری سے نہیں بلکہ مغلیات سے ہوتا جو نظرات انسانی کی تڑپ نہیں بلکہ نفس انسانی کی چھبید گیاں ہیں۔

شاعری اپنی ہویٰ نیرنگی دانشوری جو سخن ہو سوسلم راز بلیبوس ہو

اور یہی غالب و مومن کے درمیان بڑا فرق ہے۔ غالب کے مشکل اشارے حل کرنے پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور کائنات یا فطرت انسانی کا ایک نہ ایک غفی راؤ کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن مومن کی گتیاں سلجھانے پر محض گتیاں سلجھانے کا سلجھانا ہی باقی ہے جو مومن کے اشارے گویا ان کی طرح کے نفعے ہیں جن کے حل کرنے پر محض اسی بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ حل ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے یہاں تصنیف آ میر چھبیدگی اور دقت نظر جو غلو تخیل اور بلند فکری نہیں

بظاہر مومن تو یہ کہہ سکتے تھے لیکن جن باتوں کے حل سے انھوں نے توبہ کی تھی اب وہ محض شعر ہو کر رہ گئی تھیں یہی وجہ ہے کہ مومن معاملہ بندی کے معاملات میں اپنے صحیح رنگوں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ مومن اور طبعیت کی وجہ سے متانت کا رکھ رکھاؤ بہتے لیکن طبیعت کو نہ مارتے۔ ان کا عشق مجازی وہاں ہوس کی طرف مائل ہے لیکن ہستی اور ابتذال کم ہے اور ان کے معاملے بیشتر کسی پرور نہیں سے ہیں۔ معاملہ بندی و اصل گویا تصور رات کا نتیجہ ہے اس لیے اس بیان میں تسلسل ہو تو خوب ہے۔ مومن کی معاملہ بندی میں تسلسل اکثر ملتا ہے خصوصاً جب وہ خود

رویا کریں گے آپ بھی مجھوں اسی طرح اٹھائیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

نہ تاب جرمیں ہو نہ آرام دل میں کم کج دل کو چین نہیں ہو کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے بند کی پہلی قربان تیرے پھر مجھے کہے اسی طرح

(بقیہ ماثیہ صفحہ آئندہ ہے)

اپنے کسی مشفق سے خفا ہو جاتے ہیں۔ تو سن اور جرات کی معاملہ بندی میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے۔

ہفتہ ماہیہ صغیر گشتہ) نے جائے داں بنے جو بن جائے پیرینا
 مشفق اور بھی ہیں بتاھے جان میں
 کیا کچھ ہیں تو ہے مشکل سہی طرح
 کہ تاہو ظلم کوں کسی پر تری طرح
 کیا سبھاں میں جیتے ہیں تن اسی طرح
 وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب
 باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب
 اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب
 یہ تم اسے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہو
 تھا مٹا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہو
 ہائے کیا کہنے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہو
 شیخ صنعا کی طرح سوئے کلیسا جائے ہو
 دہی وعدہ یعنی نباہ کا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 مجھے یاد سب ہو ذرا ذرا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 وہ ہر ایک بات پر روٹنا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 وہ بیان مشوق کا بر ملا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 گلہ، ملامت افسر یا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 تو بیاں سے پہلے ہی بیرونا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 کبھی ہم بھی تم ہی تھے آشنا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 سونا ہنسنے کا تو ذکر کب تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 تو کہا کہ جانے مری بلا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 وہ نہیں نہیں کی ہر آن صدا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
 میں وہی ہوں تو سن بیتلا تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گرم ہو تو دنا جتانے کو دس دم
 کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تھا ہے جی کو بری لگی
 کبھی ہم میں تم میں بھی جا چکی تھی ہم تو تم بھی راہ تھی
 سوز ذکر جو کئی سال کا کیا تم نے اپنے کا وعدہ تھا
 کہا میں نے بات وہ کوئے کی کہ میں سے صاف نہ لگی
 وہ بگڑا اصل کی رات وہ نہ مانس کسی بات کا
 جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے بے دنا

کہ مومن اپنے کیے کو برا سمجھنے لگے تھے جرات بر خلاف اس کے اسی کو اچھا سمجھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رات کس کس طرح کمانہ رہا نہ رہا پردہ نہ لٹا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے نہ سے جوی بلا سے رہا رہا نہ رہا
مومن اس بت کی نیم نالہی میر ہم کو دعوئے آفت نہ رہا
جیسا مجھے آرام تر سے اٹھ سے آیا اٹھ کرے یوں ہی ترا سینہ پہ رہا تھ
دست جنوں نے میرا گریاں بھولیا الجھا ہواں سے شوخ کے بند تھا کیا تھ
کو دگر گھر میں تو پہنچا میں تیرے پر کیا کر لیا دم بھل جانا تھا کھٹکے سے برابر رات کو
یاد دوائی پیش نے تیری شوخی صل کی مر گئے ہم دکھ کو بین ہائے بستر رات کو
وہ جو بھل میں تو بھی تو یاں نرسند از گئی یہ سوچ ہو گیا نہ ہوا کے خواب میں
خیمہ میں یارب ڈوپہ کس کے ہنٹ گیا ہر زمیں سے روشنی افلاک نور افشاں تلک
شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر سو جانا کچھ مجھے شب و تاب دیکھ کر
لگی پھکی ہو سر زانوئے غم پر جو کہ یاد آیا کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قدہ کر
اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھانے کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند
ہائے رے چھیر رات سن سن کے حال میرا کہہ کہ کیسا صاحب
دشت سے مر می سائے اجا پٹے گئے آنا جو گر تو آؤ کہ خالی مکاں جواب
کشاد دل پہ باندھی ہو کر آج نہیں جو خیر آپ کے بند تھا کی
کیا جب التفات اس نے دیا پڑی ہم کو حصول دعا کی
ہیں پاک نظر ہم تو دے ذوق فراحت بے چاشنی ہوسہ ہشام نہ ہوگا
فیروں سے اس نے چھوڑی ہرگز نہ ہاتھ پائی جب تک اہل کا حد مدد چار تک نہ پہنچا
اتنا تو نہ گھبراؤ راحت میں نرسراؤ گھر میں مرے رہ جاؤ آج آئے ہوکل جانا
غیر کو سینہ کے جو سیمبر دکھ لایا تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھ لایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ ہے)

ظہر و تعریض اور کرکٹا عرانہ و محبت کے خاص چنچلے ہیں اسی معاملہ بندی کے تحت میں آئے ہیں اور

بقیہ حاشیہ مکرر شدہ کوئی بھیجیے ہر دل کو پسلو میں
کس نے کی اس سے ہکاماری آج
پہرتے ہیں سو سو دوسے ہی میں میں سوئے کتے ہیں
کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھاتے ہیں
شام سے اپنے سو رہے وہ تو ادرم ان کے کوچہ میں
دولہہ ہائے شوق سے کیا کیا پہرتے ہیں گھبراتے ہیں
کرتے ہیں آواز زفری، دیتے ہیں دستک سو سوار
گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیر در کھکھکاتے ہیں
اب اختیار سے ہاتھ پائی ہو کیوں
نواکت لب اسے ناز میں ہر چکی؟
دو کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے
کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے کھا کوئی
ارمان بکھنے دے بس لے ہم نوا
اب ستم کش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا
ان کو بے تابی ہو کیوں اس خواب کی تعمیر سے
ہاں ہاتھ تصور میں مرا زید کرہو
خط بھی لکھا تو سلام اس میں تعیوں کا لکھا

دشہ ۱۱۰۰ دیکھیے غزال مسلسل گزشتہ صفحہ پر یا غزلیں جن کے مطالعے درج ذیل ہیں۔

تو بہرہ کہ ہم عشق بتاں کا نہ کریں گے
دہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
منظر زلف غیر ہی اب ہیں کیا ہو
بلے دید تری دید سے دل پہلے بھرا ہو
گزنہیں ملتے ملوں گا اور سے
کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں
شانی تھی دل میں اب نہ نہیں کسی زخم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
کیونکہ نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
سین نہ آپ تو ہم بواہوس سے حال کہیں
شب بھر میں کیا کیا ہجوم ملا ہے
اب اور سے جی لگائیں گے ہم
تو بہرہ کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے
سہ سہ کے نادرست تری خوگیا لڑی
کہ سخت جا بے دل اپنے راز داں کے لیے
زباں تنک گئی مر جاکتے کتے
جوشن تھے جلا میں گے ہم
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ہم نے خواب آپ کیا اپنے کام کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس میں شک نہیں کہ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے موسیٰ نے اس میں داغ و بخوب اور بہت کافی دی ہے اور جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو مسانت و بزرگی کا وہ جائزہ تصنیع جو انہوں نے اوڑھ رکھا ہے شائوں سے کھسکتا نظر آتا ہے۔ شاعرانہ فکر کے موسیٰ موجود ہیں اور خاتم بھی۔

شونعی و ظرافت کہ فطری ہی نیز اس زمانہ کی خصوصیات میں سے ہے موسیٰ کے ہاں بہت شونخ اور

اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے	اہل حقہ حاشیہ معفو گوشتہ ہم حال کے جائیں گے سینے کہ نہ سینے
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں	ہر دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے	وہ بدخواہ مجھ سے تو میرا نہیں
خاک میں نام کو دشمن کے لگاتے کیوں ہو	مگر گیس آنکھوں میں تم سر نہ لگاتے کیوں ہو
آخر کو دشمنی ہو دے گا کو اثر کے ساتھ	ماں لگا کر گئے اب سے دماغ یار کی
اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے	ہم حال کے جائیں گے سینے کہ نہ سینے
یہ بھی کہیں دل دے گے گنگنا رہو	تو گنہ عشق سے فرمائے ہو زائد
ناصر ہی کوئے آؤ گرا نانا خواہ نہیں	لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصر اس جان جہاں کو اک نظر دکھلادیا	گوحد سے ہو پر اب بھی ہو ہی ناصر کی یاد
بھوکو یاروں نے پارسا جانا	مے نہ اتنی گنگے سے جو اس بن
بس مے سانسے حور دن کا بیاں اسے داغ	جو ملیں تجھ سے بعد شوق دہ کیا ہوں گے نہ کر
دیکھے جو مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف	جلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
شب تنگدہ میں گزرے ہر دن خافقاہ میں	موسىٰ کو کچھ ہو دولت دنیا و دوں نصیب
آفتابے کئی ہنگام وضو کرتے ہیں	پی ہو حضرت موسیٰ نے بھی مضمر نہ کو
کر تو ہی ذرا ناصر بینا میری اتنی	یہ کون کہے اس کی ترک دماغی نے
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے	ناصر دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہسم
یہ لیا سبب کہ سنا ہے بار بار مجھے	ذواب ترک صنم چہ ہی مگر موسیٰ
میں نہ مانوں لگا کہ موسیٰ زائد سا ہوں	کہ کچا ہوں اس کا اخلاص تباہ میں اتنا

زیادہ ہو، و غلط نامع اور زراہ کی جس کامیابی سے اور جی کھول کے عجایا انھوں نے اڑائی ہیں اور جس قدر جملے انھوں نے
کے میں اتنی کامیابی سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور اس کی وجہ خاص کر یہ تھی کہ ان کے دل میں بھی سخت اور کڑ
نامع بسا ہوا تھا

تو جن کی شاعری میں ان کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو اندرونی باتیں بھی مائل تھیں یعنی ان کی
علیٹ اور مذہبیت، علیٹ کی وجہ سے وہ اکثر اوقات کسی نہ کسی علم کی اصطلاح لے آتے ہیں جس کی وجہ سے
شعر کا بھنا یا شعر کا مل مشکل ہو جاتا ہے حالانکہ ان کی شعریت ان کی علیٹ پر غالب ہے پھر بھی جب کبھی وہ
شعر بناتے ہیں تو یہ علیٹ ضرور سامنے آ جاتی ہے۔ تصوف میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے (اور اسی لیے ان کا
مستحق زمین ہی پر رہتا تھا ورنہ وہ شعر میں مذاق زمانہ کے مطابق خوب کھپ جاتا اور یہ خشک علیٹ
گراں نہ گزرتی، مذہبیت دوسرا ہڈا تھا۔ تمام فائدان ان کا سخت قسم کا مسلمان خود موجد۔ عامل باحدیث
اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مذہبی اصطلاحیں آ جاتی ہیں اور اکثر بند اور
ظاہر دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں مناظرہ یا وعظ
میں ہوں تو لطف دیتی ہیں۔ شاعری میں ذرا اُٹھل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔

طرز ادا تو حسن کا خاص گرا اور جہر ہے جب کبھی رعایت اور صنائع کے تیج سے اس طرف آتے
ہیں تو اپنے خاص رنگ میں ہوتے ہیں۔ ندرت اسلوب کی خاص کر ان کے یہاں بے حد فراوانی ہو کبھی
ناور تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں کبھی کسی امر کو مسلم بان کر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں

صبح دم آئے کو تھا، وہ گواہی دے ہو	رجت تھری ٹھس و قمر آشوب
کیوں نہ چہرے پر وہ ہوش اب زیادہ کرے	بدگمان ہو سب سیرا، کی نیشہ سے
خلاج جواب راست ہو طراح اس بدگمانی کا	وہ کافر گوریں سوسن مرا شانہ ہلا ہوا
ساقہ نہ پیلنے کا ہسانہ تو دیکھ	آکے میری نقش پر وہ رو گیا
تو جن حسد کرتے ہیں ساماں جہاد کا	ترسا صم کو دیکھ کے نصرا نیوں میں ہم
ہم بند گئی بت ہونے نہ کبھی کافر	ہر جائے اگر تو من موجود خدا ہوتا

وغیرہ وغیرہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ندرت اسلوب و دقیق زیادہ تھی بجائے لطیف ہونے کے البتہ شوخی ادا میں کافی خوشگوار شوخیاں دکھلائی ہیں۔ ان کی جدید فارسی ترکیبیں ان کی مشکل پسند طبیعت اور فارسیت کا نتیجہ ہیں ان کے کلام میں جگہیں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اکثر خوب ہیں۔ لیکن بیشتر لائی ہوئی ہیں نہ کہ آئی ہوئی اسی لیے رواں اور رائج نہ ہو سکیں۔ ان کی ترکیبوں اور غالب کی ترکیبوں میں بھی فرق تھا۔ جدید ترکیبیں وہ پہلی معلوم ہوتی ہیں جو جوش تصور سے بن جائیں نہ وہ جو ایک ریاضی داں یا انجینیر سوچ کر نکالے۔ شاعری میں عموماً ترکیب کی جدت جو جوش تصور اور وسعت تصور کو چند الفاظ میں محصور کر دینے کی تدبیر ہو ا کرتی جو خواہ کسی تشبیہ کی بابت ہو یا واقعہ کی بابت جو حسن کا جوش تصور تعقید پسند تھا نہ کہ وسعت پسند۔ اس لیے ان کی تشبیہوں میں حرکت نہیں ہو اور انجناد کی وجہ سے ان کی ترکیب بھی روشن اور تانی و دلکش نہیں ہیں جتنی غالب کے یہاں۔

مومن اپنے مقطع سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ مومن کی رعایت سے بہت بہتر مٹی اور کافر بہتر کے مضامین نہایت آسانی اور خوبی سے لائے جاسکتے ہیں۔

مومن عرصہ تک روشناس نہیں ہو سکے جس کی وجہ خاص ان کی تعقید تھی۔ اس کے علاوہ انھیں حالی یا آزاد جیسا شاگرد نہ ملا کہ موجودہ طرز تنقید کے مطابق انھیں اجاگر کرتا بلکہ صاحب آب حیات و گلستاں بے خزاں نے تو ان کے کمالات پر شروعات میں پردہ ہی ڈال دیا تھا لیکن اب جبکہ مومن روشناس ہوئے ہیں انھیں غالب کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھی زیادتی ہے۔ دونوں کے طبائع مختلف، افتاد و مزاج جدا لگانہ، ایک کر کے تو بہ کرنے والا، ایک تو بہ کو اپنی ہتک سمجھنے والا۔ ایک کٹر مومن مسلمان دوسرا صرف انسانیت میں اعتقاد رکھنے والا۔ تغزل کا نظریہ بھی جدا لگانہ۔ مومن کی غزلوں میں محض تغزل ہے غالب کے یہاں گونا گونی جذبات کے علاوہ تصوف، اعتقادات و فلسفہ بھی ہے یعنی تخیل کے میدان میں ایک محدود ہے دوسرا لامحدود ایک کے یہاں بے چینی روح جو دوسرے کے یہاں محض بے چینی و داغ۔ ایک کا تخیل تمام نفسیات انسانی کی سیر میں مصروف ہے دوسرے کا محض ایک ہی جذبہ کے تلطف میں گم رہا۔ ایک کی زندگی تامل و تامل ہے چینی۔ خیالی، جذباتی، اعتقادی اور دنیا کی طرف سے دوسرے کی زندگی تامل و منظم یعنی مومن

مالی حیثیت سے مطمئن تھے۔ جذبات آسودہ، اعتقادات مستحکم اور اٹل ظاہر ہو کماں وہ دماغ پریشاں کماں یہ روح مطمئن اور درجہ بھی ہو کہ مومن تصور ابست لفظی صناعی سے کہ مثل علانی دنیوی سو ہو واجبہ رہے اور وہ روح بے مہین کہ آزاد تھی اس مایا میں نہ بھنس سکی مومن اگر عمر طبعی پاتے تب بھی غالب تک نہ پہنچ سکتے اکثر جگہ یہ صحیح ہو کہ ہم طرحی غروں میں مومن کے اشار غالب سے بہت کم نہیں معلوم ہوتے یا اکثر فارسی ترکیبیں مومن کی بھی کچم کچم مدہ نہیں ہیں لیکن ان اشار میں خوبی محض فن کی جو جس میں مومن اس زمانے کے معیار کے مطابق غالب سے کم نہ تھے لیکن تنوع مضامین اور طرنگی ادا کی مقابلہ کمی کی وجہ سے اب مومن و غالب کے مقامات نہایت آسانی سے قائم کئے جاسکتے ہیں رہا یہ امر کہ دونوں کی دماغی قابلیتیں عوام کی سطح سے بہت بلند تھیں ایک مسلم حقیقت ہے لیکن روش دونوں کی جدا گانہ تھی ورنہ ایسے معاملہ بند کی باتیں تو ہر عاشق شاعر کے یہاں ایک ہی جیسی ملیں گی۔

نور محسن ہاشمی

فانی کی موت

ایک منظر

(اندھیری رات آسمان تمام سیاہ نظر آ رہا ہے اس سیاہی میں صرف دو تارے جگمگا رہے ہیں۔ ایک بڑا بڑا کستہ ہے)

ایک رو بہ پروتھت سے میرے نور میں یہ آئے تاب
منظر تاریک ہی باروشنی کا انقلاب !
سرفرازی کو مری تھامے ہوئے دوشِ علم
منزلِ حُسن و لطافت کی طرف میرے قدم
آئینہ ساز نظر ہو جسوہ سامانی مری
جگمگاتی ہو تجسلی بن کے حیرانی مری
صبح کے سہیں آجائے سے لرز جاتا ہوں میں
چھانوں میں اسرارِ دو عالم کے چھپتا ہوں میں
دوسرا قافہ دات کی تاریکیوں میں نور کا پیغام ہوں
میں کسی سبے تابی آغاز کا انجھام ہوں
جل رہی ہو مجھ میں شاید آہ و فریادِ ازل
میری جان زار سے قائم ہو بنیادِ ازل
ہر نفسِ لہزاں ہو میرا ہتھامِ زندگی
جھومتا ہو عرش پر میرا نظامِ زندگی
آنکھ کی مانند ہر لحظہ جھپک جاتا ہوں میں
اشکِ علم کی طرح دہن میں ٹپک جاتا ہوں میں
ایہ کہ کے تارہ و ثنائی اور سیاہ بندانیاں طوکر تارہ اپنے آئنا ہر زمین کے ایک رفیع لیکن سیاہ پہاڑ پر ایک جنازہ
گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے دو پیکر کند ہوں پر اٹھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ایک پیکر کا نام زندگی ہے دوسرا
کا نام موت۔ موت کا پیکر یہ نوہر کرتا ہے۔)

موت کا پیکر تم گم گداہ سینہ بتیاب جس میں راز تھا
یہ کوئی دریا تھا یا ٹوٹا ہوا اک ساز تھا
چند سانوں کے بچنے میں تھا اک مغانِ غم
اک دل مایوس اور فریادی ذوقِ ستم
بند ہو وہ آنکھ جس میں حسن کا پیغام تھا
ختم ہو وہ زلیت جس میں عشق کا انجام تھا
بند ہیں وہ گوش جو سنتے تھے آوازِ روش
ہو گئے دنیاے رنج و غم کے انسانے غمش
زندگی کی گود میں پالا ہوا اک جسمِ ناز
برگیا افسوس بیدا و زمانہ سے گداز
دو تجلی جس پہ نازاں تھی فضا کے کائنات
بن گیا اس وقت اک دیر انداز و روحیات
فکر جو پرواز کرتی تھی فرازِ عرشِ ریا
آج بے جس ہو گئی ہو آج بے گل کے فرش پر

داع دل جس کے نمایاں اہل بخشہ کیلئے
 دو فغاں جس میں نظر آتا تھا دل نہایا کو
 جوتاسے توڑنا تھا ویدہ تر کے لیے
 وہ صدا جس میں تھا نمہ حسرت بیدار کا
 موت کے پہلو میں آنے کا بہانہ بن گئی
 آج دنیا نے غموشی کا نسا نہ بن گئی

ازندگی یوں ماتم کرتی ہے

زندگی - ظلمت ہستی کا آئینہ غم وینا نہ دیکھ
 اس میں آئیں گی نظر تجھ کو ہزاروں قبریں
 مرگ نا آتی کا شب تاریک میں جلو نہ دیکھ
 اک سیہ چادر نہیں ہیں زندگی کی حسرتیں
 موت کے دہن میں خوابیدہ ہو دل کا ارتعاش
 بے بصراک گوہر نایاب پائیں کس طرح
 ریشمی دامن میں دنیا کے جو غلطان ہی رہا
 جس نے دنیا کو پکارا دردی آواز سے
 جس نے زندہ کر دیا بحکیت کے انجام کو
 بن گیا غم جس کے نعنوں سے پیام و نگہاں
 سو گیا جو آج میرے سینے خاموش بہا
 یہ زحمن کر ٹوٹا ہوا تارہ اس جازہ کے طواف ایک نور کا قطعہ سا ڈال دیتا ہے اندھیری فصا میں نظر آتا ہے کہ ایک

روح سفید اس حلقہ میں بلند ہو رہی ہے موت، زندگی اور آسان کا سکرانا ہوتا رہا دل کر گاتے ہیں

آٹھ گئی آج بزم راز و نیاز
 زندگی غم تھری انسان کی
 بے صدا ہو گیا ہے پردہ ساز
 ڈھونڈ لی اس نے راہ دور دراز
 آہ و فریاد اتنی سینہ گداز
 چھوڑ دی تو نے بزم درد و نواز
 آ رہی ہے سروش کی آواز
 موت سے ہو ہے ہیں راز و نیاز
 ”آج روز وصال فانی ہو
 ہم سمجھتے ہیں تیری ہستی کو
 محمد عبد القیوم خاں باقی

تجلیات

یاد تری شراب ہے، ذکر ترا سرود ہے؛
 کیف طرب میں موجزن میرا ہم وجود ہے؛
 اپنی ہی جن میں عرش سرور نکل گیا ہوں میں
 اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غسیم صعود ہے؛
 اس میں کہاں سرور و نور آگ ہی آگ ہے ہوس
 مثل سموم ہر نفس، آہ بزرگِ درد ہے؛
 آنکھ ہو حق شناس اگر آتا ہی تو ہی تو منظر
 در نہ تمام کائنات بست کدہ نمود ہے؛
 پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہو دھلی ہوئی
 عرش بریں سے پڑ بہ پڑ قدسیوں کا ورود ہے؛
 فکر دل دجگر نہ کر عشق میں جان کر بھی گزرو
 اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سہو ہے؛
 غرق سرور و نور ہوں جامِ دہسو سے دہو ہوں
 میرے لیے کھلا ہوا میکرو شہود ہے؛

آثر صبا

اس دور میں :-

ہر شعر و اصل میں تابیخ ام ہے نجلو مری آفاق نوردی کی قسم ہے
 اُس مرد قلندر کو سڑی کستی ہو دنیا اس دور میں جو طالب انصاف کرم ہے
 ہر روح کی خلوت میں جو آباد ہوا بتک وہ خالق اکبر بھی تصور کا صنم ہے
 حل کرتا ہوا فلاس کے عقدے وہ پختہ جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے
 خلوت میں یہ عفریت تعیش ہو مگر اب منبر پہ بھی استاد ہو اور آنکھ بھی نم ہے
 ہر شخص ہو سنگین حقایق سے گریزاں ہر فرد کو محبوب ہی شیعہ رم ہے
 جو قیصر و غفور کے آگے نہ جھکا تھا مدت ہوئی وہ سرد را محاد پہ خم ہے
 جذبات میں جدت نہ خیالات میں سحت تحریر میں رعنائی نہ تقریر میں دم ہے
 بیخ بستہ ہو نوخیز نوجوانی کا ارادہ اور ڈھلے بڑھاپے پہ گرا نباری غم ہے
 مشرق کی نگاہوں میں ہی ہم لہ قرآن وہ بات جو مغرب کی کتابوں میں رقم ہے

جینے کے لیے اذن ہو قانون کا مطلوب

اللہ ! ستم ہو مرے اللہ ! ستم ہو !

احمد ندیم قاسمی

ذائقے محسوس

زندگی میں کوئی محشر کبنا آ جائے قلب لہزاں کو کسی طور قرار آ جائے
سینچتا ہوں دل خاک اشک سحر گاہی ہو شاید اجر طے ہوئے گلشن میں بہار آ جائے

دل کی تذبذب سے رہن نہیں تو مومن کا نظام بند و سود و زیاں ہر شب بستی کا غلام
زندگی میں اثر دانشِ امر و نہ پوچھ تیری دنیا کے تجلی پہ چھپائی ہوئی شام

دل سوڑھے ہے اک دیں میں رہتا ہوں تیر سختیاں گردِ دُش ایام کی ستا ہوں میں
قصہ دردِ الم بچلی شبوں کو اکشر چپکے چپکے ترے افلاک سے کتا ہوں میں

ساقی دہری تو مجھ کو تنک جام نہ کر اس خود زار میں آئین جنوں عام نہ کر
شرم رکھ لے مری تقدیر کی اس روز جزا ایک بدنام زمانہ کو تو بدنام نہ کر

تیرا پیغام سناتے ہیں ستارے مجھ کو کرتے ہیں رات کو آنکھوں کو اشارے مجھ کو
توڑ دیتا ہوں جنوں جب کہ تصور کے حدود کھینچ لیتے ہیں سمندر کے کنارے مجھ کو

ضرب غم سے ابھی دستورِ نفس چاک نہیں حامل ہوج شرریہ رخ و خاشاک نہیں
تیری تقدیر نے بخشا غم یا راں بھی مجھے کہ دل نعوذہ منزا دار غم پاک نہیں
فضل حسین کیفِ اسرارِ ایللی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کتاب العلم (جز اول) : دنا شران دی ایسٹرن پبلیشنگ اینڈ ایڈیٹشرز لمیٹڈ لاہور صفحات ۵۰۱ اسائنمنٹس قیمت ۱۱۰ روپے طباعت و کتابت کا نذر نفیس مع متعدد رنگی و سیاہی تصاویر۔

محمد سعید بیگ و محمد اسماعیل صاحبان نے ایک بہت بڑے سرمایے سے یہ کتاب بک آف نالیج کی وضع کی کمالی جزو خوبی طباعت اور اشاعت کی نفاست کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہر مقصد یہ ہو کہ ہر علم کی معلومات ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائیں کتاب العلم کا یہ پہلا حصہ ہر بقیہ حصے بھی اسی نمونے پر تیار کیے جائیں گے۔ فہرست مضامین سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہیں کائنات، معدنیات، حیاتیات، انسانیات، ملکیات، کیمیا و طبیعیات، ایجادات، فنون لطیفہ، تاریکیات، زرعیات، ادبیات، نظمیات، دینیات، قصہ جات، شخصیات، استفسارات، میکینیکیات، تفریحیات، صحیات اور اقتصادیات۔ دراصل یہ کتاب انگریزی کی بک آف نالیج، ورلڈ آف وڈرز اور ورلڈ آف سائنس وغیرہ عام معلومات کی قسم کی کتابوں سے کبھی گئی جزو زیادہ تر تصاویر اور مضامین ان ہی سے لیے گئے ہیں لیکن اصطلاحات کا ترجمہ بہت ہی معرب زبان میں کیا گیا ہے۔ یوں بھی عبارت میں عریضت اور فارسی انتشار و اڑی بہت زیادہ ہے۔ عموماً ایسی کتابیں عوام کو بول بچوں اور طالب علموں کے لیے زیادہ اور خواص کے لیے کمتر مخصوص ہوتی ہیں اس لیے زبان ایسی رکھنی چاہیے جو بہت سادہ اور آسان ہو تاکہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکے اور معمولی پڑھا لکھا بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ موجودہ اسلوب بیان سے زیادہ لوگ کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک بات اور اس کتاب میں نامناسب معلوم ہوتی ہے وہ جگہ جگہ اس کی مذہبیت ہے۔ کئی جگہ علمی مضامین میں آدم و حوا کا قصہ دہرایا گیا ہے یا دیگر مذاہب اور مذاہم کے نقطہ نظر دیے گئے ہیں خالص علمی مضامین میں (اور پھر جبکہ یہ کتاب ہر فرقہ کے لیے ہر صرف مسلمانوں

کے لیے نہیں) مذہب کو جگہ بگہ بیچ میں نہیں لانا چاہیے تھا مثلاً زرعیات، ادبیات وغیرہ میں بہت سہجوتا اگر دینیات کے عنوان ہی میں یہ مباحث رکھے جاتے یا اسلام ہی کے متعلق لکھا تھا تو اسلامیات کا موضوع وضع کیا جاتا۔ دیگر لحاظ سے کتاب کی افادیت میں کلام نہیں ضروری ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری میں ہو کتاب پر لاگت تو یقینی زیادہ آئی ہوگی پھر بھی قیمت کچھ زیادہ ہے۔

اسلام اور سچیت : ساز ابو الفاضل اللہ صاحب امرتسری، ملنے کا پتہ دفتر الحدیث امرتسر صفحہ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ قیمت ۲۰ روپے۔ کتابت و طباعت سمولی۔

مولانا موصوف کی یہ کتاب عیسائیوں کی کئی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی ہے اور بہت سی ان غلطیوں کو دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے جو عیسائی مبلغین پھیلاتے رہتے ہیں۔ عیسائیت کا فتنہ مسلمانوں کے لیے پنجاب میں خصوصیت سے بڑے خطروں کا حامل ہے ضرورت تھی کہ ان شہریوں کے خلاف جو وہاں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں سخت بدوجہد کی جائے۔ اور ان کو ان ہی کے دلائل سے بند کر دیا جائے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب عرصہ سے اس جدوجہد میں مصروف ہیں خدا انھیں ثواب عظیم عطا کرے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کی تصانیف خرید کر ان کو زیادہ سے زیادہ کام کر سکنے کا موقع دیں۔

مسئلہ قومیت : ساز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائز صفحہ ۱۲۷۔ قیمت بے جلد عر کا غدر کتابت اور طباعت اچھی۔

مولانا موصوف نے یہ مقالہ قومیت کے مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اصل مقصد قوم اور قوم پرستی سے کیا ہے اور اسلام میں قومیت کے کیا معنی ہیں۔ جماعت، قوم اور امت کے معانی میں کیا فرق ہے اور مسلمانوں کی قومیت کن معنوں میں دوسروں کی قومیت سے جدا گانہ ہے۔ یہ مقالہ دراصل پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات یہ ہیں۔ قومیت اسلام، کلمہ جامعہ متحدہ قومیت اور اسلام، کیا ہندوستان کی نجات فتنہ میں ہے، اسلامی قومیت کا حتمی مفہوم، ہر موضوع کو بڑی وضاحت اور انشراح سے واضح کیا ہے جو قابلہ کتاب ہے **ہفت اورنگ** (حصہ اول) از اقبال حسین صاحب انصاری جو پٹنہ لکھنے کا پتہ ابو محمد انصاری محلہ ساجہ جو پٹنہ سائز صفحہ ۱۲۷۔ قیمت ۱۴ روپے۔ عر کا غدر کتابت و طباعت سمولی۔

یہ سات مضمونوں کا مجموعہ ہے جو فارسی ادب سے متعلق مضامین پر لکھے گئے ہیں۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ زردشت، ایران میں شاعری، ادب، فردوسی طوسی، چار مقالہ نظمی عروضی سمرقندی، صوفیانہ لہجہ، چرخسان الغیب، شیخ علی حزمیں۔ ان مضامین میں کوئی داؤد تحقیق نہیں دی گئی ہے لیکن جو کچھ ہر موضوع پر موجود تھا اس کو ایک جگہ جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور اس لیے فارسی ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

ذکر و فکر :- از مقصود زاهدی۔ طے کا پتہ نمبر ۱۶ زاہدی بردار زراہیان میرٹھ۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۱۲، قیمت ۸ روکا غنیمت مولی، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مقصود صاحب کے چند سماجی، سیاسی اور نفسیاتی چہرے چھٹے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں وہ مطالعے خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں جو نفسیاتی جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ مثلاً میلے کو، بنگی و بیچارگی، فربخ خیال، ادا کٹر نیکی وغیرہ مقصود صاحب کے بیان میں ہلکا سا طنز جو ہمارے سماجی تکلفات کا پردہ اٹھانے میں بہت کامیاب ہوتا ہے مقصود صاحب کی قوت مشاہدہ باریک بین ہے اور واقعیت نگاری کے لیے یہی چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ مقصود صاحب اس ذکر و فکر کو جاری رکھیں گے اور بہت جلد وہ اپنے لیے اردو ادب میں اچھی جگہ بنا سکیں گے۔

میرے نغمے :- از سلام پھلی شہری طے کا پتہ اردو سوسائٹی دفتر اہلسانہ، "اضطراب" جاپنگ مارٹ نظیر آباد لکھنؤ صفحات ۱۰۲، سائز ۲۲×۲۹، قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی پہول اور انگارے، اول الذکر میں رومانی نظیں اور دوسرے حصہ میں نقدی نظیں شائع ہونا عینیں لیکن سرکاری اجازت نہ ملنے کے باعث صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے۔

سلام پھلی شہری صاحب اردو کے ان نوجوان شعرا میں سے ہیں جو ادب کو زندگی سے قریب تر دیکھنا چاہتے ہیں جو تمام نظام معاشرت میں بنیادات کے حامی ہیں اور جو موجودہ سیاسی تنظیم کو پلٹ کر ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں ہر ایک کو برابر کے مواقع ملیں نہ کوئی ظالم ہو نہ مظلوم نہ کوئی آقا ہو نہ خادم

نہ کوئی سرمایہ دار ہونہ کوئی مزدور۔ سلام کی گری تخیل اور شدت احساس ان موضوع کے لیے یقیناً مناسب تھی۔ جو ان کی سیاسی نظموں کا کافی معروف ہیں زیر نظر روحانی نظموں میں بھی ان کا شدت احساس بدرجہ اتم نمایاں ہے۔ عید کی مبارکباد کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟ انسانہ در انسانہ محبت کے گیت، بھلا دور وہاں، حسین تعارف اچھے مطالعے ہیں اور یہیں قوی امید ہے کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اپنے آرٹ میں اور ترقی کرے گا۔

قاعدہ مفتاح القراءۃ: از حکیم عبداللہ رشید نواب رشد کی مطبوعہ اس ایم حن شاعرہ ہند پریس لیمیٹڈ نمبر ۲۰ بنیاد پوکھر لین کلکتہ۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۴۴ قیمت درج نہیں۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

فن تجوید پر یہ قاعدہ حکیم عبداللہ رشید صاحب نے بڑے غور و خوض نیز ان تجربات کے بعد شائع کیا ہے جو موصوف نے مسلم ہائی اسکول ایشیٹس میں کیے۔ اس میں مختلف مشقوں کے ذریعہ طلباء کو حروف کے جوڑان کے صحیح تلفظ اور صریح آوازوں کے متعلق صحیح رہبری کی گئی ہے۔ طلباء کے لیے بہت مفید چیز ہے۔ امید ہے عربی اور فن تجوید کے طالب علم اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔

پارہ عم: مرتبہ شعبہ اشاعت قرآن ادارہ دار الاسلام متصل پٹھان کوٹ۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۹۶ قیمت ۸ روپے کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ پارہ عم دار الاسلام نے مع ترجمہ و تفسیر ومعانی الفاظ شائع کیا ہے، ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر لفظ کے معنی الگ الگ بھی دے دیے ہیں اس سے عربی دانی میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ امید ہے کہ ادارہ دار الاسلام پورا قرآن شریف اسی اہتمام سے شائع کر سکے گا طلباء اور عوام کے لیے یکساں مفید ہے۔

نسیم کے سو شعر: مرتبہ سید جمیل الدین۔ طے کا پتہ۔ عثمانیہ کڈ پو دکان نمبر ۱۵ محمد علی بلڈنگ نمبر ۱۲ صفحات ۴۰۔ تقطیع چھوٹی قیمت ۴ روپے کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

جناب سید مظفر حسین صاحب نسیم کے یہ سو منتخب اشعار جمیل الدین صاحب نے پیش کیے ہیں مختصر پیش لفظ پر دلیس سید نجیب انشرف صاحب نے لکھا ہے۔ انھوں نے صحیح تحریر فرمایا ہے کہ نسیم صاحب کے کلام میں صداقت زیادہ ہے اور نظریں گمرائی بھی ہے اور دل پر سوز بھی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

سینے میں اک جالا اساکھا کیا جانے کب بیٹھ گیا دھیر رہے ہو دل کی حالت۔ دل کی حالت کیا کہنے

بلکہ ہوئے یہ بادل ملکی ہوئی یہ راتیں یاد آگئیں بھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں
 لب پہ ناز نہیں شکوہ نہیں فرمایا نہیں سچ تو یہ ہے کہ ترا کوئی ستم یاد نہیں
 سالنامہ نظامیہ :- مرتبہ ابو الخیر کچ نشیں۔ ملنے کا پتہ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدر آباد دکن صفحہ
 ۹۶ قیمت ہر سائز — کتابت طباعت اچھی کاغذ معمولی۔

حیدر آباد دکن کی ایک قدیم مذہبی درسگاہ کا نام جامعہ نظامیہ ہے چند سالوں سے اس جامعہ
 کا یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ اس سال فروری ۱۹۹۷ء میں منایا گیا۔ اس سلسلے میں جامعہ نظامیہ کی علمی مذہبی
 خدمات نیز کارگزاریوں اور حالات میں جو مقالے اور مضامین ترتیب دیے گئے وہ اس رسالہ میں درج
 ہیں۔ چند مضامین اس سلسلے کے علاوہ بھی شامل کئے گئے ہیں مثلاً تاریخ قرآن و تجوید آزادوی نسواں اور
 منکر جناب و سر و سر و نظر شعرا عرب (جو پہلے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے) وغیرہ جو قابل مطالعہ
 ہیں۔

نصاب تعلیمی مرکز :- انجمن خدمت خلق، عربک کالج دہلی

تعلیم انسان کے اس بڑے مرکز نے اپنا نصاب حال ہی میں شائع کیا ہے جس کے دیکھنے سے
 معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرکز کتنی تنہا دی اور جاں نثانی سے ہر کسی معاوضے کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ
 کر رہا ہے۔ تعلیم اور مسائل تعلیم کے سبب خدمت ہو چکا ہے۔ ہر مرکز میں کل چار جماعتیں ہیں ہر جماعت کے نصاب
 کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کھائی چھائی حساب اور عام معلومات۔ اصل میں خواندگی کا نصاب تو پہلی جماعت
 میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی اسی تین جماعتوں میں ان کی شوق کو مستحکم کیا جاتا ہے اور شوق کو ابھارا جاتا ہے۔

ایک اخبار، ایک دارالمطالعہ، ایک لائبریری اور ایک انجمن بھی قائم ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحب
 استعداد حضرات حسبِ وجہ اس کی مالی امداد کریں نیز لوگ اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھائیں۔ نصاب
 مندرجہ بالا پتہ پر کارڈ لکھ کر مائل کیا جاسکتا ہے۔

شہیدانِ کمانِ استقامت :- درحاضرہ کے علمی، اداری اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز و تند اور تلخ تبصرہ
 از ہلالِ دل میں شہید قیمت ہر صفحہ ۹۶۔ پتہ درج نہیں۔

سلک گوہر میں (ایک خفائی تشیل) از حلال الدین اشک قیمت ۴۰ روپے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر
رفعت منزل خیریت آباد، حیدر آباد دکن۔

اشک صاحب کی پہلی کتاب اس لغنی اور مایوسی کی آئینہ دار ہے جو اس دور کے اکثر ذہین اور
ہونہار نوجوانوں میں پائی جاتی ہے اور جو دراصل اس دور کی روح ہے۔ اس میں انھوں نے موجودہ
دنیا اور اس کی تمام برکتوں کو شیطانی بتایا ہے۔ ان کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان باوجود بہت سی نعمتوں
کے چونکہ مسرت سے محروم ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی زندگی میں ایک غلام محسوس کرتا ہے۔ مسرت سے محرومی
اشک صاحب کے نزدیک شیطان کا کرشمہ ہے۔ انسانی اعمال کی ذمہ داری اتنی آسانی سے شیطان
پر نہیں رکھی جاسکتی۔ دراصل ملکوتیت اور شیطانتیت خود انسان کے اندر موجود ہے۔ اس کش مکش سے انسانی
زندگی کی دلچسپیاں قائم ہیں۔ ارسنات کے تحت میں ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اشک صاحب
کا شیطان کا استعمال اچھوتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں اگر دوسرے ادبیات سے قطع نظر کی جائے تو بھی
اردو میں سجاد انصاری، فلک پیر، رشید احمد صدیقی، اقبال ان سب کے ہاں یہی تصور ملتا ہے۔ دراصل
اردو میں سب سے پہلے شیطان کو سجاد انصاری نے محرم راز کی حیثیت سے پیش کیا۔ اقبال اسے
مخوابہ اہل فراق بھی کہتے ہیں اور اس کے "سوز نفس سے کار عالم کی استواری" بھی عبارت سمجھتے ہیں۔
اشک صاحب نے زیادہ سے زیادہ اپنی پوری کتاب میں اقبال ہی کے بعض اشعار کو داغ کیا ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شعر و ادب، تنقید، فلسفہ، آرٹ، عورت، سب اس لیے گمراہ کن و زورنی
ہیں کہ بعض شیطانوں نے انھیں اپنی اغراض کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا ہے۔ یہ ذہنیت دلچسپ ضرور ہے۔
اور پر خلوص بھی مگر بالکل صحیح نہیں۔ ایک مسرت وہ ہوتی ہے جو "احاس زیاں نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی
ہے۔ ایک وہ ہے جو سود و زیاں دونوں سمجھنے سے۔ دراصل انسان پہلے احساس زیادہ رکھتا ہے نہ تھا اس
لیے اگرچہ وہ خوش تھا مگر اس کی خوشی بچوں کی سی تھی وہ صرف خوش رہنے کے لیے نہیں آیا، وہ رنج و
راحت، بھنی وستی کو ہوا کرنے کے لیے آیا ہے۔ اقبال کے اہلیں نے جو دنیا کی تعریف کی ہے وہ دراصل
اشک صاحب کے تصور سے زیادہ حقیقی ہے۔

سوز و ساز و درد و رنج و آرزو و جستجو

یوں دیکھتے تو مسرت کی کمی اتنا بڑا جرم نہیں رہ جاتی بلکہ اس سے محرومی اس بے حسی سے بہتر ہو بعض وقت مسرت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہو

در اصل زندگی پر ایک بہتر تبصرہ اشک صاحب کی دوسری کتاب "سلک گوہر" میں ملتا ہو۔ اگرچہ یہ بہت مختصر ہو۔ اس میں شاعری، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور اس قسم کے دوسرے ساچوں سے آزاد ملتی ہو۔ غنائی شاعری اردو میں اب شروع ہوئی ہو۔ اس لیے اس کی اٹھان بہتر دی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھنی چاہیے اشک صاحب کے اشعار میں شعر کی روح ضرور موجود ہو مگر کبھی طریقہ انظار پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور بعض مصرعے اور شعر اعتراف عجز کی زندہ مثالیں ہیں۔

دونوں کتابیں توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ شیطان کا استقام پر جوش نثر میں لکھا گیا ہو۔ کاش خیالات اور گہرے اور بچتے ہوتے تاکہ سطحیت بالکل نہ آنے پاتی۔

ہمارے مزدور :- از محمد عبد القادر صاحب نیکوچرا شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو دہندہ دہلی صفحہ ۶، قیمت درج نہیں کاغذ، کتابت و طباعت بہت اچھی۔

انجمن ترقی اردو نے اپنے پروگرام کے ماتحت یہ چھوٹا سا رسالہ اس لیے نکالا ہو تاکہ عام لوگ معاشیاتی مسائل سے اچھی طرح باخبر ہو سکیں۔ عبد القادر صاحب نے یہ رسالہ بڑی تحقیق سے مرتب کیا ہو اور اس میں وہ تمام معاشیاتی مسائل آگے جو ہندوستان کے ایوان قانون سازی میں منظور ہو کر عمل پذیر ہوتے رہے ہیں۔ آکسفورڈ پریس کی طرح یہ عام فہم طریقہ علوم پھیلانے کا یقیناً بہت مفید اور اچھا ہو۔ اسید بیکہ انجمن مذکور اس قسم کے دیگر رسائل بھی ملک کے سامنے جلد رکھ سکے گی۔ اگر آئندہ زبان اور آسان ہو تو بہتر ہو گا اور غوام بھی اس سے متفید ہو سکیں گے۔

سالے :-

اضطراب :- ایڈیٹر مسعود اختر جمال۔ دارالاشاعت دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس صفحہ ۳۴۔ چند سالانہ سے رکاز کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جگمراؤ آبادی صاحب کی نگرانی اور مسودہ اختر جہاں صاحب کی ادارت میں کچھ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کا اچھا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض اچھے مضامین دوسرے رسالوں سے بھی مستعار لیے جاتے ہیں اس صورت سے اس کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ زیر نظر نمبر جولائی و اگست کا ہے۔ اس میں بھی اچھے اچھے رسالوں کے اچھے اچھے ادبی اور علمی مضامین مجتمع ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ انگریزی میں کئی رسالے اس قسم کے نکلتے ہیں جن میں تمام دیگر رسالوں کا بخیر ڈھونڈا ہوا ہے۔ اس رسالہ میں اس بخیر کے علاوہ اس کے اپنے مضمون نگاروں کے بھی مضامین اور نظمیں ہیں اگر یہی رفتار اضطراب کی رہی تو امید ہے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط تر پیدا کر لے گا۔

ہیمل (خاص نمبر) میران مارن سنہاروی وقیر عثمانی صاحبان صفحات تقریباً ۲۱۶ قیمت ۷ روپے کاپتہ دفتر رسالہ ہیمل گیا۔ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

رسالہ ہیمل کا خاص نمبر بڑی خصوصیت کے ساتھ نکلا کرتا ہے۔ اور بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اچھے اور تحقیق سے لکھے ہوئے مقالے، دلچسپ نظمیں اور اچھے ڈرامے ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں بھی ”آفا حشر اور اس کا آرٹ“، ”موازنہ غالب و مومن میری نظریں“، ”ذقیی اور فردوسی“ وغیرہ مضامین بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح افسانوں، ڈراموں، نظموں اور غزلوں کا معیار بھی برا نہیں ہے۔ شائقین کے لیے ایک اچھے مطالعہ کا سامان ہیں۔

فہرست مضامین پر اگر صفحات دے دیے جاتے تو اچھا تعانیزان کی ترتیب بھی جیسی عام طور پر ہوتی ہے۔ دیکھنا چاہیے تھی تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ ہشتہارات کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ادبی رسالوں میں صحنی امراض کے اشتہا رات نہ ہونے چاہئیں۔

نئی زندگی - مدیر انیس الرحمن جیلے کاپتہ دفتر رسالہ نئی زندگی ۹۴ سلسلہ سنٹری زیر روڈ الہ آباد چند سالانہ صرانی پرچہ ۸ صفحات ۶۴، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جولائی ۱۹۴۱ء سے ڈاکٹر سید محمود کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ مقصد اس رسالہ کا یہ ہے اس میں خالص ہندوستانی کھیلوں، مسائل، یک بحث کی جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے

ادبوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مشترک کلچرل ترکے کو پیش گوئی تاکہ ایک دوسرے سے گزشتہ کی طرح قریب آسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے رسالے کی سخت ضرورت تھی جو جوہر ہندوستان کی فضا دیکھتے ہوئے اس قسم کے رسائل کا کلکنا مفید اور پرتاچ ثابت ہوگا۔ زیر نظر اگست نمبر میں خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ (۱) مسلم عد حکومت میں ہندوؤں کی حالت (۲) مذہب پر عربوں کا حملہ (۳) یورپین سامراج کی اسلام پوزایاں (۴) ہندوستان میں زبان کا مسئلہ (۵) آئندہ انسانہ (۶) تمام مذاہب عالم کی حیرت انگیز یکسانیت (۷) مرہٹہ حکمران فرقہ پرست نہ تھے مضمون نگاروں کی فرست جو صفحہ ۲ پر دی گئی ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نئی زندگی والوں نے کس قدر سہرا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں نوجوان طبقہ ہی سے آئندہ کی بہتری کی امید ہو سکتی ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اور اس کا مقصد و مہیا رہتا رہے۔

ہمارا اخبار ۲۰ مرتبہ سید محمد اویں ڈپٹی کلکٹر ملیا صفحات ۱۰۔ سائز ۱۶×۱۶ چاند سالانہ ۲۰
یہ پندرہ روزہ اخبار جنگ کی حقیقتوں کو جاری رکھنے کے لیے نکالا گیا ہے۔ اپنے مقاصد کے
پیش نظر اس کی ترتیب بہت معتدل اور مناسب ہے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں نکل رہا ہے۔

رفتار زمانہ

اس مہینہ میں، اب تک جنگ کے کوئی کارنامے، خاص طور سے بیان کے قابل نہیں ہیں لیکن تقریریں کئی ہوئی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر فتوحات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم ان کا اصل مطلب نہیں سمجھے، انہیں نظر انداز کریں اور بات اسی کو مانیں، جو توپ کے منہ سے کی جائے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ یہ تقریریں ہمیں سیاست کے وہ بھید بتاتی ہیں، جو اور کسی طرح سے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ تبصرے ہیں ان واقعات پر جو ہمیں روز کی خبروں میں تھوڑے تھوڑے بتائے جاتے ہیں اس طرح کہ ان کی مجموعی شکل ہمارے سامنے نہیں آتی جنگ کی خبر صرف یہ ہے کہ جرمنی کا قریب قریب پورے جزیرہ ناکریمیا پر قبضہ ہو گیا ہے اور جرمن ہوائی جہاز، دون (Dornier) اور دو لگا دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اس پر منڈلا رہے ہیں، یعنی قفقاز کو روس سے الگ کرنے کی کارروائی شروع ہو گئی ہے، اگر میاں پر قبضہ کرنے کا مشابہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک ہوائی مرکز بنایا جائے، جہاں سے بحر کاسپین کے کناروں تک مشرق میں اور ترکی کے ساحل تک جنوب میں ہوائی جہاز بھیجے جا سکیں۔ ماسکو کے گرد لڑائی ہو رہی ہے جرمنوں کو جان اور مال کا بہت نقصان ہو رہا ہے لیکن دوماسکو کا محاصرہ کرنے پر نئے ہوئے ہیں۔ روسیوں نے یہ ہوشیاری کی کہ ماسکو کے جنوب میں بھٹنے کا رخاتے تھے، ان میں سے کام کی چیزیں پہلے ہی اٹھا لے گئے اور محاذ سے دو مشرق کی طرف باکرنے کا رخانے قائم کر دئے اور جیسے اوکرائن میں بے کے ڈھیروں کے سوا جرمنی کے کچھ ہاتھ نہ لگا تھا ایسے ہی یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جنگ کے شور اور پریشانیوں میں ایسا کام کرنے جانا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن روسیوں کے پاس سامان جنگ کی پہلے بھی کمی تھی کارخانوں کو اس طرح منتقل کر کے انہوں نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ سامان تیار ہوتا رہے مگر بتنا پہلے کے مقابل میں کم ہی ہوگا، لیکن گراڈ کا محاصرہ بدستور جاری ہے، وہاں کی روسی فوج اکثر نکل کر

دشمن کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن گھیر سے نکل نہیں پاتی۔ یہ حالت بہت مایوسی کی ہوتی اگر وہی ہمت ہار جاتے۔ وہ ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کا استقلال بڑھتا جاتا ہے اور اسلحہ کی جو تقریر حال میں ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرناکامی اور نقصان روسیوں کے ارادے کو اوڑھ لیا وہ مضبوط کر دیتا ہے اس کے مقابلے پر ہر ہٹلر کی وہ تقریر رکھنا چاہئے جو انھوں نے کچھ دن ہوئے میونخ میں کی تھی اور جس میں طرح طرح سے بات بنا کر دکھایا گیا ہے کہ جرمنی کو کوئی ناکامیابی نہیں ہوئی ہے، ہر ہٹلر کی تقریر میں اور بہت سے نکتے بھی تھے، جن کا تعلق روس کی جنگ سے نہیں، بلکہ دنیا کی سیاست سے ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس وقت ذرا ان تقریروں پر غور کر لیجئے جو اس جنگ کا حال بتاتی ہیں اور اس سیاست کا جس کی خاطر یہ جنگ ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر کی تمام تقریریں ایک سی ہوتی ہیں۔ ان کے اصول وہی ہیں، جو ہر بڑے پیمانے کی صنعت کار کا الگ الگ کل پرزے تیار کر لئے جائیں اور پھر انھیں جوڑ کر جو چیز بنانا ہو تیار کر لی جائے۔ ہر ہٹلر کی تقریر میں بہت سی پُرانی باتیں تھیں اور بالکل نئی بات شاید کوئی بھی نہیں تھی۔ لیکن دنیا کی حالت بدلتی رہتی ہے اور ہر ہٹلر اپنی پرانی تقریروں میں کچھ بڑھا کر اور کچھ گھٹا کر جو نئی تقریر کرتے ہیں، اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ روس کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں لڑتے ہیں، کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی موسم کو ناموافق دیکھ کر یا رسد کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد تاشاد کھانا نہیں ہے، ہم دشمن کی فوج کو ختم کرنا اور ملک پر پورا قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہر ہٹلر پہلے ہی کہہ چکے ہیں، لیکن چند دن کے اندر اسکو فوج کرنے کا دعویٰ جو انھوں نے پہلے کیا تھا وہ اس مرتبہ دہرایا نہیں گیا۔ اس کے بجائے انھوں نے لینن گراڈ کے محاصرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس شہر کو گھیر بیٹھے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ایک دن یہاں کی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے پاس نہ کھانے کو کچھ رہے گا اور نہ گولہ بارود۔ ہم محاصرے میں ایک سپاہی کی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے، بس محاصرے کو جاری رکھیں گے اور اگر روسی دوسرے شہروں کی طرح لینن گراڈ کو اڑا دیں گے تو یہ بھی ہمارا کام ہے جو ان کے ہاتھوں اور خود بخود ہو جائے گا۔ خود بخود ہونے والا

کام کتنے دنوں میں ہو گا یہ ہر شلر نے نہیں بتایا اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے، اس لئے کراب جاڑ شروع ہو گیا ہے اور ان کا وعدہ تھا کہ اس کی جنگ جاڑوں سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

سیاست پر جو تبصرہ ہر شلر نے کیا ہے، وہ بھی اسی انداز میں تھا، وہ برطانیہ پر جنگ جوئی کا الزام لگاتے ہیں جس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ برطانیہ ان سے صلح کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہر شلر اپنی طرف سے کئی مرتبہ صلح کی بحث چھیڑ چکے ہیں۔ اس کی اسٹائن نے بھی تصدیق کی ہے۔ کہ ہر شلر نے مغربی ملکوں کو روس کے خلاف ملانا چاہا۔ اپنی تقریر میں اسٹائن نے یہاں تک کہا کہ ہر شلر اصل میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لئے بیٹھے گئے تھے۔ جنگ کی ذمہ داری برطانیہ پر ڈالنے میں ہر شلر کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ برطانیہ یورپ کی اس نئی تنظیم میں حائل ہے وہ جو کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب فضا موافق ہے، اٹلی ان کے قابو میں ہے، فرانس کو انہوں نے اس حد تک راضی کر لیا ہے کہ اب فرانسیسی فوج روس کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کی جا رہی ہے، یورپ کی باقی تمام قومیں ہر شلر کے ماتحت یا ان کی دست نگر ہیں۔ اس لئے جرمنی کے پروسیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو اس بات کا چرچا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ہوگی کہ یورپ کی تمام قوموں کی ایک کانفرنس جلد ہونے والی ہے۔ کانفرنس کا اشتہار دینے کے لئے اور لوگوں کو موعوب کرنے کے لئے پہلے کہا گیا تھا کہ اس کا اجلاس اسکو کے مشہور محل کرملین میں ہوگا، لیکن جرمن فوجیں ابھی تک اسکو نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اس لئے کانفرنس جو براؤنیا میں ہوگی کانفرنس کا غالباً ایک مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تصدیق ہو جائے اور آگے کے لئے جرمنی کو اس کا باضابطہ طور پر اختیار ہو جائے گا کہ جس طرح سے چاہے جنگ کرے اور جس طرح چاہے صلح کی تدبیریں کرے۔ یہ بات شاید صاف صاف کہی تو نہیں جاتی لیکن کانفرنس میں صلح کی تحریک بھی اٹھائی جائے گی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جنگ کا اصل ذمہ دار وہ ہے، جو اس وقت صلح سے انکار کرے۔

ایسے تو کانفرنس کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اس سے لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں، ترک میں جرمنی کے اشارے پر یہ غلط فہمی جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہے، ترک دیکھتے ہیں کہ جنگ روز بروز ان کے ملک کے

قریب آتی جا رہی ہے، انھیں اندیشہ ہے کہ وہ اس کی پیٹ میں آ جائیں گے، اس لئے قدرتی طور پر وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے جرمنی اور برطانیہ میں صلح کرادی جائے۔ ترکوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے جرنل بکتے پھرتے ہیں کہ ہاں ہاں اب صلح ہو جانا چاہئے، اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے اور ترک جو دل سے صلح پسند ہیں اب اس کی کوشش کریں تو صلح اور بھی جلدی ہو سکتی ہے۔ ترکوں کو سب اپنا دوست سمجھتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ صلح کا فرانس قسطنطنیہ میں ہو، واقف کا ترک تو وہی سمجھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہ ترکی کے صدر عصمت پاشا نے جمہوریہ کی بری کے موقع پر اپنی تقریر میں بیان کیا تھا، لیکن سب لوگ واقف کا راور موٹیا نہیں ہوتے وہ تو جنگ سے بیزار ہیں اور ہر شے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

مجھدار ترک تو جانتے ہیں کہ برطانیہ جرمنی سے صلح نہیں کرے گا اور ابھی صلح کا نام لینا فضول ہے لیکن برطانیہ کے دماغ میں یہ بات نہیں سماؤ، وہ صلح اور جنگ کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق فرانس کو شکست کے بعد برطانیہ کو صلح کر لینا چاہئے تھا۔ اب بھران کے نزدیک روس کی شکست کے بعد صلح کی گفتگو کرنے کا موقع آئے گا۔ ہمارے لئے اولیٰ تو روس کی شکست کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ روس اپنی موجودہ حالت میں بھی مہینوں لڑ سکتا ہے، دوسرے اگر خدا نخواستہ روس نے شکست جی کھائی تو برطانیہ صلح کی گفتگو کرنے کے بجائے جنگ جاری رکھنے کا نئے سرے سے عہد کرے گا۔ ہسٹر چرل پچھلے سال کہہ چکے ہیں کہ برطانیہ اگر ضروری ہو تو برسوں تک اور ضروری ہو تو اکیلا لڑتا رہے گا۔ اتالن نے اپنی پچھلی تقریر میں روس کی طرف سے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ اتالن ہسٹر چرل اور پریزیڈنٹ روزولٹ کی تقریروں سے دنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے اور جہاں تک ممکن ہو گا وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہیں گے۔ متحدہ ریاستوں نے روس کو بہت بڑی رقم قرض دی ہے۔ پریزیڈنٹ روزولٹ نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ اگر جلد فیصلہ کرنا ہو تو ان کی اور اتالن کی گفتگو براہ راست ہو جائے اس طرح روس میں جنگ جاری رکھنے کا سامان ہو گیا ہے اور کوئی توجہ نہیں، اگر اتالن کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ مغربی یورپ میں کہیں پر برطانوی فوجیں لڑیں اور جرمنی کے خلاف غارت خانہ قائم کریں۔

پریزیڈنٹ روزولٹ کا اختیار بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، انہیں صرف صحیح تدبیر سوچنے میں کمال حاصل نہیں ہے، وہ اپنی قوم کو اپنی مصلحت سمجھا بھی سکتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ لینڈ اینڈ لیز — ادھار بٹا کا قانون منظور ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب قانون غیر جانب داری میں ترمیم کی جا رہی ہے اس کے بعد ہی ریاستوں کے تمام تجارتی جہاز مسلح ہو جائیں گے امریکہ سے انگلستان ہر قسم کا مال امریکہ کے جنگی جہازوں کی خطرات میں بچایا جاسکے گا اور بطلانوی بیٹرا خاص جنگی کاروائیوں کے لئے وقف کیا جاسکے گا۔ اس طرح وہ اتحاد جواب تک دل میں تھا، ایک بہت معقول علیٰ صورت اختیار کرے گا اور متحدہ ریاستیں، برطانیہ اور روس ایک دوسرے سے مل جائیں گے کہ فاشسٹ، قوموں کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔

جاڑ شروع ہو گیا ہے اور جنگ ایک نئی قسم کی کیفیت کی طرح ان میدانوں میں بھی پھیل رہی ہے جہاں اب تک دھوپ اور ریت نے مورچوں اور خندقوں سے نکلنا مشکل کر دیا تھا۔ یکپل سال بطلانوی پس سٹاٹ نے لیبیا میں پیش قدمی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع کی تھی اس مرتبہ دشمن زیادہ چالاک اور مستعد ہوا اس لئے ضروری تھا کہ اسے تیار ہونے کا موقع کم سے کم دیا جائے۔ موسم کے ناموافق ہو جانے کا امکان ابھی باقی ہے۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ بارش کی وجہ سے فوجی کاروائیوں میں فعل پڑتا ہے لیکن اچانک حملہ کرنے میں بھی بڑے فائدے ہیں، ان کو خالی اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ موسم اپنا رنگ بدل کر پریشان کرے گا۔

واقعہ کارلوگوٹ کے اخباروں میں جو بیانات شائع کرتے ہیں ان سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ریگستان کی لڑائی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ زمین ایسی ہوتی ہے جو کسی کو سہارا نہیں دیتی جس پر کسی کے قدم جھٹھ نہیں پاتے۔ کبھی آدمی اس کے اوپر ہوتا ہے تو کبھی یہ آدمی کے اوپر ہو جاتی ہے اس میں نہ راستہ بنایا جاسکتا ہے نہ ٹھکانہ اور اگر کسی کو اس کا پتہ رہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی منزل کدھر ہے تو یہی بہت غنیمت ہے۔ ایسی زمین میں کوئی مستقل محاذ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تھوڑی تھوڑی کر کے فوج نہیں کی جاسکتی اس لئے اگر آپ کی سمجھ میں فوراً نہ آجائے کہ لیبیا میں بطلانوی اور جرمن فوجوں کی لڑائی کس طرح ہو رہی ہے تو اسے سمجھانے والے کا قصور نہ جانئے، ریگستان کی جنگ میں فوج کے مختلف حصے اس

روٹوف پر قبضہ کر کے وہ جلد سے جلد جنوب کی طرف بڑھیں گی اور جزیرہ ناکریا سے لاکر بائیم کے پاس بھی وہ فوج اتاریں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ لیکن جلدی کی بھی ایک حد ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن خود جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی ناکافی نہیں۔ اس لئے ترکی کے وزیر اعظم ہرشل سے گفتگو کرنے کے لئے بلائے گئے ہیں اس امید میں کہ شاید ترکوں کی مدد سے کام کچھ اور جلدی ہو جائے۔ ظاہر ہے ترک کسی کی دھونس میں نہ آئیں گے جرمنی جتنا اصرار کرے گا اتنا ہی وہ انکار کریں گے اور بہت ممکن ہے ہرشل جلدی میں اپنا کام اس طرح بگاڑ دیں کہ پھر وہ بنائے نہ بن سکے۔ فی الحال تو ہم بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں میں برطانیہ کی پیش قدمی نے صرف ایک میدان میں نہیں۔ سیاست اور جنگ کے بہت سے میدانوں میں دشمن کو مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اب لڑائی صرف یہاں نہیں ہوگی بلکہ اس کا نفاذ اکر سے شمالی ایران تک ہوگا۔

